مقالاتِ سعیدی

از رشحاتِ فکر

مفسر قرآن و شارح حدیث حضرت علامہ غلام رسول سعیدی



اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

پڑھو اور تمہارا رب سب سے بڑا کریم ہے جس نے قلم سے لکھنا سکھایا، آدمی کو وہ سکھایا جو نہ جانتا تھا (العلق ۳-۵)

مقالاتِ سعیدی

جس میں توحید و رسالت، خلفاء راشدین، مسائل کلامیہ، عبادات فقہیات اور شخصیات جیسے اہم موضوعات پر مفصل، علمی و تحقیقی بحث کی گئی ہے

از رشحاتِ فکر

علامہ غلام رسول سعیدی

شیخ الحدیث دار العلوم نعیمیہ، کراچی ۳۸

ضیاء القرآن پبلی کیشنز کراچی

نام کتاب	مقالات سعیدی
مؤلف	علامہ مولانا غلام رسول سعیدی
	شیخ الحدیث، دار العلوم نعیمیہ، کراچی
ناشر	محمد حفیظ البرکات شاہ
	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، کراچی
سال اشاعت	مارچ 2014ء، بار اول
مطبع	اوریلیاء پرنٹرز
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	TF70

ملنے کا پتہ

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-32212011-32630411۔

فیکس:۔ 021-32210212

e-mail:- info@zia-ul-quran.com

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

انتساب

بہ گرامی خدمت استاذی واستاذ العلماء فخر المحققین مولانا عطاء محمد چشتی (بندیال) جن کی شفقت کو میں آج تک نہیں بھلا سکا۔ جن کے فیضان نظر سے نجانے کتنے ذرے آسمان علم پر چمکے اور چھا گئے، جن کی تعلیم وتربیت نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں کچھ پڑھ سکوں، پڑھا سکوں اور لکھ سکوں۔ آج بھی جسے علم کی واقعی پیاس ہوتی ہے وہ انہیں کے چشمۂ فیض تک پہنچتا ہے۔

غلام رسول سعیدی غفرلہٗ



معروضہ

یہ مجموعہ میرے ان مقالات کا ہے جن کو میں وقتاً فوقتاً لکھتا رہا، حصول علم کے زمانہ سے مضامین لکھنے شروع کئے، جن میں سے بعض ملک اور بیرون ملک کے مختلف اخبار اور جرائد میں اب تک چھپتے رہے۔ بعض مضامین کا میں ریکارڈ نہ رکھ سکا وہ تلف ہو گئے۔ بعض مضامین جو مستقل کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں ان کو میں نے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔

ان مقالات کو میں نے چند ابواب کے تحت درج کیا ہے۔ مثلاً توحید و رسالت، خلفاء راشدین، عبادات، فقہیات وغیرہ۔ بعض مضامین ایسے تھے جن کو میں نے لکھنا شروع کیا پھر کسی اور مصروفیت کی طرف متوجہ ہو گیا اور ان کو پورا نہ کر سکا۔ مثلاً ''بلا سود معیشت'' ۱۹۷۷ء میں میں نے اس کو لکھنا شروع کیا اور کافی حصہ لکھ ڈالا۔ پھر درمیان میں اس کو چھوڑ کر ''تاریخ نجد و حجاز'' کے عنوان سے ایک مبسوط کتاب لکھ ڈالی اس کے بعد میں مسلم شریف کا ترجمہ اور اس کی شرح لکھنے میں مشغول ہو گیا اور یہ مسودہ جوں کا توں پڑا رہا اب جب ان مقالات کو جمع کیا تو اس کو بھی پورا کیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی شخصیات کے موضوع پر میرے دو مضمون شائع ہو چکے تھے۔ اب خلفاء راشدین کا سیٹ مکمل کرنے کے لئے حضرت عثمان اور حضرت علی کے موضوع پر دو مستقل مضمون لکھے۔ الوہیت کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا خیال تھا اور اس موضوع پر میں نے کافی کچھ لکھا جس کا کچھ حصہ انجمن طلباء اسلام نے الوہیت اور نبوت کے نام سے شائع کیا اس مجموعہ میں میں نے وہ سب شامل کر دیا ہے جو اس وقت تک الوہیت کے موضوع پر لکھا تھا اور پھر بعض مصروفیات کی وجہ سے اس کو مکمل نہ کر سکا۔ تاہم جو کچھ لکھا ہے اگر اس کو کوئی شخص صدق نیت اور غور سے پڑھے تو ان شاء اللہ وہ یہ مانے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے اور وہ ایک ہی ہے۔ اخیر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان مقالات کو قارئین کے لئے مفید ثابت

کرے اور اس سرتاپا گنہگار کے لئے مغفرت کا ذریعہ بنائے۔ فقط

غلام رسول سعیدی غفرلہٗ

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۰ ہجری

موبائل:0300-2156309

0321-2021744

☆☆☆☆☆

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نحمدہ و نصلی و نسلم علی رسولہ الکریم

توحید و رسالت

الوہیت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا فرمایا اور اس کے ذرہ ذرہ میں اپنی ذات اور صفات پر علامات اور نشانیاں رکھیں، پھر انسان کی عقل میں ایسا نور پیدا کیا جس کی وجہ سے وہ ان نشانیوں میں سے صاحب نشان تک پہنچ سکے، معرفت عقل کے علاوہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی طرف عقل انسانی کی رہنمائی کی، وجود باری پر ٹھوس شواہد اور ثبوت مہیا کئے۔ آسان، سادہ اور فطری دلیلوں سے انسانی ذہن کو مسخر کیا اور اعجاز آفرین بیان سے انسان کے دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کیا کہ وہ بارگاہ الوہیت کے سامنے تصدیق و تسلیم کے ساتھ بے اختیار جھک گیا۔

نبوت اور رسالت کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے کتب اور صحائف بھی نازل کئے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کی معرفت کے علاوہ انسان کی اخروی سعادت اور اس کی دنیاوی زندگی کے لئے ایک جامع اور مربوط نظام کے اصول اور قواعد بیان فرمائے۔

اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، وہ نہیں چاہتا کہ انسان گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا پھرے اور قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں کو شیطان کی زہر آفرینیوں سے ضائع کر دے۔ وہ ہر زاویے اور ہر رخ سے انسان کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ سورج کے طلوع و غروب، گردش لیل و نہار، موت و حیات کے حدوث اور تکلیف و راحت کے توارد میں اس نے انسانی ذہن کی سوچ کے دھاروں کا رخ اپنی ذات کی طرف موڑنے کے لئے ہدایت کا سامان کر رکھا ہے، وہ آسمان و زمین کے حقائق و آثار اور بدلتے ہوئے حالات میں غور و فکر کی قوت دیتا ہے

تا کہ کسی طور سے انسان کجروی سے باز آئے، اپنے خالق کو پہچانے، اس کی نعمتوں کا اعتراف کرے اور اس کے بے اندازہ لطف و کرم کے احساس سے ممنون ہو کر سجدۂ سپاس بجالائے۔ ہم آپ کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی وحدانیت اور اس کی قدرت و حکمت پر چند شواہد پیش کرتے ہیں۔

انقطاع اسباب سے استدلال

ہمارے مشاہدات اور تجربات سے یہ امر یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہے کہ ہر چیز اپنے وجود میں کسی علت اور سبب کی محتاج ہے اور اس عالم آب و گل میں کوئی شے بغیر سبب کے ظہور پذیر نہیں ہوتی اور جب ہر ممکن کا ایک سبب ہوتا ہے اور اس سبب کا پھر کوئی سبب ہوتا ہے و علیٰ ھٰذا القیاس۔ اگر یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے تو اسباب اور مسببات کا ایک غیر متناہی سلسلہ لازم آئے گا اور امور غیر متناہی کا سلسلہ عقلاً محال ہے۔ اس لئے لازماً ماننا پڑے گا کہ اسباب کا سلسلہ اخیر میں جا کر کسی ایسے سبب پر ختم ہو جاتا ہے جو اپنے وجود میں کسی اور سبب سے مستغنی ہے اور جب یہ وجود علت اور سبب سے مستغنی ہے تو ضروری ہوا کہ یہ وجود امکان اور احتیاج کے نقص سے پاک ہو کیونکہ ہر ممکن کسی سبب اور علت کا محتاج ہوتا ہے، لہٰذا یہ وجود واجب قرار پایا جو بذاتہٖ موجود ہے اور تمام موجودات عالم کا موجد ہے۔

طبعی خواص کی نفی سے استدلال

بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اشیاء میں خواص ہوتے ہیں اور بغیر کسی سبب اور علت کے ان اشیاء سے وہ طبعی خواص اور آثار صادر ہوتے ہیں مثلاً پتھر کو اچھالیے تو وہ بغیر کسی سبب اور علت کے اوپر سے نیچے کی طرف چلا آئے گا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہ ساری کائنات اسی طرح بغیر کسی سبب کے اپنے طبعی تقاضوں سے وجود میں آئی ہو۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ آپ ایک درخت کی طرف دیکھیں، اس کا تنا بھی لکڑی کا ہے اور جڑیں بھی لکڑی کی ہیں اور تنا اوپر کی طرف جاتا ہے اور جڑیں نیچے کی طرف جاتی ہیں۔ اب اگر لکڑی کی طبیعت کا تقاضا اوپر جانا ہے تو جڑیں نیچے کیوں جاتی ہیں اور اگر اس کا تقاضا نیچے جانا ہے تو تنا اوپر کیوں جاتا ہے؟ معلوم ہوا کہ لکڑی کی اپنی طبیعت کا تقاضا کچھ نہیں ہے بلکہ درخت

کی لکڑی پر کسی اور ذات کا تصرف ہے اور اس قادر قیوم نے درخت کی اس لکڑی کے جس حصہ کو چاہا اوپر اٹھا دیا اور جس حصہ کو چاہا نیچے جھکا دیا۔

شہتوت سے استدلال

امام شافعی ایک شہتوت کے درخت سامنے کھڑے تھے۔ کسی نے ان سے وجود باری کے بارے میں سوال کیا کہ آپ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ امام شافعی نے فرمایا: اس شہتوت کے درخت کو دیکھ لو، اس کے پتوں کو اگر بکریاں چریں تو دودھ حاصل ہوتا ہے اور شہد کی مکھی ان پتوں کو چاٹ لے تو شہد بنتا ہے، ریشم کا کیڑا ان پتوں کو کھا لے تو اس سے ریشم حاصل ہوتا ہے اور اگر ہرن ان کو کھا لے تو اس سے مشک حاصل ہوتا ہے اور ان چاروں چیزوں کے حقائق اور آثار مختلف ہیں اور شہتوت کے پتوں کا تقاضا ایک ہی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ طبیعت واحدہ کا تقاضا بھی واحد ہوتا ہے، پس اگر ان پتوں کی طبیعت کا تقاضا دودھ ہے تو اس سے ریشم، شہد اور مشک کیسے حاصل ہوا اور اگر ان کی طبیعت کا تقاضا ریشم ہے تو ان سے مشک، شہد اور دودھ کس طرح حاصل ہوا؟ معلوم ہوا کہ یہ پتے اپنی ذات میں کسی چیز کا تقاضا نہیں رکھتے۔ اصل میں ان تمام اشیاء کا خالق اور موجود اللہ تعالیٰ کی ذات مقدسہ ہے، وہ چاہے تو اس پتے کو بکریوں کے منہ میں ڈال کر ان سے دودھ نکال دے اور چاہے تو شہد کی مکھیوں سے ان پتوں کو چسوا کر اس کو شہد بنا دے اور چاہے تو ہرن کو یہ پتے کھلا کر ان کو مہکتی ہوئی مشک میں تبدیل کر دے اور اگر چاہے تو ان پتوں کو ریشم کے کیڑوں کی خوراک بنا کر اس سے ریشم بنا دے۔ اس کائنات کی حقیقتوں میں سے آپ جس حقیقت پر بھی غور کریں گے یہی منکشف ہوگا کہ ہر حقیقت کے پیچھے اسی موثر حقیقی کا دست غیب کارفرما ہے اور بظاہر نظر آنے والے سارے اسباب ایک حجاب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔

لیموں سے استدلال

لیموں کو دیکھئے، اس کا چھلکا گرم خشک ہوتا ہے اور اس کا گودا گرم تر ہوتا ہے اور اس کا عرق سرد خشک ہوتا ہے اور لیموں کے یہ تمام مختلف آثار اس کے واحد بیج میں ہوتے ہیں

اور اس بیج کی طبیعت کا تقاضا بھی ایک ہونا چاہئے، لیکن اس بیج سے جب لیموں کا پھل پک کر سامنے آیا تو اس میں گرم خشک، گرم تر اور سرد خشک سب قسم کے آثار موجود تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ سلسلۂ موجودات طبعی آثار کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک زبردست حکیم مطلق اور قادر قیوم کی قدرت اور حکمت کا نتیجہ ہے کہ وہ چاہے تو گرم خشک بیج سے سرد تر پھل پیدا کر دے اور چاہے تو سرد تر بیج سے گرم خشک پھل کو وجود میں لے آئے۔

زرعی پیداوار سے استدلال

سلسلۂ پیداوار کو دیکھئے، ہم ایک دانہ گندم کو زمین میں دبا کر چلے آتے ہیں، پھر وہ کون سی طاقت ہے جو اس دانہ گندم کو پھاڑ کر اس سے باریک کونپل نکالتی ہے اور وہ اس قدر باریک اور نازک ہوتی ہے کہ اگر ہم اس کو ہاتھ میں لے کر مسل ڈالیں تو ختم ہو جائے۔ پھر اس کونپل کو اس قدر شکتی اور قوت کون دیتا ہے کہ وہ سخت سے سخت زمین کا سینہ چیر کر، زمین کے اندر جا کر اپنی مستحکم جڑیں بنا لیتی ہے؟ پھر شبنم کے قطرے اور نسیم سحر کے نرم و نازک جھونکے اس میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں۔ سورج کی کرنیں اس میں پختگی لاتی ہیں اور وقت مقررہ پر ہونے والی بارشیں اس میں ہریالی پیدا کرتی ہیں۔ چاند کی کرنیں اس میں ذائقہ لاتی ہیں اور سورج کی تیز دھوپ اس فصل کا قوام تیار کر کے اسے مکمل کرتی ہے اور فصل کٹ جانے کے بعد تند و تیز آندھیاں دانہ کو بھوسہ سے الگ کرنے کے لئے اہم رول ادا کرتی ہیں۔

سوچئے! زمین و آسمان کی تمام قوتیں اگر ہماری فصلوں میں اپنا اپنا رول ادا نہ کرتیں تو کیا ہم زمین سے ایک دانہ گندم بھی حاصل کر سکتے تھے۔ پھر بیج بونے سے لے کر فصل کی کٹائی تک اس مربوط نظام کو کون چلا رہا ہے؟ کیا کسی بے جان بت نے یہ نظام وضع کیا ہے یا نظام شمسی کے پابند سیارے یہ نظام چلا رہے ہیں اور جب ہم سمجھتے ہیں کہ عناصر کائنات میں سے کوئی چیز اس نظام کی واضع اور اس پیداوار کی خالق نہیں ہے اور نہ ہی یہ عقل باور کر سکتی ہے کہ کسی ناظم کے بغیر کوئی نظام عمل میں آ جائے یا کسی مقنن کے بغیر کوئی قانون تشکیل پا جائے یا کسی خالق کے بغیر کوئی مخلوق وجود میں آ جائے تو پھر کیوں نہیں مان لیتے کہ اس کائنات کے ماوراء ایک زبردست حکیم اور قادر قیوم کی ذات فرمانروا ہے؟ جس کی عجیب و

غریب حکمت اور زبردست طاقت سے زرعی پیداوار کا یہ سارا سلسلہ رواں دواں ہے۔ اسی لئے وہ فرماتا ہے:

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ۝ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝ (الواقعہ)

بھلا بتاؤ تو سہی تم جو کچھ زمین میں بو کر آتے ہو اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اس فصل کو بالکل ملیامیٹ کر دیں اور تم کف افسوس مل کر یہ کہتے رہ جاؤ: ہم پر اچانک آفت آ پڑی یا ہم بالکل محروم ہو گئے۔

ایک اور زاویہ سے دیکھئے کہ غلہ کی مختلف اجناس کا ہر سال ایک معین موسم میں پیدا ہونا اور پھل دار درختوں کی مختلف اقسام کا ہر سال اپنے اپنے موسم میں پھل لانا اور پھولوں سے لدے ہوئے پودوں اور درختوں میں ہمیشہ اپنے مقررہ ایام میں کلیوں کا کھلنا اور پھولوں کا مہکنا اور ہر نوع کے بیج سے اسی نوع کے پھل، پھول اور غلہ کا پیدا ہونا کیا ان تمام مقررہ اور منضبط امور سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زرعی پیداوار کا یہ عظیم سلسلہ کوئی امر اتفاقی نہیں ہے اور نہ از خود بغیر کسی صانع کے یہ نظام خود بخود چل رہا ہے اور نہ ہی یہ نظام متعدد شرکاء کی تخلیق کا مرہون منت ہے بلکہ اس وسیع زرعی نظام کے پیچھے خلاق واحد کا دست قدرت کارفرما ہے جو فیاض اور جواد بھی ہے اور حکیم وقدیر بھی۔

اگر کوئی شخص اس کے وجود یا اس کی وحدانیت کا انکار کرتا ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ پھول ہمیشہ ایک موسم میں کیوں کھلتے ہیں؟ غلہ اور پھلوں کی پیداوار میں ہمیشہ ایک مخصوص موسم اور ماحول کا اعتبار کیوں ہوتا ہے اور گندم کے بیج سے چاول، اخروٹ کے بیج سے انناس کیوں پیدا نہیں ہو جاتا؟ الحاد، شرک اور دہریت کی بنیاد پر کوئی شخص ان سوالوں کا معقول جواب نہیں دے سکتا اور جو شخص اپنی ذہنی توانائیوں کو ضائع نہیں کر چکا اس کو لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ زرعی پیداوار کے اس مربوط نظام میں تسلسل، انضباط اور باقاعدگی یونہی کوئی امر اتفاقی نہیں ہے۔ نہ متعدد شرکاء کی کوشش کا ثمرہ ہے، بلکہ زرعی پیداوار کا یہ وسیع اور پر حکمت سلسلہ

اس خلاق واحد کی قدرت، حکمت اور فیاضی کا منہ بولتا شاہکار ہے۔

ڈارون کے نظریہ کا ابطال

نطفہ کا ایک قطرہ جو علقہ، مضغہ اور دوسرے تخلیقی مراحل طے کر کے صورت انسانی میں ڈھل کر ماں کی گود میں ہمکتا ہوا آ پہنچتا ہے۔ کیا نطفہ سے لے کر اس پیکر انسانی تک کی تمام منزلیں اس نے خود بخود طے کر لی ہیں؟ کسی انسان کا خود بخود بن جانا تو بہت بڑی بات ہے اس عالم اسباب میں تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ اگر یہ بنا بنایا انسان کبھی کسی حادثہ یا بیماری سے بگڑ جائے تو بغیر کسی خارجی عمل کے وہ خود بخود ٹھیک ہو جائے تو سوچئے کہ جو چیز بننے کے بعد خود بخود ٹھیک نہیں ہو سکتی وہ ابتداءً خود بخود بن کیسے سکتی ہے؟ غلط کہتا ہے وہ شخص جس نے دعویٰ کیا ہے کہ انسان کیڑے مکوڑوں کے مراحل طے کرتا ہوا بندر تک آ پہنچا اور پھر اس بندر نے ارتقائی منازل طے کر کے انسانی شکل اختیار کر لی۔ اولاً تو کیڑے مکوڑے بھی خود بخود نہیں پیدا ہوتے اور ثانیاً یہ کہ اس ترقی یافتہ دور میں ہزارہا سائنسی اور کیمیاوی ترکیبیں استعمال کرنے کے باوجود آج تک بندر کو انسان کا بدل بنا کر پیش نہیں کیا جا سکا تو اب سے لاکھوں سال پہلے جب موجودہ علم اور سائنس کا نام و نشان تک بھی نہ تھا اس وقت بندر کس فارمولے پر عمل کر کے انسان بن گیا اور وہ فارمولا اب کہاں گم ہو گیا؟ اس لئے لامحالہ کہنا پڑے گا کہ انسان کی پیدائش کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، بلکہ وہ سرتاپا محض اس قادر قیوم کی قدرت اور حکمت کا ساختہ پرداختہ ہے۔

خلقت انسان سے استدلال

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ انسان کو عدم سے وجود میں لانے والا خود وہ انسان نہیں ہے۔ نہ اس کے ماں باپ اس کے موجد ہیں۔ کیونکہ دنیا میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ مرد و زن کے اختلاط کے باوجود اولاد پیدا نہیں ہوتی اور نہ دنیا کے دوسرے انسان اس کے موجد ہیں۔ کیونکہ مشاہدہ شاہد ہے کہ آج تک کوئی انسان اپنے جیسا دوسرا انسان نہیں بنا سکا اور انسانی مراتب کے نیچے جو حیوانات اور اشجار اور دیگر اجسام کا عالم ہے، وہ بھی اس کا موجد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ عالم تو انسان سے ارذل اور اس کی اغراض کے تابع ہے اور اسفل، اعلیٰ

کا موجد کسی حال میں نہیں ہو سکتا اور انسان کے اوپر چاند، سورج اور دیگر سیارگان کا جو عالم ہے وہ بھی اس کا موجد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ تمام سیارے ایک مقررہ نظام کے تحت گردش کر رہے ہیں اور ان کی گردش کی یہ یکسانیت بتلاتی ہے کہ یہ کسی کے بنائے ہوئے نظام عمل کے تابع ہیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس عالم امکانی میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو انسان کے موجد ہونے کی صالح اور دعویدار ہو، تو ضروری ہوا کہ انسان کا موجد جسم اور جسمانیت سے خارج اور امکان اور حدوث کے عیب سے پاک ہو۔

انسانی تخلیق کے مراحل سے استدلال

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس عالم اسباب میں انسان کی پیدائش مرد و زن کے اختلاط سے وجود میں آتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے اور حضرت حواء کو بغیر عورت کے اور حضرت آدم کو مرد اور عورت دونوں کے بغیر پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اس نے انسان کی تخلیق کے لئے مرد اور عورت کے اختلاط کو ایک عام سبب بنایا ہے لیکن اس کی عظیم قدرت ان تمام اسباب سے بالاتر ہے۔ وہ چاہے تو مٹی کے ایک ڈھیر سے حضرت آدم جیسے عظیم الشان نبی کی تخلیق کر دے اور وہ چاہے تو نطفہ کی ایک حقیر بوند سے انسانوں کی پیدائش کا ایک لامتناہی (1) سلسلہ شروع کر دے۔

اب سوچئے کہ نطفہ کی ایک بے جان بوند سے یہ جیتا جاگتا انسان کس طرح وجود میں آ گیا۔ عملی تحقیقات اور سائنس کے روز افزوں تجربات کے باوجود سائنس دان آج تک کسی بے جان مادے سے کسی جاندار شئے کو وجود میں نہیں لا سکے۔ اب تک جو ثابت ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ نطفہ جوہر حیات تو ہے لیکن خود زندگی سے خالی ہے۔ پھر جو چیز خود حیات سے عاری ہو وہ ایک صاحب حیات کی موجد کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ بے جان نطفہ کی یہ بوند اپنے اندر علم و ادراک اور قوت و توانائی کا وہ جوہر رکھتی ہے جس سے وہ ایک مکمل انسان کی صورت گری پر قادر ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ کیا انسان مکمل ہو جانے کے بعد اتنی طاقت رکھتا ہے کہ اپنے جسم کے بالوں میں سے کسی ایک بال کو ایک سے دوسری جگہ منتقل کر سکے؟ تو

1۔ لامتناہی سے مراد لاتقف عند حد ہے۔ جو در حقیقت متناہی بالفعل ہے۔

جب یہ انسان مکمل اور طاقت ور ہونے کے باوجود اپنے اندر تغیر و تبدل کی قدرت نہیں رکھتا تو جس وقت یہ ایک حقیر نطفہ کی بوند کی شکل میں تھا اس وقت یہ اپنے اندر تغیر اور نشو و نما کی شکتی کیسے رکھ سکتا تھا؟ اس لئے ماننا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق اور تصویر و تشکیل میں اسی خلاق واحد کا دست قدرت کارفرما ہے۔

انسان کی تخلیق اس کے نطفہ میں موجود ایک انتہائی باریک جرثومہ سے ہوتی ہے اور جب مرد کا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچتا ہے تو یہ جرثومہ عورت کے رحم میں کسی وقت اس نسوانی انڈے سے جا ملتا ہے جو اس جرثومہ کی طرح انتہائی باریک ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے امتزاج سے ایک باریک خلیہ بن جاتا ہے اور یہی خلیہ حیات انسانی کا نقطۂ آغاز ہے اور اس خلیہ کا وجود میں آ جانا ہی استقرار حمل کی علامت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس خلیے کو علقہ یعنی جمے ہوئے خون کی شکل میں لاتا ہے، پھر اس علقہ کو تدریجاً مضغہ یعنی گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل کرتا ہے، پھر اس گوشت کے ٹکڑے کی صورت گری کی جاتی ہے اور گوشت کے اس لوتھڑے کو انسانی اعضاء کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے اور اس کو مرد یا عورت کی ساخت عطا کی جاتی ہے۔ استقرار حمل کے چار ماہ بعد اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ پھر عورت کے پیٹ میں اس کو غذا پہنچا کر اس کی جسامت بڑھائی جاتی ہے اور اس کے دماغ میں وہ تمام صلاحیتیں رکھی جاتی ہیں جن کے سبب سے وہ آگے چل کر اپنی زندگی میں تعلیم و تربیت اور ماحول کے زیر اثر کسی ڈاکٹر، انجینئر، سیاست دان، عالم دین، ولی کامل، تاجر یا ایک جاہل مزدور اور بدمعاش غنڈے کی شخصیت میں معاشرے کے اندر ابھرتا ہے۔

انسانی تخلیق کے ان تمام مراحل میں انسان کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ اپنے نطفہ کو عورت کے رحم تک پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے نطفہ سے ایک خاص جرثومہ ونسوانی بیضہ سے کون ملاتا ہے؟ پھر اس امتزاج کے نتیجہ کو پہلے علقہ، پھر مضغہ کی شکل میں کون لاتا ہے؟ پھر اس مضغہ کو الگ الگ انسانی صورتوں کا لباس پہنا کر چار ماہ بعد اس میں روح کون پھونکتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا کس کا کام ہے کہ اس شخص کو سلیم الاعضاء بناتا ہے یا محتاج اور اپاہج؟ پھر اس کے ذہن اور دماغ میں مختلف شعبوں کی الگ الگ صلاحیتوں کو کون رکھتا ہے

اور نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں اس کو مسلسل غذا اور نشوونما کا مادہ کون فراہم کرتا ہے؟ کیا یہ تمام کام خود وہ عورت کرتی ہے یا کوئی ڈاکٹر اور حکیم اپنی ادویات سے اس عمل کو جاری رکھتا ہے یا پھر یہ کسی سائنس دان کا شاہکار ہے یا بے جان بت جو خود سے ہل بھی نہیں سکتے، وہ نطفہ کی ایک بوند کو جیتا جاگتا انسان بنا دیتے ہیں؟ پھر آخر یہ کس کا کارنامہ ہے؟ کیا اب بھی عقل یہ فیصلہ نہیں کرتی کہ خدائے واحد کے سوا ان افعال کا اور کوئی خالق نہیں ہے؟

اور اگر اب بھی کوئی شخص ڈھٹائی سے کہہ دے کہ خود بخود محض اتفاق سے یہ عمل ہو رہا ہے تو ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر تخلیق انسانی محض ایک اتفاقی حادثہ ہے تو اس میں ابتداءً مرد اور عورت کے اختلاط کی قید کیوں ہے؟ محض ایک مرد یا صرف ایک عورت سے بچہ کیوں نہیں پیدا ہو جاتا اور تمام دنیا میں انسان کی پیدائش کے لئے ایک ہی ضابطہ کیوں مقرر ہے؟ ہمیشہ ایک مکمل بچہ پیدا ہونے کے لئے ایک مخصوص عرصہ کیوں درکار ہوتا ہے؟ لادینی اور دہریت کی بنیاد پر ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے اگر کوئی شخص عقل سے بالکل اندھا اور ہوش و حواس سے قطعاً عاری نہیں ہو چکا تو اسے لازماً کہنا پڑے گا کہ اس عالم کے ماوراء ایک قادر و قاہر ہستی ہے جو خلاق اور جواد ہے جس نے نسل انسانی کے ارتقاء کے لئے ایک سبب بنایا اور اس سبب میں اس قدر کشش رکھ دی کہ مرد اپنے شہوانی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا نطفہ عورت کے رحم تک پہنچا دے اور بس۔ غور کیجئے! جو بچہ پیٹ سے باہر آ کر ہوا کے ایک جھونکے اور دودھ کی چند چسکیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا وہ مسلسل نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں ہوا، پانی اور خارجی غذا کے بغیر کیسے زندہ اور جیتا جاگتا رہا؟ ہم پوچھتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور اس کی نشوونما کے لئے ہوا، پانی اور خارجی غذا مؤثر ہیں یا نہیں؟ اگر ان چیزوں کا اس کی زندگی میں کوئی دخل نہیں تو دنیا میں انسان ان چیزوں کے بغیر کیوں زندہ نہیں رہ سکتا؟ اور اگر یہ چیزیں اس کی حیات اور بقاء میں مؤثر ہیں تو ان کے بغیر وہ ماں کے پیٹ میں کس طرح زندہ رہ سکا؟ معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے نہ طبیعت اور فطرت کا تقاضا ہے، بلکہ وہ خالصتاً اللہ عز وجل کا ساختہ پرداختہ ہے۔ ظاہری اسباب محض حجاب ہیں اور مؤثر حقیقی وہی خالق لم یزل ہے، وہ

چاہے تو ماں کے پیٹ میں خارجی ہوا اور غذا کے بغیر حیات اور روئیدگی دے دے اور چاہے تو پیٹ کے باہر خارجی ہوا اور غذا سے اس کو نشوونما عطا کر دے۔ وہ چاہے تو نطفہ کی ایک بوند سے جیتا جاگتا انسان کھڑا کر دے اور چاہے تو محض مٹی اور گارے سے ایک عظیم الشان انسان پیدا کر دے۔

کیا اس عالم رنگ و بو اور وسیع کائنات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی ایسی ہستی ہے جو اپنی قدرت اور حکمت کے ایسے عجیب و غریب مظاہر دکھا سکے اور کیا اس صناع فطرت کے ان عظیم کرشموں کو دیکھنے کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ یونہی اتفاقاً ہو رہا ہے اور توالد و تناسل کے اب باقاعدہ، متواتر اور مربوط نظام کے پیچھے کسی قادر و قیوم اور خلاق حقیقی کا ہاتھ کار فرما نہیں ہے؟

ایک مرتبہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ میں شطرنج کے کھیل سے بڑا متعجب ہوتا ہوں کہ یہ کھیل ایک مربع فٹ تختہ کے ۶۴ خانوں میں کھیلا جاتا ہے اور اگر ان خانوں میں لاکھ مرتبہ بھی شطرنج کھیلی جائے تو ہر بار بازی مختلف ہوتی ہے۔ حضرت عمر فرمانے لگے: میں اس سے کہیں زیادہ بڑے امر پر تعجب کرتا ہوں کہ انسان کا چہرہ صرف بالشت بھر کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ارب ہا ارب بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ چہرے پیدا کیے لیکن کوئی چہرہ دوسرے چہرے سے نہیں ملتا۔ کسی کی آنکھ دوسرے کی آنکھ سے، ناک ناک سے، ہونٹ ہونٹ سے اور کان کان سے نہیں ملتے۔

اور میں کہتا ہوں کہ چہرہ تو بہت دور کی بات ہے انسان کے ہاتھ کی دو ڈھائی انچ کا انگوٹھا ہوتا ہے اور کسی انگوٹھے کی لکیریں دوسرے سے نہیں ملتیں، بلکہ ایک ہی انسان کے دائیں انگوٹھے کی لکیریں بائیں انگوٹھے سے نہیں ملتیں۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ۔ (المومنون)

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: سبحان ہے وہ ذات جس نے چربی کی ایک بوٹی سے دکھایا، نرم ہڈی سے سنوایا اور گوشت کے ایک ٹکڑے کو گویا کر دیا۔ جو لوگ انسان کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھتے ہیں وہ اس بات کی کیا توجیہ کریں گے کہ انسان کے جسم میں ہر جگہ

گوشت ہے پھر بولنے کا خاصہ صرف زبان میں کیوں ہے اور کیوں ضروری ہے کہ دیکھنے کے لئے صرف آنکھیں مخصوص ہیں؟ جسم کے کسی اور حصہ کی چربی بینائی کا آلہ کیوں نہیں بن جاتی؟ اس لئے اگر کوئی شخص محض ہٹ دھرمی پر نہیں اتر آیا تو اس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے نہ کسی فطری ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے بلکہ وہ مکمل طور پر اس خلاق واحد کی قدرت اور حکمت کا حسین شاہکار ہے۔

ماں کے دودھ سے استدلال

جب ایک عورت ماں بن جاتی ہے اور اس کی گود میں بچہ کھیلنے لگتا ہے تو اس کے سینے سے دودھ اتر آتا ہے، جو غذا وہ پہلے کھاتی تھی اب بھی وہی غذا کھاتی ہے، نہ غذا میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے نہ کھانے والے میں کوئی تبدیلی ہوئی، پھر یہ دودھ کہاں سے آ گیا؟ اگر یہ غذا کا اثر تھا تو کسی اور شخص کے کھانے سے اس کے سینے میں دودھ کیوں نہیں اترتا اور اگر اس عورت کی خاصیت ہے تو بچہ کی پیدائش سے پہلے اس کے سینے سے دودھ کیوں نہیں نکلا؟ معلوم ہوا کہ یہ اثر نہ غذا کا ہے نہ غذا کھانے والی کا، یہ صرف اس قادر مطلق کی کارفرمائی ہے جو رنگ برنگ ترکاریوں کو خون کی رنگت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اس خون کو دودھ کی سفید دھاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر ہمارے پاس کوئی ایسا خارجی عمل نہیں جس کے ذریعے ہم ماں کے سینے سے جاری ہونے والے دودھ کو روک سکیں۔ مبدأ فیاض کے نزدیک جب تک بچے کو دودھ کی ضرورت ہوتی ہے وہ ماں کے سینہ میں دودھ اتارتا رہتا ہے اور جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو دودھ کے جاری ہونے کا یہ سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے کیا انسان کے جسمانی نظام میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی حکمت اور قدرت کی یہ بہترین نشانیاں نہیں ہیں؟

جانوروں کے دودھ سے استدلال

جانوروں سے جو ہم دودھ حاصل کرتے ہیں یہ اس چارے سے حاصل ہوتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں۔ پھر جب جانوروں کی اوجھڑی میں یہ چارہ پہنچتا ہے تو اوجھڑی میں ہضم اول کا مرتبہ شروع ہوتا ہے۔ اوجھڑی کے اوپر کے حصہ میں خون اور نچلے حصہ میں گوبر اور

درمیانی حصہ میں دودھ کا قوام تیار ہوتا ہے اور اس قوام کو اللہ تعالیٰ ہضم کے مختلف مراحل سے گزارتا ہوا جانوروں کے تھنوں تک پہنچا دیتا ہے۔ دودھ کے نیچے گندگی اور غلاظت ہے اور اس کے اوپر سرخ رنگ کا سیال خون دوڑ رہا ہے۔ آخر وہ کون سی حقیقت ہے جو جانوروں کے پیٹ میں تصرف کر کے سرخ رنگ کے سیال خون اور بدبودار گوبر کے درمیان سے صاف، سفید، شیریں اور خوشبودار دودھ کو اس طرح باہر نکال لیتی ہے کہ نہ گوبر کا کوئی ذرہ اس میں داخل ہوتا ہے اور نہ خون کا کوئی قطرہ اس میں شامل ہوتا ہے؟ کیا یہ صاف اور پاکیزہ دودھ اس خالق کائنات کی طرف اشارہ نہیں کرتا جو فرماتا ہے: اِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ (النحل) ''ان جانوروں میں تمہارے لئے غور وفکر کا موقع ہے۔ ہم تم کو گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں، جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے''۔

دودھ کا یہ حصول چارہ کا طبعی خاصہ نہیں ورنہ نر جانور بھی یہی چارہ کھاتے ہیں اور ان سے دودھ کا کوئی قطرہ حاصل نہیں ہوتا اور نہ یہ مادہ جانور ہی کی طبعی خصوصیت ہے ورنہ ایام حمل میں یا اس سے پہلے بھی وہ دودھ دیتی رہے۔ نہ بچہ کی خصوصیت ہے کیونکہ بچہ کے مر جانے کے بعد بھی وہ ایک مدت معینہ تک دودھ دیتی رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں سے دودھ کے حصول کے نظام میں چارہ، جانور اور بچہ کوئی چیز مرکزی کردار ادا نہیں کرتی۔ اس تمام مربوط نظام میں جو دودھ کے حصول کا سبب ہے وہ ایک ذات کارفرما ہے جو عالم کے ذرہ ذرہ میں اپنا تصرف فرما رہی ہے۔

نظام ہضم سے استدلال

انسان جو غذا کھاتا ہے وہ اس کے معدہ میں چلی جاتی ہے اور وہاں اس کا ہضم اول شروع ہوتا ہے۔ اس غذا کا جو صاف جوہر ہے وہ جگر کی طرف چلا جاتا ہے اور جو کثیف مادہ ہے وہ انتڑیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ پھر جگر میں ہضم ثانی ہوتا ہے اور صاف جوہر جگر میں جا کر سوداء، صفراء، پانی اور خون بن جاتا ہے۔ پھر وہاں ان کی تقسیم شروع ہوتی ہے۔ صفراء پتہ کی طرف چلا جاتا ہے اور سوداء تلی کی طرف چلا جاتا ہے اور پانی گردہ کی طرف اور خون

رگوں کی طرف چلا جاتا ہے اور وہاں ہضم ثالث کا عمل شروع ہوتا ہے اور حرارت غریزی سے اعضاء بدن کی جو صورت تحلیل ہوتی رہتی ہے۔خون ان اعضاء میں پہنچ کر اس کے عوض اس عضو کی نئی صورت مہیا کرتا ہے۔سوچئے! کیا یہ سب یونہی ہو رہا ہے؟ کھانے کے چند نوالوں سے جو خون گوشت اور ہڈیوں کی صورت میں نشوونما پا رہی ہے کیا یہ کسی عظیم حکمت اور زبردست قدرت کے زیر انتظام نہیں ہے؟

انسانی نشوونما سے استدلال

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے جس طرح انسان کے جسم کی ساخت بنائی ہے، اس میں متعدد کارآمد اعضاء رکھے ہیں۔ پھر جو غذا ہم پانی اور کھانے کی شکل میں حاصل کرتے ہیں اس کا ایک ایک ذرہ وہ ان تمام اعضاء کو ان کی مخصوص جگہوں پر پہنچاتا ہے اور جس عضو کو جتنی توانائی کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو اتنی توانائی فراہم کرتا ہے اور اس طرح تدریجاً انسان کو اس کے طبعی ارتقاء تک پہنچاتا ہے۔آپ سوچئے کہ انسان کے جسم میں اس سارے نظام کو کون چلا رہا ہے؟ کیا یہ نظام خود بخود چل رہا ہے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا، یا کوئی مافوق الفطرت ہستی اس نظام کو چلا رہی ہے؟ پھر وہ ہستی کیا سورج ہے، چاند ہے، پانی ہے، آگ ہے، پتھر ہے؟ جانور ہے، انسان ہے، کیا ہے؟ یہ تمام چیزیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے خود کسی کے بنائے ہوئے نظام کے تحت سرگرم عمل ہیں اور اس نظام کے پابند ہیں اور اس کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہیں۔عناصر ہوں یا کواکب، زمین کی پہنائیاں ہوں یا افلاک کی بلندیاں، یہ سب ایک نپے تلے مقدر اور منضبط نظام کے تحت اپنے اپنے حصہ کا کام انجام دے رہے ہیں۔تو معلوم ہوا کہ جس ذات نے ان تمام موجودات کو ایک نظام میں مربوط کیا ہوا ہے وہی ذات انسانی جسم کی ساخت اور اس کی نشوونما کی خالق اور مربی ہے۔سورج اور چاند اسی کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں۔دن اور رات کا سلسلہ اسی کے اذن سے وجود میں آتا ہے۔سمندروں میں طوفان اسی کے حکم سے اٹھتے ہیں، اسی کے حکم سے بارشیں نازل ہوتی ہیں۔اسی کے اذن سے کھیتیاں ہری ہوتی ہیں، وہ نہ چاہے تو بادلوں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ اترے اور کھیتیاں ویران ہو جائیں اور زمین غلہ کا ایک دانہ بھی نہ اگا سکے اور انسانوں اور حیوانوں کو

کھانے پینے کے لئے کوئی چیز نہ مل سکے اور یہ سب بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں۔

بیماری اور موت سے استدلال

صحت اور بیماری، زندگی اور موت سب اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے۔ اگر وہ کسی شخص کو بیمار کرنا چاہے تو ہم ہزار جتن کے باوجود اس کی صحت واپس نہیں لا سکتے جب کہ اس جیسی بیماری کے ہزاروں مریض معمولی علاج سے شفایاب ہو جاتے ہیں اور اس بیمار کے لئے بڑے سے بڑے ڈاکٹر اپنی تمام صلاحیتوں کو صرف کرنے کے باوجود اس کی صحت کو واپس نہیں لا سکتے اور بالآخر وہ شخص بیماری کے ایام گزارتا ہے اور اس عالم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی زندگی کی ایک میعاد مقرر کی ہے اور جب کوئی انسان اپنی زندگی کے سانس پورے کر لیتا ہے تو خواہ وہ بادشاہ ہو یا فقیر، بڑے سے بڑا ڈاکٹر ہو یا ماہر طبیب، سائنس دان ہو یا فلسفی، اسے بہرحال اس وقت مرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑی سی بڑی کوشش اور اہم سے اہم سائنسی علم ہزار جتن کے باوجود مدت حیات پوری ہونے کے بعد اسے موت کے چنگل سے نہیں بچا سکتا۔ اگر اس عالم اسباب سے کوئی ماوراء ہستی نہیں ہے تو پھر وہ کون سی طاقت ہے جو کسی بیماری کو تندرستی سے اور مرنے والے کو زندگی سے ہم کنار ہونے نہیں دیتی؟ اس نظام کائنات میں تو ہر چیز خود ایک نظام کی پابند ہے وہ کیسے کسی کو صحت اور زندگی سے روک سکتی ہے؟

نظام کائنات کے ربط اور تسلسل سے استدلال

اس نظام کائنات پر غور کیجئے، سورج ہر روز ایک مقررہ جہت سے طلوع ہوتا ہے اور ایک مقررہ جہت میں غروب ہو جاتا ہے۔ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن، ہر سال اپنے اپنے موسموں میں کھیتوں کا پروان چڑھنا، پھولوں کا اپنے وقت میں کھلنا، تمام روئے زمین میں ایک خاص طریقہ سے انسانوں کا پیدا ہونا اور اس کے بعد ایک وقت مقرر پر انسان کا مر جانا، کیا یہ تمام سلسلہ کائنات ایک مقررہ اور مربوط نظام کے تحت جاری نہیں ہے؟ پھر کیا کوئی ہوش مند انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تمام منضبط اور مربوط نظام بغیر کسی خالق اور ناظم کے خود بخود اپنے آپ عدم سے وجود میں آ گیا ہے۔

پانی کی فراہمی سے

پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے، پانی کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمندر کا پانی اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ اس کے چند گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارے جاسکتے۔ پھر یہی پانی جب بخارات کی شکل میں طبقۂ زمہریر یہ تک پہنچتا ہے تو بادلوں سے موسلا دھار ٹھنڈا، میٹھا اور شفاف پانی بن کر برستا ہے۔ تو وہ کون ہے جو اس کڑوے پانی میں شکر گھول دیتا ہے؟ دریاؤں سے جو اکثر و بیشتر پانی حاصل ہوتا ہے وہ بھی بادل اور بارش کا فیضان ہوتا ہے اور پہاڑیوں کی بلند بانگ چوٹیوں پر جو برف جمی ہوتی ہے وہاں اس برف کو ان چوٹیوں پر کون جماتا ہے؟ کیا پہاڑوں کی چوٹیوں سے برفانی گھاٹیوں تک برف گرنے کا انتظام اور بادلوں کے ذریعہ پانی کی بہم رسانی کا نظام یونہی خود بخود وجود میں آگیا ہے؟ جب کارپوریشن کا ایک نل بھی ایک مستری اور چند مزدوروں کے بغیر نہیں لگ سکتا تو پانی کی اس قدر عظیم الشان ترسیل کا انتظام کسی ایڈمنسٹریٹر (Administrator) کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ پھر یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ کارپوریشن جو ایک محلہ کو ٹیکس لے کر پانی فراہم کرے۔ اس کی نظامت کو تو ہم تسلیم کرلیں اور جو ساری دنیا کو بغیر کسی ٹیکس کے پانی مہیا کر رہا ہے اس کے نظام اور اس کی قدرت کا ہم انکار کردیں، جبھی تو وہ فرماتا ہے:

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ۝ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنَٰهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ (الواقعہ)

"یہ بتاؤ کہ تم جو پانی پی رہے ہو کیا بادلوں سے اس پانی کو تم نے اتارا ہے یا ہم اتارنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اس پانی کو اس قدر کڑوا کردیں کہ تم پی بھی نہ سکو پھر تم کیوں اس کا شکر ادا نہیں کرتے"۔

پانی کے حصول کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ زمین کے نیچے گہرائی میں پانی رکھا گیا ہے جس کو ہم ہینڈ پمپ (Hand Pump) اور ٹیوب ویل سے نکال کر اپنے کام میں لاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس پانی کو زمین کی تہہ میں کس نے رکھا ہے اور اتنے لاکھوں فٹ کی گہرائی میں جا کر رکھ بھی کون سکتا ہے؟ یہ بات تو وہی شخص کہہ سکے گا جو عقل و فہم سے بالکل

عاری ہو کہ وہ پانی خود بخود وہاں موجود تھا۔ اس دنیا کے ہزاروں تجربات اور مشاہدات ہمیں بتاتے ہیں کہ یہاں خود بخود کچھ نہیں ہوتا۔ ایک کنستر میں بھی پانی خود بخود جمع نہیں ہوتا۔ زمین کی اتھاہ گہرائی میں لاکھوں مکعب فٹ پانی کس طرح جمع ہو سکتا ہے؟ جن علاقوں میں دریاؤں اور نہروں کا پانی بھی نہیں پہنچ سکتا، وہاں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے زمین کے اس پانی کو دریائی پانی کا بدل بنا دیا ہے اور خود فرماتا ہے: اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۞ (الملک) ''اگر اللہ تعالیٰ زمین کے پانی کو نیچے گہرائی میں دھنسا دے تو بتلاؤ پھر تمہارے لئے کون پانی لے کر آئے گا''۔ جس جگہ زمین کی گہرائیوں سے پانی نکالنے کی ضرورت تھی وہاں اسے زمین کے اندر گہرائیوں میں رکھا، جہاں سخت پہاڑی اور پتھریلی زمینیں ہیں اور زمین کو کھودنا مشکل ہے، اس نے وہاں پانی کے چشمے جاری کر دیئے۔ کہیں برفانی چوٹیوں اور بادلوں کی لگاتار برسات سے دریاؤں کو رواں دواں کر دیا، کہیں کنوؤں اور ندیوں کا انتظام کر دیا۔ غرض جس جگہ پانی کی بہم رسانی کی ضرورت جس طرح پوری ہو سکتی تھی اس طریقہ سے وہاں پانی کو پہنچایا۔ کیا پانی کی یہ حکیمانہ ترسیل کسی جلیل القدر حکیم اور زبردست قادر اور عظیم خالق کے وجود کا تقاضا نہیں کرتی، کیا اب بھی کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ خلق خدا کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق ہر جگہ ان کے مقام کے مناسب یہ پانی خود بخود بغیر کسی پہنچانے والے کے پہنچ رہا ہے؟

نظام کائنات کے تناسب سے

زمین و آسمان کی پہنائیوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ قائم کیا ہوا ہے۔ مکھی سے لے کر ہاتھی تک دیکھئے، اللہ تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک جسم کی ساخت اس کے حسب حال بنائی ہے۔ ہاتھی کے عظیم جثہ میں اس کی ضرورت کے جو اعضاء پیدا کئے ہیں وہ تمام اعضاء مکھی کی معمولی جسامت میں بھی موجود ہیں۔ حشرات الارض سے لے کر درندوں تک، چرندوں سے لے کر پرندوں تک جانوروں کی ہر نوع کو دیکھئے، ہر جانور میں اس کی بے عیب خلقت اور عظیم حکمت کے آثار نظر آئیں گے۔ پھر اس نے ہر جانور کی ایک غذا مقرر کی اور اس کو اپنی غذا کے حصول کے راستے اور اپنے سے بڑے

جانوروں سے تحفظ کے طریقے سکھائے۔ شمال مغربی سرد اور برفانی علاقوں کے جانوروں کو دیکھئے، ان کے جسم پر لمبے لمبے اور گھنے اونی بال نظر آئیں گے۔ بالوں کی یہ افزائش ان کا علاقائی سردی سے تحفظ کرتی ہے اور مشرقی اور گرم علاقوں میں ان جانوروں پر یہ بال نہیں ہوتے کیونکہ اگر اس قدر گرم علاقوں میں ان پر یہ بال ہوں تو وہ گرمی سے جھلس کر رہ جائیں۔ اسی طرح ہر علاقہ کے رہنے والے انسانوں کے مزاج کو وہاں کے حسب حال بنایا ہے، افریقہ اور اس جیسے گرم علاقوں میں رہنے والوں کا مزاج اس قسم کا بنایا ہے کہ وہاں کی شدید گرمی کو برداشت کر سکیں اور شمال مغربی علاقوں میں جہاں بے انتہا ٹھنڈ پڑتی ہے وہاں کے رہنے والوں کے مزاج میں اس سخت سردی کو سہارنے کا عنصر رکھا ہے۔ یہ حکیمانہ تدبیر اور مخلوق کی حسب حال رعایت اور یہ حسین عالمی انتظام دیکھ کر کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ علم وحکمت کا یہ عجیب وغریب کارخانہ بغیر کسی چلانے والے کے از خود چل رہا ہے؟

کرن امید سے

امام جعفر صادق کی ایک بار ایک دہریہ سے ملاقات ہوئی جو وجود باری تعالیٰ کا انکار کرتا تھا، آپ نے اس سے پوچھا: کیا کبھی تم سمندر میں کشتی میں سوار ہوئے ہو؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے پوچھا: کبھی طوفان کا سامنا بھی کیا؟ اس نے کہا: ہاں! کشتی ٹوٹ پھوٹ گئی، ملاح ڈوب گیا اور لہروں کے تھپیڑے مجھے ساحل تک لے آئے۔ آپ نے فرمایا: پہلے جب تو کشتی پر بیٹھا تھا تو تیرا اعتماد ملاح پر تھا اور جب ملاح طوفانی لہروں میں ڈوب گیا تو پھر تیرا اعتماد کشتی پر تھا اور جب کشتی ٹوٹ گئی اور تو ایک تختے کے سہارے بہنے لگا تو تیرا بھروسہ اس تختہ پر تھا اور جب تختہ بھی تیرے ہاتھ سے نکل گیا اور تو محض لہروں کے رحم وکرم پر بہہ رہا تھا اور طوفانی لہریں تجھے غرقاب کر رہی تھیں، اس وقت تیرا کیا خیال تھا کہ یہ لہریں تجھے غرق کر دیں گی یا اس وقت بھی تیرے دل میں امید کی کوئی کرن باقی تھی؟ وہ کہنے لگا: میں اس وقت بھی پرامید تھا کہ شاید سلامتی سے نکل آؤں۔ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اب جب کہ سارے مادی اور ظاہری سہارے ایک ایک کر کے چھوٹ چکے تھے اس وقت تو نے کس ذات کے ساتھ امید قائم کی ہوئی تھی کہ وہ تجھ کو بچالے۔ دہریہ خاموش رہا، آپ نے فرمایا:

جس وقت کوئی مادی اور ظاہری سہارا نہ رہے اور سلامتی کے اسباب ایک ایک کر کے سارے ختم ہو جائیں اس وقت جس ذات سے امید قائم ہوتی ہے اور بے چارگی اور لامتناہی اندھیروں میں جس ذات سے مدد کی روشنی ملتی ہے وہی تیرا اور سارے جہان کا پروردگار ہے، اسی نے تجھ کو غرق ہونے سے بچالیا، اسی کی یہ شان ہے کہ انسان جب چاروں طرف سے مایوسیوں میں گھر جاتا ہے اور اسے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی اور وہ سمجھتا ہے کہ وہ عنقریب اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں میں گھر کر ختم ہو جائے گا کہ اچانک وہ غیب سے اس کی سلامتی کے اسباب پیدا کر دیتا ہے، اسی لئے اس نے فرمایا ہے: هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْ بَعْدِ مَا قَنَطُوا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهُ ۚ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ ﴿۲۸﴾ (الشوریٰ) ''وہ ذات جو لوگوں کے مایوس ہونے کے بعد اچانک موسلا دھار بارش نازل فرما دیتی ہے اور اپنی رحمت کو عام کر دیتی ہے وہی لوگوں کے کام بنانے والی اور قابل ستائش ہے''۔

مایوسی کے وقت مشرکوں کے رجوع الی اللہ سے

جب انسان مصیبتوں کے جنجال میں پھنس جاتا ہے اور اسے نجات کا کوئی راستہ نہیں ملتا اس وقت کٹر سے کٹر کافر بھی اللہ کی طرف رجوع کر لیتا ہے، جب خشکی اور تری کے سفروں میں لوگ مبتلائے آفات ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں اور ایسی شدید صعوبتیں اور ہولناک طوفان پیش آتے ہیں، جن سے ذہن پریشان، دل مضطرب اور بدن کا رُواں رُواں خوف سے کانپنے لگتا ہے، ایسے ہولناک سفر میں بت پرست اور ضدی سے ضدی مشرک بھی اپنے بتوں کو بھول جاتا ہے اور بڑے سے بڑا دہریہ بھی اپنے الحاد سے توبہ کر لیتا ہے اور ان تمام لوگوں کو اس وقت اپنے عقیدہ سے تراشے ہوئے سارے باطل خدا ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس وقت انہیں خدائے واحد کے سوا کسی کے دامن میں پناہ نظر نہیں آتی اور چاروناچار سب کے سب اسی اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہیں اور ہر شخص اس کی رحمت کے سامنے دامن پھیلا دیتا ہے اور رو رو کر کہتا ہے: اے احکم الحاکمین اور اے سارے جہاں کے رب! اگر تو نے اس بار ہمیں اس مصیبت سے نجات دے دی تو پھر ہم الحاد اور شرک کو چھوڑ کر صرف تیری بندگی بجالائیں گے اور جب اللہ تعالیٰ ان کو مصیبت کے اس بھنور سے سلامتی

کے ساتھ نکال لاتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یکسر فراموش کر کے پھر الحاد اور شرک کے گڑھوں میں جا گرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس حالت کا نقشہ کھینچتا ہوا فرماتا ہے:

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَ مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾ (الانعام)

''اے رسول! آپ کہیے: وہ کون ہے جو تمہیں جنگلات اور سمندروں کی مصیبتوں سے نجات دیتا ہے؟ جس کو تم آہستہ آہستہ او رگڑگڑا کر پکارتے ہو کہ اگر وہ اس مرتبہ ہم کو مصیبت کے اس گرداب سے نکال دے تو ہم ضرور اس کا احسان مانیں گے آپ کہیے کہ اللہ تعالیٰ تم کو صرف اس مصیبت سے ہی نہیں ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے۔ لیکن مصائب سے چھٹکارا پانے کے بعد پھر تم اس کا احسان فراموش کر کے شرک کی پستیوں میں جا گرتے ہو''۔

نفس انسان کی شہادت سے

مصائب اور پریشانیوں میں گھر جانے کے بعد ہر انسان فطری طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تصدیق ہوتی ہے: وَ فِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (الذاریات) ''یقین کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات پر زمین میں بھی نشانیاں ہیں اور ان کے اپنے نفسوں میں بھی، کیا تم غور نہیں کرتے''۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کے نفس میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر شہادت اور دلیلیں موجود ہیں جن پر اس نے کفر، الحاد اور شرک کے پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کی زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب کسی اچانک حادثہ سے شرک اور الحاد کے یہ سارے حجاب اچانک اٹھ جاتے ہیں اور توحید کی شہادت بے نقاب ہو کر

آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے اور وہ بے ساختہ اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ الکریم کے حضور جھک جاتا ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کی زندگی میں اسی شہادت سے انقلاب آیا، جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ کو فتح کرلیا تو عکرمہ نے جدہ کا رخ کیا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر حبش جانے کا قصد کیا۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی طوفانی لہروں میں گھر گئی، پہلے پہل تو تمام بت پرست اپنے اپنے بتوں اور دیوتاؤں کو پکارتے رہے مگر طوفان کی ہولناکیاں بڑھنے لگیں اور مسافروں کو یقین ہوگیا کہ اب کشتی ڈوب جائے گی۔ جب دیوتاؤں کی شکتی کا مان جاتا رہا تو سب بے اختیار پکار اٹھے کہ اب سوائے اللہ کے اور کوئی بچانے والا نہیں ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ اس خدائے واحد کے دروازۂ رحمت پر دستک دی جائے۔ پھر سب نے مل کر بیک آواز اس کی رحمت کو پکارا اور گڑگڑا کر دعائیں مانگنی شروع کردیں، عکرمہ کی زندگی میں یہ ایک انقلاب آفریں لمحہ تھا، انہوں نے سوچا کہ ان کے تصور کے تراشے ہوئے سارے بت بے حقیقت ہیں، ان کی بصیرت جاگی اور انہوں نے سوچا: جو خدا یہاں ان کی کشتی کو طوفان کے گرداب سے نکال سکتا ہے وہ درحقیقت خشک وتر ہر جگہ اپنے بندوں کی فریاد سنتا ہے اور ان کی مدد کرتا ہے۔ اس وقت ان کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت اور جہالت کے سارے پردے اٹھ گئے اور دل پر کفر والحاد کے جس قدر حجاب پڑے ہوئے تھے، یکلخت دور ہوگئے اور ان کے نفس میں جو توحید کی شہادت مستور تھی وہ پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ابھری اور انہوں نے اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر یہ کشتی اس طوفان سے نکل گئی تو میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں حاضر ہوں گا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرلوں گا اور اس خدائے واحد پر ایمان لاؤں گا جس کی بحر و بر پر حکومت ہے، جو طوفانوں کے رخ پھیر سکتا ہے، ہر قسم کی مصیبت کو ٹال سکتا ہے اور جس کو اس عظیم کائنات کی لامحدود وسعتیں کہیں بھی کسی بے بس اور لاچار کی فریاد سننے سے روک نہیں سکتیں۔ چنانچہ سلامتی سے ساحل پر آنے کے بعد انہوں نے اپنا عہد پورا کیا اور صدق دل سے مسلمان ہوئے اور بقیہ تمام عمر خدمت اسلام میں گزار دی۔

زمین اور اس کی کیفیات سے

زمین اور اس کے وسیع دامن میں پھیلے ہوئے پہاڑ، بلند اور مہیب چٹانیں، کہسار، آبشار، ریگستان اور بے آب وگیاہ صحرا کی وسعتوں میں پر بہار نخلستان، یہ سب آخر کس نے بنائے ہیں؟ ان کو مخصوص فاصلوں اور جغرافیائی حدود میں کس نے مقید کیا ہے؟ پھر زمین کے سینے میں معدنیات کے ذخائر کس نے چھپا رکھے ہیں؟ قدرتی گیس اور تیل کے وسیع و عریض چشمے، لوہا، تانبا اور چاندی سے لے کر سونے تک قیمتی دھاتیں یہ کس کی شکتی سے وجود میں آئی ہیں؟ پھر ان میں سے ہر ایک تغیر پذیر ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر راستے بنائے جا سکتے ہیں۔ چٹانوں کو اپنی جگہ سے اکھاڑا جا سکتا ہے۔ دریاؤں کے رخ بدلے جا سکتے ہیں۔ آج کے ریگستان کل کے نخلستان میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ بنجر زمین زرخیز کھیتوں اور پر بہار باغات سے بدلی جا سکتی ہے۔ زمین اور اس کی تمام خصوصیات کا وجود میں آنا کسی موجد اور خلاق کا تقاضا کرتا ہے اور زمین کے نشیب وفراز اور فاصلوں سے، اس میں دریاؤں اور پہاڑوں کا وجود اور اس کے اندر مناسب مقامات پر معدنیات کا وجود بتلاتا ہے کہ یہ محض اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ایک عظیم خلاق کی بہترین حکمتوں کا ثمرہ ہے، پھر زمین اور اس کے تمام آثار اور خواص کا تغیر پذیر رہنا اور ہر زمانہ میں اس کے اندر تبدیلیوں کا واقع ہونا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کرہ ارضی ازلی، ابدی، قدیم اور لا فانی نہیں ہے اور جس طرح ابتداءً یہ اپنے وجود میں کسی موجد اور خالق کی محتاج تھی اس طرح ہر دور میں اپنے تبدل وتغیر میں کسی قادر قیوم کی محتاج ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمین کا وجود کسی خالق کی اور اس کے عجائبات کی مناسب ترتیب کسی زبردست حکیم کی اور اس کا تغیر وتبدل کسی عظیم اور جلیل قادر قیوم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس پوری کائنات میں زمین اور اس کی ان تمام خصوصیات کی تخلیق کا سوائے خدائے بزرگ و برتر کے اور کوئی دعویٰ دار نہیں ہے۔ زمین کے یہ تمام حقائق عجائبات اور حکیمانہ ترتیب نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے، نہ یہ کسی انسانی وہم کے بنائے ہوئے دیوی یا دیوتا کا کارنامہ ہے اور نہ ہی یہ انسانی ہاتھوں کے تراشیدہ بتوں کی کاوش ہے اور نہ ہی یہ کسی فانی انسان، بے خرد گائے اور غیر متحرک پیپل کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ ان تمام دلائل کو

دیکھتے ہوئے جس کی عقل سلیم اور ہوش وحواس سلامت ہوں، وہ یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے گا کہ یہ اس ذات کا کارنامہ ہے جو ازلی وابدی ہے، واجب اور قدیم ہے، جو خالق بھی ہے اور قادر بھی اور حکیم بھی ہے اور علیم بھی اور وہ ذات سوائے خدائے واحد کے اور کوئی نہیں ہے۔

چنانچہ وہ خود فرماتا ہے: هُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْأَرْضَ وَ جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ أَنْهٰرًا (الرعد: ۳) ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے زمین پھیلائی اور اس میں پہاڑ نصب کیے اور دریا رواں دواں کر دیئے'' نیز فرمایا: وَ الْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ أَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ أَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ۝ (الحجر) ''اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو قائم کیا اور اس میں ہر ایک مناسب اور موزوں چیز پیدا کی''۔

اور ایک جگہ فرماتا ہے: الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ مَهْدًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (الزخرف) ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا، پھر اس میں تمہارے لئے راستے بنائے تاکہ تم راہ پا سکو'' اور فرماتا ہے: وَ لَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ (الاعراف) ''اور ہم نے تم کو زمین پر تصرف کرنے کی قدرت کی اور اس میں تمہارے رزق کا سامان فراہم کیا، بہت کم لوگ ہیں جو اس کی نعمتوں کا اعتراف کر کے شکر ادا کریں''۔

لیل ونہار سے

رات اور دن کا توارد اور اختلاف سورج کی حرکات سے وجود میں آتا ہے، سورج کی حرکت سے زمین کا جو حصہ اس کے بالمقابل ہو وہاں دن ہوتا ہے اور جب سورج حرکت طے کرتا ہوا زمین کے اس حصہ سے غروب ہو جاتا ہے تو اس حصہ میں رات ہو جاتی ہے اور اس وقت سورج کرۂ ارض کے دوسرے حصہ کے بالمقابل طلوع ہو کر وہاں دن کی رونقیں لے آتا ہے اور اسی طرح پیہم اور لگاتار کرۂ ارض کے ہر حصہ میں سورج کے طلوع اور غروب سے دن اور رات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سورج کو کون حرکت دے رہا ہے اور زحل، مشتری، مریخ اور دوسرے کواکب سیارہ میں سے دن اور رات کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے صرف سورج کی تخصیص کس نے کی ہے؟ کسی اور سیارہ سے یہ کام کیوں

نہیں لیا گیا؟ کیا سورج کی حرکت، روشنی اور توانائی کا یہ سلسلہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس میں ضبط، تسلسل اور دوام کیوں ہے اور اگر سورج از خود یہ عمل کرتا ہے تو اس جیسے دوسرے سیارگان جو فی نفسہٖ جسم ہونے اور متحرک رہنے میں اس جیسے ہیں وہ یہ عمل کیوں نہیں کرتے؟ پھر سورج میں روشنی، توانائی اور ایک خاص محور پر متواتر گردش کا نظام کس نے بنایا ہے؟ پھر یہ کس کی حکمت ہے جس نے سورج کو زمین سے ایک خاص اور مناسب فاصلہ پر ایسے مدار میں رکھا ہے کہ اگر وہ اس فاصلہ سے کسی قدر اونچا ہو تو یہ کائنات ارضی سخت ٹھنڈک سے منجمد ہو جائے اور اگر وہ اس فاصلہ سے سومیل ہی نیچے اتر آئے تو یہ تمام کائنات ارضی جل کر بھسم ہو جائے۔ سوچئے کہ سورج کا زمین سے یہ مناسب فاصلہ، ایک خاص محور پر مقررہ نظام کے تحت اس کی گردش، اس کی روشنی اور توانائی یہ کس کی قدرت اور حکمت کا کارنامہ ہے۔ کیا عقل کا اندھا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ پتھر کی بے جان مورتیوں، توہماتی دیوتاؤں یا انسانوں کا کام ہے جو ہزاروں سال سے اسی نظام شمسی کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر مٹ جاتے ہیں؟ اس لئے یہ لوگ اگر عقل و خرد سے بالکل ہی بیگانہ نہیں ہو گئے تو انہیں اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ سورج کی تخلیق اس ہستی اعلیٰ کا کارنامہ ہے جو ازلی، ابدی، واجب، قدیم، قادر اور حکیم ہے، جس کے حکم سے ایک سورج ہی نہیں تمام سیارگان اپنے مقرر کردہ دائرہ عمل میں گردش کر رہے ہیں، بلکہ کائنات کا ہر ذرہ اس کے حکم کے تابع اور اس کے بنائے ہوئے نظام کے تحت اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔

وَ الشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ (یٰسین) ''سورج اپنے مرکز کے گرد گردش کرتا رہتا ہے اور اس کی گردش اس زبردست حکیم کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق ہے''۔ سورج کی حرکات سے محض دن اور رات کا وجود ہی عمل میں نہیں آتا بلکہ دن اور رات کا اختلاف بھی وجود میں آتا ہے۔ گرمی، سردی، بہار اور خزاں یہ تمام موسم دن اور رات کے اختلاف سے رو پذیر ہوتے ہیں اور انسانوں اور حیوانات کی جسمانی نشو نما اور مختلف فصلوں، پھلوں اور پھولوں کی پیداوار اور افزائش کے لئے موسم کا اختلاف بے حد ضروری ہے۔ اگر موسموں کا یہ حکیمانہ اختلاف نہ ہوتا تو نہ زمین پر فصل اگتی اور نہ باغوں

میں پھول مہکتے، یہ موسمی اختلاف صرف نباتات کی بقاء کے لئے ہی نہیں بلکہ انسان کی بقاء کے لئے بھی ضروری ہے۔

یہ کس قدر زبردست حکمت ہے کہ موسموں کا یہ اختلاف اچانک اور فوراً نہیں ہوتا بلکہ تدریجاً سردی کم ہوتی جاتی ہے اور گرمی بڑھتی جاتی ہے، اگر دسمبر، جنوری کی سخت سردی کے بعد اچانک مئی، جون کی گرمی آ جائے تو اس اچانک تبدیلی سے انسان کے اعصاب پر کس قدر گہرا اثر پڑتا اور مشکل سے ہی کوئی ذی نفس زندہ رہ سکتا، وہ حکیم مطلق درجہ بدرجہ سردی اور گرمی کے موسم لاتا ہے، تاکہ انسان ایک موسمی ماحول سے نکل کر دوسرے موسمی ماحول میں آنے کے لئے بالکل تیار ہو جائے۔

رات اور دن میں مکمل تضاد ہے اور دو متضاد چیزیں ہمیشہ فساد کا موجب ہوتی ہیں لیکن قدرت نے رات اور دن کے خوبصورت اور حسین تضاد میں مصالح اور منافع کی تحصیل کے لئے مکمل معاونت رکھی ہے، دن بنایا تاکہ اس میں انسان ہو یا حیوان وہ اپنی معیشت کا سامان حاصل کر سکے اور رات پیدا کی تاکہ دن بھر کا تھکا ماندہ انسان ہو یا حیوان وہ رات کی آغوش میں اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو آرام پہنچا سکے اور رات میں اس کو ایسی میٹھی اور گہری نیند عطا کی جس کے سبب اس کا تھکا ہوا ذہن سکون حاصل کر سکے۔ فرض کیجئے، یہ زمین گول نہ ہوتی اور اس پر ہمیشہ دن کا وجود مسلط رہتا تو کیا انسان کے اعصاب جواب نہ دے جاتے؟ کیا انسان کو آرام اور سکون کا کوئی لمحہ میسر ہوتا اور اگر زمین خواہ گول ہی ہوتی لیکن سورج نہ ہوتا تو اس کائنات پر ہمیشہ شب تاریک چھائی رہتی، پھر کوئی ذی روح کس طرح اپنے لئے سامان معیشت حاصل کرتا۔ کھیتیاں کیسے پروان چڑھتیں اور کوئی جاندار کس طرح زندہ رہتا۔ معلوم ہوا کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن اور پھر ان میں کمی اور زیادتی کا تناسب اور تدریجاً اختلاف کسی ازلی اور ابدی قادر اور حکیم کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ ؕ اَفَلَا

”آپ فرمائیے: یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک دن قائم رکھتا تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون رات قائم کر سکتا تھا جس

تُبْصِرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَ مِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ (القصص)

میں تم آرام پاتے۔ کیا تم غور نہیں کرتے کہ یہ محض اس کی رحمت ہے جس نے رات اور دن دونوں قائم کئے تا کہ رات میں تم آرام کرو اور دن میں معاش تلاش کرو اور یہ کہ تم شکر ادا کرو"۔

کشتیوں سے

چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے لے کر دیو پیکر جہازوں تک جو دریاؤں اور سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، یہ سب انسانی عقل اور اس کے ہاتھوں کی تراش و خراش کا نتیجہ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی تیاری کے لئے لکڑی، لوہا اور دوسرے میٹریل (Material) کو کس نے پیدا کیا؟ بادبانی کشتیوں کو متحرک رکھنے کے لئے ہوائیں کس نے چلائیں اور دخانی جہازوں کی حرکت کے لئے ایندھن کس نے پیدا کیا۔ لکڑی کی طبیعت میں یہ خاصہ کس نے رکھا کہ وہ ہزاروں ٹن بوجھ اٹھانے کے باوجود بھی سطح سمندر پر تیرتی رہتی ہے۔ لوہا اور لکڑی دونوں جسمیت میں متماثل ہیں۔ پھر ان میں یہ فرق کس نے رکھا ہے کہ لوہا ایک تولہ بھی ہو تو پانی میں ڈوب جاتا ہے اور لکڑی ہزاروں ٹن کی بھی ہو تو سطح آب پر تیرتی رہتی ہے؟ پھر انسانوں کے دلوں میں یہ سکون اور طمانیت کس نے رکھی ہے کہ وہ بحری سفر کے لئے بے خوف و خطر تیار ہو جاتے ہیں؟ پھر ہر علاقہ کو کسی خاص جنس کے ساتھ کس نے خاص کیا جس کی وجہ سے بحری سفر کی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور جب غیظ و غضب سے بھرپور طوفانی لہریں اٹھتی ہیں تو ان طوفانوں سے جہازوں کو سلامتی کے ساتھ کون پار لے جاتا ہے اور جب جہاز خطرات سے گھر جاتا ہے تو مسافروں کی نگاہیں کس کی طرف اٹھتی ہیں؟ دعاؤں کے لئے ہاتھ کس کی بارگاہ میں اٹھتے ہیں؟ ہم دن رات ایسے واقعات دیکھتے ہیں لیکن ان واقعات و حوادثات کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کا جو ہاتھ کارفرما ہے اس کی طرف ہمارا ذہن منتقل نہیں ہوتا۔ نقوش اور فطرت کے عجیب و غریب کرشمے شب و روز ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن فاطر اور نقاش کی طرف ہماری نظریں نہیں

انشیں۔ صنعت وخلقت کے بہترین نمونے ہر وقت ہمارے پیش نظر رہتے ہیں لیکن مانع اور خالق کی طرف ہم ملتفت نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (الجاثیہ)

"اللہ ہی وہ ذات ہے جس نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا ہے تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں چلیں اور تم اس کے فضل سے اس کا رزق تلاش کرو اور شکر بجالاؤ"۔

ہواؤں سے

ہواؤں کا وجود انسان کے سانس لینے کا مادہ ہے۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ہوائیں بند ہو جائیں تو انسان اور حیوان میں سے کوئی ذی روح زندہ نہ رہ سکے۔ انسان اپنی زندگی کی بقاء میں ہوا، پانی اور خوراک کا محتاج ہے۔ ان میں سب سے زیادہ احتیاج اور ضرورت ہوا کی ہے کیونکہ اس کے بغیر کوئی ذی روح ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد پانی کی ضرورت ہے۔ کیونکہ خوراک کی بہ نسبت انسان پانی کا زیادہ محتاج ہے اور ایک دو دن انسان کو پینے کے لئے پانی نہ ملے تو وہ اس کے بغیر گزارہ کر سکتا ہے اور پانی کے بعد خوراک کی ضرورت ہے۔ کیونکہ چند دن انسان کو کھانے کے لئے کچھ نہ ملے تو وہ بہرحال کسی نہ کسی طرح زندہ رہ سکتا ہے۔ اب آپ قدرت کے نظام پر غور کیجئے کہ انسان کو اپنی بقاء کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی، جس کے بغیر وہ ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا حصول اس نے سب سے سہل اور آسان کر دیا ہے کہ انسان ہو یا حیوان وہ بغیر کسی مشقت کے ہر وقت اور ہر جگہ ہوا کو بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے حصول کے لئے اس کو نہ کوئی قیمت اور ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے نہ کسی کا زیر احسان ہونا پڑتا ہے اور پانی کی ضرورت بقاء انسانی کے لئے ہوا کی بہ نسبت کم ہے۔ اس لئے اس کا حصول بھی اس قدر عام نہیں ہے۔ تاہم ایک ذی روح دن میں متعدد بار پانی پینے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس لئے پانی اگرچہ ہر وقت اور ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتا، تاہم اس کی متوسط ضرورت کے پیش نظر

اللہ تعالیٰ نے ایسے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں کہ وہ بعض صورتوں میں بغیر کسی مشقت اور قیمت کے پانی حاصل کر لیتا ہے اور بعض صورتوں میں معمولی مشقت اور قیمت سے اسے ضرورت کے مطابق پانی حاصل ہو جاتا ہے اور غذا اور خوراک کی ضرورت چونکہ ہوا اور پانی کی بہ نسبت کم ہوتی ہے اس لئے اس کو غذا وغیرہ کے حصول کے لئے بہرحال مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ اب آپ سوچئے! انسانی بقاء اور اس کی ضرورت کے مطابق جس ذات نے ہوا، پانی اور خوراک کا یہ نظام بنایا ہے کیا آپ اس ذات کی عظیم حکمت اور علم کا انکار کر سکتے ہیں جو ذات ہمہ وقت اور ہر جگہ ہواؤں کے سمندر کو رواں دواں رکھتی ہے؟ کیا اس کی بے پناہ قدرت کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ انسانی ضروریات کے مطابق ہوا، پانی اور خوراک کی ترسیل کو کیا کوئی شخص ایک اتفاقی حادثہ قرار دے سکتا ہے؟ جو شخص غور و فکر اور تدبر سے بالکل عاری نہیں ہو گیا اس کو بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کائنات کے نظام کے پیچھے ایک ہستی اعلیٰ اور مطلق العنان قادر قاہر حکمران کی تدبیر اور حکمت کام کر رہی ہے اور اس عظیم اور وسیع کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اس کی حکمت اور قدرت کا منہ بولتا شاہکار ہے۔ ہواؤں سے فقط ہم سانس ہی نہیں لیتے، دریاؤں میں روانی، سمندروں میں طلاطم، اطراف عالم میں کھیتوں اور باغات کی نشوونما، سمندروں میں جہازوں کی آمد و رفت، بادلوں کی گردش اور بارشوں کا حصول، یہ تمام امور اس صناع مطلق کی پیدا کردہ ہواؤں کے سبب سے ہیں۔ اگر وہ چند ساعتوں کے لئے بھی ہواؤں کو چلنے سے روک لے تو ساری کائنات کا نظام معطل ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

وَ مِنْ اٰیٰتِهِ الْجَوَارِ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۳۲﴾ اِنْ یَّشَاْ یُسْكِنِ الرِّیْحَ فَیَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰی ظَهْرِهٖ (الشوریٰ) ”اور اللہ تعالیٰ کی قدرت پر نشانیوں میں سے ایک نشانی سمندروں میں رواں دواں پہاڑوں کی مانند جہاز ہیں، اگر اللہ چاہے تو ہواؤں کو روک لے اور یہ جہاز سمندر میں کھڑے کے کھڑے رہ جائیں“۔

نیز فرماتا ہے:

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّ ”اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بعض یہ

لِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۴۶﴾ (الروم)

ہیں کہ وہ ایسی ہوائیں بھیجتا ہے جو تمہیں بارش کی آمد کی خوشخبری دیتی ہیں تا کہ تم اس سے حظ رحمت لے سکو اور انہی ہواؤں سے اس کے حکم سے جہاز چلتے ہیں تا کہ تم (تجارت کے ذریعہ) اللہ کا فضل ڈھونڈ سکو اور اس نعمت پر اس کا شکر ادا کر سکو"۔

اللہ تعالیٰ نے ہوائیں دو قسم کی پیدا فرمائی ہیں۔ آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ۔ ہم سانس کے ذریعے آکسیجن لیتے ہیں، پھر ہمارے جسم اور خون میں جو گندے اور زہریلے مادے ہیں وہ اس آکسیجن کو کاربن ڈائی آکسائیڈ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور جب ہم سانس باہر چھوڑتے ہیں تو وہ ہوا کاربن سے بھری ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے درختوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کر لیتے ہیں اور تازہ آکسیجن چھوڑتے رہتے ہیں۔ سوچئے کہ اگر درختوں کا وجود نہ ہوتا یا درختوں میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو جذب کرنے کی خصوصیت نہ ہوتی تو یہ فضا ہمارے سانسوں کے ذریعے چھوڑی ہوئی کاربن ڈائی آکسائیڈ سے پراگندہ ہو جاتی۔ سانس لینے کے لئے تازہ آکسیجن کا ملنا محال ہو جاتا اور زہریلی اور بدبودار ہواؤں میں ہم گھٹ گھٹ کر مر جاتے۔ ہماری ضرورت کے مطابق درختوں میں کاربن کو جذب کرنے اور آکسیجن کو چھوڑتے رہنے کی خصوصیت کیا خود بخود پیدا ہوتی ہے یا یہ کسی اتفاقی امر کا نتیجہ ہے یا کسی جلیل الشان مدبر اور رفیع المرتبت حکیم کی عظیم ترین حکمت اور قدرت کا ثمرہ ہے؟ اگر ہم انصاف کا خون کرنے پر آمادہ نہیں ہو گئے اور ہٹ دھرمی پر نہیں اتر آئے تو لامحالہ ہمیں کہنا پڑے گا کہ ہواؤں میں جو خصوصیات، حکمتیں اور فوائد مضمر ہیں نہ یہ کسی دیوی یا دیوتا کا کارنامہ ہے، نہ خود تراشیدہ بتوں کی کاوش ہے، نہ کسی انسان کی محنت کا ثمرہ ہے۔ سوائے اس قدیر و حکیم کے جو خلاق لم یزل ہے کسی اور شخص میں نہ یہ شکتی ہے کہ ہواؤں کو پیدا کر سکے اور نہ اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ ان ہواؤں کو فضا میں رواں دواں رکھ سکے اور نہ یہ ہمت ہے کہ ان ہواؤں میں اس قسم کی خصوصیات اور فوائد

مضمر کر سکے۔ یہ صرف اور صرف اللہ عزوجل کی قدرت کا ثمرہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ (الروم: ۴۸)

''اللہ ایسی ہوائیں بھیجتا ہے جو بخارات کو بادل بنا دیتی ہیں، وہ ان بادلوں کو فضا میں پھیلا دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے''۔

بادلوں سے

بادل بخارات کا ایک مجموعہ ہیں جو مختلف مقدار حجم میں فضاء میں تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ بخارات عموماً پانی کو اور بسا اوقات برف اور اولوں کو اپنے اندر لئے پھرتے ہیں۔ اب غور کیجئے کہ پانی ہو یا برف اور اولے، ان کا طبعی تقاضا اوپر سے نیچے گرنا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ کشش ثقل انہیں نیچے لانا چاہتی ہے، پھر وہ کون سی طاقت ہے جو بادلوں کے اندر پانی کو جب تک چاہے روکے رکھتی ہے اور جب چاہے چھوڑ دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ بارش کے ہونے یا نہ ہونے میں پانی کے طبعی تقاضا کا دخل ہے نہ کشش زمین کا، بلکہ ان تمام امور پر کوئی غالب و قاہر ہستی ہے جو جب چاہے بادلوں سے پانی برسا دے اور جب چاہے ان سے پانی روک لے۔ پھر اس کی قدرت کے ساتھ حکمت پر غور کیجئے کہ اگر وہ چاہتا ہے تو تمام فضاء پر بادلوں کو مسلط کر دیتا ہے اور ہم سورج کی روشنی کو ترس جاتے اور لگا تار بارش سے فصلیں برباد ہو جاتیں، مکانات منہدم ہو جاتے اور انسان کو روئے زمین پر زندہ رہنا دشوار ہو جاتا اور اگر وہ چاہتا تو سرے سے بادلوں کا وجود نہ ہوتا، لوگ تپتی ہوئی دھوپ میں سائے کو ترس جاتے، کھیتیاں پروان نہ چڑھتیں اور بعض علاقوں میں پینے تک کے لئے پانی میسر نہ ہوتا، پھر وہ بادلوں کو کسی ایک جگہ معلق نہیں رکھتا بلکہ ہواؤں کے ساتھ ان کو رواں دواں رکھتا ہے اور جس وقت اور جس علاقہ میں بارش کی ضرورت ہوتی ہے وہاں پانی برسا دیتا ہے۔

اب سوچئے! انسانوں اور زمینوں کی ضرورت کے مطابق بادلوں کا وجود اور علاقائی ضروریات کے مطابق بادلوں کی آمدورفت، کیا یہ خود بخود ہے یا کوئی اتفاقی حادثہ ہے؟ بعض زمینوں میں پٹ سن، پان، چاول اور چائے کی کاشت ہوتی ہے جنہیں لگا تار بارشوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض زمینوں میں غلہ کی دوسری اجناس کی کاشت ہوتی ہے جنہیں

ایک خاص موسم میں بارش کی ضرورت ہوتی ہے، زمینوں کی ان مختلف صلاحیتوں اور مختلف جغرافیائی ضرورتوں کی مناسبت سے کہیں لگاتار اور کہیں ایک خاص وقت میں بارشیں برسانے والا کون ہے؟ ان تمام امور پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ بارش کا یہ نظام کیا خود بخود چل رہا ہے یا کوئی اتفاقی حادثہ ہے یا کسی انسان، موہوم دیوتا اور خود تراشیدہ بت کی کوشش ہے یا اس قادر، قیوم، علام الغیوب اور قدیر و حکیم کی قدرت اور حکمت کا ثمرہ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کی ضروریات کا متکفل ہے، جو ہر علاقہ کی ضرورت کو جانتا ہے اور ہر زمین کی کیفیت، استعداد اور صلاحیت کا علم رکھتا ہے۔ پھر ان تمام انسانوں، علاقوں اور زمینوں کی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق بادلوں کے ذریعہ بارش نازل کرنے کا نظام قائم فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًۢا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَ اَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّ نُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَاۤ اَنْعَامًا وَّ اَنَاسِیَّ كَثِیْرًا (الفرقان)

"اور اللہ تعالیٰ ہی ایسی ہواؤں کو بھیجتا ہے جو باران رحمت کی نوید دیتی ہیں اور ہم ہی نے آسمان سے پاک کرنے والا پانی اتارا تاکہ اس بارش سے ہم خشک اور ویران کھیتیوں کو سرسبز اور شاداب کر دیں اور اسی بارش سے اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسان کو پانی پلائیں"۔

نیز فرمایا گیا:

وَ اَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَاۤ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ (الحجر)

"اور ہم نے بادلوں سے بارش برسانے والی ہوائیں بھیجیں، پھر ہم نے بادلوں سے پانی اتارا، پھر وہ پانی (نہروں اور دریاؤں کی صورت میں جمع کر کے) تم کو پلایا، حالانکہ اس پانی کے نازل کرنے اور جمع کرنے میں تمہارا کوئی دخل نہ تھا"۔

حرفِ آخر

پھولوں کے چھوٹے پودے سے لے کر چنار کے درخت تک نباتات کی بے شمار اقسام ہیں۔ ان میں سبزیاں، پھل اور پھول سب کچھ ہی ہیں۔ ان کی روئیدگی زمین، پانی، ہوا، آفتاب کی شعاعوں اور چاند کی کرنوں سے ہوتی ہے۔ لیکن کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ان سب کی روئیدگی کے اسباب ایک قسم کے ہونے کے باوجود ان اسباب کے آثار ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتے، جو پانی پھولوں کو ملتا ہے وہی سبزیوں کو، جو ہوا پھلوں کو تازگی دیتی ہے وہی فصلوں کو، اس کے باوجود کوئی پھول دوسرے پھول سے، کوئی پھل دوسرے پھل سے، کوئی فصل دوسری فصل سے نہیں ملتی، آخر ان میں فرق پیدا کرنے والا کون ہے اور مانا کہ نباتات کی روئیدگی ان اسباب سے ہے لیکن ان اسباب کا خالق کون ہے؟

افلاک کی ان بلندیوں پر جہاں انسان کے وہم کی بھی رسائی نہیں ہے، وہاں کروڑوں ستارے کس نے روشن کئے ہیں؟ اگر ایک چراغ سے تیل ختم ہو جائے تو وہ بجھ جاتا ہے۔ شہر کا بجلی گھر فیل ہو جائے تو پورا شہر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو ان آسمانی روشنیوں کا انتظام کس نے کیا ہوا ہے جس کی روشنی میں آج تک کمی نہیں ہوئی؟

کیکر کے درخت میں کبھی سیب کیوں نہیں لگتا؟ کبوتر کے انڈے سے کبھی کوا کیوں نہیں نکلتا؟ انسان سے انسان ہی کیوں پیدا ہوتا ہے؟ ذرہ سے لے کر آفتاب تک یہ تمام کائنات نظام واحد میں مربوط ہے۔ اس ربط اور نظم وضبط کا خالق کون ہے؟

یہ دن اور رات کا تسلسل، یہ سورج کا طلوع اور غروب، یہ نباتات میں روئیدگی اور جانوروں اور انسانوں کی نسل میں باقاعدگی کا مربوط نظام، یہ نیلگوں آسمان، یہ تاروں بھری روشن راتیں، یہ اودی گھٹائیں، یہ بلند کہسار اور سرسبز وادیاں، یہ ابلتے ہوئے چشمے اور بہتے ہوئے دریا، یہ لہلہاتے ہوئے کھیت اور مہکتے ہوئے باغات، کیا یہ سب کے سب خدائے واحد کے موجود ہونے کی شہادت نہیں دیتے؟ کیا اس کائنات کے نظام کی یکسانیت اور وحدت میں اس عظیم خالق کی وحدت نظر نہیں آتی تو بس ہمیں کہنے دیں کہ جس شخص کو اس حسین کائنات میں خدا کے حسن کا جلوہ نظر نہیں آتا اسے وہ جنت میں بھی نظر نہیں آئے گا۔

نبوت

اسلامی عقائد میں عقیدۂ رسالت نہایت اہمیت کا حامل ہے، حتیٰ کہ کوئی شخص رسول کو مانے بغیر خدا کو مان لے تو اس کا یہ ایمان مقبول نہیں ہے۔ اگر مقام رسالت کی ادنیٰ بے ادبی ہو جائے تو عمر بھر کی کمائی ہوئی نیکیاں اکارت ہو جاتی ہیں اور اگر کوئی شخص کمالات رسالت کو بڑھا کر الوہیت کی سطح پر لے آئے تو وہ ورطۂ شرک میں گر جاتا ہے، الحاد اور دہریت نے یہ شبہات پیدا کر دیئے کہ نبی کی کیا ضرورت ہے؟ وصال خدا تو اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے، بعض لوگوں نے کہہ دیا کہ رسول کی حیثیت ایک مرکز ملت اور سربراہ مملکت سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے اقوال اور افعال قیامت تک باقی رہنے والے قوانین کی اساس نہیں ہو سکتے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا کہ رسول ہماری طرح ایک عام انسان تھے، فرق صرف یہ ہے کہ ان پر وحی آتی تھی۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ نبوت سے متعلق تمام اہم حقائق دلائل کے ساتھ مختصراً پیش کر دیئے جائیں تاکہ ایک عام انسان کو مقام رسول سے آگہی میں کوئی دشواری نہ ہو۔

ضرورت نبوت

انسان حواس و خرد کا مالک ہے۔ نظر و فکر کی استعداد رکھتا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کے احکام کی معرفت میں قدم قدم پر رسول کا محتاج ہے، فلاح آخرت تو دور کی بات ہے دنیا میں بھی صالح حیات کا کوئی لمحہ اعانت وحی کے بغیر میسر نہیں ہو سکتا۔ علماء اسلام نے ضرورت نبوت پر متعدد دلائل فراہم کئے ہیں۔ بعض ازاں یہ ہیں:

(۱) واقعات عالم اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جن لوگوں نے نبی اور رسول کے بغیر خالق کو تلاش کیا وہ مظاہر پرستی کا شکار ہو گئے۔ کسی نے آگ کی پوجا کی اور کسی نے گاؤ ماتا کی، کوئی بت پرستی کا شکار ہوا اور کوئی کواکب پرستی کا۔ لہٰذا تاریخ اور تجربے سے یہ ثابت ہے کہ نبی اور رسول کے بغیر انسان خدا پرستی کا صحیح تصور نہیں پا سکتا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی ذات مبداء فیاض ہے اور انسان اکتساب فیض کرنے والا ہے اور افادہ و استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ مفید اور مستفید کے درمیان کوئی نہ کوئی مناسبت ہو۔ جب کہ واجب اور ممکن اور قدیم اور حادث کے مابین کسی قسم کی کوئی مناسبت نہ تھی تو افاضہ اور استفاضہ کیسے ہو سکتا تھا؟ فیض دینے والا خالق قادر اور لینے والا مخلوق و عاجز تھا تو اس کی رحمت نے چاہا کہ ایک ایسی مخلوق پیدا کرے جو عام بندوں اور خدا کے درمیان برزخ کی شان رکھتی ہو۔ جس کی ایک صفت اللہ سے واصل اور دوسری بندوں میں شامل ہو۔ تاکہ وہ پہلی حیثیت سے خدا سے فیض لے اور دوسری حیثیت سے بندوں کو فیض دے اور اس مخلوق کا نام اس نے نبی اور رسول رکھا۔

(۳) جس طرح اللہ تعالیٰ نے خارج اور ظاہر کے ادراک کے لئے حواس کو پیدا کیا اور معانی اور بواطن کے ادراک کے لئے عقل کو پیدا کیا اسی طرح غیب کے ادراک کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو پیدا فرمایا اور جس طرح صورت کا بغیر حواس کے اور معنی کا بغیر عقل کے انسان کی سمجھ میں آنا محال ہے اسی طرح غیب کا ادراک بغیر نبوت کے ناممکن ہے۔ حشر و نشر، جنت و دوزخ، حساب و کتاب اور دوسرے امور جن کا تعلق غیب سے ہے اور خود اللہ تعالیٰ کی ذات جو غیب الغیب ہے ان میں سے کسی چیز کو بھی ہم نبی کی وساطت کے بغیر نہیں جان سکتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہماری اس ضرورت کے سبب نبی اور رسول کو پیدا فرمایا۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے آنکھ کو دیکھنے کے لئے پیدا فرمایا ہے، لیکن یہ آنکھ اس وقت تک کسی چیز کو نہیں دیکھ سکتی جب تک کہ خارجی نور اس کا معاون نہ ہو۔ اسی طرح عقل کو اللہ تعالیٰ نے معرفت ذات کے لئے پیدا فرمایا ہے۔ لیکن عقل اس وقت تک ذات الٰہی کی معرفت نہیں پاسکتی جب تک کہ آفتاب نبوت اس کا معاون نہ ہو۔

(۵) بسا اوقات حواس غلطی کر جاتے ہیں۔ مثلاً متحرک سواری میں بیٹھے شخص کو درخت دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حواس کی ایسی غلطیوں کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا فرمایا۔ لیکن بعض اوقات عقل بھی مغالطہ کھا جاتی ہے۔ لہٰذا ضروری تھا

کہ عقل کی اصلاح کے لئے بھی کسی ہادی کو پیدا کیا جاتا اور جو حقیقت عقل کی اصلاح کرنے والی ہے، وہی نبوت ہے۔

(۶) انسان طبعی طور پر شہوت اور غضب سے مغلوب ہوتا ہے اور عام طور پر دنیا میں منہمک اور آخرت سے غافل ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ کوئی شخص اپنی تعلیم سے اس میں دنیا سے بے رغبتی اور فکر آخرت پیدا کرے۔ عذاب کی وعید سے خوف خدا اور ثواب کی ترغیب سے شوق وصال پیدا کرے۔ اس ضرورت کی تکمیل کی خاطر اللہ تعالیٰ نے نبی کو پیدا فرمایا۔

(۷) انسان مصنوعات کی رہنمائی سے عقل کے ذریعے اگر صانع کا عرفان حاصل بھی کر لے تب بھی اس کے احکام کی تفصیلات کو عقل محض سے نہیں جان سکتا اور تفصیل احکام میں وہ نبی کا محتاج ہے تو اپنے احکام کی تفصیل بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی کو پیدا فرمایا۔

(۸) اگر اللہ تعالیٰ فقط کتاب نازل کر دیتا اور نبی پیدا نہ کرتا تو عرفان ذات کے لئے یہ بھی ناکافی تھا کیونکہ کتاب فقط احکام کا علم دیتی ہے، اس کی تشریح نہیں کرتی۔ نبی کے بغیر عقل انسانی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔ پس اللہ نے نبی بھیج کر عقل انسانی پر کرم فرمایا کہ وہ احکام کی تشریح نبوت کی زبان سے پا سکے۔

(۹) اگر ہمارے سامنے صرف احکام ہوتے تو ممکن تھا کہ کوئی شخص یہ کہہ دیتا کہ یہ احکام انسان کے لئے قابل عمل نہیں۔ اس لئے نبی ان احکام پر عمل کر کے ہمیں یہ بتاتا ہے کہ یہ احکام دشوار نہیں، قابل عمل ہیں۔ وجود نبوت کے بغیر ان احکام کے لائق عمل ہونے کی کوئی سند نہیں ہے۔

(۱۰) کتاب سے فقط احکام کا علم حاصل ہوتا ہے، ان پر عمل کرنے کا طریقہ اور نمونہ صرف نبی کی ذات سے ملتا ہے۔ نبی صرف حامل کتاب نہیں ہوتا، مجسم کتاب ہوتا ہے۔ اس کی سیرت اور کردار عبارت کتاب کی اور عبارت کتاب اس کی سیرت اور کردار کی تعبیر ہوتی ہے۔

حقیقت نبوت

اصطلاح شرع میں ''نبی'' اس انسان کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام کی تبلیغ کے لئے مخلوق کے پاس بھیجا ہو اور اس کی تائید معجزہ سے فرمائی ہو۔ ہر نبی کے لئے معجزہ ضروری ہے۔ اولاً تو اس لئے کہ نبوت صادقہ اور کاذبہ کے درمیان فارق صرف معجزہ ہے، اللہ تعالیٰ جھوٹے نبی کے صدق پر کوئی خارق عادت ظاہر نہیں فرماتا۔ اب اگر سچے نبی کے صدق پر بھی کوئی امر خارق ظاہر نہ کیا جائے تو سچے اور جھوٹے نبی کے درمیان امتیاز نہ ہو سکے گا اور یہ مقصد بعثت کے منافی ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ ''بخاری شریف'' میں ہے کہ انبیاء میں سے کوئی نبی نہ تھا، مگر اسے ایسی نشانیاں دی گئیں جو ایک بشر کے ایمان لانے کے لئے کافی تھیں۔

علماء اصول نے نبی اور رسول میں فرق کیا ہے، نبی اس انسان کو کہتے ہیں جس پر وحی اترے عام ازیں کہ وہ صاحب کتاب ہو یا نہ ہو اور رسول وہ شخص ہے جو کتاب اور وحی دونوں کا حامل ہو۔ اس جگہ ایک شبہ ہوتا ہے کہ فرشتہ نبی کے پاس جب وحی لے کر آتا ہے تو نبی کو کیسے یقین ہوتا ہے کہ یہ فرشتہ ہے، شیطان نہیں ہے؟ امام رازی نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ جس طرح نبی اپنے صدق کے اظہار کے لئے امت کے سامنے معجزہ پیش کرتا ہے، اسی طرح جب فرشتہ نبی کے پاس وحی لے کر آتا ہے تو وہ بھی اپنے صدق کو ظاہر کرنے کے لئے نبی کے سامنے معجزہ لاتا ہے اور حق یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک وصف دیا ہے جس کی وجہ سے ہم انسان اور حیوان کے درمیان امتیاز کر لیتے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے نبی کو اس وصف کے ساتھ ایک اور وصف بھی دیا ہے جس سے اس کے نزدیک ملائکہ اور شیاطین میں امتیاز ہو جاتا ہے (1)۔ ہم چونکہ صرف حواس اور عقل سے ادراک کرتے ہیں۔ اس سے ہم پر صرف وہی امور منکشف اور متمیز ہوتے ہیں جو حواس اور عقل کے دائرہ میں ہیں اور نبی حواس کے علاوہ ایک اور صفت سے بھی ادراک کرتا ہے جس سے اس پر امور غیبیہ منکشف ہوتے ہیں۔ اس لئے فرشتہ کی لائی ہوئی وحی اس کے نزدیک ہر قسم کے شک و

1۔ امام غزالی فرماتے ہیں: ان له صفة بها يبصر الملائكة ويشاهدهم كما ان للبصير صفة بها يفارق الاعمى حتى يدرك بها المبصرات۔ (احیاء العلوم ج۵ ص۱۵۰)

شبہ سے بالاتر اور آفتاب سے زیادہ صاف اور یقینی ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام پر نزول وحی کی کتنی صورتیں ہیں، اس کا کسی عدد متعین میں احصاء تو نہیں کیا جا سکتا، البتہ علماء کرام نے تتبع اور تلاش سے جس قدر صورتوں کو معلوم کیا ہے وہ یہ ہیں:

(۱) خواب کے ذریعے کوئی حکم دیا جائے، جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں دکھایا کہ وہ اپنے فرزند کو ذبح کر رہے ہیں۔

(۲) گھنٹی کی آواز کی طرح وحی محسوس ہو۔

(۳) نبی کے دل میں کوئی بات القاء کی جائے۔

(۴) جبرائیل نبی سے کسی معروف انسان کی شکل میں آ کر کلام کرے جیسا کہ جبرائیل نے دحیہ کلبی کی شکل میں آ کر حضور سے گفتگو کی۔

(۵) جبرائیل کسی غیر معروف انسان کی شکل میں آ کر کلام کرے جیسے جبرائیل نے اعرابی کی شکل میں آ کر حضور سے گفتگو کی۔

(۶) جبرائیل اپنی اصل شکل میں آ کر ہم کلام ہو، جیسے حضور سے جبرائیل نے اصلی شکل میں آ کر باتیں کیں۔

(۷) اللہ تعالیٰ پردہ کی اوٹ سے کلام کرے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا۔

(۸) اللہ تعالیٰ نبی سے بیداری میں بے پردہ کلام کرے، جیسے حضور سے شب معراج میں کلام فرمایا۔

(۹) اللہ تعالیٰ رسول سے اس کی نیند میں کلام فرمائے، جیسے معراج منامی کے واقعات ہیں۔

(۱۰) اسرافیل کے ذریعے وحی کی جائے، جیسے بعثت سے پہلے اسرافیل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتا تھا۔ (بروایت شعبی)

(۱۱) نیند میں نبی فرشتوں کا کلام سنے اور ایسے متعدد واقعات ہیں۔

اعجاز نبوت

معجزہ نبی کے اختیار میں ہوتا ہے یا نہیں، اس میں بعض متاخرین نے اختلاف کیا ہے اور بعض مبتدعین نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جس طرح لکھتے وقت کاتب کے ہاتھ میں قلم بے بس اور بے اختیار ہوتا ہے، اسی طرح اظہار معجزہ کے وقت نبی بھی بے اختیار اور بے بس ہوتا ہے اور حق یہ ہے کہ معجزے کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو نبی کا فعل ہو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب دہن لگا کر حضرت ابوقتادہ کی نکلی ہوئی آنکھ کو لگا دینا یا سلمہ بن اکوع کی ٹوٹی ہوئی پنڈلی کو جوڑ دینا، معجزہ کی یہ قسم نبی کے اختیار میں ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جو نبی کا فعل نہ ہو لیکن اس کا کسی وجہ سے نبی کے ساتھ تعلق ہو۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر کلام الٰہی کا نزول یا پتھر کا حضرت موسیٰ کے کپڑے لے بھاگنا، یہ معجزے ہیں لیکن ان کے اظہار میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اختیار کا دخل نہ تھا۔

جو معجزہ نبی کا فعل ہوتا ہے، اس کا اختیاری ہونا ایسا ہی ہے جس طرح ہمارے افعال ہمارے اختیار میں ہوتے ہیں کہ ان افعال کا خالق اللہ تعالیٰ ہوتا ہے اور کاسب ہم ہیں۔ اس طرح جو معجزات انبیاء علیہم السلام کے افعال ہیں، ان کا خالق اللہ ہے اور اس کے کاسب انبیاء علیہم السلام ہیں۔

امام غزالی فرماتے ہیں کہ جس طرح ہماری ایک صفت ہے جس سے ہمیں حرکات اختیاریہ پر قدرت ہوتی ہے۔ اسی طرح انبیاء کی ایک صفت ہوتی ہے جس کے سبب معجزات ان کے اختیار میں ہوتے ہیں (1)۔ اور میر سید شریف جرجانی فرماتے ہیں کہ صحیح ترین بات یہی ہے کہ معجزہ انبیاء کا مقدور ہوتا ہے (2)۔

منصب نبوت

نبی کو اللہ تعالیٰ دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجتا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد

1۔ ان له صفة بها تتم له الافعال الخارقة للعادات كما ان لنا صفة بها تتم الحركات المقرونة بارادتنا و اختيارنا و هى القدرة۔ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۱۹۰)

2۔ ان نفس هذا الحركة معجزة من جهة كونها خارقة للعادة و مخلوقة و ان كانت مقدورة للنبى الله تعالى وهو الاصح۔ (شرح مواقف ص ۶۶۶)

ہے: وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرہ:۳۰) ”جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا: میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں“۔ لہٰذا نبی زمین پر خدا کا نائب مطلق اور خلیفہ علی الاطلاق بن کر آتا ہے۔ نبی کا قول اللہ کا قول، نبی کا فعل اللہ کا فعل اور نبی کی مرضی اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء:۸۰) ”جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کر لی“۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح:۱۰) ”جس نے رسول سے بیعت کی اس نے اللہ سے بیعت کر لی“۔ اسی وجہ سے ابن تیمیہ نے کہا: و قد اقامه الله مقام نفسه فی امره و نهیه و اخباره و بیانه۔ (الصارم المسلول ص ۴۱) ”اللہ تعالیٰ نے نبی کو امر و نہی اور خبر و بیان میں اپنا قائم مقام بنا کر بھیجا ہے“۔

نبی قوانین کا واضع اور احکام کا شارع ہوتا ہے۔ اس کا امر خدا کا امر اور اس کی نہی خدا کی نہی ہوتی ہے۔ نبی کے حکم دینے کے بعد امت کے لئے عمل کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ یَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ (الاحزاب:۳۶)

اور نبی کے فیصلہ کے بعد اس سے اختلاف تو کجا اس کو ناگوار سمجھنے سے بھی انسان مسلمان نہیں رہتا۔

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۝ (النساء:۶۵)

”آپ کے رب کی قسم! کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں آپ کا فیصلہ نہ مان لیں اور آپ کے کیے ہوئے فیصلے سے وہ اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں اور اس کو بخوشی تسلیم کرلیں“۔

حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو ان صریح احکام کے باوجود منصب نبوت کو مرکز ملت کے مساوی قرار دیتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا مرکز ملت یا سربراہ مملکت سے نفاق رکھنے کے

سبب کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے۔ جب کہ نبی سے نفاق رکھنے کی وجہ سے تو کوئی شخص مسلمان نہیں رہتا(1)۔ کیا مرکز ملت کے فیصلے کو ناگوار سمجھنے سے آدمی دین سے نکل جاتا ہے۔ حالانکہ نبی کا فیصلہ جس کو پسند نہ ہو وہ کافر ہو جاتا ہے(2)۔ مرکز ملت کو یہ اختیار نہیں ہوتا کہ جس چیز کو چاہے حلال کرے اور جس کو چاہے حرام کر دے۔ اس کے برخلاف نبی کو حلال اور حرام کرنے کا اختیار ہوتا ہے(3)۔ مرکز ملت کے اقوال و افعال حجت شرعیہ نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس نبی کا ہر قول اور ہر فعل حجت شرعی ہے۔ نبی کا ہر وقت وحی سے رابطہ قائم رہتا ہے اس لئے اس کی ہر بات مستند ہوتی ہے اور مرکز ملت کی اپنی استقامت پر بھی کوئی سند نہیں ہوتی(4)۔

انکار حدیث کی بنیاد اس امر پر ہے کہ نبی کی حیثیت مرکز ملت کے مساوی ہے، جس طرح ایک سربراہ مملکت کے احکام اس کے دور حکومت میں نافذ ہوتے ہیں، قیامت تک لاگو نہیں ہوتے، اسی طرح نبی کی احادیث بھی اپنے وقت میں حجت تھیں، قیامت تک کے لئے سند نہیں ہیں اور اب جب یہ ظاہر ہو گیا کہ نبی کو مرکز ملت پر قیاس کرنا قطعاً باطل اور فاسد ہے تو احادیث نبویہ کا حجت ہونا بھی بے غبار ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ نبی اللہ کی کتاب کا معلم اور شارح بن کر آتا ہے۔ نبی کی تعلیم سے آیات کے معانی متعین ہوتے ہیں اور احادیث رسول سے صرف نظر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ الغرض نبی کتاب کا شارح، ایمان کا منبع اور اللہ کا نائب ہوتا ہے اور مرکز ملت اس میں سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔

علوم نبوت

نبی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا عارف اور کتاب کے احکام و اسرار کا عالم ہوتا ہے،

1۔ اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝ (المنافقون:1)

2۔ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (النساء:65)

3۔ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓىٕثَ (الاعراف:157)

4۔ مَاۤ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَ مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:7)

افراد امت کے ایمان اور نفاق اور حسنات وسیئات سے واقف ہوتا ہے۔شہادت اور غیب پر یکساں نظر رکھتا ہے۔امام غزالی حقیقت نبوت کے بیان میں فرماتے ہیں: عقل سے آگے ادراک کی ایک اور آنکھ کھلتی ہے۔اس آنکھ سے نبی غیب کے آئندہ ہونے والے واقعات کو اور دوسرے ان حقائق کو دیکھ لیتا ہے جن تک عقل کی رسائی نہیں ہوئی (1)۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں: غیب کی دو قسمیں ہیں، غیب اضافی اور غیب مطلق، غیب اضافی وہ ہے جو سب کے لئے غیب نہ ہو، بعض سے غائب اور بعض پر ظاہر ہو، جس طرح صورت اور رنگ غیب ہیں، لیکن اندھے کے لئے، بینا کے لئے نہیں۔ اسی طرح جن اور ملائکہ، جنت اور دوزخ غائب ہیں۔لیکن انسانوں کے لئے، فرشتوں کے لئے نہیں اور بھوک اور پیاس، شہوت وغضب فرشتوں کے لئے غیب ہیں، انسانوں کے لئے نہیں۔پس یہ تمام صورتیں غیب اضافی کی ہیں اور جو چیز تمام مخلوقات کی نظر سے غیب ہو، وہ غیب مطلق ہے اور اس غیب پر اللہ صرف اپنے نبی اور رسول کو مطلع کرتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز کی اس تقریر سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم یوں تو عام انسانوں کو بھی ہوتا ہے اور فرشتوں کو بھی۔لیکن جو غیب نبی کے ساتھ مختص ہے وہ سب سے خاص اور منفرد غیب ہے وہی اس آیت کریمہ کا منشاء ہے: عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن) "اللہ غیب کا جاننے والا ہے، وہ اپنے غیب خاص پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا، سوا ان لوگوں کے جن پر اللہ راضی ہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے شیطان کو جو علم دیا ہے اس کا ذکر یوں فرماتا ہے: اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَ قَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ (الاعراف:۲۷) شیطان اور اس کی ذریات روئے زمین کے تمام بنی آدم کو دیکھتی ہیں۔پس ضروری ہوا کہ نبی کا علم شیطان سے زیادہ ہو۔ورنہ شیطان علم کے اعتبار سے نبی پر غالب ہوگا اور یہ سراسر باطل ہے۔اولاً اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ (المجادلہ:۲۱) "میں اور میرے رسول غالب ہیں" ثانیاً اس لئے کہ

1۔ ووراء العقل طور آخر تنفتح فیه عین اخری یبصر بها الغیب وما سیکون فی المستقبل امور اخر العقل معزول عنها۔(المنقذ من الضلال ص ۵۴)

جب شیطان نبی پر غالب ہوا تو جس طرح وہ دوسروں کو گمراہ کرنے پر قادر ہے اسی طرح نبی کو گمراہ کرنے پر قادر ہوگا۔ حالانکہ شیطان نے خدا کے سامنے خود اعتراف کیا کہ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ (ص) ''اے رب! تیری عزت وجلال کی قسم! میں سب لوگوں کو گمراہ کردوں گا، ماسوا تیرے مخلص بندوں کے'' پس ضروری ہوا کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو تمام روئے زمین کے بنی آدم کا علم عطا فرمایا ہے تو انبیاء علیہم السلام کو اس سے زیادہ علم عطا فرمائے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ان لوگوں پر جو شیطان کے لئے روئے زمین کا علم مانتے ہیں اور نبی کے لئے پس دیوار کا علم بھی تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الانعام: ۷۵) ''ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو تمام آسمانوں اور زمینوں کی نشانیاں دکھلائیں''۔

امام رازی اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: تحت الثریٰ سے عرش عظیم تک کوئی حقیقت نہیں تھی مگر اللہ تعالیٰ نے اسے حضرت ابراہیم کو دکھلا دیا۔ (تفسیر کبیر ج ۴ ص ۴۷) اس سے ظاہر ہوگیا کہ شیطان کا علم علوم نبوت کی عظمتوں کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اگر شیطان روئے زمین کے بنی آدم کو دیکھتا ہے تو نبی کی نظر میں فرش سے عرش تک کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہوتی اور شیطان تو کجا فرشتوں کا علم بھی نبی سے بڑھ کر نہیں ہوتا۔

امام غزالی فرماتے ہیں: مخلوقات میں آخری مرتبہ نبی کا ہوتا ہے جس پر تمام حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ (اقصی الرتب رتبۃ النبی تنکشف لہ کل الحقائق، احیاء العلوم: ج ۳ ص ۸) اور ایک جگہ لکھتے ہیں: نبی کی ایک صفت ہے جس سے وہ نیند یا بیداری میں آئندہ ہونے والے واقعات کو غیب سے جان لیتا ہے اور اس صفت سے وہ لوح محفوظ کا مطالعہ کرتا ہے اور غیب کے امور کو دیکھ لیتا ہے۔ (احیاء العلوم: ج ۴ ص ۱۹۰)

ان لہ صفة بھا یدرك ما سیکون فی الغیب اما فی الیقظة او فی المنام اذبھا یطالع اللوح المحفوظ فیری ما فیہ من الغیب۔

لوح محفوظ کے علوم کا احاطہ کر لینا، غیب مطلق کو جان لینا اور کتاب کے احکام و اسرار کا عالم ہونا اگرچہ یہ بھی علوم نبوت کی عظیم اقسام ہیں۔ لیکن نبوت کا اصل کمال اللہ تعالیٰ کی

صفات کا عرفان ہے۔ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی صفات کا عرفان ہے، انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے ثمرات کے عارف ہوتے ہیں اور دنیا میں ہونے والے ہر واقعہ اور حادثہ کا ربط اللہ تعالیٰ کی صفات سے جوڑ لیتے ہیں۔ انہیں پتہ ہوتا ہے فلاں واقعہ فلاں صفت کا ثمرہ ہے۔ وہ صفات شناسائے ربوبیت ہوتے ہیں اور آنے والے حوادث کا رخ پہچان لیتے ہیں۔

استصواب

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ اگر انبیاء علیہم السلام کے علوم میں ایسا ہی عموم اور شمول ہوتا ہے تو علم کے باوجود حضرت آدم نے شجر ممنوع سے کیوں کھایا؟ جب حضرت یعقوب کو علم تھا کہ حضرت یوسف کنویں میں سلامت ہیں تو ان کے غم میں کیوں روتے رہے؟ جب حضور کو علم تھا کہ کفار کی دعوت پر ستر قاریوں کو بھیجنا بالآخر کفار کے ہاتھوں ان کی شہادت کا سبب ہوگا تو آپ نے انہیں کیوں بھیجا؟ جواباً گزارش ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا علم ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ اس پر غفلت یا نسیان نہ آ سکے۔ ثانیاً عرض یہ ہے کہ ان مثالوں سے علم کی نفی ہرگز نہیں ہوتی۔ حضرت آدم کو یقیناً علم تھا کہ شجر ممنوع سے کھانا سبب مواخذہ ہے۔ لیکن انہوں نے بھول کر کھا لیا اور حضرت یعقوب کو قطعاً معلوم تھا کہ حضرت یوسف سلامت ہیں اور ان سے ملاقات ہوگی۔ کیونکہ ان کے خواب کی تعبیر پوری ہونی تھی مگر غلبۂ محبت کے باوجود وہ خود فراموشی کے عالم میں تھے اور فراق یوسف کے صدمے سے روتے رہتے تھے اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفار کی خباثتوں کے علم کے باوجود صحابہ کرام کو بھیجنا متعدد حکمتوں کے سبب تھا۔ ایک یہ کہ حضور یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ قتل کے خوف سے تبلیغ دین نہیں چھوڑنی چاہئے۔ دوسری یہ کہ حضور نے علم کے باوجود قضا و قدر کی موافقت کے لئے صحابہ کو بھیجا۔ تیسری حکمت یہ ہے کہ اگر حضور کفار کی دعوت پر قاریوں کو نہ بھیجتے تو کل حشر کے دن کفار اللہ کے سامنے حضور کے خلاف استغاثہ کرتے کہ ہم نے طلب ہدایت کے لئے مبلغ مانگے تھے تیرے نبی نے ان کو نہیں بھیجا۔ چوتھی حکمت یہ ہے کہ حضور نے باوجود علم کے صحابہ کو بھیج کر ان کے لئے شہادت کی سعادت کا موقع فراہم کیا، جس کے لئے وہ ترستے رہتے تھے، اس

سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ قاریوں کے بھیجنے پر اعتراض اس شخص کے ذہن میں ہو گا جس کا مطمع نظر دنیا کے سوا کچھ نہ ہو۔ ورنہ سچے مسلمان کے لئے شہادت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور خوف شہادت سے تبلیغ کو چھوڑ دینا نہ مردانگی ہے نہ مسلمانی۔

جن جزوی واقعات سے منکرین کمالات نبوت، انبیاء علیہم السلام کے علوم کی نفی کرتے ہیں ان سب کا یہی حال ہوتا ہے یا وہاں نفس علم کے باوجود بعض حکمتوں کو پورا کرنے کے لئے مثلاً تعلیم دین اور تکمیل شریعت کی خاطر اللہ تعالیٰ بعض چیزوں سے نبی کی توجہ ہٹا دیتا ہے اور ایسا علم جس پر کسی حال میں غفلت اور نسیان نہ آسکے، صرف اللہ تعالیٰ کے علم لازوال ہی میں ممکن ہے۔

عصمت نبوت

نبی کا ایک مرکزی وصف عصمت ہے، اسی وصف کی اساس پر شریعت تعمیر ہوتی ہے اور اگر نبوت کی حقیقت سے عصمت کو الگ کر دیا جائے تو اس کے لائے ہوئے دین کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ میر سید شریف جرجانی نے "شرح مواقف" اور سعد الدین تفتازانی نے "شرح مقاصد" میں عصمت کی جو تعریف کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ گناہوں کے تمام مفاسد اور نیکیوں کے تمام فوائد پر نظر رکھنے کی وجہ سے نبی کو ایک ایسا ملکہ فاضلہ اور وصف راسخ حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ معصیت پر قدرت کے باوجود اس سے بچا رہتا ہے اور جوں جوں ان کے سینہ پر وحی الٰہی کی بارش ہوتی ہے اور اللہ سے ان کا رابطہ قوی ہوتا ہے، اس وصف کا رسوخ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

عقلی اور نقلی دلائل سے علماء اسلام نے عصمت انبیاء کے ثبوت پر متعدد دلائل فراہم کئے ہیں۔ بعض ازاں یہ ہیں:

(۱) نبی کے تمام افعال واقوال دلیل شرعی ہوتے ہیں۔ اگر اس کے اقوال وافعال میں معصیت آجائے تو ان سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

(۲) نبی کے صدق پر معجزہ دلیل ہوتا ہے، اگر نبی جھوٹ بولے تو معجزہ سے اعتماد ساقط ہو جائے گا۔

(۳) اگر نبی فاسق ہو تو اس کی پیروی حرام ہوگی، حالانکہ امت پر نبی کی پیروی واجب ہے۔

(۴) اللہ کو غصہ میں لانے والی چیز یہ ہے کہ انسان وہ بات کہے جسے خود نہ کرتا ہو(1)۔ اب اگر نبی کا اپنا دامن شر سے آلودہ ہو اور وہ لوگوں کو خیر کی تلقین کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا مستحق ہوگا، حالانکہ اللہ نبی سے زیادہ کسی پر راضی نہیں ہوتا۔ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن: ۲۷) ''جن پر اللہ راضی ہے وہ اس کے رسول ہیں''۔

(۵) اگر انبیاء میں فسق ہوتا تو ان کی گواہی مقبول نہ ہوتی۔ حالانکہ ان کی گواہی کا قبول کرنا واجب ہے کیونکہ وہ اللہ کی ذات پر گواہ ہوتے ہیں۔

(۶) قرآن حکیم میں انبیاء کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (الانعام) ''یہ سب نیک ہیں''۔

(۷) ایک اور جگہ فرماتا ہے: وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ (ص) ''یہ ہمارے نزدیک اخیار اور پسندیدہ ہیں''۔

(۸) شیطان نے بھی خدا کے سامنے اعتراف کیا کہ انبیاء کو گمراہ نہ کر سکے گا۔ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ (ص)

(۹) انبیاء فرشتوں سے برتر ہیں اور جب فرشتے معصوم ہیں تو انبیاء کی عصمت بدرجہ اتم ثابت ہوتی ہے۔

(۱۰) العیاذ باللہ اگر انبیاء گناہ گار ہوتے تو مستحق عذاب ہوتے۔ حالانکہ انبیاء نہ صرف یہ کہ خود عذاب سے بری ہوں گے بلکہ ان کی شفاعت سے ہم جیسے لاکھوں گناہ گار نجات پائیں گے۔

بعثت سے قبل اور بعد نبی سے کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا، نہ کبیرہ نہ صغیرہ، نہ سہواً نہ عمداً، البتہ نسیان اور اجتہادی خطا نبی کے حق میں جائز ہے۔ قرآن حکیم میں جن زلات انبیاء کا ذکر ہے وہ سب اسی قبیل سے ہیں اور انبیاء کا ان پر استغفار کرنا محض ان کی تواضع اور انکسار ہے۔

1۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (الصف)

خصائص نبوت

انبیاء علیہم السلام جسمانی اور روحانی کمالات کے اعتبار سے انسانیت کے اعلیٰ ترین افراد ہوتے ہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں: نبی کی حقیقت کو نبی کے سوا کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ (احیاء العلوم ج ۳ ص ۸) امام رازی حلیمی سے نقل کرتے ہیں کہ انبیاء کی حقیقت عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے۔ (تفسیر کبیر ج ۲ ص ۴۲۳) ظاہر ہے کہ بشریت کے جس قالب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلیات کا مرکز بنانے کے لیے منتخب کرلیا ہو، وہ عام لوگوں کی مثل نہیں ہوسکتا۔ اللہ تعالیٰ نبی کی آنکھوں میں ایسی صفت رکھتا ہے جس سے وہ غیب وشہادت دونوں کو دیکھ سکے۔ اس کے دل کو ایسی استعداد عطا کرتا ہے جس سے وہ بار وحی کا متحمل ہو سکے اور اس کی فکر کو وہ جرأت دیتا ہے جس سے وہ صفات الٰہیہ پر کمند پھینک سکے۔

ذیل میں ہم نبی کے حواس خمسہ کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جس سے یہ حقیقت روشن ہوجائے گی کہ نبی عام لوگوں کی مثل نہیں ہوتا۔

باصرہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھ سے فرش تا عرش حقائق دیکھے۔ حضور نے فرمایا: میں تمہیں سامنے اور پس پشت یکساں دیکھتا ہوں، ایک مرتبہ فرمایا: میں نے زمین کے تمام مشارق ومغارب دیکھ لئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اپنی آنکھوں سے خدا کو دیکھا۔

سامعہ: نبی وحی کو سنتا ہے، جنات اور فرشتوں کی آواز سنتا ہے، سلیمان علیہ السلام نے مسافت بعیدہ سے چیونٹی کی آواز سن لی اور حضور نے بے پردہ خدا کا کلام سنا۔

شامہ: حضرت یعقوب علیہ السلام نے کوسوں دور سے حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشبو ان کے کرتے سے سونگھ لی۔

ذائقہ: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لقمہ چکھ کر اس میں ملا ہوا زہر معلوم کرلیا۔

لامسہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بدن چھوتے ہی آگ گلزار ہوگئی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی نے حلیمی سے نبی کے چھیالیس خواص نقل کیے ہیں۔ ہم ان سے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) نبی اللہ سے بلاواسطہ کلام کرتا ہے۔

(۲) فرشتوں، جنوں اور غیب کو دیکھ لیتا ہے۔

(۳) حیوانات، نباتات اور جمادات سے ہم کلام ہوتا ہے۔

(۴) ماضی اور مستقبل کے واقعات کو جانتا ہے۔

(۵) اس کی عقل کامل ہوتی ہے اور اس کا کیا ہوا فیصلہ خطاء سے محفوظ ہوتا ہے۔

(۶) نبی دلوں کے حال پر مطلع ہوتا ہے۔ (فتح الباری ج ۱۶ ص ۲۰)

نبی کے خواص میں سے یہ بھی ہے کہ وہ قوانین کی تقویم اور شریعت کی تشکیل کرتا ہے اور وہ صرف قوانین کا واضع ہی نہیں ہوتا بلکہ ان قوانین کو نافذ کرتا ہے اور ایک ایسا معاشرہ بنا کر جاتا ہے جو اس کے لائے ہوئے دین کی مکمل تعبیر ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ سے مزاج بدل جاتے ہیں، فطرتیں پلٹ جاتی ہیں، وہ راہزنوں کو راہبر اور خائنوں کو امانت دار اور بت پرستوں کو بت شکن بنا دیتا ہے۔ شر بھی نبی کے دامن میں آجائے تو خیر بن کر نکلتا ہے، بحر و بر اس کے تابع اور عناصر مسخر ہوتے ہیں۔ دریا اس کے لئے راستہ چھوڑ دیتا ہے اور درخت اس کے حکم سے جڑوں سمیت دوڑے چلے آتے ہیں۔

الوہیت اور نبوت

نبی اپنے تمام کمالات کے باوجود بندہ ہوتا ہے اور ہر قدم پر اللہ کی نصرت اور اس کی رحمت کا محتاج ہوتا ہے۔ نہ نبی کے علم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی نسبت ہوتی ہے، نہ اس کی قدرت کو اللہ کی قدرت سے کوئی علاقہ ہوتا ہے۔ ایک ذرہ کے علم میں بھی اللہ اور اس کے رسول کے علم میں کوئی مماثلت نہیں ہوتی اور ایک رائی کے دانہ پر بھی قدرت میں خدا اور نبی میں کوئی مساوات نہیں ہوتی، نبی کا جو کمال بھی ہوتا ہے وہ خدا کا دیا ہوا مستعار اور جائز الزوال ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ہر وصف ذاتی، قدیم اور لازوال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی غافل نہیں ہوتا اور نبی کی توجہ بسا اوقات بعض چیزوں سے ہٹ جاتی ہے، خدا اور رسول میں اگرچہ قدوم وحدوث اور اصل و استعارہ کا فرق ہوتا ہے لیکن یہ فرق چونکہ عقلی اور نظری ہے اور عام ذہنی سطح سے بلند ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ انبیاء کو ایسے احوال و عوارض میں مبتلا کرتا

ہے جس سے اس کے کمالات کا حادث اور مستعار ہونا عام لوگوں کو بھی محسوس اور معلوم ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ متعدد بار نبی پر غفلت طاری کرتا ہے تاکہ نبی کے وسیع علم کو دیکھ کر عام آدمی نبی کے علم پر اللہ تعالیٰ کے علم کا دھوکا نہ کھا سکے۔ اسی طرح عصمت کے باوصف بعض اوقات اللہ تعالیٰ نبی کو نسیان یا اجتہادی خطاء کے عارضہ سے ممنوعہ کاموں میں مبتلا کرتا ہے تاکہ نبی کی معصومیت ایک عام انسان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی نزاہت کاملہ سے مشتبہ نہ ہو جائے اور یونہی نبی کو تسخیر کائنات کی قدرت دینے کے باوجود اللہ تعالیٰ نبی کو درد اور تکلیف اور دوسرے عوارض بشریہ میں مبتلا کرتا ہے تاکہ کوئی شخص نبی کی قدرت پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اور اس کی طاقت پر اللہ تعالیٰ کی طاقت کا دھوکا نہ کھا سکے۔

مقام نبوت

اللہ تعالیٰ کا نبی اس کی مخلوق میں سب سے بلند ہوتا ہے، سالہا سال سے لوح محفوظ کا مطالعہ کرنے والے اور عرصہ دراز سے تسبیح کرنے والے فرشتوں کے سامنے جب پہلا نبی آیا تو سارے فرشتے اس کے حضور سجدے میں گر گئے، آدم اور ملائکہ کی پہلی ملاقات سے ہی ظاہر ہو گیا کہ جس مقام پر فرشتوں کے علم کی انتہاء ہوتی ہے وہاں سے علوم نبوت کی ابتداء ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں سے فرمایا: اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ (البقرہ:۳۱) ''مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ'' تو انہوں نے جواب میں کہا: لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (البقرہ:۳۲) ''تیرے دیئے ہوئے علم کے سوا ہمارے پاس اور کوئی علم نہیں'' اور یہ کہہ کر انہوں نے اللہ کے علم کے مقابلہ میں اپنا علم بھی ثابت کر لیا اور جب عرصۂ محشر میں اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام سے پوچھے گا: مَاذَاۤ اُجِبْتُمْ (المائدہ:۱۰۹) ''جب تم نے مخلوق کو حق کی دعوت دی تو انہوں نے کیا کہا؟'' تو وہ سب یک زبان ہو کر عرض کریں گے: لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ۞ (المائدہ) ''اے اللہ! تیرے بیکراں علم کے سامنے ہمارا علم کوئی حقیقت نہیں رکھتا''۔ کیونکہ کمال ادب یہی ہے کہ سورج کے سامنے چراغ کو نہ لایا جائے اور اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم کے مقابلہ میں اپنے علم کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بارگاہ صمدیت کے ادب واحترام میں انبیاء کا جو مقام ہے وہاں فرشتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

انبیاء کرام کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک حیثیت سے ان کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے وہ امت سے متعلق ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے احوال مختلف ہوتے ہیں، ایک وقت وہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام مصر سے قافلہ کی روانگی سے پہلے کنعان میں بیٹھ کر فرماتے ہیں: اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ (یوسف: ۹۴) ''میں (حضرت یوسف کی خوشبو سونگھ رہا ہوں'' اور ایک وہ وقت ہے کہ گھر کے قریب کنویں میں حضرت یوسف (علیہ السلام) گرے ہوئے ہیں اور آپ کا ذہن اس طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں تو پھر کائنات کی کسی اور شے کی طرف ان کا التفات نہیں ہوتا اور جب مخلوق کی طرف متوجہ ہوں تو کوئی چیز ان سے مخفی نہیں رہتی۔

نبی چونکہ اللہ کے پاس سے آتا ہے اس لئے اس کا اصل مقام اللہ تعالیٰ کی ذات میں انہماک اور اس کی صفات میں استغراق ہوتا ہے، وہ اپنی فطرت اور مزاج سے اللہ تعالیٰ کے جلوؤں میں کھویا رہتا ہے۔ نبی کی خلوت اللہ کی دید اور اس کی جلوت اللہ کی شنید ہوتی ہے، وہ اسی کی تجلیات میں محو رہتا ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو نبی کے ذریعہ مخلوق کی ہدایت مقصود ہوتی ہے، اس لئے وہ فرشتوں کو بھیج کر نبی کو اس عالم محویت سے ہٹاتا ہے اور مقام بعثت پر فائز کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ پیارے! تم تو منزل رسیدہ ہو، ذرا اس امت کو بھی مقام آشنا کر دو، جس محویت اور انہماک سے ہمیں دیکھتے ہو، اس دید کا کچھ حصہ امت کو بھی عطا کر دو۔ اٹھو! پنجۂ ابلیس میں اسیر لوگوں کو ضلالت کے ماروں کو صراط مستقیم دکھا دو۔ یہ مخلوق اپنی بدکاریوں کے سبب جہنم کے کنارے آ پہنچی ہے، اسے آگ میں گرنے سے بچا لو۔ اپنی انقلاب آفریں نظروں سے کام لو اور اس معاشرہ کو بدل ڈالو، بت پرستی کے متوالوں کو توحید کا رسیا کر دو اور ابلیسی کام کرنے والوں کو فرشتوں کی پاکیزگی دے دو۔



ختم نبوت

پاکستان کی تاریخ میں ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کا دن انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس دن پاکستان کی قومی اسمبلی نے پوری قوم کی نمائندگی کرتے ہوئے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا اور اب آئینی طور پر وہ مسلمانوں سے ایک الگ قوم شمار کئے جاتے ہیں۔ بہت سے ناواقف لوگ قادیانیت کو سمجھے بغیر اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے قرآن کریم کی خانہ ساز تفسیر اور نبوت کی خودساختہ اقسام بیان کر کے سادہ لوح لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اس کا دعویٰ نبوت ختم نبوت کے عقیدے سے متصادم نہیں ہے۔ اس وجہ سے بہت سے ایسے لوگ جو دین کے اصول اور قواعد سے ناآشنا تھے، مرزا صاحب کی نبوت سے متفق ہو گئے۔ لیکن اب جب کہ پوری ملت اسلامیہ نے قادیانیوں کو کافر قرار دے دیا ہے اور پاکستان میں اس کی سرکاری حیثیت بھی منوالی ہے تو اب ان حضرات کو یہ سوچنے کا موقع ملے گا کہ چند لاکھ قادیانیوں کے مقابلے میں کروڑوں مسلمان جھوٹے نہیں ہو سکتے۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کے اجماعی مسلک کی مخالفت کو گمراہی قرار دیا ہے، پھر تمام مسلمانوں کے خلاف قادیانیوں نے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ ہدایت کیسے ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے اس موڑ پر آ کر ان کا ذہن رخ بدلے اور غور و فکر کرے اور اگر وہ نہیں سوچتے تو ہم انہیں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور اس موقع پر یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے سامنے ازسرنو اسلام پیش کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ حضور تاجدار مدنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا ہے۔ جس آخری اینٹ سے قصر نبوت مکمل ہونا تھا وہ لگ چکی ہے اور آپ کے بعد اب کسی شخص کے نبی بننے کا جواز نہیں رہتا اور جو دعویٰ نبوت کرے گا کافر ہوگا۔

اس بحث سے پہلے ہم نبی کی تعریف، اس کی شرائط اور صفات بیان کریں گے، پھر ختم نبوت کا مفہوم واضح کریں گے، اس کے بعد اہم شبہات کا ازالہ کریں گے اور آخر میں انہیں حق و صداقت کے نام پر اسلام کی دعوت دیں گے۔ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یہ

بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ نبوت کا مسئلہ عقیدے سے متعلق ہے لہٰذا اس کا اثبات صرف قرآن کریم کی آیات صریحہ اور احادیث متواترہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اخبار آحاد بھی عقائد کے اثبات کے لئے کافی نہیں ہیں اور نہ ہی فلاسفہ کے مبہم اقوال اس بحث میں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

حقیقت نبوت

نبی اس انسان کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے شریعت کی تبلیغ پر مامور کیا ہو، خواہ وہ شریعت سابقہ ہو یا جدیدہ، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ (البقرہ: ۲۱۳) ”اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا جو مومنوں کو بشارت دیتے تھے اور کفار کو عذاب سے ڈراتے تھے اور ان پر کتاب نازل کی (یعنی مجموعۂ احکام خواہ بصورت صحیفہ ہو یا بشکل وحی) تا کہ وہ اس کے مطابق لوگوں کا فیصلہ کریں“۔

نبوت کا تحقق وحی الٰہی سے ہوتا ہے، اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْۤ اِلَیْهِمْ (النحل: ۴۳) ”اور ہم نے آپ سے پہلے جو پیغمبر بھیجے وہ مرد ہی تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے“۔

نیز فرمایا: اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (النساء: ۱۶۳) جس طرح ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہے اسی طرح ہم نے نوح اور دیگر انبیاء (علیہم السلام) کی طرف وحی نازل کی تھی“۔

نبی کی شرائط میں سے یہ ہے کہ وہ اپنی صداقت پر معجزہ پیش کرے کیونکہ بغیر معجزہ کے نبوت صادقہ اور نبوت کاذبہ میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ نیز ”صحیح بخاری“ میں ہے کہ انبیاء میں سے کوئی نبی نہ تھا مگر اسے ایسی نشانیاں دی گئیں جو ایک بشر کے ایمان لانے کے لئے کافی تھیں، نبی کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ جس قوم کی طرف مبعوث ہو اس کی زبان جاننے والا ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (ابراہیم: ۴) ”ہم نے کسی قوم کی طرف

رسول نہیں بھیجا، مگر اسی قوم کی زبان میں'' اور یہ تو بالکل بدیہی بات ہے کہ نبی پر جو وحی ہوتی ہے وہ اس کا مفہوم اور مطلب پوچھنے میں دوسروں کا محتاج نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ انبیاء کے حق میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران)'' اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم، حضرت نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا کی ہے''۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام مخلوق میں سب سے زیادہ پسندیدہ صفات کے حامل ہوتے ہیں اور فضائل و کمالات کے لحاظ سے دنیا میں کوئی ان کا ہمسر نہیں ہوتا۔ اس آیت کے بموجب نبی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تمام لوگوں کی جسمانیت اور عقل کے لحاظ سے کامل ہو۔ علم و فضل میں تمام لوگوں سے بڑھ کر ہو، قابل نفرت صفات سے منزہ ہو، اس کی سیرت پاکیزہ اور اخلاق حمیدہ ہوں، حوصلہ مند اور جری ہو، کفار سے مرعوب نہ ہو اور آوازۂ حق سنانے کے لئے بڑے سے بڑے فرعون کو بھی خاطر میں نہ لاتا ہو۔ نبی اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے۔ اس کی خوشنودی اللہ کی مرضی اور اس کا حکم اللہ کا فرمان ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (نساء: ۸۰)'' جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

ظلی اور بروزی نبوت

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی نے اپنی نبوت کو ثابت کرنے اور وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (احزاب: ۴۰) سے تعارض اٹھانے کے لئے غیر مستقل نبوت کا سہارا لیا ہے اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو کبھی امتی نبی، کبھی غیر تشریعی نبی اور کبھی ظلی اور بروزی نبی کہتے ہیں۔ لیکن یہ تمام اصطلاحات غیر اسلامی ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے ان کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ نبی کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے وحی حاصل کر کے لوگوں کو پہنچائے۔ خواہ اسے شریعت سابقہ کی وحی کی جائے یا جدیدہ کی اور جس شخص کو اللہ نے یہ منصب دے دیا وہ حقیقی، مستقل اور تشریعی نبی ہے۔ ظل، بروز اور امتی نبی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان اِنَّاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ كَمَاۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى نُوْحٍ وَّ

النَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ (النساء: ۱۶۳) اور وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِیۡۤ اِلَیۡهِمۡ (النحل: ۴۳) سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جس کی طرف اللہ وحی فرمائے اور فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ ۪ وَ اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡكُمَ بَیۡنَ النَّاسِ (البقرہ: ۲۱۳) فرما کر یہ بتلا دیا کہ نبی کے ذمہ وحی سے حاصل شدہ احکام کو بیان کرنا ہے۔

پس جو شخص وحی کا دعویٰ کرتا ہے وہ حقیقت میں نبوت مستقلہ کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیونکہ نہ نبوت کا اس کے سوا کوئی اور مفہوم ہے اور نہ ہی نبوت غیر مستقل ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ واجب اور مستحق عبادت ہے، اس کے سوا الوہیت کا اور کوئی مفہوم نہیں ہے، اسی طرح وحی اور اس کی تبلیغ کے سوا نبوت کا کوئی مفہوم نہیں اور جس طرح کوئی شخص ظلی اور بروزی خدا نہیں ہو سکتا اسی طرح کوئی شخص ظلی اور بروزی نبی بھی نہیں ہو سکتا۔

ختم نبوت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں جس قدر چیزیں پیدا فرمائی ہیں، ان کو تدریجاً اپنے کمال طبعی تک پہنچایا ہے۔ جب تک کوئی شئے اپنے کمال طبعی تک نہیں پہنچتی اس وقت تک اس میں ارتقائی تغیرات آتے رہتے ہیں اور جب وہ ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اپنے منتہائے کمال تک پہنچ جاتی ہے تو آخر عمر تک وہ اسی مرتبے پر رہتی ہے اور اس میں کوئی اضافہ اور ترقی نہیں ہوتی۔ اسی نہج پر اللہ تعالیٰ نے نظام شریعت قائم کیا۔ شرائع اور احکام کا سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر ارتقائی منازل طے کرتا ہوا حضور سید عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ کر اپنے منتہائے کمال تک آ پہنچا۔ اسی طرح رسالت، نبوت اور شریعت کی جس قدر اصطلاحیں تھیں، وہ سب آپ پر ختم ہو گئیں اور آپ کے بعد ان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔

انبیاء سابقین علیہم السلام جن شریعتوں اور اسوۂ ہائے زندگی کو لے کر آتے رہے وہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر محیط نہ تھے۔ مثلاً عیسیٰ علیہ السلام نے تجرد کی زندگی گزاری اور ازدواجی سیرت کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہ تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے شاہی کی زندگی گزاری ہے اور فقر کے لئے ان کی زندگی میں کوئی اسوہ نہیں۔ اس طرح سابقہ شریعتوں میں سیاست اور عبادت کا الگ الگ نظام تھا۔ یہ سب جزوی شریعتیں تھیں۔ اس لئے ایک جامع

اور کامل نبی کی ضرورت تھی جس کی سیرت میں انسان کی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہدایت ہو، قیامت تک پیش آنے والے حالات اور مسائل میں کوئی مسئلہ نہ ہو مگر اس نبی کی شریعت میں اس کے لئے رہنمائی موجود ہو، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ (المائدہ: ۳) حضور سید عالم ﷺ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس شریعت کو کامل اور مکمل کر دیا اور کامل اور مکمل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ انسانی ضروریات کے لئے وحی کے ذریعہ جتنی ہدایات دی جا سکتی تھیں، وہ سب دی جا چکی ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر وحی کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دین ابھی کامل اور مکمل نہیں ہوا۔

پہلے زمانہ میں جب انبیاء کے آنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک نبی آتا اور بعض امور کے لئے ہدایت جاری کر دیتا اور کچھ امور رہ جاتے اور پھر دوسرا نبی آتا اور بعض احکام جاری کرتا۔ لیکن ضابطہ اخلاق و عادات ادھورا ہی رہ جاتا۔ اس لئے ایسے نبی کی ضرورت تھی جس کے وجود سے ادھورے اخلاق پورے ہو جائیں اور نا تمام نظام مکمل ہو جائے۔ حتیٰ کہ حضور ﷺ آئے اور دین و دنیا کا ایک ایسا کامل نظام پیش کیا جس میں ایک عالم سے لے کر عابد تک، سپاہی سے لے کر سپہ سالار تک اور تاجر سے لے کر قاضی تک سب کے لئے ہدایت ہے، اگر تخت سلطنت پر بیٹھنے والا حاکم یہ فخر کرتا ہے کہ میں حضور کی سیرت کا تابع ہوں تو ایک کلہاڑا چلانے والا مزدور بھی سینہ تان کر کہہ سکتا ہے کہ میں بھی حضور کی سنت کا پیروکار ہوں۔ انسانی اخلاق کے وہ تمام شعبے جو آپ کے آنے سے پہلے نا تمام تھے، آپ کے آنے سے تمام اور کامل ہو گئے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا:

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ۔ ''میں اس لئے آیا ہوں کہ مکارم اخلاق کو پورا کر دوں''۔ پہلے نبیوں کی زندگی اور سیرت میں حیات انسانی کا کوئی حصہ رہ جاتا تھا جسے پورا کرنے کے لئے دوسرے نبی آتے تھے۔ اگر آپ کی زندگی میں بھی کوئی خلا ہوتا تو اسے بھی پورا کرنے کے لئے بعد میں کوئی نبی آتا۔ لیکن آپ نے ایسی جامع اور کامل زندگی گزاری ہے کہ اس میں بعد میں آنے والوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی اور اب اگر آپ کے

بعد کوئی شخص کسی کی نبوت کو تجویز کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کی سیرت کے تمام اور کامل ہونے پر ایمان نہیں رکھتا۔

پہلے انبیاء بعض قوموں کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ جس قوم کے لئے وہ شریعت لے کر آتے اس کے سوا کوئی اور قوم اس ہدایت سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن رحمت خداوندی کا سیلاب تمام انسانوں کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا تھا، اللہ کی ہدایت کا امڈتا ہوا دریا یہ چاہتا تھا کہ ایک ایسا نبی بھیجے جس کی شریعت میں رنگ و نسل، خاندان اور قبیلہ اور زبان و بیان کی کوئی قید نہ ہو، جس کی تبلیغ کی تند و تیز موجوں کی راہ میں زمانہ اور زمانیات رکاوٹ نہ بن سکیں، جس کا پیغام زمانہ بعثت سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والے ہر انسان کے لئے ہدایت ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو بھیجا اور فرمایا: قیامت تک کی نسلوں کو مخاطب کر کے کہہ دیجئے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا (الاعراف: ۱۵۸) "میں تم تمام لوگوں کے لئے رسول بن کر آیا ہوں" اب حضور کے بعد اگر کوئی فرقہ کسی شخص کی نبوت کو جائز رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے حضور کی رسالت کو کافی نہیں سمجھتا اور وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ (سبا: ۲۸) پر ایمان نہیں رکھتا۔

اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں پہلے بھیجیں ان میں سے کسی کی حفاظت کا انتظام نہیں فرمایا۔ کیونکہ ان میں مذکورہ ہدایت کی قیامت تک کے لئے ضرورت نہ تھی۔ لیکن قرآن چونکہ وقوع ساعت تک کے لئے ہدایت تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا اور فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (الحجر) اسی لئے حضور سے فرمایا کہ آپ کہہ دیجئے: وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَ مَنْۢ بَلَغَ (الانعام: ۱۹) "مجھ پر یہ قرآن اس لئے وحی کیا گیا ہے، تا کہ میں تمہیں اور قیامت تک جن کو اس کا پیغام پہنچے، انہیں عذاب آخرت سے ڈراؤں"۔ پس معلوم ہوا کہ وحی قرآن قیامت تک کے لئے کافی ہے اور جو شخص اس کے بعد کسی اور وحی کا قائل ہے وہ وقوع ساعت تک قرآن کے عموم اور شمول پر ایمان نہیں رکھتا۔

حضور سے پہلے جو نبی آئے تھے وہ کسی خاص علاقہ کے لئے نبی ہوتے تھے۔ جو نبی جس علاقے کے لئے ہوتا، اسی علاقہ کے لوگ اس سے استفادہ کر سکتے تھے۔ اللہ نے چاہا کہ ایک ایسا نبی بھیجے جس کی تبلیغ میں علاقہ کی حد بندیاں حائل نہ ہوں۔ پس اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور فرمایا: وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ۝ (الانبیاء) نیز فرمایا: تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا۝ (الفرقان) حضور علیہ السلام کی رحمت اور آپ کی ہدایت تمام جہانوں کے لئے ہے۔ لہٰذا جس چیز پر بھی عالم رنگ و بو کا اطلاق ہوگا، اس کے لئے حضور کی ہدایت کافی ہے۔ اب اگر حضور کے بعد کسی علاقہ کے لوگ ایک نیا نبی تجویز کر لیں تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تمام علاقوں کے لئے حضور کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔

پہلے زمانے میں ایک شریعت آتی، پھر منسوخ ہو جاتی، پھر ایک اور شریعت آتی اور وہ بھی منسوخ ہو جاتی۔ ایک زمانہ میں کئی کئی شریعتیں چلتی رہتیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ایک ایسی شریعت بھیجے جو تمام شریعتوں پر غالب ہو، جسے بعد میں کوئی منسوخ نہ کر سکے، پس فرمایا:

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

(الصف:۹) ''اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین کامل دے کر بھیجا تا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے''۔ پس حضور کی شریعت اور آپ کا دین تمام ادیان پر غالب ہے اور حضور کے بعد جو شخص وحی کے ذریعے اللہ کے احکام پانے کا دعویٰ کرتا ہے وہ حضور کے لائے ہوئے دین کے غالب ہونے کا ایمان نہیں رکھتا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے مختلف اسالیب سے حضور کی ختم نبوت کو بیان فرمایا ہے، لیکن بالآخر گفتگو کو ختم کرنے کے لئے فرما دیا:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِیّٖنَ

(الاحزاب:۴۰) ''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کو ختم کرنے والے''۔

خاتم کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ بعثت انبیاء کا سلسلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا

ہے اور آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہو سکتا۔ لیکن مرزا غلام احمد قادیانی کہتا ہے کہ خاتم کا معنی مہر ہے اور مطلب یہ کہ حضور کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی مہر بنایا ہے۔ جس شخص پر حضور اپنی مہر لگا دیتے ہیں وہ نبی بن جاتا ہے۔ چنانچہ میں بھی حضور کی مہر سے نبی بن گیا ہوں۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ نبی بنانا اللہ کا کام ہے، حضور کا منصب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (الانعام: ۱۲۴) ”اللہ خوب جانتا ہے وہ کسے رسول بنائے گا“۔ معلوم ہوا کہ رسالت کا جاعل اور خالق اللہ تعالیٰ ہے، حضور نہیں ہیں۔ جس شئے کو بند کرنے کے بعد اس پر سیل اور مہر لگا دیتے ہیں، اس کو عربی میں ختم سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے فرمایا: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (البقرہ: ۷) کفار کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے۔ یعنی اب ان میں ہدایت نہیں آ سکتی۔ اسی طرح ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ سلسلہ نبوت پر حضور کے ذریعہ مہر اور سیل لگا دی ہے۔ اب حضور کے بعد اس میں کسی کی مزید نبوت کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔

ایک شبہ کا ازالہ

یوں تو مرزا صاحب کے پیروؤں کے متعدد شبہات ہیں، لیکن ان سب پر گفتگو اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ اس موضوع پر ان کی جو معرکۃ آلاراء دلیل ہے اور جس کو وہ بڑے طمطراق سے پیش کرتے ہیں، ہم اسے پیش کیے دیتے ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿۶۹﴾ (النساء)۔

اس آیت کا صاف اور صریح ترجمہ تو یہی ہے کہ ”جو شخص اللہ اور رسول کی اطاعت کرے وہ (آخرت میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جن پر اللہ نے انعام کیا جو انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، ان کی رفاقت بہت اچھی ہے۔ مَعَ کا معنی لغت عربی میں ”ساتھ ہونا“ آتا ہے اور اس معنی کو حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا میں رفاقت کے مفہوم نے اور بھی مؤکد کر دیا ہے، لیکن مرزا صاحب کے پیروکار کہتے ہیں کہ مَعَ کا معنی ”بننا“ ہے اور آیت کا مطلب ہے: اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے لوگ نبی بن جاتے ہیں۔ وہ

کہتے ہیں کہ جب اطاعت الٰہی و رسول سے صدیق، شہید اور صالح بن سکتے ہیں تو نبی کیوں نہیں بن سکتے؟ اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ اگر مَعَ کا معنی ''بننا'' تسلیم کر لیا جائے تو اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (البقرہ: ۱۵۳) کا مطلب ہوگا: صبر کرنے والے خدا بن جاتے ہیں اور اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا (نحل: ۱۲۸) کا مطلب ہوگا کہ متقی لوگ خدا بن جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ بداہتہً باطل ہے، ثانیاً اگر اللہ اور اس کی اطاعت سے لوگ نبی بن جاتے ہیں تو کیا چودہ سو سال کے عرصہ میں اللہ اور رسول کا اطاعت گزار کوئی نہ تھا؟ یہ کیا سبب ہے کہ اس عرصہ میں صدیق، شہید اور صالحین تو آتے رہے، نبی کوئی نہیں آیا۔ ثالثاً اگر اطاعت رسول سے نبوت ملتی ہو تو ان لوگوں کو نبی ہونا چاہئے تھا، جو اطاعت میں سب سے کامل تھے، جنہوں نے نگاہ رسالت سے تربیت پائی، جن کے سامنے قرآن اترا، جن کو اپنی زندگی میں رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ (بینہ: ۸) کے ذریعے اعمال کی مقبولیت کی سند مل گئی اور جب ایسے کامل حضرات اطاعت سے نبی نہ بن سکے تو وہ شخص کیسے نبی بن سکتا ہے جس کے نہ ایمان کی ضمانت ہے نہ اعمال کی گارنٹی۔

عبارات صوفیاء

محی الدین ابن عربی اور بعض دیگر صوفیاء کی عبارات میں اولیاء اللہ کے لئے ''انبیاء الاولیاء'' کا لفظ ملتا ہے۔ مرزائی حضرات اس قسم کی عبارتوں سے یہ مطلب ثابت کرتے ہیں کہ صوفیاء کرام اولیاء اللہ کے لئے ظلی اور امتی نبوت کے قائل تھے۔ اس بات کا سب سے پہلا اور آخری جواب یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی صریح عبارات کے بعد ہمیں ان مبہم اقوال میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ اقوال ضروریات دین میں سے نہیں ہیں۔ ان میں سے جو چیز کتاب و سنت کے مطابق ہے، وہ مقبول ہے اور جو چیز کتاب و سنت کے مطابق نہیں اس کے بارے میں حسن ظن یہی ہے کہ یہ بعد کے لوگوں کا الحاق ہے، ان کی اصلی عبارت نہیں ہے۔ جس طرح زنادقہ نے رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں اپنی طرف سے گھڑ کر کلام ملا دیا اسی طرح ملاحدہ نے اکابر صوفیاء اور علماء کی عبارات میں مختلف باتیں وضع کر کے شامل کر دیں۔ چنانچہ ملا علی قاری لکھتے ہیں:

وَاَمَّا مَا حُكِيَ عَنِ ابْنِ الْعَرَبِيِّ مِنْ خِلَافِ ذَالِكَ فَحُسْنُ الظَّنِّ بِهٖ اَنَّهٗ مِنَ الْمُفْتَرَيَاتِ عَلَيْهِ الْمَنْسُوْبَاتِ اِلَيْهِ۔ (شرح فقہ اکبر ص ۱۴۴)

ہر مومن پر ولی کے اطلاق کی جو حکایت ابن عربی سے کی جاتی ہے وہ ان جملہ افتراءآت میں سے ہے جو ان کی طرف منسوب ہیں۔

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت ابن عربی کی طرف بہت سی غلط باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ اس طرح حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی طرف ایک پوری کتاب ''غنیۃ الطالبین'' کے نام سے منسوب کر دی گئی حالانکہ محققین نے تصریح کی ہے کہ وہ ان کی تصنیف نہیں ہے اور دیکھئے! امام عبدالوہاب شعرانی کی زندگی میں ان کی تصنیف ''البحر المورود'' میں تحریف کر دی گئی جس کا شکوہ انہوں نے ''المیزان الکبریٰ'' میں کیا ہے۔ پس صوفیاء کرام کی جو ایسی عبارات منقول ہیں، جو صریح قرآن و حدیث کے خلاف ہیں، ان کا اس کے سوا کوئی اور محمل نہیں کہ وہ محض جعلی، وضعی اور الحاقی عبارات ہیں، انہیں کسی طور پر بھی حجت نہیں مانا جا سکتا۔

قرآن کی آیات صریحہ سے جب ظاہر ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے تو آپ کے بعد جو شخص بھی وحی اور نبوت کا دعویٰ کرے گا، وہ باطل ہو گا۔ اس شخص کو کافر اور مرتد قرار دیا جائے گا۔ اس لئے مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ وحی اور نبوت کے بطلان کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ لیکن ہم عمومی دلائل پر اکتفاء کرنے کے بجائے بالخصوص مرزا صاحب کی نبوت پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، تاکہ متلاشیان حق پر حق تمام پہلوؤں سے آشکارا ہو جائے۔

مرزا صاحب کی نبوت

مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے پیروکار انہیں غیر تشریعی اور ظلی نبی مانتے ہیں اور لاہوری حضرات سرے سے نبی ہی نہیں مانتے، بلکہ مجدد کہتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ غیر تشریعی اور ظلی نبی کوئی نہیں ہوتا۔ وحی اور تبلیغ وحی میں نبوت اور تشریع کی حقیقت ہے اور جو شخص وحی پانے اور اس کی تبلیغ کا دعویٰ کرتا ہے وہ مستقل نبوت کا مدعی ہے اور مرزا صاحب نے جب وحی اور اس کی تبلیغ کا دعویٰ کیا تو یہ تجدید کا نہیں نبوت مستقلہ اور تشریع کا

دعویٰ تھا اور اگر قادیانی حضرات نہ مانیں تو ہم مرزا صاحب کے کلام سے یہ بات منوائے دیتے ہیں۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے، جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر و نہی بیان کئے اور اپنی امت کے لئے ایک قانون مقرر کیا وہی صاحب شریعت ہو گیا۔ میری وحی میں امر بھی ہے اور نہی بھی اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ هٰذَا لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۸﴾ صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى ﴿۱۹﴾ (الاعلیٰ: ۱۸۔۱۹)، (اربعین ج ۴ ص ۷۔ ۸۳) یعنی یہ قرآنی تعلیم تورات میں بھی موجود ہے۔

اس عبارت کے تیور بتا رہے ہیں کہ صاحب عبارت اپنے آپ کو کس پائے کا اولوالعزم نبی سمجھتا ہے، جس پر وحی اترتی ہے۔ جو صاحب شریعت ہے اور جو اپنے لئے ایک مستقل اور متوازی امت کا دعویٰ رکھتا ہے۔ آیئے! اب ہم مرزا صاحب کی نبوت کا سراپا ان کے کلام کی روشنی میں پیش کرتے ہیں جس سے ان کی نبوت کی حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو جائے گی۔

مرزا صاحب کی وحی

مرزا صاحب لکھتے ہیں:

اور یہ بالکل غیر معقول اور بے ہودہ امر ہے کہ انسان کی اصل زبان تو کوئی اور ہو اور الہام اس کو کسی اور زبان میں ہو جس کو وہ سمجھ بھی نہ سکتا ہو کیونکہ اس میں تکلیف مالا یطاق ہے۔ (چشمۂ معرفت ص ۲۰۹)

پھر یہ بھی انہوں نے ہی لکھا ہے کہ "زیادہ تر تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض الہامات مجھے ان زبانوں میں بھی ہوتے ہیں جن سے مجھے کچھ بھی واقفیت نہیں ہے، جیسے انگریزی، سنسکرت یا عبرانی وغیرہ"۔ (نزول المسیح ص ۵۷)

ایک مکتوب میں شکوہ کرتے ہیں کہ "چونکہ اس ہفتہ میں بعض کلمات انگریزی وغیرہ الہام ہوئے ہیں اور اگرچہ بعض ان میں سے ہندو لڑکے سے دریافت کئے مگر قابل اطمینان

نہیں"۔ (مکتوبات احمدیہ ج ا ص ۶۸)

کیا مرزا صاحب کی ان عبارات سے ظاہر نہیں ہو جاتا کہ جس کلام کو انہوں نے وحی کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ ان کے اپنے قول کے مطابق غیر معقول اور بے ہودہ باتوں کے سوا کچھ نہیں۔ غور فرمائیے کہ کیا نبی کے کلام کی یہی شان ہوتی ہے۔

مرزا صاحب کا کلام

مرزا صاحب نے حق اور باطل کا ایک معیار پیش کیا ہے، وہ ہے تناقض۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "جھوٹے کے کلام میں تناقض ضرور ہوتا ہے"۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ ۵ ص ۱۱۲)

اب غور کیجئے کہ مرزا صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: "پہلے زمانہ میں جو کوئی نبی ہوتا تھا وہ کسی گزشتہ نبی کی امت نہیں کہلاتا تھا گو اس کے دین کی نصرت کرتا تھا"۔

(چشمہ معرفت ضمیمہ ۹)

دوسری جگہ لکھتے ہیں: اس طرح تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت کی قوت قدسی کچھ بھی نہ تھی اور آپ حضرت موسیٰ سے بھی گرے ہوئے ہیں، بلکہ ان کے بعد ان کی امت میں سے سینکڑوں نبی آئے۔

پہلے کلام میں ہے کہ گزشتہ نبیوں میں کوئی امتی نبی نہ تھا۔ دوسرے میں ہے: سینکڑوں امتی نبی تھے اور یہ کھلا ہوا تناقض ہے اور مرزا صاحب کی تحریر کے مطابق یہ صرف جھوٹے شخص کا ہی حصہ ہے۔ ایک اور تناقض ملاحظہ فرمائیے۔ مرزا صاحب لکھتے ہیں:

اگر خدا تعالیٰ سے غیب کی خبریں پانے والا نبی کا نام نہیں رکھتا تو پھر بتلاؤ کس نام سے اس کو پکارا جائے۔ اگر اس کا نام محدث رکھنا چاہتے ہو تو میں کہتا ہوں کہ تحدیث کا معنی کسی لغت کی کتاب میں اظہار غیب نہیں ہے۔ مگر نبوت کا معنی اظہار غیب ہے۔

(ایک غلطی کا ازالہ ص ۷)(1)

اس عبارت کا مفاد یہ ہے کہ محدث پر اظہار غیب نہیں ہوتا۔ اب دوسرا قول ملاحظہ فرمائیے:

1۔ اشتہار مرزا غلام احمد قادیانی بجواب سوال مندرجہ اخبار الحکم قادیان مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء

''اور محدث بھی ایک معنی سے نبی ہی ہوتا ہے، گو اس کے لئے نبوت تامہ نہیں۔ مگر تاہم جزوی طور پر وہ ایک نبی ہی ہے۔ کیونکہ وہ خدا تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا شرف رکھتا ہے اور امور غیبیہ اس پر ظاہر کئے جاتے ہیں''۔ (توضیح مرام ص ۱۸)

مرزا صاحب کا کلام متناقض ہے اور خود ان کی تصریح کے مطابق تناقض جھوٹے کلام میں ہوتا ہے۔ پس سوچنا چاہئے کہ ایک جھوٹا شخص دعویٰ نبوت میں کس طرح سچا ہو سکتا ہے۔

کذب صریح

انبیاء علیہم السلام صادق اور صدیق ہوتے ہیں۔ نبوت سے قبل اور بعد ان کے کلام میں کذب راہ نہیں پا سکتا۔ قرآن کریم میں ان کے صدق کو متعدد آیات سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اختصار کے پیش نظر مرزا صاحب کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے، لکھتے ہیں:

''بخاری'' میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لئے آواز آئے گی کہ ''ھذا خلیفۃ اللہ المھدی'' اب سوچو کہ یہ حدیث کس پائے اور مرتبہ کی ہے جو اس کتاب میں درج ہے۔ جو اصح الکتب بعد از کتاب اللہ ہے۔ (شہادت القرآن ص ۴۱)

حالانکہ بخاری میں ایسی کوئی حدیث نہیں۔

مرزا صاحب کی جرأت اور حوصلہ

نبی کی صفت یہ ہوتی ہے کہ پیغام حق سنانے میں وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود جیسے جابر بادشاہ کو للکارنا، حضرت موسیٰ کا فرعون کے دربار میں گرجتے ہوئے کلمۂ حق سنانا، اس حقیقت کے واضح شواہد ہیں۔ اس کے خلاف مرزا صاحب کی جرأت اور حوصلہ ملاحظہ فرمائیے۔

ڈاکٹر مارٹن کلارک نے اگست ۱۸۹۷ھ میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ وہ ایسے الہامات شائع کرتے ہیں جن سے لوگوں کی عزت پر حرف آتا ہے اور ان کی تذلیل ہوتی ہے۔ چنانچہ گورداس پور کے ایک عیسائی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انہیں حکم دیا کہ وہ ایسے الہامات شائع نہ کریں، لہٰذا انہوں نے عدالت کے روبرو اقرار کیا کہ میں مرزا غلام احمد قادیانی بحضور خداوند تعالیٰ اقرار صالح کرتا

ہوں کہ آئندہ میں ایسی پیشین گوئی شائع کرنے سے پرہیز کروں گا جس کے یہ معنی ہوں یا ایسے معنی خیال کئے جا سکیں کہ کسی شخص کو (یعنی مسلمان ہو خواہ ہندو ہو یا عیسائی وغیرہ) ذلت پہنچے گی یا وہ مورد عتاب الٰہی ہوگا۔ (تریاق القلوب ص ۱۳۰)

غور فرمایئے! کیا نبی ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ ایک کافر حاکم کے خوف سے اپنے الہام اور وحی کا دروازہ بند کرلے۔ یاد رکھیے! نبی کی شان ہے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (الحجر: ۹۴) یعنی جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، اس کا پوری قوت سے اعلان کیجئے۔ جو شخص کفار کے خوف سے اپنی مزعوم وحی کو چھپاتا پھرے وہ نبی نہیں ہوسکتا۔

معاونت کفار

کفار کی معاونت کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے، اگرچہ نبی کا کفار کی معاونت کرنا امر محال ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے بر سبیل فرض جگہ جگہ فرمایا ہے کہ اگر نبی نے کفار کی موافقت یا معاونت کی تو اس کا شمار بھی ظالموں میں سے ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (البقرہ) لیکن مرزا صاحب نے انگریز کی تائید اور حمایت میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ خود ان کے قول کے مطابق ان سے پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''انگریزی سلطنت تمہارے لئے ایک رحمت ہے، ایک برکت اور خدا کی طرف سے تمہاری وہ سپر ہے''۔ (تبلیغ رسالت ج ۱۰ ص ۱۲۳، ازالہ اوہام ص ۵۰۹)

نیز لکھتے ہیں:

''میں سولہ برس سے برابر اپنی تالیفات میں اس بات پر زور دے رہا ہوں کہ مسلمانان ہند پر اطاعت گورنمنٹ فرض ہے اور جہاد حرام ہے''۔

(اشتہار مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۴ء)

یہ عبارات کسی تبصرہ کی محتاج نہیں ہیں۔ جس انداز سے یہ عبارات میں کفار کی چاپلوسی اور خوشامد کی گئی ہے نبی کا تو خیر ذکر ہی کیا کسی باغیرت مسلمان سے بھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

مرزا صاحب کی پیشین گوئیاں

انبیاء علیہم السلام نے جس قدر اپنی قوم کو پیشین گوئیاں بیان کیں وہ سب پوری ہوئیں اور دنیا پر ان کی نبوت کا صدق ظاہر ہو گیا۔ مرزا صاحب نے بھی پیشگوئی کے صدق کو نبوت کی دلیل مانا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

میں بار بار کہتا ہوں کہ نفس پیشگوئی داماد احمد بیگ (سلطان محمد کی موت) کی تقدیر مبرم ہے۔ اس کا انتظار کرو اور اگر میں جھوٹا ہوں تو یہ پیش گوئی پوری نہیں ہوگی اور میری موت آ جائے گی۔ (انجام آتھم ص ۳۱)

مرزا صاحب نے محمدی بیگم سے نکاح کی پیشگوئی کی، لیکن اس کا نکاح مرزا سلطان محمد سے ہو گیا۔ پھر مرزا صاحب نے پیشگوئی کی کہ مرزا سلطان محمد شادی کے اڑھائی سال بعد مر جائے گا اور محمدی بیگم ان کے نکاح میں آ جائے گی۔ لیکن مرزا صاحب فوت ہو گئے اور سلطان محمد ان کی موت کے بعد دیر تک بفضلہ تعالیٰ زندہ رہا۔

اسی طرح انہوں نے عیسائی پادری آتھم کی موت کے بارے میں پیش گوئی کی کہ وہ ۵ ستمبر ۱۸۹۴ء کے دن مر جائے گا۔ لیکن وہ زندہ رہا اور عیسائیوں نے بڑی شان و شوکت سے اس کا جلوس نکالا۔ چنانچہ مرزا صاحب کے ایک مرید نے مضمون میں لکھا:

میں نے امرتسر جا کر عبداللہ آتھم کو خود دیکھا، عیسائی اسے گاڑی میں بٹھائے ہوئے بڑی دھوم دھام سے بازاروں میں لئے پھرتے تھے، لیکن اسے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ واقعہ میں یہ مر گیا ہے اور یہ صرف اس کا جنازہ ہے جسے لئے پھرتے ہیں، آج نہیں تو کل مر جائے گا۔ (مضمون رحیم بخش قادیانی مندرجہ الحکم ج ۲۵ ص ۳۴، مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۲۳ء)

جو پیش گوئیاں پوری نہ ہو سکیں، ان کا سلسلہ بہت طویل ہے۔ اب ہم صرف ایک پیش گوئی نقل کرتے ہیں جو مرزا صاحب نے اپنی موت کے بارے میں کی ہے۔

لکھتے ہیں:

پس خدا مارا ہشتاد سال عمر داد یا شاید ازیں زیادہ۔ (مواہب الرحمان ص ۲۱)	اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی سال کی عمر دی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

اور پھر آخر میں اردو میں فرمایا کہ میں تیری عمر بڑھادوں گا، یعنی دشمن جو کہتا ہے کہ صرف جولائی ۱۹۰۷ء میں ۱۴ مہینے تک تیری عمر کے دن رہ گئے ہیں یا ایسا ہی جو دوسرے دشمن پیشگوئی کرتے ہیں ان سب کو جھوٹا کروں گا اور تیری عمر کو بڑھادوں گا۔

(اشتہار مؤلفہ مرزا صاحب بنام تبصرہ ۱۹۰۷ء)

پہلی بشارت کے بموجب مرزا صاحب کی عمر ۸۰ سال سے زیادہ ہونی چاہئے اور دوسری کے مطابق مرزا صاحب کو ستمبر ۱۹۰۸ء کے بعد تک زندہ رہنا چاہیے تھا، لیکن دونوں پیشگوئیاں غلط ثابت ہوئیں اور مرزا صاحب مئی ۱۹۰۸ء میں ۶۸ سال زندگی گزار کر راہی ملک عدم ہوئے۔

جن پیشگوئیوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک پیشین گوئی مرزا صاحب نے بڑے طمطراق سے پیش کی، لیکن وہ پیشگوئی پوری نہ ہوئی اور مرزا صاحب خود اپنے قول کے مطابق جھوٹے قرار پائے۔ ہم قادیانی حضرات سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر آپ واقعی مرزا صاحب کو مانتے ہیں تو خدارا سوچئے اور سمجھئے اور مان لیجئے کہ ان کا دعویٰ نبوت جھوٹا تھا، انہوں نے جن پیشگوئیوں کے پورے نہ ہونے پر اپنے جھوٹ کو معلق کیا تھا، وہ پوری نہ ہوئیں اور مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت کا جھوٹ اور بطلان آشکارا ہو گیا۔

مرزا صاحب کی موت

نبی کی موت قابل رشک ہوتی ہے، جس طرح نبی کی زندگی رحمت ہوتی ہے اسی طرح اس کی موت بھی رحمت ہوتی ہے۔ لیکن مرزا صاحب کی موت بڑی عبرتناک تھی اور مرزا صاحب کی اپنی تعبیر کے مطابق ان کی موت خدا کی سزا اور اس کے عذاب کی ایک بھیانک تصویر تھی۔

مرزا صاحب نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری کے خلاف ایک اشتہار شائع کیا اور اس میں انہیں مخاطب کر کے لکھا: اگر میں ایسا کذاب اور مفتری ہوں جیسا کہ اکثر اوقات آپ اپنے ہر ایک پرچہ میں مجھے یاد کرتے ہیں، تو میں آپ کی زندگی

میں ہی ہلاک ہو جاؤں گا۔ اگر وہ سزا جو انسان کے ہاتھوں نہیں بلکہ محض خدا کے ہاتھوں سے ہے، جیسے طاعون، ہیضہ وغیرہ مہلک بیماریاں آپ پر میری زندگی میں وارد نہ ہو سکیں تو میں خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں۔ (اشتہار بنام تبصرہ ۱۹۰۷ء ملخصاً)

اسی اشتہار میں مرزا صاحب نے ہیضہ کو خدا کی سزا قرار دیا ہے۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری مرزا کی وفات کے بعد دیر تک (تقریباً چالیس سال) بخیر و عافیت زندہ رہے اور مرزا صاحب خود اسی ہیضہ کی بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ چنانچہ مرزا صاحب کے خسر میر ناصر صاحب قادیانی مرزا صاحب کی سوانح میں لکھتے ہیں:

جب آپ کو بہت تکلیف ہوئی تو مجھے جگایا گیا تھا، جب میں حضرت مرزا صاحب کے پاس پہنچا تو آپ کا حال دیکھا تو آپ نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: میر صاحب! مجھے وبائی ہیضہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے کوئی ایسی صاف بات میرے خیال میں نہیں فرمائی، یہاں تک کہ دوسرے روز دس بجے مرزا کا انتقال ہو گیا۔ (حیات ناصر ص ۱۴)

غور فرمایئے! مرزا صاحب نے اپنے اشتہاری اقرار میں تین باتیں کہیں تھیں:

(۱) ہیضہ میں مرنا خدا کی سزا ہے۔

(۲) اگر مرزا صاحب مولانا ثناء اللہ کی زندگی میں فوت ہو گئے تو وہ مفتری اور کذاب ہیں۔

(۳) اگر مولوی ثناء اللہ پر ان کی زندگی میں ہیضہ نہ آیا تو وہ خدا کی طرف سے نہیں۔

لیکن مرزا صاسب ہیضہ میں مبتلا ہو کر مولوی ثناء اللہ صاحب کی زندگی میں فوت ہو گئے اور مولانا ثناء اللہ پر ان کی زندگی میں ہیضہ نہ آیا۔ اب ہم قادیانی حضرات سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ مرزا صاحب کو سچا سمجھتے ہیں یا جھوٹا، اگر جھوٹا سمجھتے ہیں تو جھوٹے شخص کی نبوت سے دستبردار ہو جائیں اور اگر سچا سمجھتے ہیں تو ان کی عمر کی آخری بات کو تو مان لیجئے کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ کیونکہ مولانا ثناء اللہ پر ان کی زندگی میں ہیضہ نہیں آیا اور یہ کہ وہ کذاب اور مفتری ہیں کیونکہ وہ خود مولانا ثناء اللہ کی زندگی میں فوت ہو گئے اور وہ یہ کہ وہ بصورت ہیضہ خدا کی سزا میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے۔

قادیانیوں کو دعوت اسلام

کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے جس قدر باتوں کو ماننا ضروری ہے، وہ سب امور قرآن کریم نے بیان کر دیئے ہیں۔ اگر حضور ﷺ کے بعد کسی اور نبی کی بعثت بھی ہوتی تو قرآن میں اس کا بھی ذکر ہوتا اور جب قرآن کریم میں حضور کے بعد کسی نبی کی بعثت کا ذکر نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوسکتا۔ آخر جن چیزوں کے ماننے سے صحابہ کرام اور خیر القرون کے اخیار مومن ہو گئے۔ ان چیزوں کا ماننا آج کیسے ناکافی ہو گیا۔ کیا ان کا اسلام اور تھا اور اب کوئی اور اسلام ہے۔ اگر ہم قرآن کو ناقص اور اسلام کو ناتمام دین نہیں مانتے تو ہمیں ماننا ہوگا کہ قرآن کریم نے جن چیزوں پر ایمان لانے کا حکم دیا ہے ان کے سوا کسی اور پر ایمان لانا جائز نہیں ہے اور مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی نبوت چونکہ قرآن کا مامور نہیں ہے۔ اس لئے ان کو نبی ماننا قرآن، ایمان اور اسلام سب کے مخالف ہے۔

یاد رکھیے! نبی غیر نبی سے افضل ہوتا ہے۔ اگر مرزا غلام احمد قادیانی نبی ہوتے تو صحابہ کرام سے افضل ہوتے، کیونکہ وہ نبی نہ تھے اور قرآن بتلاتا ہے کہ صحابہ کرام کے بعد آنے والے لوگ ان سے افضل تو کجا ان کے برابر بھی نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ فرمایا: لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً (الحدید:۱۰) "تم میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے صدقہ دیا اور قتال کیا تم لوگ ان کے برابر نہیں ہوسکتے، ان کے درجات بہت بلند ہیں"۔

عموماً نبی کی اولاد نبی ہوتی ہے، اگر حضور ﷺ کے صاحبزادگان زندہ رہتے تو وہ بھی نبی ہوتے۔ لیکن چونکہ آپ پر نبوت کو ختم کرنا تھا اس لئے انہیں زندگی نہیں دی گئی اور بچپن میں فوت کر دیا۔ حضور ﷺ کو ان کی وفات پر صدمہ ہوا۔ کفار نے آپ کو لاولد اور ابتر کے طعنے دیئے اور اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا کہ یہ سب کچھ برداشت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ختم نبوت میں رخنہ گوارا نہیں ہوسکتا۔

حضور ﷺ کی اولاد اور آپ سے براہ راست فیض لینے والے صحابہ جب نبی نہیں

ہو سکتے تو وہ شخص کیسے نبی ہو سکتا ہے جو آپ سے چودہ سو سال دور کی نسبت رکھتا ہے، جس کے نہ ایمان کی ضمانت ہے نہ اخلاق کی گارنٹی۔ اگر قادیانی حضرات نے واقعی ایک نئی اور الگ ملت کی طرح نہیں ڈالی ہے تو انہیں چاہیے کہ وہ اسی دین اور ملت کی طرف لوٹ جائیں جسے حضور ﷺ لے کر آئے ہیں۔ جس دین میں حضور ﷺ کے بعد اور کسی نبی کی بعثت کا تصور نہیں ہے۔ ایک ایسے شخص کی خاطر جس کا کلام متناقض اور متضاد، جس کی ہر پیش گوئی غلط اور جھوٹی، جس کی زندگی کفار کی چاپلوسی، بزدلی اور جھوٹ کا مرقع ہے اور جس کی موت عذاب الہٰی کی بھیانک صورت ہے اور اس نبی کو نہ چھوڑیں جس کی باتیں جوامع الکلم اور پیش گوئی حق و صداقت، جس کی زندگی افتخار رسل اور جس کا وصال اللہ کے اشتیاق سے عبارت ہے۔

ہم انتہائی درد کے ساتھ قادیانی حضرات سے گزارش کرتے ہیں کہ ایمان ایک قیمتی دولت ہے۔ اس دولت کو اس شخص پر لٹا کر ضائع نہ کریں جس کی نبوت تو کجا ایمان بھی ثابت نہیں ہے۔ آؤ! جعلی اور وضعی نبوت کو چھوڑ کر صرف اس کی نبوت پر قناعت کر لو جس کی نبوت ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا، دلائل سے مبرہن اور آئندہ بعثت کے ختم ہونے کی علامت ہے۔ وہ نبی جو کوثر کا مالک، لواء حمد کا حامل اور انبیاء کا خاتم ہے اسے چھوڑ کر کسی کذاب، مفتری اور کفر رسیدہ شخص کو نبی مان لینا ہرگز نجات کا راستہ نہیں ہے۔ پس اے راہ نوردان شوق! اگر تم واقعی حق کی تلاش رکھتے ہو تو آؤ اور قادیان کو چھوڑ کر طیبہ کی طرف لوٹ آؤ۔



عصمتِ مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم)

رسول اور کتاب رسول پر اہل کتاب یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں تمام انبیاء کے گناہوں کا ذکر ہے، خصوصاً محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم ملتا ہے کہ استغفر لذنبك یعنی اپنے گناہوں کی معافی مانگ، برخلاف اس کے مسیح کی کوئی خطاء ولغزش مذکور ہے نہ اسے استغفار کرنے کی ہدایت ہے، بلکہ تمام انبیاء سے بڑھ کر اس کی شان میں وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ مرقوم ہے، پس مسیح بہرصورت محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہے۔

غلامانِ رسول کی گزارش

• اس وقت دنیا میں جس قدر آسمانی کتابیں موجود ہیں، ان میں صرف قرآن کریم کا ہی یہ امتیاز ہے کہ اس نے تمام انبیاء کی سیرت کے تقدس کا تحفظ کیا ہے اور انہیں ایک صالح اور برگزیدہ انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اگر آج اسرائیلی یا عیسائی حضرات خضر، موسیٰ یا عیسیٰ علیہم السلام کی حیات صالحہ کا مطالعہ کرنا چاہیں تو انہیں بھی اسرائیلی صحائف کو چھوڑ کر آیات قرآنی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ آیئے! اب ہم آپ کو بتلائیں کہ "کتاب مقدس" نے انبیاء کو دنیا کے سامنے کس حیثیت سے پیش کیا اور قرآن نے کس اعتبار سے۔

کتاب مقدس اور کتاب مجید کا تقابل

حضرت نوح "کتاب مقدس" کی نظر میں: اور نوح کاشتکاری کرنے لگا، اس نے انگور کا ایک باغ لگایا اور اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرہ پر برہنہ ہو گیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو باہر آ کر خبر دی۔ (پیدائش باب ۹ آیت: ۲۰ تا ۲۲)

قرآن کی نظر میں: سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ (الصٰفّٰت) سلام ہو نوح پر تمام جہانوں میں، بلا ریب ہم نیکوکاروں کو یونہی جزاء دیتے ہیں اور بلاشبہ وہ ہمارے اعلیٰ درجہ کے کامل

الایمان بندوں میں سے ہیں"۔

حضرت لوط "کتاب مقدس" کی نظر میں: اور لوط صغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں۔ کیونکہ اسے صغر میں بستے ڈر لگا اور وہ، اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مطابق ہمارے پاس آئے، آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں .... (اس سے آگے بڑی شرمناک عبارت ہے جسے شامل کرنے کا اس عاجز میں حوصلہ نہیں۔ سعیدی)۔ (پیدائش باب ۱۹ آیت: ۳۰ تا ۳۶)

قرآن کی نظر میں:

وَ لُوْطًا اٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا وَّ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓىٕثَ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ ۙ وَ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۠ (الانبیاء)	"اور ہم نے لوط کو حکم اور علم عطا کیا اور انہیں اس بستی سے نجات دی جس میں رہنے والے حرام کاری کرتے تھے۔ بے شک اس بستی کے لوگ بدکار فاسق تھے اور ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں داخل کر لیا اور لاریب وہ صالحین میں سے تھے"۔

حضرت سلیمان "کتاب مقدس" کی نظر میں: اور سلیمان نے خداوند کے آگے بدی کی اور اس نے خداوند کی پوری پیروی نہ کی۔ (سلاطین باب ۱۱، آیت ۶)

قرآن کی نظر میں:

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَیْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ ؕ (ص) "اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، کیا ہی اچھا بندہ تھا، وہ خدا کی طرف بہت زیادہ رجوع کرنے والا تھا"۔

حضرت عیسیٰ "کتاب مقدس" کی نظر میں: پھر کسی نے اس سے سوال کیا کہ اے نیک استاد! میں کیا کروں تاکہ ہمیشہ کی زندگی کا وارث بنوں؟ یسوع نے کہا: تو مجھے کیوں نیک کہتا ہے، کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا۔ (لوقا باب ۱۸، آیت: ۱۸۔۱۹)

مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا،

کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔ (گلتیوں باب ۳، آیت: ۱۳)

قرآن کی نظر میں:

یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۙ وَیُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (آل عمران)

''اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے، وہ دنیا اور آخرت میں وجاہت والا اور مقربین میں سے ہے۔ وہ لوگوں سے پنگھوڑے اور ادھیڑ عمر میں کلام کرے گا اور وہ صالحین میں سے ہوں گے''۔

تمام نبیوں کی حیثیت ''کتاب مقدس کی نظر میں: نبی اور کاہن دونوں ناپاک ہیں۔ (یرمیاہ باب ۲۳، آیت: ۱۱)

قرآن کی نظر میں:

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَیْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَیْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۙ وَزَكَرِیَّا وَیَحْیٰى وَعِیْسٰى وَاِلْیَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۙ وَاِسْمٰعِیْلَ وَالْیَسَعَ وَیُوْنُسَ وَلُوْطًا ؕ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۙ وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (الانعام)

''اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عطا کئے اور سب کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی اور ان کی اولاد میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو اور نیکوکاروں کو ہم یونہی جزاء دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس یہ سب صالح ہیں اور اسماعیل اور یسع اور یونس اور لوط۔ ہم نے ہر ایک کو اپنے وقت میں تمام جہانوں پر فضیلت دی اور ان کے آباء اور اخوان اور اولاد میں سے بعض کو ہم نے پسند کرلیا اور انہیں صراط مستقیم پر چلایا''۔

کتاب مقدس اور قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات کے تقابل سے ظاہر ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام کی عظمت و ناموس کا ضامن صرف قرآن کریم ہے، ورنہ "کتاب مقدس" کے مجموعہ نے آدم سے لے کر عیسیٰ تک کسی نبی کی عصمت کو مجروح کیے بغیر نہیں چھوڑا۔ "کتاب مقدس" نے تمام انبیاء کو بالعموم ناپاک قرار دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بالخصوص لعنتی ٹھہرایا۔ اس کے برعکس قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام کو بالعموم ہدایت اور پاکیزگی کا سبب اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجود کو بالخصوص رحمت قرار دیا۔ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا (مریم:۲۱)

اس تفصیل کی روشنی میں یہ اعتراض ساقط ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم نے تمام نبیوں کو گناہ گار ٹھہرایا ہے۔ رہا یہ امر کہ "قرآن مجید" میں بعض انبیاء و رسول کی زلات کا ذکر ہے، ان کے لئے "ذنوب" کا لفظ استعمال ہوا اور اس کا استغفار ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس کو سمجھنے کے لئے عصمت کے مفہوم پر غور کرنا ضروری ہے۔

عصمت انبیاء

عام لوگوں کے خیال میں عصمت کا معنی ہے: انبیاء سے گناہ کے صدور کا محال ہونا، حالانکہ یہ قطعاً غلط اور باطل ہے، اس لئے کہ انبیاء کرام بھی امتثال امر اور اجتناب مناہی کے مکلف ہوتے ہیں۔ اگر ان سے گناہ کا صدور ممکن نہ ہو اور وہ معصیت پر قادر نہ ہوں تو انہیں معاصی سے روکنا محض عبث ہوگا اور نہ ان کے تقویٰ و طہارت میں کوئی کمال اور خوبی ہوگی۔ حق یہ ہے کہ باوجود گناہ پر قادر ہونے کے گناہ سے اجتناب کے ملکہ اور مہارت کو عصمت کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ تفتازانی نے "شرح عقائد" میں اور دیگر محققین نے اپنی تصانیف میں عصمت کی یہی تعریف کی ہے۔ اس حقیقت کو ایک واضح مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ ہم قدرت کے باوجود نجاست اور غلاظت نہیں کھاتے اور نہ کبھی اسے کھانے کا خیال ہمارے دل میں آتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نجاست کا نجس ہونا طبعی طور پر ہم پر منکشف ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اپنی ماں بہن اور دیگر محارم کے بارے میں نفسانی خواہش نہیں رکھتا کیونکہ ان کی حرمت فطری طور پر اس کے دل میں جاگزیں ہے۔ حالانکہ وہ ان سے التذاذ پر قادر ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی نگاہ چونکہ تمام اشیاء کی حقیقت پر ہوتی ہے۔ اس لئے تمام معاصی اور مناہی ان کے نزدیک ایسے ہی نجس اور ممنوع ہوتے ہیں جیسے ہمارے لئے مکروہ غلاظتیں اور محارم کے رشتے۔ ہم مکروہ طبعی اور مکروہ شرعی میں فرق کرتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کے نزدیک یہ فرق نہیں ہوتا۔ ان کی فطرت سلیم اور طبیعت صحیح ہوتی ہے۔ جس چیز سے خدا نے روک دیا وہ چیز ان کے نزدیک ایسی ہی ناپسند ہوتی ہے جیسے کوئی مکروہ طبعی ہو اور جس کام کا خدا نے حکم دیا وہ ان کے لئے ایسا ہی پسندیدہ ہے جیسے کوئی مرغوب طبعی ہو۔ ان کا مزاج خدا کا منشاء اور ان کی فطرت خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ پر قدرت کے باوصف گناہ کا کرنا تو کجا ان کے دل میں کبھی گناہ کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا۔

یوں تو اولیاء کرام کو بھی حسب مراتب گناہوں سے بچنے کی مہارت ہوتی ہے جسے اصطلاح شرع میں محفوظ ہونے سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ان کی اس حفاظت پر کوئی دلیل قطعی یقینی قائم نہیں ہے۔ اس باب میں جو کچھ وارد ہے وہ سب ظن و تخمین ہے، اس کے برعکس عصمت انبیاء پر عقل و نقل سے متعدد قطعی اور یقینی دلائل قائم ہیں۔ اختصار کے پیش نظر صرف ایک دلیل ملاحظہ فرمائیں۔

فاسق اور گناہ گار کی شہادت مردود ہوتی ہے۔ اگر انبیاء کرام میں فسق اور گناہ ہوتا تو ان کی شہادت بھی مردود ہو جاتی۔ حالانکہ ان کی شہادت کو قبول کرنا فرض ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت کے دعویٰ پر انبیاء کو شاہد بنا کر بھیجا، اگر ان کی عصمت میں خلل ہو تو اس سے ان کی شہادت مخدوش ہو گی اور شہادت کے ضعف کا اثر اس دعویٰ پر پڑے گا جس پر انہیں شاہد بنا کر بھیجا جاتا ہے۔

زلات انبیاء

جب یہ بات صاف ہو گئی کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں اور ان کے قلوب پر خطرہ معصیت وارد نہیں ہوتا تو ظاہر ہو گیا کہ قرآن نے جن انبیاء کی بعض زلات کا ذکر کیا ہے، ان کی حقیقت گناہ نہیں ہے۔ مثلاً آدم علیہ السلام کا شجر ممنوعہ کھالینا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک قبطی کو گھونسہ مار کر ہلاک کر دینا وغیرہ۔ یہ امور یا از قبیل نسیان ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے

حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿طٰہٰ: ۱۱۵﴾ ''آدم علیہ السلام بھول گئے اور ہم نے ان کے دل میں معصیت کا کوئی ارادہ نہ پایا'' یا یہ چیزیں اجتہادی خطاء کے قبیل سے ہیں، جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَیْهِ (الانبیاء: ۸۷) حضرت یونس قوم پر ناراض ہو کر اللہ کے اذن خاص کے بغیر چلے گئے اور یہ خیال فرمایا کہ اللہ اس پر مواخذہ نہ کرے گا، حالانکہ اللہ نے مواخذہ فرمایا۔ پس یہ ان کی اجتہادی خطاء تھی اور انبیاء علیہم السلام اگرچہ گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، لیکن ان کے حق میں نسیان اور اجتہادی خطاء یہ دونوں امر جائز ہیں اور ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ گناہ کی حقیقت ہے: قصد اور ارادہ سے کسی امر ممنوع کا ارتکاب کرنا۔ بھولے سے کسی امر ممنوع کو کر لیا جائے یا نیک نیتی سے کسی امر میں ارادہ صحیح کام کرنے کا ہو، لیکن اس کام میں حقیقت کو نہ پا سکے اور خطاء لاحق ہو جائے تو یہ گناہ نہیں ہوتا۔ بلکہ پہلی شکل میں انسان معذور اور دوسری میں ماجور ہوتا ہے اور انبیاء علیہم السلام نے جو ممنوع کام نسیان سے کئے ان میں وہ معذور ہیں اور جو اجتہادی خطاء سے کئے ان میں وہ اجر و ثواب کے مستحق ہیں اور ان کاموں پر قرآن کریم کا عصیان، غوایت اور ذنب کا اطلاق کرنا محض مجاز اور استعارہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ان امور پر استغفار کرنا ان کی غایت درجہ کی تواضع اور عظیم انکسار ہے اور اللہ تعالیٰ کا ان امور پر عتاب فرمانا انبیاء کی رفعت شان کے سبب سے ہے۔

عصمت مصطفیٰ

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ چونکہ تمام انبیاء سے بلند و بالا ہے۔ اس لئے آپ کے حق میں عصمت کا تحقق زیادہ اتم اور احکم ہے۔ اس لئے جمہور علماء اسلام کے نزدیک حضور کے لئے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ، سہواً یا عمداً ثابت نہیں۔ نہ نبوت سے پہلے نہ نبوت کے بعد، انبیاء سابقین کے حق میں اجتہادی خطاء جائز اور ثابت تھی، لیکن حضور کے حق میں اجتہادی خطاء بھی جائز نہیں ہے۔ چنانچہ قاضی عیاض اور امام نووی نے فرمایا کہ محققین کا مذہب یہی ہے کہ آپ کی فکر اور اجتہاد، آپ کے قول اور عمل سب حق و صواب ہیں، خطاء کی

سرمو گنجائش نہیں اور اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ (الحج) اور اِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (شوریٰ) اس کے صدق پر شاہد ہیں۔ آپ نے نصوص پر بھی عمل کیا اور اپنے اجتہاد پر بھی۔ لیکن یہ سب منشاء الٰہی کے موافق اور وحی کے مطابق تھا اور اسیران بدر کے بارے میں وحی کی تنبیہ ان بعض لوگوں کے لیے تھی جنہوں نے متاع دنیوی کی طمع میں قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینے کی رائے دی تھی اور یہ ان کی بلاشبہ اجتہادی خطاء تھی۔ اور ابوبکر صدیق نے قیدیوں کو چھوڑنے کی رائے اس لیے دی تھی تا کہ یہ لوگ اس حسن سلوک سے متاثر ہو کر اسلام لے آئیں۔ چنانچہ اسی وجہ سے حضور نے اس رائے کو پسند کر لیا اور یہ عین صواب تھا۔ پھر وحی نے بھی اس کی تائید کر دی اور فرمایا: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَ اللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (انفال:٦٧) "تم مال دنیوی کا ارادہ کرتے ہو اور خدا آخرت کا ارادہ فرماتا ہے"۔ طمع دنیا سے فدیہ کی رائے دینے والوں کی خطاء پر تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا سے تنبیہ کی اور حضور کی پسند کو اپنی پسند ٹھہرا کر اور وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ فرما کر حضور کی رائے کی تصویب کر دی۔ اس معاملہ میں حضرت عمر کی رائے ان لوگوں کے مقابلہ میں صحیح تھی جنہوں نے طمع مال کی وجہ سے فدیہ کی رائے دی۔ مگر صحیح ترین بات وہی تھی جس کو حضور نے پسند فرما لیا۔ نیز عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ (توبہ:٤٣) اور عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى (عبس) اور اس قسم کی دوسری آیات میں جو التفات، محبت اور رمز لطیف ہے، وہ اہل اسرار پر مخفی نہیں ہے۔

استغفار خاتم النبیین

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو استغفار کا امر فرمایا اور ارشاد ہوا: وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمد:١٩) جناب اشرف علی تھانوی اس کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: "اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے"۔ ایسے ہی تراجم سے عیسائیوں نے دھوکا کھایا کہ حضور (معاذ اللہ) خطاء کار یا گناہ گار تھے۔ علمائے حق نے اس آیت کی بے شمار توجیہات کی ہیں۔ بعض از اں یہ ہیں:

(ا) ابن بطال فرماتے ہیں کہ انسان فطرتاً حق عبادات ادا کرنے سے قاصر ہے، اگر وہ زندگی کا ہر سانس عبادت میں گزار دے پھر بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق نہیں ادا کر

سکتا۔ پس آپ کو جس استغفار کا حکم دیا ہے، وہ اس قصور فطری کی بناء پر ہے نہ اس وجہ سے کہ (معاذ اللہ) آپ نے کوئی گناہ کیا تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ کی نعمتیں لامحدود ہیں وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (نحل: ۱۸) اور انسان کا تشکر محدود ہے اور ظاہر ہے کہ متناہی تشکر غیر متناہی نعمتوں کا متکفل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انسان فطرۃً عاجز ہے کہ وہ نعمتوں کے حساب سے شکر ادا کر سکے تو اس عجز فطری کی بناء پر حضور ﷺ کو استغفار کا حکم دیا گیا، نہ کسی معصیت کی وجہ سے۔

(۳) ملا علی قاری رحمہ الباری فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ فرائض رسالت، مصالح امت اور تبلیغی امور میں اشتغال کی وجہ سے بعض اوقات مشاہدہ ذات وصفات میں منہمک نہ رہتے۔ پس استغفار کا حکم اس عدم انہماک کی طرف راجع ہے، نہ معصیت کی طرف۔

(۴) خور و نوش، نشست و برخاست اور آرام و استراحت وغیرہ امور مباحہ میں مشغول ہونے کی وجہ سے سرکار دو عالم ﷺ بعض مرتبہ مطالعۂ ذات میں مستغرق نہ رہتے تو اس عدم استغراق کی وجہ سے استغفار کا حکم ہوا۔

(۵) حضور ﷺ کو امور طبعیہ بھی لاحق ہوتے تھے۔ مثلاً بول و براز اور جنابت وغیرہ اور ان احوال میں انسان مشاہدہ ذات وصفات سے قاصر ہے، تو اس قصور کی بناء پر استغفار کا حکم ہوا، اگرچہ یہ قصور فی نفسہٖ معصیت نہیں ہے۔

(۶) حضور ﷺ اکثر زبان سے بھی ذکر فرماتے تھے۔ مگر بعض اوقات عوارض بشریہ مثلاً نیند یا جنابت وغیرہ لاحق ہونے کی وجہ سے یہ ذکر نہ کر سکتے، تو اس پر استغفار کا حکم ہوا۔

(۷) حضور ﷺ انبیاء سابقین کی صفات کے جامع ہیں اور انہوں نے استغفار کیا ہے تو آپ کو بھی استغفار کا امر کیا تاکہ آپ میں بھی اس صفت کا ظہور ہو۔

(۸) علامہ زرقانی فرماتے ہیں کہ حضور کو تعلیم اور تشریع کے لئے استغفار کا حکم کیا تاکہ امت کو طریقۂ استغفار معلوم ہو جائے۔

(۹) جلال الدین محلی لکھتے ہیں کہ استغفار کا حکم اس لئے کیا تاکہ حضور کے استغفار کرنے سے یہ سنت ہو جائے اور امت کو شرف بالاقتداء حاصل ہو۔

(۱۰) شیخ ابوالسعود لکھتے ہیں: تواضع اور انکسار کے لئے حضور کو استغفار کا حکم دیا۔

(۱۱) امام غزالی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ہر آن میں آن سابق سے بلند ہوتا تھا اور حضور ہر آن سابق کو آن لاحق کے مقابلے میں ذنب خیال فرماتے، اگرچہ وہ فی نفسہ ذنب نہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے استغفار کا حکم ہوا۔

(۱۲) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عصمت کے باوصف اظہار عبودیت کے لئے استغفار کا امر کیا۔ جیسے باوجود کعبہ سے افضل ہونے کے آپ کو اس کے طواف کا حکم دیا تھا۔

(۱۳) قاضی عیاض فرماتے ہیں: اللہ کو توبہ کرنے والوں سے محبت ہے: اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (بقرہ: ۲۲۲) تو حضور کو اللہ کی محبت حاصل کرنے کے لئے توبہ کا حکم دیا۔

(۱۴) عارف مناوی لکھتے ہیں: جس طرح پلک جھپکائے بغیر اگر ہم لگا تار کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو یہ ہمارے لئے باعث مشقت ہے اور اگر دیکھنے کے دوران ایک آن کے لئے پلک جھپکالیں تو یہ نظر کے لئے حجاب ہونے کے باوجود رحمت ہوگا اور اس سے ہماری نظر کے تسلسل میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہوگا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم جس عالم کے مشاہدہ میں مشغول ہوتے ہیں۔ اگر لگا تار اس کا مطالعہ کرتے رہیں تو یہ آپ کے لئے سبب مشقت ہوگا۔ اس لئے گاہے گاہے آپ کے قلب پر انوار و تجلیات کا حجاب چھا جاتا ہے، چنانچہ حضور نے فرمایا: ”انہ لیغان علی قلبی“ اور یہ حجاب اگرچہ آپ کے تسلسل مشاہدہ میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں پیدا کرتا تاہم آپ کے مقام عالی کے پیش نظر آپ کو اس حجاب پر استغفار کا امر کیا۔

مغفرت خاتم النبیین

سورۂ فتح کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِیْنًا ۝۱ لِّیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (الفتح)

اشرف علی تھانوی اس آیت کے ترجمہ میں لکھتے ہیں: بیشک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے۔

اسی قسم کے تراجم سے عیسائیوں کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ)

گناہ گار یا خطاء کار تھے۔ محققین علماء اسلام نے اس شبہ کو اٹھانے کے لئے اس آیت کے بھی متعدد صحیح محمل بیان فرمائے ہیں۔ چند از اں یہ ہیں۔

(۱) علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہاں مغفرت کا اطلاق اس چیز پر ہے جو نہ فی نفسہٖ معصیت ہے نہ اللہ کے نزدیک۔ بلکہ مغفرت کا اطلاق اس چیز پر ہے جس کو حضور اپنی نظر عالی کے پیش نظر ذنب خیال فرماتے تھے۔

(۲) شیخ ابو سعود لکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات تشریعی ضرورتوں کے سبب سے افضل اور اولیٰ امر کو ترک فرما دیتے تھے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان امور کا ترک بھی جائز ہے اور یہ مغفرت اس ترک کی طرف راجع ہے اگرچہ وہ ترک معصیت نہیں ہے۔

(۳) حضور نے منع کرنے کے باوجود بعض کاموں کو تبلیغی ضرورت کی وجہ سے کیا، تاکہ معلوم ہو کہ نہی تنزیہہ کے لئے تھی اور عمل بیان جواز کے لئے اور یہ عمل اگرچہ گناہ نہ تھا، تاہم اللہ نے اس کی مغفرت کا بھی بیان فرما دیا۔

(۴) علامہ بدر الدین عینی فرماتے ہیں کہ ابرار کی نیکیاں بھی مقربین کے ہاں گناہ کا حکم رکھتی ہیں۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسے امور کی مغفرت کا اعلان کر دیا۔

(۵) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نہ آپ نے کوئی گناہ کیا نہ کرنا ہے۔ لیکن اگر بفرض محال کوئی گناہ ہو بھی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کا بھی اعلان کر دیا ہے۔

(۶) قاضی عیاض لکھتے ہیں: جب وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (احقاف:۹) ''نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہوگا نہ یہ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوگا'' نازل ہوئی تو مشرکین نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا: ہمارا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال برابر ہے، تو اللہ تعالیٰ نے کفار کے رد میں یہ آیت نازل فرمائی، یعنی حضور کا انجام خیر معلوم ہے اور کفار کا حال بد، پھر برابری کیسی؟

(۷) اور ناصر رسالت علامہ تاج الدین سبکی فرماتے ہیں: اظہار مغفرت ایک کلمہ تشریف ہے۔ جیسے بادشاہ کسی وزیر کو خوش ہو کر کہہ دے: جاؤ تمہارے سات خون معاف، بغیر اس بات کے کہ اس نے کوئی خون کیا ہو یا کرنا ہو۔ اسی طرح اللہ عزوجل نے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر راضی ہو کر آپ کی مغفرت کا اعلان کر دیا۔ بغیر اس امر کے کہ حضور نے کوئی گناہ کیا ہو یا کرنا ہو۔

(۸) شیخ عزالدین ابن سلام لکھتے ہیں: تمام انبیاء مغفور ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی مغفرت کا اعلان نہیں فرمایا۔ اسی سبب سے عرصہ محشر میں انبیاء لوگوں کی شفاعت نہیں کریں گے اور نفسی نفسی کہہ کر اپنی فکر کا اظہار کریں گے، اگر دنیا میں حضور کی مغفرت کا اعلان نہ ہوتا، تو ممکن تھا کہ حضور بھی شفاعت کرنے میں تامل کرتے۔ اسی سبب سے اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں آپ کی مغفرت کا اعلان کر کے آپ کو تسلی دے دی تا کہ عرصہ محشر میں حضور اپنی طرف سے بے فکر اور مطمئن ہو کر امت کی شفاعت کر سکیں۔

(۹) علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ مغفرت کے معنی ستر ہیں اور ہمارے حق میں مغفرت ذنوب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہماری ذوات اور ہمارے عذاب کے درمیان اپنی رحمت کو حائل کر دے اور انبیاء کے حق میں مغفرت ذنوب کا مفہوم یہ ہے کہ ان کی ذوات اور ان کے مفروضہ گناہوں کے درمیان اللہ اپنی عصمت اور حفاظت کو حائل کر دے۔ اس اعتبار سے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی اور پچھلی زندگی کے گناہوں سے معصوم اور محفوظ کر دیا۔

(۱۰) حضور عصمت کے باوصف امتثال امر اور تواضع کی وجہ سے کثرت سے استغفار کیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک دن میں ستر سے زائد مرتبہ استغفار کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اظہار قبولیت کے لئے یہ آیت نازل فرمائی۔

(۱۱) سیدی عبدالعزیز دباغ نے افادہ فرمایا کہ معصیت کا سبب اللہ تعالیٰ سے غفلت ہے۔ جب بندے اور خدا کے درمیان غلبۂ شہوت، غلبۂ غضب یا غلبۂ حرص کے حجابات حائل ہو جاتے ہیں تو وہ معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بندہ کی جسمانی کثافت، بشری ہیولانیت اور ظلمات معصیت کے حجابات بھی اس کے اور خدا کے درمیان حائل رہتے ہیں جس کی وجہ سے وہ معرفت الٰہی سے بے بہرہ، حضور و شہود سے غافل اور کسب معصیت میں اندھا ہو جاتا ہے اور انبیاء علیہم السلام کی ذوات قدسیہ اور

اللہ عزوجل کے ذات کے درمیان یہ حجاب نہیں ہوتے۔ اسی وجہ سے وہ جمال ذات کے محرم، اسرار اور صفات سے واقف اور شہود و حضور میں مستغرق ہوتے ہیں، پھر گناہ کیسا۔ نیز غوث عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں: نجس اور متعفن کپڑے پر آ کر مکھیاں بیٹھتی ہیں۔ اگر کپڑا نہ ہو تو مکھیاں بھی نہ ہوں گی اور یہ حجاب بمنزلہ کپڑے اور گناہ بمنزلہ مکھیوں کے ہوتے ہیں۔ پس جب انبیاء اور خدا کے درمیان حجاب نہ رہا تو گناہ بھی نہ رہا اور یہ رفع حجاب حسب مراتب ہوتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: ''غفر'' کا معنی ہمارے حق میں ستر (۷۰) ذنوب اور انبیاء کے حق میں عدم ذنوب ہوتا ہے۔ اس تمہید کے بعد آیت کا مطلب بیان فرماتے ہیں: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝ (الفتح) پیارے! ہم نے اپنے اور تمہارے درمیان کسی قسم کا کوئی حجاب نہیں رکھا اور فتح مبین عطا کر دی ہے تاکہ تم ہمیشہ مشاہدہ ذات اور مطالعہ صفات میں مستغرق اور منہمک رہو اور تمہاری زندگی گزشتہ ہو یا آئندہ، اس میں کسی قسم کی کوئی خطاء راہ نہ پا سکے نہ اجتہاداً نہ عمداً۔

(۱۲) گناہ کا ایک سبب نفس اور اس کے تقاضوں سے اندھا دھند محبت کرنا ہے۔ جب انسان اور اس کے اعمال کے درمیان محبت نفس آتی ہے تو معصیت جنم لیتی ہے اور نیکی کا سبب اللہ اور اس کے احکام سے بے اندازہ محبت ہے۔ جب انسان محبت الٰہی سے سرشار ہوتا ہے تو اسے ہر گناہ سے نفرت اور ہر نیکی سے الفت ہو جاتی ہے۔ پھر نفس کے تقاضوں کو پورا کرنا مشکل اور شریعت کی دشوار گزار راہوں میں آبلہ پا چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ جب دل اس کی یاد سے معمور اور آنکھیں اس کے جلوؤں سے مخمور ہوں تو انسان اس کی خاطر سر کٹا سکتا ہے، لیکن خواہش کے آگے سر جھکا نہیں سکتا۔ تو اس آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے: ہم نے آپ کے لئے اپنی محبت کی راہوں کو کشادہ کر دیا تاکہ آپ کی زندگی کے کسی حصہ میں کوئی ایسا عمل نہ آنے پائے جو محرومِ محبت کا ثمرہ ہو۔

مسیح و حبیب

حبیب ﷺ کی عصمت، استغفار اور مغفرت کا مفہوم ظاہر ہو جانے کے بعد اب یہ کہنے کا جواز باقی نہیں رہتا کہ مسیح کو استغفار کا حکم نہیں ہوا اور حبیب کو ہوا، لہٰذا مسیح حبیب سے افضل ہے اور مسیح وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ کا مصداق اور حبیب گناہوں پر نادم اور شرمسار۔

مسیح کے بارے میں "کتاب مقدس" نے کہا:

"لعنتی تھا"۔ (گلتیوں باب: ۳، آیت: ۱۳)

حبیب کے حق میں قرآن نے کہا:

"سب کے حق میں وہ سراپا رحمت ہیں"۔ (الانبیاء)

"کتاب مقدس" نے یہ بھی کہا:

"دنیا کا سردار آتا ہے"۔ (یوحنا باب: ۱۴، آیت: ۳۰)

مسیح کی صفت "کتاب مقدس" میں:

"نیک نہ تھا"۔ (لوقا، باب: ۱۸، آیت: ۱۹)

حبیب کی صفت قرآن میں:

"آپ ہدایت مستقیمہ کے حامل ہیں، آپ خلق عظیم کے مالک ہیں"۔ (الحج، ن)

اور "کتاب مقدس" میں ہے:

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخش دے گا، یعنی سچائی کی روح"۔ (یوحنا، باب: ۱۴، آیت: ۱۷)

مسیح کا حال "کتاب مقدس" میں:

"مسیح کو خدا نے چھوڑ دیا، وہ تختہ دار پر چلایا: اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ (متی، باب: ۲۷، آیت: ۴۶)

حبیب کا حال قرآن میں:

"قسم چاشت کی اور رات کی جب وہ چھا جائے، تمہارے رب نے تمہیں نہیں چھوڑا"۔ (الضحیٰ)

عنوانات سابقہ میں مسیح کی جو شخصیت اور صفات پیش کی گئی ہیں وہ "بائبل" کی زبان ہے اور اہل کتاب کے لئے آئینہ۔ ورنہ قرآن اور اہل قرآن کے نزدیک مسیح رحمت اور وجاہت دارین کے حامل ہیں۔

اور حبیب وہ ہیں جن کے آنے کی بشارت دینے کے لئے مسیح دنیا میں آئے، جن کی شریعت پر عمل کرنا مسیح کے لئے افتخار کا سہرا ہے۔ کوثر کے ساقی، لواء حمد کے حامل اور مقام محمود کے حامل ہیں۔ آدم سے عیسیٰ تک سارے نبیوں کو جن کی شفاعت کی حاجت ہے، اپنے رب کے التفات کا محور اور اس کی تجلیات کا مرکز ہیں، جن کا منشاء اس کی مرضی اور جن کا اسوہ اس کی شریعت کہلاتی ہے۔



عظمتِ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم

اللہ تعالیٰ نے تمام جمادات کی خوبیاں ایک نبات میں رکھ دیں اور نباتات کے کل محاسن ایک حیوان میں رکھ دیئے اور تمام حیوانات کے کمالات انسان میں رکھ دیئے، اس لئے قرآن کریم میں فرمایا: سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (حم السجدہ: ۵۳) دیدہ بینا کو آفاق و انفس کی تمام آیات حضرت انسان کے دامن میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہیں اور ان تمام انسانوں کے فضائل ومحامد ایک نبی کی ذات میں رکھ دیئے اور تمام انبیاء کے حیران کن کمالات اور معجزات جمع کر کے حقیقت محمدی میں رکھ دیئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تشریع ہو یا تکوین، کسی عالم کی حقیقت میں کوئی کمال نہیں ہے، مگر وہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدسہ سے وابستہ ہے، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حیوان سعی بسیار کے باوجود انسان نہیں ہوسکتا اور ایک انسان ریاضت وعبادت کے ان گنت مراحل اور محاسن ومحامد کی بے شمار وادیاں عبور کرنے کے بعد بھی مقام نبوت نہیں پا سکتا اسی طرح حضرت آدم سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء کے کمالات جمع کر لیں پھر بھی مقام مصطفوی تک رسائی نہیں ہوتی، بلکہ حق یہ ہے کہ جس جگہ تمام انبیاء علیہم السلام کے فضائل ومناقب کی انتہا ہوتی ہے۔ وہاں سے مقام مصطفیٰ کی ابتداء ہوتی ہے۔

معجزہ نبی کے اس فعل کو کہتے ہیں: جو عام انسان کی قدرت اور اختیار سے باہر ہوتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نبی اسباب عادیہ کے بغیر ان افعال کو صادر کرتا ہے اور اسباب عادیہ سے عام انسان بھی ان افعال کو وجود میں لا سکتا ہے۔ لیکن حضور کے معجزات اس قسم کے ہیں کہ عالم اسباب میں سے کوئی سبب انہیں وجود میں نہیں لا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زمین پر عصا مارا تو اس میں سے پانی نکل آیا، لیکن زمین میں بہر حال پانی ہوتا ہے اور پانی تک زمین کو کھودا جائے تو اس سے پانی نکل آتا ہے۔

حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سفر کے موقع پر اپنی انگلیوں سے پانی جاری کر دیا، کمال

حضرت موسیٰ کا بھی تھا کہ زمین سے بغیر آلات کے پانی جاری کیا۔ لیکن ان کے کمال کی عظمت کو کون پا سکتا ہے۔ جنہوں نے اس جگہ سے پانی جاری کر دیا جہاں اصلاً پانی نہیں ہوتا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے لوہا نرم کر دیا تھا، وہ آسانی سے اس لوہے سے زرہ بنا لیتے تھے۔ لیکن لوہا ایسی جنس ہے کہ اسباب عادیہ سے نرم ہو ہی جاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقعہ پر احد پہاڑ کی ایک گھاٹی میں سر داخل کیا تو وہ موم کی طرح نرم ہوتا چلا گیا اور پتھر ایسی جنس ہے جس میں کسی طرح نرمی نہیں آتی۔ ایک مرتبہ احد پہاڑ کو دیکھ کر آپ نے فرمایا: ''أُحُدٌ جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهُ''۔ ''احد ایک پہاڑ ہے، یہ ہم سے محبت کرتا ہے ہم اس سے محبت کرتے ہیں''۔ پتھر کی حقیقت میں محبت نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ جس دل میں محبت نہ ہو لوگ اسے سنگ دل کہتے ہیں۔ لیکن سرکار کی نظر اگر پتھر پر پڑ جائے تو وہ بھی محبت سے معمور ہو جاتا ہے۔

اب سوچئے! داؤد علیہ السلام کا اعجاز لوہے کو نرم کرنا تھا، لیکن لوہا تو بہر صورت کسی نہ کسی سبب سے نرم ہو ہی جاتا ہے۔ اعجاز تو ان کا ہے جنہوں نے اس جنس میں محبت پیدا کی جس میں اصلاً محبت نہیں ہوتی۔

جو نبی آتا تبلیغ کرتا اور تبلیغ کے باوجود لوگ راہ راست پر نہ آتے تو ان پر عذاب نازل ہوتا اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (اسراء) ہم اس وقت تک عذاب نہیں دیں گے جب تک رسول نہ آ جائے، ثابت ہوا کہ رسول آنے کے بعد لوگ ایمان نہ لائیں تو عذاب رک نہیں سکتا اور حضور آئے تو فرمایا:

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (الانفال: ۳۳) ''اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ان پر عذاب نازل کرے اور آپ ان میں ہوں''۔

پتہ چلا کہ انبیاء سابقین کی بعثت کے بعد عذاب ٹل نہیں سکتا تھا اور حضور کی آمد کے بعد کسی پر عذاب آ نہیں سکتا۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب عیسیٰ علیہ السلام تک لاکھوں نبی آئے، تبلیغ کرتے رہے، لیکن دنیا سے کفر کی سیاہی ڈھل نہ سکی، شرک کی صدائیں گونجتی رہیں، عناصر اور کواکب

کی پوجا ہوتی رہی اور ایک سرکار کی بعثت کیا ہوئی، زمانے میں انقلاب آ گیا۔ انسانوں نے کلمہ پڑھا، جنات مسلمان ہوئے، حیوانات نے آپ کی نبوت کی گواہی دی، شجر و حجر نے رسالت کا اقرار دیا، حتیٰ کہ آپ کے ساتھ جو شیطان (ہمزاد) پیدا ہوا تھا وہ بھی مسلمان ہو گیا۔ غرض صنم کدہ جہاں میں ہر طرف تکبیر و تہلیل کی آوازیں گونجنے لگیں۔

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوع آفتاب دشت و جبل سحر سحر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کے جھرمٹ میں بیٹھے تھے، ناگاہ اٹھ کر کہیں تشریف لے گئے اور جب کافی دیر تک نہ آئے تو ہم لوگ پریشان ہو گئے۔ آپ کو تلاش کرنے کا خیال آیا۔ سب سے پہلے میں اٹھا۔ بنی النجار کے باغ کے قریب پہنچا، میرا خیال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باغ میں تشریف فرما ہیں۔ باغ کے دروازے بند تھے۔ میں نے اس میں داخلہ کے لئے ایک نالہ کے سوا اور کوئی راستہ نہ پایا۔ پس میں نے لومڑی کی طرح اپنا جسم سکیڑا اور نالہ کے ذریعہ باغ میں داخل ہوا، اندر پہنچا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے۔

غور فرمایئے کہ باغ کی چار دیواری کے باہر ابو ہریرہ کو کیسے یقین ہو گیا کہ حضور باغ میں تشریف فرما ہیں اور ایسا یقین کہ اور کوئی راستہ نہ ملا تو نالہ کے ذریعہ ہی داخل ہو گئے؟ لگتا ہے باغ کے باہر انہیں خوشبوئے رسالت آ رہی تھی اور ان کے دل و دماغ میں جب مشام نبوت کی مہک پہنچی تو انہیں یقین ہو گیا کہ سرکار باغ کے اندر ہیں۔ پھر باغ کے اپنے پھلوں اور پھولوں کی خوشبو مغلوب ہو گئی تھی اور سرکار کی خوشبو ان پر غالب تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کسی جنس کے بالمقابل نہیں آئے، مگر اس جنس کے کمالات مغلوب ہو جاتے اور سرکار کے انوار اس پر غالب رہتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی سورج کے بالمقابل کھڑے نہیں ہوئے، مگر حضور کا نور سورج کے نور پر غالب رہتا اور کبھی چاند کے سامنے نہیں آئے، مگر چاند کی روشنی پر حضور کی روشنی غالب رہتی۔ آپ متوسط قد تھے۔ مگر جب کبھی لمبے

قدوالوں کے درمیان چلتے تو سب سے بلند نظر آتے۔ ہر جنس سے فوق، ہر نوع سے اعلیٰ، مسجد اقصیٰ میں انبیاء کے امام ہوئے، سدرہ پر پہنچے تو فضائی پرواز کے شہباز حضرت جبریل علیہ السلام بھی پیچھے رہ گئے اور ایک وقت ایسا آیا کہ تجلیات الٰہیہ کی سب سے بلند جلوہ گاہ عرش الٰہی بھی نیچے رہ گیا اور حضور اس سے بھی اوپر تشریف لے گئے۔ زمان و مکاں کو شرف ظرفیت بخشا۔ لیکن ایک مقام ایسا آیا کہ زمان و مکان کی قیود پیچھے رہ گئیں اور سرکار ان قیود سے آگے نکل گئے۔

ہر یک بقدر خویش بجائے رسیدہ است
آنجا کہ جائے نیست تو آنجا رسیدۂ



مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

عقل و خرد میں یہ طاقت کہاں کہ ان کی حقیقت کو سمجھ سکے، وہم و گمان میں یہ وسعت کب کہ ان کے مقام کو پا سکے، ماہیت اور حقیقت کی بحث چھوڑیں، آیئے مقام مصطفیٰ کے جو پہلو عقل کے سامنے اور عظمت رسول کے جو زاویے ہماری نظر میں ہیں انہیں اہل دل کے سامنے پیش کر دیں۔

حضور آئے تو نظام عالم میں انقلاب آیا، دلوں کی سوچ بدلی، عمل کے اطوار بدلے، جن کا کردار ننگ انسانیت تھا، ان کی پاکبازیوں پر قدسیوں کو رشک آنے لگا۔ وہ کیا آئے کہ چمنستان وجود میں خزاں ندیدہ بہار آئی۔ عرفان کی کلیاں چٹکیں، ایمان کے پھول مہکے، بندے کو خدا سے وہ قرب حاصل ہوا جس کا نہ تصور تھا نہ گمان۔ رحمت خداوندی کی ایسی بارش ہوئی کہ دنیائے وجود کا ہر ذرہ شاداب ہو گیا۔

ان کے آنے سے اصول اور پیمانے بدلے، رنگ و نسل کا امتیاز اٹھا۔ انسانیت کے ہر طبقہ کو ہدایت ملی۔ اللہ اللہ یہ ان کا مرتبہ ہے، وہ رخ بدلیں تو قبلہ بدل جائے۔ وہ ہاں کہہ دیں تو احکام فرض ہوں، منع کر دیں تو حرمت لازم ہو، ادب اتنا کہ ان کی آواز پر آواز اونچی نہیں ہو سکتی۔ نام لے کر بلانے کی اجازت نہیں۔ دل پر کسے اختیار ہوتا ہے، مگر ان کے فیصلہ کے خلاف دل میں بھی ناگواری ہو تو ایمان نہیں رہتا۔

ان کا مقام کوئی کیسے سمجھے، فرشتوں کو حیرت ہے کہ جن کے ہاتھوں کی ایک جنبش سے مہر و ماہ گردش میں آ جاتے ہیں، جو خاک کی مٹھی اٹھا کر پھینکیں تو چہرے بگڑ جائیں۔ وہ کبھی طائف کی وادی میں مظلومیت سے پتھر کھاتے ہیں، کبھی جبل احد کی گھاٹیوں میں اپنے چہرے سے لہو پونچھتے نظر آتے ہیں۔ نیاز کا عالم یہ ہے کہ ساری رات مصلی پر کھڑے روتے گزر جاتی ہے اور مقام ناز یہ ہے کہ بدر کے میدان میں رب ذوالجلال سے کہتے ہیں: اگر آج یہ جماعت ہار گئی تو قیامت تک تیری پرستش نہ ہو سکے گی۔ کبھی چٹائی پر لیٹتے ہیں جس

کے نقش بدن پر ابھر آئے، کبھی سرعرش مسند آرا ہوئے۔ جبریل ان کے سینہ میں وحی اتارتا ہے، پھر وہی جبرائیل ان سے اسلام اور ایمان کی باتیں سیکھتا ہے۔ زمان ومکان کی قیود اور عالم رنگ و بو میں آئے، پھر یکایک ان تمام تعینات اور قیودات سے نکل کر لامکان جا پہنچے، عقل حیران ہے، انہیں کیا سمجھے، وہ مختار کل ہیں یا عجز سراپا۔ جبرائیل کو فیض دینے والے ہیں یا اس سے فیض یافتہ، عرشی ہیں، فرشی ہیں، مجرد ہیں، مقید ہیں، ناز ہیں، نیاز ہیں، کیا ہیں۔

ع حیران ہوں میرے شاہا! میں کیا کیا کہوں تجھے

ضرورت مصطفیٰ

اللہ تعالیٰ روز اول سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور ضرورت کا اظہار فرماتا رہا ہے۔ عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے حضور کی اطاعت کا وعدہ لیا۔ پھر عالم اجسام میں اسی نور کو جبین آدم میں رکھ کر فرشتوں سے سجدہ کرایا اور جب رشد و ہدایت کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر رسول اپنی امت کو تلقین کرتا رہا کہ اگر میرے زمانے میں یا اس کے بعد وہ مبعوث ہو جائیں تو تمہیں ان پر ایمان لانا ہوگا۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا تا آنکہ حضرت ابراہیم نے ان کے آنے کی دعا مانگی۔ حضرت عیسیٰ نے کہا:

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا" (یوحنا، باب: ۱۴، آیت: ۱۷) الغرض آپ کی آمد کے انبیاء و رسل سارے منتظر تھے۔ آپ نہ آتے تو یہ آرزوئیں کس طرح پوری ہوتیں، یہ دعائیں کیونکر مستجاب ہوتیں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو نبی آتے تھے ان کی سیرت انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط نہ ہوتی تھی، اس لئے کسی ایسے نبی کی ضرورت تھی جس کی زندگی اخلاق کے تمام شعبوں پر مشتمل ہو۔ چنانچہ آپ آئے اور فرمایا: "بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ" میں ادھورے اخلاق کو پورا کرنے آیا ہوں۔

☆ حضرت آدم سے عیسیٰ تک جس قدر نبی آئے سب خدا کی کسی نہ کسی صفت کا مظہر بنے، یہ تمام نبی مظہر صفات تھے۔ ذات کا مظہر کوئی نہ تھا۔ حتیٰ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ذات حق کا مظہر اور جمال الوہیت کا آئینہ بن کر آئے۔

☆ جو نبی دنیا کے سامنے آتا وہ خدا کی ذات پر گواہی دیتا اور شہادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ سن کر اور دیکھ کر، سماع کی شہادت فرع اور مشاہدہ کی شہادت اصل کہلاتی ہے اور اگر سماعی شہادت کے ساتھ مشاہداتی شہادت لاحق نہ ہو تو وہ شہادت کامل نہیں ہوتی۔ انبیاء سابقین نے خدا کی ذات پر شہادت دی مگر وحی سے سن کر دی اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کی ذات پر شہادت دی اور خدا کو دیکھ کر شہادت دی۔

☆ اللہ تعالیٰ نبوت کو تخلیق کرتا رہا، ایک کے بعد دوسرا نبی مبعوث کرتا رہا۔ پھر خدا نے چاہا کہ ایک ایسا نبی مبعوث فرمائے جس سے کوئی بڑھ نہ سکتا ہو، جو تخلیق کی معراج ہو، جو اس کے فن کی آن اور اس کی عظمت کا نشان کہلائے۔ جس کے بنانے پر وہ ناز کرے، جسے دیکھ کر دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اٹھیں: من خدائے عزوجل را بچندیں وجوہ پرستش مے کنم کہ آن رب محمد است صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کے آنے کی ضرورت تھی، اگر آپ نہ آتے تو قدسیوں کے خواب ناتمام رہتے، رسولوں کی دعائیں مستجاب نہ ہوتیں، مکارم اخلاق ادھورے رہتے اور نبیوں کی شہادت کامل نہ ہوتی۔ حضور نہ آتے تو رحمت خداوندی کا عموم اور ہدایت کا شمول نہ ہوتا۔ کتنی آرزوئیں تشنہ رہ جاتیں اور کتنی امنگیں ناتمام رہتیں۔ اللہ اللہ! وہ نہ ہوتے تو جمال حق کا آئینہ نہ ہوتا، وہ نہ آتے تو شاہکار الوہیت کا ظہور نہ ہوتا۔

وحی مصطفیٰ

جبرائیل امین جب پہلی وحی لے کر غار حرا میں آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یاد الٰہی میں مستغرق تھے۔ جبرائیل نے کہا: اِقْرَاْ (پڑھیے) بھلا جس کا ذہن حسن الوہیت کی تجلیات میں کھویا ہوا ہو، جس کی آنکھیں ذوق نظارہ سے مخمور ہوں، اسے کب گرد و پیش کا ہوش رہتا ہے۔ حضور نے اسی بے خودی کے عالم میں فرمایا: ''ما انا بقارئ'' (میں نہیں پڑھتا)، جبرائیل نے حضور کو سینہ سے لگا کر بھینچا اور پھر کہا: اِقْرَاْ پھر فرمایا: ''ما انا بقارئ'' پھر سینہ سے لگا کر کہا: اِقْرَاْ پھر ''ما انا بقارئ'' جواب ملا۔ چوتھی بار جبرائیل امین نے کہا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ جب حضور نے اپنے رب کا نام سنا تو آپ متوجہ ہوئے

کہ یہ بھی تو اسی ذات کا نام لے رہا ہے جس کے جلوؤں میں میں محو ہوں۔ یہ سنتے ہی آپ نے پڑھا: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ (علق)

جبرائیل نے حضور کو سینہ سے کیوں لگایا؟ لوگ کہتے ہیں کہ جبرئیل حضور کو اپنے سینہ سے لگا کر حضور میں ملکوتی مناسبت پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ حضور ان سے وحی لے سکیں۔ لیکن ذوق سلیم اس کو باور نہیں کرتا۔ حضور دنیا میں مخلوق سے فیض لینے نہیں آئے تھے، بلکہ تمام خلق خدا کو فیض دینے آئے تھے اور جبرائیل حضور کو سینہ سے لگا کر کچھ دینا نہیں، لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ سینہ سے سینہ ملا تو یہ راز کھلا کہ حضور مصطفوی میں فقط اِقْرَاْ نہ کہو اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝ پوری آیت پڑھو، جس کا کلام پڑھوانا ہے اس کا نام لو۔ یہ فیض پہنچا تو جبرائیل نے پوری آیت پڑھی ورنہ پہلے ہی پڑھ دیتے۔

دوسرے نبیوں پر بھی کتاب نازل ہوئی، مگر ہم نے دیکھا کہ انہیں منزل کتاب تک جانا پڑتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا: کتاب لینی ہے تو پہاڑ طور پر آؤ۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حصول کتاب کے لئے کہیں جانا نہیں پڑتا تھا۔ حضور نبی کریم جس جگہ ہوتے تھے کتاب وہیں آجاتی تھی۔ حضور نزول کے تابع نہ تھے، نزول حضور کے تابع تھا۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے؟ انہوں نے فرمایا: "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ" (حضور کا خلق قرآن تھا) عربی میں خَلق انسان کی ظاہری بناوٹ کو اور خُلق باطنی اوصاف کو کہتے ہیں۔ گویا خَلق صورت کا اور خُلق سیرت کا نام ہے اور حضرت عائشہ کے اس فرمان سے ظاہر ہوا کہ حضور کی سیرت کی اٹھان فطرتاً وہی تھی جس کی ہدایت بعد میں قرآن نے دی ہے اور اگر بالفرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تنزیل قرآن نہ ہوتی، پھر بھی آپ کی سیرت قرآن کے مطابق ہوتی۔ حدیث عائشہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر حضور کی سیرت کو جامع عبارت سے بیان کیا جائے تو وہ متن قرآن ہوگا اور اگر آیات قرآن کو انسان کی سیرت میں متشکل کیا جائے تو وہ حضور کی سیرت کہلائے گی۔

علوم مصطفیٰ

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا۔ ظاہر

باطن، غیب وشہادت اور تکوین وتشریع کی کوئی حقیقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ سے مخفی نہیں ہے۔
امام ترمذی، تصحیح بخاری کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تَجَلّٰی لِیْ کُلُّ شَیْءٍ وَ عَرَفْتُہٗ"۔ ہر چیز مجھ پر منکشف ہوگئی اور میں نے اسے جان لیا" نیز "صحیح بخاری" میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز کے بعد فرمایا: "وَاللّٰہِ مَا یَخْفٰی عَلَیَّ رُکُوْعُکُمْ وَلَا خُشُوْعُکُمْ"۔ "خدا کی قسم! مجھ سے نہ تمہارا رکوع پوشیدہ ہے نہ خشوع"۔ رکوع نماز کی ظاہری ہیئت کو اور خشوع باطنی کیفیت کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ظاہر و باطن اور غیب وشہادت کی ہر حقیقت حضور کے علم میں ہے۔ "صحیح بخاری" کی ایک اور حدیث میں ہے: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: "سَلُوْنِیْ فَلَا تَسْئَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا اَخْبَرْتُکُمْ"۔ "مجھ سے سوال کرو، تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں استفسار نہیں کرو گے مگر میں تمہیں اس چیز کی خبر دوں گا"۔ یہ دعویٰ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا علم تمام حقائق ممکنہ کو محیط ہو۔ چنانچہ عبداللہ بن حذافہ جن کے بارے میں لوگ شک کرتے تھے کہ شاید وہ حذافہ کے بیٹے نہیں ہیں اور ان پر تہمت لگاتے تھے۔ انہوں نے پوچھا: میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: تمہارا باپ حذافہ ہی ہے، ایک اور شخص نے سوال کیا: میرا باپ کون ہے؟ فرمایا: تمہارا باپ سالم ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ تکوینی امور ہوں یا تشریعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا علم سب پر مشتمل ہے۔

امام بخاری کی ایک اور روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر جلوہ فرما ہوئے اور آپ نے ہمیں ابتدائے عالم سے تمام احوال کی خبریں بیان کرنا شروع کیں۔ یہاں تک کہ اہل جنت کے جنت میں جانے اور اہل نار کے جہنم میں جانے تک کے تمام واقعات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کر دیے۔ پس جسے یہ باتیں یاد رہیں اسے یاد رہیں اور جس نے بھلا دیں اس نے بھلا دیں۔ "صحیح مسلم" میں اس حدیث کو ایک اور سند کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ہیں: "فَاَخْبَرَنَا بِمَا کَانَ وَ بِمَا ھُوَ کَائِنٌ" حضور نے ایک مجلس میں "ماکان و مایکون" یعنی ماضی و مستقبل کی تمام خبریں بیان کر دیں۔

اس جگہ بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایک مجلس میں ان تمام امور کا تفصیلاً بیان

نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس حدیث کا مفاد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اہم اہم باتیں بیان کر دی تھیں۔ اس کے جواب میں پہلے گزارش یہ ہے کہ گمراہی کی اولین بنیاد یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کو اپنے اوپر قیاس کر لیا جائے اور اس بناء پر یہ فرض کیا جائے کہ چونکہ ہم قلیل وقت میں کثیر امور بیان نہیں کر سکتے، اس لئے حضور بھی نہیں کر سکتے۔ اب دیکھیں کہ قلیل وقت میں یہ بیان ممکن ہے یا نہیں، تو دیکھئے! قرآن کریم کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے ایک امتی آصف بن برخیا نے پلک جھپکنے سے پہلے تین ماہ کی مسافت سے تختِ بلقیس لا کر حضرت سلیمان کے سامنے رکھ دیا۔ پس جب سلیمان علیہ السلام کا ایک امتی اس قدر طویل کام کو ایک لحہ میں کر سکتا ہے تو جن کے سامنے حضرت سلیمان بھی امتی کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ایک دن میں یہ تفصیلی احوال کیوں بیان نہیں کر سکتے؟ نیز "بخاری شریف" میں ہے کہ حضرت داؤد گھوڑی پر زین ڈالنے کا حکم دیتے اور زین ڈالنے سے پہلے زبور ختم کر لیتے اور سب کو چھوڑ دیتے، واقعہ معراج بھی تو ایک لحہ میں وقوع پذیر ہوا۔ پس جو ایک لحہ میں تفصیلاً سیر معراج کر سکتے ہیں وہ ایک مجلس میں ابتدائے آفرینش سے دخول جنت تک کے تفصیلی احوال بھی بیان کر سکتے ہیں اور اگر یہ مشکل ہے تو پھر وہ بھی ممکن نہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ (بنی اسرائیل) "تمہیں جو علم ملا ہے وہ قلیل ہے"۔ تمام جہان والوں کے علم کو اللہ تعالیٰ قلیل فرماتا ہے اور حضور کے علم کے بارے میں فرمایا: وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ (النساء) "اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام چیزوں کا علم عطا کر دیا جنہیں آپ پہلے نہیں جانتے تھے اور یہ اللہ کا آپ پر فضل عظیم ہے" غور کیجئے! جس کے نزدیک کل جہان والوں کا علم قلیل ہے تو جس کے علم کو وہ عظیم کہہ دے اس کی عظمتوں کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔

رحمتِ مصطفیٰ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں۔ عالم موجودات کے ذرہ ذرہ کو حضور کی رحمت شامل ہے۔ نبوت اور رسالت ہو یا امامت اور ولایت، سب کا سبب حضور کی رحمت ہے۔ مومنوں کو حضور کی رحمت سے ایمان ملا اور کفار کو دنیا میں حضور کے سبب امان ملی، یوں تو سب نعمتیں

حضور کی رحمت اور آپ کی وساطت سے ہی ملتی ہیں، لیکن جو نعمتیں آپ نے اپنے ہاتھوں سے بانٹیں، جو رحمتیں آپ خود تقسیم کرتے رہے، ان کی شان ہی کچھ اور ہے۔

مکہ کے کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے تھے۔ آپ تبلیغ کرتے تو دلسوز آوازے کستے، راستہ میں کانٹے بچھا دیتے، دوران عبادت گندگی ڈال دیتے، ابو سفیان آپ پر چڑھائی کر کے لشکر لایا، وحشی نے آپ کے محبوب چچا سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا، ہندہ نے ان کا جگر نکال کر دانتوں سے چبایا، یہ سارے ظالم اور ستم ایجاد لوگ جب فتح مکہ کے بعد مقہور اور مغلوب ہو کر آپ کے سامنے پیش ہوئے، جب یہ مجبور اور آپ ان سے ہر طرح کا انتقام لینے پر قادر تھے، اس وقت آپ نے فقط اتنا فرمایا:

لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۭ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۹۲﴾ (یوسف)

''میں تمہیں کوئی ملامت نہیں کرتا، جاؤ خدا تمہیں معاف کرے، وہ بہت ہی رحم کرنے والا ہے''۔

حضرت حمزہ نے اسلام کی خاطر بڑی قربانیاں دی تھیں۔ حضور نبی کریم کو ان سے بڑا پیار تھا۔ ان کی شہادت پر حضور بہت آزردہ رہے۔ ان کا قاتل وحشی حضور کی خدمت میں آ کر کہتا ہے: میں اسلام لانا چاہتا ہوں، مگر ایک شرط ہے، پوچھا: کیا؟ کہنے لگا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ (الفرقان)

''جو لوگ شرک نہیں کرتے نہ ناحق قتل کرتے ہیں اور نہ زنا کاری اور جو ایسا کریں انہیں سخت عذاب ہوگا اور قیامت کے دن ان کا عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور وہ اس میں ہمیشہ مبتلا رہیں گے''۔

وحشی نے کہا: میں نے یہ سب گناہ کئے ہیں، اگر میں اسلام لے آؤں تو کیا میری بخشش ہو جائے گی؟ اسی وقت قرآن نازل ہوا اور حضور نے فرمایا: اللہ عزوجل فرماتا ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا

''مگر جو شخص ان گناہوں کے بعد توبہ کر

فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (الفرقان: ۷۰) لے اور ایمان لے آئے اور اس کے عمل نیک ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی پچھلی برائیوں کو نیکیوں سے تبدیل کر دے گا''۔

وحشی کہنے لگا: یہ تو اسلام لانے سے پہلے گناہوں کی معافی ہے، اگر اسلام لانے کے بعد مجھ سے کوئی گناہ ہوا تو اس کی بخشش کیسے ہوگی؟

فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: ۱۱۶) ''اللہ جس کے لئے چاہے گا شرک کے علاوہ تمام گناہ بخش دے گا''۔

وحشی کہنے لگا: اور اگر خدا میرے لئے بخشش نہ چاہے تو پھر اس کی کیا گارنٹی ہے کہ خدا مجھے بھی بخش دے گا۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا (الزمر: ۵۳) ''آپ کہہ دیجئے: اے میرے گناہ گار بندو! خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ تعالیٰ تمہارے تمام گناہ بخش دے گا''۔

وحشی نے کہا: اب مجھے اطمینان ہو گیا ہے اور میں اسلام قبول کرتا ہوں۔ غور کیجئے! کتنی بحث و تکرار کر کے اور کس قدر ناز اٹھا کر اس شخص کو کلمہ پڑھایا ہے جو آپ کو سخت ترین اذیت پہنچانے والا اور آپ کے محبوب ترین چچا کا قاتل تھا۔

ایک روز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحن کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ پاس ہی قریش کے صنادید بیٹھے آپ کو ایذاء پہنچانے کی تجویز سوچ رہے تھے۔ ان میں سے عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور عین سجدہ کی حالت میں حضور کی پشت پر اونٹنی کی اوجھڑی لا کر رکھ دی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ اشقیاء تمسخر کر رہے تھے کہ سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا آئیں اور اس جھلی کو حضور کی پشت سے اٹھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر عمرو بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف اور عقبہ بن ابی معیط ان تمام کافروں کے نام لے لے کر دعا ضرر کی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب رحمت ہیں تو یہ دعا ضرر کیسی؟ اس کی وجہ سمجھنے کے لئے اس

بات پر غور فرمائیے کہ طائف کی وادی میں کفار نے حضور کو پتھروں سے گھائل کیا۔غزوۂ احد میں آپ کا چہرہ لہولہان کر دیا۔یہ دلخراش منظر دیکھ کر جبرائیل سے بھی یارائے ضبط نہ رہا۔اس نے بھی کہا: ان ظالموں کے لئے دعا ضرر کریں۔لیکن جب حضور رحمۃ للعالمین کے ہاتھ اٹھے تو ان کے حق میں دعا خیر کے لئے اٹھے اور فرمایا: اے خداوند! انہیں ہدایت دے، یہاں اتنی تکلیفوں کے باوجود دعا دے کر حضور نے یہ ظاہر فرمادیا کہ میری ذات کو اذیتیں دو برداشت کرلوں گا۔میرے چچا کو قتل کر کے ان کا جگر تک چباڈالو صبر کرلوں گا، ہر ستم گوارا ہوسکتا ہے۔لیکن اللہ کی عبادت میں خلل ڈالو، نماز میں فساد برپا کردو یہ گوارا نہیں ہوسکتا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جس قدر عبادت کا حکم دیا ہے، خود اس سے زیادہ عبادت کی ہے۔چنانچہ امت کے لئے پانچ نمازیں فرض کیں اور خود تہجد بھی پڑھتے تھے۔دوسروں کے لئے مال میں سے چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض کی اور خود سب کچھ صدقہ کر دیا کرتے تھے۔ہمارے لئے صرف دن کا روزہ مقرر کیا اور خود وصال کے روزے بھی رکھے، جس میں نہ سحری ہے نہ افطار۔

اللہ تعالیٰ کو اوروں سے شکوہ ہے کہ وہ قیام کم کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُۙ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًاۙ (مزمل) آپ بہت زیادہ قیام کرتے ہیں، ذرا کم کیا کریں۔اسی طرح اوروں سے شکایت ہے کہ وہ راہ خدا میں مال کم خرچ کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: لَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ (اسراء:۲۹) آپ راہ خدا میں مال بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں، ذرا کم خرچ کیا کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى (طٰہٰ) ''آپ صبح اور شام نماز ادا کیا کریں، تاکہ آپ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جائیں''۔اللہ اکبر! ساری مخلوق کی عبادت یہ ہے کہ وہ خدا کو راضی کرے اور حضور کی عبادت یہ ہے کہ خدا انہیں راضی کر دے۔جب محب اپنے محبوب کو دیکھ لے تو وہ راضی ہو جاتا ہے۔گویا اللہ تعالیٰ نے حضور سے فرمایا: آپ نماز پڑھئے اور نماز کے دوران ہماری تجلیات کا مشاہدہ کیجئے تاکہ آپ راضی ہوں۔اسی لئے حضور نے فرمایا: ''جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ'' نماز پڑھنے

سے میری آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔

زیارت بھی ایک عبادت ہے۔ چنانچہ کعبہ اور قرآن کی زیارت کرنا عبادت ہے اور سب سے بڑھ کر عبادت ایمان کی نگاہ سے حضور کے چہرۂ انور کو دیکھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص اب عبادت کر کے ولی اور غوث کا مرتبہ تو پا سکتا ہے لیکن صحابیت کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ غور کیجئے! جب حضور کو دیکھنا اتنی عظیم عبادت ہے تو رب ذوالجلال کو دیکھنا کس قدر عظیم عبادت ہو گی اور یہ ایسی عبادت ہے کہ پوری کائنات میں سوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عبادت کا اور کوئی عابد نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرائیل نے پوچھا کہ احسان کس مرتبہ کا نام ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ''۔ ''خدا کو دیکھتے ہوئے اس کی عبادت کرنا''۔ لہٰذا کاملین اور مقربین اس طرح عبادت کرتے ہیں کہ دوران نماز جمال الوہیت نظر میں ہوتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے: الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۲۱۸﴾ وَ تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ (الشعراء) ''آپ دوران عبادت حالت قیام میں ہوں یا حالت سجود میں، خدا آپ کو دیکھتا رہتا ہے''۔ دیکھئے! عبادت کے وقت تمام عابدوں کی نظریں خدا کی طرف ہوتی ہے اور خدا کی نظریں مصطفیٰ کی طرف ہوتی ہیں۔

ہمیں معلوم ہے ہم سے سنو محشر میں کیا ہو گا
سب اس کو دیکھتے ہوں گے، وہ ان کو دیکھتا ہو گا

مقام مصطفیٰ

ایک دن صحابہ کرام باتیں کر رہے تھے کہ آدم صفی اللہ ہیں، ابراہیم خلیل اللہ ہیں، موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ ہیں۔ اسی دوران حضور نبی کریم رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور فرمایا: بلا ریب آدم صفی اللہ ہیں، ابراہیم خلیل اللہ، موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ ہیں، مگر یاد رکھو! میں حبیب اللہ ہوں اور میں فخر نہیں کرتا، ایک اور موقعہ پر فرمایا: میں تمام رسولوں کا قائد ہوں اور مجھے اس پر فخر نہیں۔ یعنی میرے لئے یہ فخر کی بات نہیں کہ مجھے ان کی قیادت مل گئی، فخر تو رسولوں کو کرنا چاہئے جنہیں مجھ جیسا قائد مل گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام فکر آخرت سے دعا کرتے ہیں: لَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ (الشعراء) "اے خداوند! روز حشر ہمیں شرمندہ نہ کرنا" اور جس مرتبہ کے لئے حضرت ابراہیم نے دعا کی حضور کو وہی مقام بنا مانگے دیا اور فرمایا: یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (تحریم:۸) "حشر کے دن اللہ تعالیٰ نہ اپنے نبی کو شرمندہ کرے گا اور نہ ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو" بلکہ شرمندہ نہ کرنا تو کجا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا: سر محشر آپ سرخرو ہوں گے اور لواء حمد آپ کے ہاتھ میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نوازشوں اور عنایتوں کی موسلا دھار بارش ہوگی اور وہ اس وقت تک بخشتا اور نوازتا رہے گا جب تک آپ راضی نہیں ہوں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمنا کی: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (اعراف:۱۴۳) "اے رب! مجھے اپنی ذات دکھا، تاکہ میں اس کا نظارہ کروں" انہیں فرمایا: لَنْ تَرٰىنِیْ "تم نہیں دیکھ سکتے" اور حضور سے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ (فرقان:۴۵) "کیا آپ نے اپنے رب کو نہیں دیکھا" اللہ عزوجل کے جلال و جبروت کا کیا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کا کلام اگر کسی پہاڑ پر اترے تو وہ ریزہ ریزہ ہوجائے۔ اس کی صفت کی تجلی اگر حضرت موسیٰ جیسے نبی پر ہو تو ہوش جاتے رہیں۔ پہاڑوں میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے کلام کا بار اٹھا سکیں۔ تو ان کا حوصلہ کیسا ہوگا جن کے سینہ پر قرآن کی ایک دو نہیں چھ ہزار سے زیادہ آیتیں اتریں۔ مخلوقات کے عالم میں کسی کو اسے دیکھنے کی ہمت نہیں تو ان آنکھوں کا کیا کہنا جنہوں نے اپنے رب کو اس شان سے دیکھا کہ دکھانے والے نے بھی داد دے کر کہا: مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (نجم)

عارفوں کے دو گروہ ہوتے ہیں، ایک وہ ہیں جن کی نظر پہلے مصنوع پر پڑتی ہے اور پھر اس کے بعد صانع تک پہنچتے ہیں۔ دوسرے وہ ہیں جن کی نظر ابتداءً صانع پر ہوتی ہے، اس کے بعد مصنوع کو دیکھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابراہیم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ نُرِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِیَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِیْنَ (الانعام)

اللہ نے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آسمان اور زمین کی تمام حقیقتیں دکھائیں۔

اس کے بعد وہ تجلیات الٰہیہ تک پہنچے، یہ تھا مقام ابراہیم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام یہ

ہے کہ ایک موقعہ پر آپ نے فرمایا:

رَأَيْتُ رَبِّیْ عَزَّ وَجَلَّ فِی اَحْسَنِ صُوْرَةٍ قَالَ فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاُ الْاَعْلٰى قُلْتُ اَنْتَ اَعْلَمُ قَالَ فَوَضَعَ كَفَّهٗ بَيْنَ كَتِفَیَّ فَوَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَیَّ فَعَلِمْتُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

''میں نے اپنے رب کو حسین صورت میں دیکھا، اس نے پوچھا: ملاء اعلیٰ کس بات میں نزاع کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: تو ہی خوب جانتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینے میں محسوس کی، پھر میں نے تمام آسمانوں اور زمینوں کو جان لیا''۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پہلے زمین و آسمان کو دیکھا اور حضور نے پہلے خدا کو دیکھا اور پھر زمین و آسمان کو دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ (الشعراء: ۶۲) ''میرے ساتھ ہے رب میرا'' پہلے اپنا ذکر کیا، پھر خدا کا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ: ۴۰) ''اللہ ساتھ ہے ہمارے'' پہلے خدا کا ذکر فرمایا اور پھر اپنا، حضرت سلیمان ملکہ سبا بلقیس کی طرف خط لکھواتے ہیں: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝ (نمل) پہلے اپنا اور پھر خدا کا ذکر کرتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بادشاہ روم ہرقل کی طرف خط لکھوایا تو لکھا: ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ من محمد الی هرقل عظيم الروم'' پہلے اللہ کا نام لکھوایا اور پھر اپنا۔ ان شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے مخلوق کو دیکھنا اور پھر مخلوق سے خالق کی طرف متوجہ ہونا، یہ حضرت ابراہیم اور موسیٰ اور سلیمان علیہم السلام کا مقام ہے اور سب چیزوں سے پہلے اپنے رب کو دیکھنا اور پھر کسی اور کی طرف التفات کرنا یہ مقام محمدی ہے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ ہر ایک کا قبلہ الگ الگ ہوتا ہے۔ مقربین کا قبلہ عرش ہے اور کروبیین کا قبلہ بیت المعمور ہوتا ہے۔ انبیاء سابقین کا قبلہ بیت المقدس ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بیت الحرام۔ لیکن یہ حضور کے جسم کا قبلہ ہے اور آپ کی روح کا قبلہ خدا کی

ذات ہے اور آپ کی ذات خدا کا قبلہ ہے۔ قبلہ کا مطلب ہے مرکز التفات یعنی اللہ تعالیٰ آپ کی توجہ کا مرکز ہے اور آپ خدا کے التفات کا محور ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہیں۔ انبیاء میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے۔ سب خدا کے طالب اور وہ اس کے مطلوب ہیں، ان کی عظمت کا اندازہ کوئی کیسے کرے جن کی نسبتوں کی خدا قسم کھائے۔ جن کا جاگنا عبادت اور جن کی نیند خدا کی زیارت ہو۔ ان کے مقام تک کسے رسائی ہو جو اس وقت خدا سے ہم کلام ہوں جب کسی کو اس سے یارائے سخن نہ ہو۔ جن کا منشاء خدا کی مرضی کہلائے اور جن کے ماتھے پر بل ہوں تو خدا ناراض ہو جائے۔



حدیثِ لولاک

مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں مولانا ظفر علی خان کی نعت گوئی کے عنوان سے جناب خالد بزمی صاحب کا مضمون پڑھا، اس مضمون میں اس شعر پر بحث کی گئی ہے۔

گر ارض و سما کی محفل میں لولاک لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں یہ نور نہ ہو سیاروں میں

خالد بزمی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''لولاک والی حدیث صحیح نہیں ہے، لیکن مولانا ظفر علی خان بہرحال محدث نہیں شاعر تھے اور انہوں نے یہ الفاظ عام رواج کے مطابق ہی استعمال کر لئے''۔

اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اگر بات صرف مولانا ظفر علی خاں کی شاعری تک محدود ہوتی تو کوئی بات نہ تھی لیکن ''حدیث لولاک'' کا ذکر تو وقت کے مجدد اور اس صدی کے سب سے بڑے محدث اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے بھی اپنے اشعار میں کیا ہے، مثلاً فرماتے ہیں:

ہوتے کہاں خلیل و بنا کعبہ و منیٰ
لولاک والے صاحبی سب تیرے گھر کی ہے

(حدائق بخشش حصہ اول ص ۹۳)

اور محدث ابن جوزی کے تلمیذ رشید شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تراعز لولاک تمکین بس ست
ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس ست

(بوستان ص ۲۰)

اس لئے اس حدیث کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا ذکر صرف ایک شاعر نے کیا ہے۔

اس حدیث کو نا قابل تسلیم قرار دیتے ہوئے خالد بزمی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''کسی حدیث کے صحت پر مبنی ہونے کا سب سے پہلا ثبوت اس حدیث کا قواعد عربی کے مطابق ہونا ہوتا ہے اور یہ الفاظ عربی زبان کے قاعدوں (1) کے مطابق درست نہیں ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ''لولاک'' کی ترکیب ہی محل نظر ہے''۔ کاش بزمی صاحب نشاندہی کرتے کہ اس حدیث میں فلاں عربی قاعدہ کی مخالفت ہے اور اس کی ترکیب میں فلاں غلطی ہے، تا کہ اس پر غور کیا جاتا۔

بہر حال اس بحث کے اجمال بلکہ اہمال سے صرف نظر کر کے اس لفظ کی ترکیب نحوی پیش خدمت ہے۔ اس حدیث میں ''لولا'' کے بعد ضمیر مجرور متصل کو ذکر کیا گیا ہے اور یہ جائز ہے۔ کیونکہ ''لولا'' کے بعد مبتداء مذکور ہوتا ہے اور خبر محذوف ہوتی ہے اور مبتداء اسم ظاہر بھی ہوتا ہے اور ضمیر بھی عموماً مرفوع منفصل ہوتی ہے۔ لیکن قلیل طور پر ضمیر متصل بھی لائی جاتی ہے اور اس وقت ''لولا'' جارہ ہوتا ہے اور مجرور بر بناء ابتداء محلاً مرفوع ہوتا ہے، چنانچہ ابن ہشام انصاری فرماتے ہیں:

اذا ولی لولا مضمر فحقه ان یکون ضمیر رفع نحو لولا انتم لکنا مومنین و سمع قلیلا لولای و لولاك و لولاہ خلافا للمبرد ثم قال سیبویه والجمهور هی جارة للضمیر مختصة به کما اختصت حتی والکاف بالظاهر ولا تتعلق لولا بشیء و موضع المجرور بها رفع بالابتداء والخبر محذوف۔

(مغنی اللبیب ج ۱ ص ۲۱۶)

جب لولا کے بعد ضمیر لائی جائے تو وہ ضمیر مرفوع ہونی چاہئے، مثلاً لولا انتم ...... الخ اور قلیلاً سنا گیا ہے: لولای۔ لولاك اور ''لولاہ'' برخلاف مبرد کے اور سیبویہ اور جمہور کہتے ہیں کہ یہ ''لولا'' جارہ اور ضمیر کے ساتھ خاص ہے جیسے ''حتّٰی'' اور کاف کی خبر اسم ظاہر کے ساتھ ہے اور یہ ''لولا'' کسی کے متعلق نہیں ہوتا اور اس کا مجرور بناء بر ابتدا محلاً مرفوع ہوتا ہے۔

1۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ صاحب مضمون کا ''قاعدوں'' لکھنا ہی خلاف قاعدہ ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں قاعدہ کی جمع قاعدوں نہیں قواعد آتی ہے تو امید ہے بزمی صاحب برا نہیں مانیں گے۔ (سعیدی)

نیز علامہ بوصیری نے عربی زبان کے مشہور قصیدہ بردہ میں "لولا" کے بعد ضمیر مجرور متصل کو استعمال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

لولاہ لم تخرج الدنیا من العدم

اور عربی زبان کا مشہور اور مستند شاعر ابوالطیب متنبی کا یہ شعر بھی "لولا" کے بعد ضمیر مجرور متصل کے استعمال پر ایک قوی شہادت ہے:

الی ذی شیمة لشغفت فؤادی فلولاہ لقلت بہ النیا

(دیوان متنبی ص ۲۷)

اس حدیث پر بزمی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "لولاك" اس حدیث سے ماخوذ ہے جس میں ہے: "لولاك لما خلقت الافلاك" اور یہ صحیح نہیں ہے۔ اس بارے میں یہ معروض ہے کہ صرف "لولاك" کے ذکر کر دینے سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ یہ "لولاك لما خلقت الافلاك" سے ماخوذ ہے، یہ حدیث متعدد الفاظ سے مروی ہے، مثلاً

(۱) لولاك لما خلقت الجنة

(۲) لولاك لما خلقت النار

(۳) لولاك لما خلقت الدنیا

پس جب یہ حدیث متعدد الفاظ سے مروی ہے تو صرف "لولاك" کا ذکر "لولاك لما خلقت الافلاك" کو کیسے مستلزم ہو گیا؟ صاحب مضمون کے علم اور بصیرت کے پیش نظر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے سامنے حدیث کے یہ مختلف الفاظ نہیں تھے۔ پھر وہ کون سا جذبہ تھا جس کی وجہ سے بزمی صاحب نے حدیث کے یہ معروف اور مسلم الفاظ چھوڑ کر خاص لفظ "افلاك" کو ذریعہ تنقید بنایا؟

اس حدیث کی تحقیق کے سلسلے میں اولاً گزارش یہ ہے کہ ماہرین حدیث نے تصریح کی ہے کہ "لولاك لما خلقت الافلاك" معناً ثابت ہے۔ لیکن لفظ "افلاك" کے ساتھ ثابت نہیں ہے۔ چنانچہ ملا علی قاری فرماتے ہیں:

لولاك لما خلقت الافلاك قال الصنعانی صنعانی نے کہا کہ "لولاك لما خلقت الا

انه موضوع کذا فی الخلاصة لکن معناه صحیح فقد روی الدیلمی عن ابن عباس رضی الله تعالی عنهما مرفوعا اتانی جبرئیل فقال یا محمد لولاک ما خلقت الجنة ولولاک ما خلقت النار و فی روایة ابن عساکر لولاک ما خلقت الدنیا۔ (موضوعات کبیر ص ۵۹)

فلاک" موضوع ہے (خلاصہ) لیکن اس کا معنی صحیح ہے۔ کیونکہ دیلمی نے ابن عباس سے مرفوعاً روایت کیا ہے: میرے پاس جبریل آئے اور کہا: اگر آپ نہ ہوتے تو میں جنت پیدا کرتا نہ نار اور ابن عساکر کی روایت میں ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں دنیا پیدا نہ کرتا۔

اور مولانا عبدالحئی لکھتے ہیں

قلت نظیر اول ما خلق الله نوری فی عدم ثبوته لفظا و ورودہ معنی ما اشتهر علی لسان القصاص والعوام والخواص من حدیث لولاک ما خلقت الافلاک۔ (الآثار المرفوعہ ص ۳۵)

میں کہتا ہوں کہ "اول ما خلق الله نوری" جس طرح معناً ثابت ہے اور لفظاً ثابت نہیں اسی طرح وہ حدیث ہے جو واعظین اور عوام وخواص کی زبان پر مشہور ہے یعنی "لولاک ما خلقت الافلاک"۔

دیلمی نے "فردوس" میں، احمد قسطلانی نے "المواهب اللدنیہ" میں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "مدارج النبوۃ" میں اور کثیر محدثین اور اجلہ علماء اسلام نے اپنی تصانیف میں اس حدیث کو متعدد الفاظ سے ذکر کیا ہے اور اس پر اعتماد کیا ہے اور اس سے مسائل کو مستنبط کیا ہے اور اس سے روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ محدثین اور علماء اسلام کے نزدیک حدیث لولاک صحیح اور ثابت ہے اور یہ متعدد الفاظ سے مروی ہے، البتہ "لولاک لما خلقت الافلاک" میں "افلاک" کا لفظ کسی روایت سے ثابت نہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ علماء اصول حدیث کی تصریح کے مطابق روایت بالمعنی جائز ہے۔ (دیکھئے شرح نخبۃ الفکر ص ۶۷) اور جب کہ "افلاک" کے معنی میں لفظ "سماء" حدیث میں وارد ہے تو "سماء" کے معنی میں "افلاک" کی روایت قطعاً جائز قرار پائی۔ اسی وجہ سے ماہرین حدیث نے تصریح کی ہے کہ یہ روایت معناً ثابت ہے اور اعاظم علماء اسلام نے اس کو "افلاک" کے لفظ کے ساتھ

روایت کیا ہے۔

ذیل میں ہم ان احادیث کو پیش کر رہے ہیں جن میں "لولاک" کے ساتھ لفظ "سماء" کی صراحت کی گئی ہے۔ چنانچہ علامہ برہان الدین حلبی فرماتے ہیں:

و ذکر صاحب کتاب شفاء الصدور فی مختصرہ عن علی بن ابی طالب رضی الله عنه عن النبی ﷺ عن الله عزوجل قال یا محمد و عزتی و جلالی لولاك ماخلقت ارضی ولا سمائی ولا رفعت هذه الخضراء ولا بسطت هذا الغبراء۔ (انسان العیون ج ۱ ص ۳۵۷)

صاحب "شفاء الصدور" نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے انہوں نے حضور ﷺ سے اور حضور نے اللہ عزوجل سے روایت کیا کہ اللہ نے فرمایا: اے محمد! مجھے اپنی عزت اور جلال کی قسم! اگر آپ نہ ہوتے تو میں زمین پیدا کرتا نہ آسمان، یہ نیلگوں چھت بلند کرتا اور نہ خاکی فرش بچھاتا۔

اور علامہ قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

و فی حدیث عمر بن الخطاب رضی الله عنه عند البیهقی فی دلائله والحاکم و صححه و قول الله تبارك و تعالی لادم علیه السلام لولا محمد ما خلقتك و روی فی حدیث اخر لولاه ما خلقتك ولا خلقت سماء ولا ارضا۔

(مطالع المسرات شرح دلائل الخیرات ص ۲۶۴)

بیہقی اور حاکم نے حدیث عمر میں ذکر کیا اور اس کو صحیح قرار دیا اور وہ اللہ عزوجل کا حضرت آدم سے یہ فرمانا ہے کہ اگر محمد نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا نہ کرتا اور ایک دوسری حدیث میں ہے اگر محمد نہ ہوتے تو میں نہ تم کو پیدا کرتا اور نہ ہی آسمان و زمین کو پیدا کرتا۔

اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی فرماتے ہیں:

امام قسطلانی "مواہب اللدنیہ و منح محمدیہ" میں رسالہ میلاد و امام علامہ ابن طغربک سے ناقل مروی ہوا کہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کیا: الٰہی! تو نے میری کنیت ابو محمد کس لئے رکھی؟ حکم ہوا: اے آدم! اپنا سر اٹھا۔ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سر اٹھایا تو سر پردۂ عرش میں محمد ﷺ کا نور نظر آیا۔ عرض کی: الٰہی! یہ کیسا نور ہے؟ فرمایا:

هذا نور نبی من ذریتك اسمه فی السماء احمد و فی الارض محمد لولاه ما خلقتك ولا خلقت سماء ولا ارضا۔ (تجلی الیقین ص ۴۰)

یہ نور ایک نبی کا ہے، تیری اولاد سے، اس کا نام آسمان میں احمد ہے اور زمین میں محمد۔ اگر وہ نہ ہوتا تو میں نہ تجھے بناتا نہ آسمان و زمین کو پیدا کرتا۔

اور علامہ عبدالرحمٰن صفوری شافعی تحریر فرماتے ہیں:

عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لِمَ خُلِقْتَ قَالَ لَمَّا اَوْحٰى اِلَىَّ رَبِّىْ بِمَا اَوْحٰى قُلْتُ يَا رَبِّ لِمَ خَلَقْتَنِىْ قَالَ تَعَالٰى وَعِزَّتِىْ وَ جَلَالِىْ لَوْلَاكَ مَا خَلَقْتُ اَرْضِىْ وَلَا سَمَائِىْ۔ (نزہۃ المجالس ج ۲ ص ۱۱۹)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ کس لئے پیدا کئے گئے؟ حضور نے فرمایا: جب اللہ نے میری طرف وحی کی تو میں نے پوچھا: تو نے مجھے کس لئے پیدا کیا؟ فرمایا: مجھے اپنی عزت کی قسم! تمہیں پیدا نہ کرتا تو نہ آسمان کو پیدا کرتا اور نہ زمین کو۔

نقول بالا میں یہ حدیث لفظ ''سماء'' کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور اسے علمائے اسلام اور ماہرین حدیث نے روایت کیا ہے اور اس سے ہمارا مقصود اس بات پر دلیل قائم کرنا ہے کہ ''افلاک'' کے معنی میں لفظ ''سماء'' کے ساتھ اس حدیث کی روایت کی گئی ہے اور چونکہ ''افلاک'' کا لفظ معناً ثابت ہے، اس وجہ سے اس حدیث کی ''سماء'' کے معنی میں ''افلاک'' کے ساتھ روایت بالمعنی قطعاً جائز قرار پائی۔

باقی بزمی صاحب کا یہ کہنا ہے کہ:

''پھر ''افلاک'' کا لفظ قرآن و حدیث میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا''۔

چنداں لائق التفات نہیں ہے، کیونکہ اگر صرف لفظ ''افلاک'' کے مطالبہ پر ہی اصرار ہے تو یہ محض لفظی ضد کے سوا کچھ نہیں، ورنہ فلک جو افلاک ہی کا واحد ہے۔ اس کا استعمال قرآن اور حدیث دونوں میں موجود ہے۔ مثلاً قران کریم میں ہے: كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ○ (یٰسین) اسی طرح حدیث شریف میں بھی لفظ ''فلك'' مستعمل ہے، چنانچہ

لغت حدیث کے مشہور امام علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں: "(فلك) فی حديث ابن مسعود تركت فرسك كانه يدور فی فلك"۔ (النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ج ۳ ص ۳۱۵)

اسی طرح لغت حدیث کے ایک دوسرے امام شیخ محمد طاہر نے بھی اس حدیث کو "مجمع بحار الانوار" ج ۳ ص ۹۵ پر فلک کے تحت ذکر کیا ہے۔

مذکورہ بالا تصریح سے ظاہر ہو گیا کہ فلک کا لفظ غیر قرآنی یا غیر حدیثی نہیں ہے اور کتاب وسنت میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ فلہٰذا اس کی جمع افلاک بھی قرآن اور حدیث کی زبان کے لئے اجنبی اور اس سے متصادم نہیں، بلکہ اطلاقات کتاب وسنت کے موافق اور عین مطابق ہے اور یہ تمام حقائق اسانید اسلام اور محققین علماء کرام پر عیاں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف میں اس حدیث کو لفظ افلاک کے ساتھ روایت کیا ہے اور اس پر اعتماد کیا ہے۔

چنانچہ امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

سر حدیث قدسی "لولاك لما خلقت الافلاك" راكه در شان ختم الرسل واقع است عليهم الصلوة والتسليمات اين جا بايد جست۔

حدیث قدسی "لولاك لما خلقت الافلاك" جو حضور ختم الرسل کی شان میں آئی ہے، اس کا بھید بھی اس جگہ معلوم ہونا چاہئے۔ (مکتوبات دفتر سوم حصہ نہم ص ۱۵۵، مکتوب ۱۲۲)

اسی حدیث کو شیخ احمد سرہندی نے "مکتوبات" دفتر سوم حصہ نہم ص ۱۷۶ مکتوب ۱۲۴) میں بھی ذکر فرمایا ہے۔ شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا جو علمی اور تحقیقی مقام ہے وہ خویش و بیگانہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور "مکتوبات" میں شیخ کا اس حدیث کو متعدد بار ذکر کرنا اور اس سے استدلال کرنا اس امر پر آفتاب سے زیادہ روشن دلیل ہے کہ ان کے نزدیک حدیث "لولاك لما خلقت الافلاك" معناً صحیح اور ثابت ہے۔

اور علامہ محمود آلوسی بغدادی فرماتے ہیں:

والتعين الاول المشار اليه بقوله ﷺ اول ما خلق الله نور نبيك يا	اور تعین اول کی طرف حضور کے قول "اول ما خلق الله نوری" میں اشارہ ہے اور

جاہر و بواسطتہ حصلت الا فاضۃ کما یشیر الیہ لولاک لما خلقت الافلاک۔ (روح المعانی ج۱ص۵۱)

اسی کے واسطہ سے خلق کو فیضان ہوا اور اس کی طرف "لولاک لما خلقت الافلاک" میں اشارہ ہے۔

تفسیر "روح المعانی" علماء اہل سنت اور علماء دیوبند میں یکساں مقبول ہے اور علامہ محمود آلوسی کو متاخرین مفسرین میں سب سے اونچا مقام حاصل ہے، ان کی علمی ثقاہت سب کے نزدیک مستند حیثیت رکھتی ہے اور حدیث پر جرح وقدح کرنے میں ان کی نظر ابن جوزی سے کم نہیں ہے۔ چنانچہ بعض ایسی احادیث جن کا عامۃ الفقہاء اور بعض محدثین نے اعتبار کیا ہے، مثلاً منع ذکر جہر کے بارے میں اثر ابن مسعود اور حدیث "تلك الغرانيق العلی" ان کی اسناد علامہ آلوسی نے محققانہ جرح کرنے کے بعد انہیں رد کر دیا ہے۔ پس ایسے عظیم محقق اور ناقد حدیث کا "لولاک لما خلقت الافلاک" سے استشہاد کرنا اس حدیث کی صحت پر نہایت قوی اور عادل شہادت ہے۔

اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی لکھتے ہیں:

"وقولہ لولاہ اقتباس من حدیث لولاک لما خلقت الافلاک"۔

(عطر الوردہ شرح قصیدہ بردہ ص ۱۷، ۲۵)

بوصیری کا قول "لولاہ" حدیث "لولاک لما خلقت الافلاک" کا اقتباس ہے۔

مولانا ذوالفقار علی مسلک دیوبند کے ترجمان اور اصول میں بزمی صاحب کے ہم عقیدہ ہیں۔ اس لئے سلفی اور دیوبندی دونوں حضرات پر مولانا ذوالفقار کی یہ تحریر حجت ہے جس میں انہوں نے "لولاک لما خلقت الافلاک" کا حدیث ہونا تسلیم کر لیا ہے۔

ان تصریحات سے اظہر من الشمس ہو گیا کہ حدیث "لولاک" کی افلاک کے لفظ کے ساتھ روایت بالمعنی جائز ہے اور سماء، جنت، نار اور دنیا کے الفاظ کے ساتھ اس کی روایت باللفظ صحیح ہے اور اس طرح حدیث "لولاک" روایت و درایت، ترکیب و اعراب ہر اعتبار سے بے غبار ہو گئی۔



حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی نمازِ جنازہ

حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پر نماز جنازہ کس طرح اور کس کیفیت سے پڑھی گئی۔ اس بارے میں مختلف قسم کی روایات تاریخ اور سیرت کی کتب میں وارد ہیں۔ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ صحابہ کرام مختلف ٹولیوں اور جماعتوں کی شکل میں آ کر آپ پر صرف صلوٰۃ وسلام عرض کرتے لیکن جو چیز حدیث صحیح سے ثابت ہے اور جو معتمد اور محققین علمائے کرام کا مختار ہے اور جس چیز کی بکثرت کتب سیر میں صراحت ہے اور جو امر اصول حنفیہ اور اصول شافعیہ کے مطابق ہے وہ یہ ہے کہ آپ کی نماز جنازہ معروف طریقہ سے پڑھی گئی۔ الا یہ کہ اس نماز جنازہ میں کوئی شخص امام نہیں تھا اور نہ اس میں ''اللھم اغفر لحینا و میتنا'' والی معروف دعا پڑھی گئی، بلکہ اس دعا کے قائم مقام حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف وتوصیف میں کلمات طیبات عرض کئے گئے۔

علامہ شہاب الدین احمد قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ لکھتے ہیں:

روی انہ لما صلی اھل بیتہ لم یدر الناس ما یقولون فسئلوا ابن مسعود فامرھم ان یسئلوا علیا فقال لھم قولوا ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی۔ الایہ۔ لبیک اللھم ربنا و سعدیک صلوت اللہ البر الرحیم والملائکۃ المقربین والنبیین والصدیقین والشھداء والصالحین و ما سبح لک من شیء یا رب العلمین علی محمد بن عبد اللہ خاتم النبیین و سید المرسلین

روایت ہے کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت نے جب آپ پر نماز جنازہ پڑھ لی تو بعد میں دوسرے حضرات نہ جان سکے کہ وہ آپ پر کس طرح نماز جنازہ پڑھیں۔ لوگوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود سے اس مسئلہ میں پوچھا تو انہوں نے حضرت علی کی طرف رہنمائی کی، حضرت علی نے فرمایا کہ قرآن کریم کی آیت مبارکہ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ، الایۃ پڑھ کر یہ کلمات عرض کرو: ''لبیک اللھم ربنا

و امام المتقين و رسول رب العلمين الشاهد البشير الداعي اليك باذنك السراج المنير و عليه السلام۔ ذكره الشيخ زين الدين بن الحسين المراغي ى كتابه تحقيق النصرة۔

سعديك صلوت الله البر الرحيم و الملائكة المقربين والنبيين والصديقين والشهداء والصالحين و ما سبح لك من شئ يا رب العلمين على محمد بن عبدالله خاتم النبيين و سيد المرسلين و امام المتقين و رسول رب العلمين الشاهد البشير الداعي اليك باذنك السراج المنير و عليه السلام"۔ چنانچہ شیخ زین الدین بن الحسین المراغی نے اپنی کتاب "تحقیق النصرة" میں اسی طرح ذکر کیا ہے۔

علامہ زرقانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ظاهر هذا ان المراد ما ذهب اليه ماعة انه لم يصل عليه الصلوة لمعتادة و انما كان الناس ياتون يدعون قال الباجي ووجهه انه عليه لسلام افضل من كل شهيد يغنيه ضله عن الصلوة عليه فهو صلی اللہ علیہ وسلم لى قال وانما فارق الشهيد في الغسل ن الشهيد حذر من غسله لازالة لدم عنه و هو مطلوب بقاءه لطيبه لانه عنوان لشهادته في الاخرة وليس لى النبي صلی اللہ علیہ وسلم ما تكره ازالته

اس عبارت کا ظاہری مفہوم اس جماعت کی تائید کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر معروف طریقہ سے نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ لوگ علیحدہ علیحدہ آتے اور دعا مانگ کر رخصت ہو جاتے۔ علامہ باجی نے اس قول کی توجیہ میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر شہید سے افضل ہیں اور جب شہید کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جاتی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ نہ پڑھی جانا بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیے۔ (نوٹ: شہید پر نماز جنازہ نہ پڑھنا شافعیہ اور ظاہریہ کا مسلک ہے،

فافترقا انتهى لكن قال قاضى عياض
الصحيح الذى عليه الجمهور ان
الصلوة على النبى ﷺ كانت صلوة
حقيقة لا مجرد الدعاء فقط انتهى
واجيب بما استدل به الاولون بان
المقصود من الصلوة عليه عود
التشريف على المسلمين مع ان
الكامل يقبل زيادة التكميل نعم
لاخلاف انهم لم يومهم احد عليه كما مر
بقول على هو امامكم حيا و ميتا فلا
يوم عليه احد و لحديث رواه ابن سعد
و اخرج الترمذى ان الناس قالوا لابى
بكر انصلى على رسول الله ﷺ
قال نعم قالوا و كيف نصلى قال يدخل
قوم فيكبرون و يصلون و يدعون ثم
يدخل قوم فيصلون و يكبرون و يدعون
فرادى۔ (شرح العلامہ الزرقانی علی المواہب
اللدنیہ للقسطلانی ج ۸ ص ۲۹۲)

احناف کے نزدیک شہید پر نماز جنازہ
پڑھی جاتی ہے۔ سعیدی غفرلہ) البتہ حضور
ﷺ کو غسل دیا گیا اور شہید کو غسل نہیں
دیا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہید کے جسم
پر جو خون لگا ہوتا ہے اس کو باقی رکھنا ہوتا
ہے تاکہ قیامت کے روز حشر میں اس کی
شہادت کی گواہی دے۔ حضور ﷺ کے
جسم پر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کو زائل کرنا
ناپسندیدہ ہوتا لیکن قاضی عیاض رحمہ اللہ نے
فرمایا کہ صحیح بات وہی ہے جو جمہور کا مسلک
ہے کہ حضور ﷺ کی نماز جنازہ معروف
طریقہ سے پڑھی گئی تھی۔ علامہ زرقانی
علامہ باجی کی دلیل کے جواب میں فرماتے
ہیں کہ حضور پر نماز جنازہ سے مقصود حضور کو
فائدہ پہنچانا نہیں تھا حتیٰ کہ اس کو شہید پر
قیاس کیا جائے، بلکہ حضور پر نماز جنازہ
پڑھنے سے مسلمانوں کو شرف دینا تھا اور
اگر جنازہ پڑھنے سے صاحب جنازہ کو کوئی
کمال حاصل ہوتا ہے تو جو شخص کامل ہو وہ
زیادتی کمال کو قبول کرتا ہے۔ ہاں اس
بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ حضور ﷺ
پر جو نماز جنازہ پڑھی گئی تھی اس میں امام
کوئی شخص نہیں تھا، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

قول ہے کہ حضور ﷺ حیات اور بعد
الوفات ہر شخص کے امام ہیں۔ بحوالہ ابن
سعد نیز امام ترمذی نے اپنی سند کے ساتھ
روایت کیا ہے کہ حضور ﷺ کے وصال
کے بعد صحابہ نے حضرت ابوبکر سے
دریافت کیا کہ ہم حضور ﷺ پر نماز
پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پوچھا: کس
طرح؟ فرمایا: گروہ در گروہ جاؤ، تکبیرات
جنازہ پڑھو، درود شریف پڑھو اور دعائیہ
کلمات عرض کرو اور سب الگ الگ نماز
پڑھو، یعنی بغیر امام کے۔

زرقانی کے اس اقتباس سے ظاہر ہو گیا کہ حضور ﷺ کی نماز جنازہ معروف طریقہ سے پڑھی گئی تھی۔ البتہ نہ کوئی شخص امام تھا اور نہ نماز میں درود شریف کے بعد ''اللھم اغفر لحینا'' والی معروف دعا پڑھی گئی تھی۔ اس کی جگہ مخصوص دعا اور ثناء کے کلمات پڑھے گئے، جو مختلف حضرات نے مختلف الفاظ سے پڑھے، جیسا کہ عنقریب ظاہر ہوگا، یہی جمہور امت کا مسلک ہے اور یہی صحیح بات ہے اور بعض لوگوں نے جو معروف نماز جنازہ کے برخلاف صرف صلوۃ وسلام کا قول کیا ہے اس کے باطل ہونے کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

(۱) علامہ قسطلانی نے ''تحقیق النصرۃ'' سے معروف نماز جنازہ کے برخلاف جو مجرد دعا کی روایت نقل کی ہے وہ بلا سند ہے اس کو ''روی'' کے صیغہ تمریض سے ذکر کیا ہے اور یہ مجہول روایت ہے۔ اس کے برخلاف امام ترمذی نے ''شمائل ترمذی'' میں سند صحیح کے ساتھ حضور ﷺ پر معروف طریقہ سے نماز جنازہ پڑھنے کی حدیث کا اخراج کیا ہے۔

(۲) علامہ باجی نے جو معروف طریقہ سے نماز جنازہ نہ پڑھنے کی توجیہ کی ہے اس کو علامہ

زرقانی نے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ پڑھنے سے مقصود حضور کے لئے مغفرت کی دعا کر کے آپ کو فائدہ پہنچانا نہیں، بلکہ مقصود حضور سے نسبت قائم رکھ کر خود کو مشرف کرنا تھا۔ اس لئے استغفار کے کلمات عرض نہیں کئے گئے۔ اس کی نظیر درود شریف ہے، ہم ''اللهم صل علی محمد'' کہتے ہیں، یعنی اے اللہ! محمد پر رحمت نازل فرما، تو اس سے قطعاً کسی مسلمان کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں ہوتی کہ وہ اللہ سے حضور کے لئے رحمت طلب کر رہا ہے اور اس کی اس دعا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی فائدہ پہنچے گا، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس درود و دعا سے درود پڑھنے والے کو فائدہ پہنچے گا کہ یہ شخص بھی حضور کے غلاموں، خیر خواہوں اور ثنا گزاروں میں شامل ہے۔ اسی طرح اذان کے بعد حضور کے لئے مقام محمود کے حصول کے لئے دعا مانگنے کا حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس دعا کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم دعا کریں گے تو حضور کو مقام محمود ملے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے: عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (بنی اسرائیل) کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مقام محمود عطا فرمائے گا تو لازماً اس دعا کے ذریعہ ہم اپنی نمک خواری، حضور کے حق میں خیر خواہی، ثنا گزاری اور اپنی غلامی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز جنازہ میں جو آپ کے حق میں دعا و ثناء کے کلمات عرض کئے گئے تھے ان سے مقصود صحابہ کرام کا اس دعا و ثناء سے خود کو مشرف کرنا تھا، نہ کہ معاذ اللہ اپنی ذات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی فیض پہنچانے کا قصد تھا۔

(۳) علامہ باجی نے حضور کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کو شہید کی نماز جنازہ نہ پڑھنے پر جو قیاس کیا ہے وہ بر خود غلط ہے۔ اس لئے کہ صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ شہید کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

امام محمد بن اسماعیل البخاری المتوفی ۲۵۶ھ اپنی ''صحیح'' میں روایت کرتے ہیں:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ اَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم خَرَجَ يَوْمًا فَصَلّٰى عَلٰى اَهْلِ اُحُدٍ صَلٰوتَهٗ	عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن تشریف لائے اور آپ

عَلَى الْمَيِّتِ۔ (صحیح البخاری ج ا ص ۱۷۹) نے شہدائے احد پر نماز جنازہ پڑھی۔

اس حدیث سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر علامہ باجی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ نہ پڑھے جانے کا محل تعمیر کیا تھا۔

بہر حال اس تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا کہ اس مسئلہ میں اختلاف ضرور رہا ہے، لیکن صحیح بات وہی ہے جو جمہور کا مسلک ہے۔ چنانچہ مجدد مائۃ حاضرہ اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ متوفی ۱۳۴۰ھ فرماتے ہیں:

جنازہ اقدس پر نماز کے باب میں علماء مختلف ہیں، ایک گروہ کے نزدیک یہ نماز معروف نہ ہوئی بلکہ لوگ گروہ در گروہ حاضر آتے اور صلوٰۃ و سلام عرض کرتے، بعض احادیث بھی اس کی مؤید ہیں کما بیناہ فی رسالتنا ''النھی الحاجز عن تکرار صلوۃ الجنائز'' اور بہت سے علمائے کرام یہی نماز معروف مانتے ہیں، امام قاضی عیاض نے اس کی تصحیح فرمائی، کما فی ''شرح الموطا للزرقانی'' سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تسکین فتن و انتظام امت میں مشغول تھے۔ جب تک ان کے دست حق پر بیعت نہ ہوئی تھی لوگ فوج در فوج آتے اور جنازہ انور پر نماز پڑھتے جاتے۔ جب بیعت ہوئی، ولی شرعی صدیق اکبر ہوئے، انہوں نے جنازہ مقدس پر نماز پڑھی، پھر کسی نے نہ پڑھی کہ بعد صلوٰۃ ولی پھر اعادۂ نماز جنازہ کا اختیار نہیں۔ ان تمام مطالب کی تفصیل قلیل فقیر کے رسالہ مذکورہ میں ہے۔ مبسوط امام شمس الائمہ سرخسی میں ہے:

ان ابا بکر رضی اللہ عنہ کان مشغولا بتسویة الامور و تسکین الفتنة فکانوا یصلون علیه حضورۃ و کان الحق له هو الخلیفة فلما فرغ صلی علیه ثم لم یصل علیه بعد لاعلیه۔ (فتاویٰ رضویہ ج ۴ ص ۵۴)

''فتاویٰ رضویہ'' کے اس اقتباس سے ظاہر ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ معروفہ نہ پڑھنا صرف علماء کے ایک گروہ کا قول ہے اور باقی تمام علماء اسلاف اس بات کو مانتے چلے آئے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ معروف طریقہ سے پڑھی گئی تھی اور اب ہم آپ کے سامنے جمہور کے مسلک پر ایسے دلائل اور شواہد پیش کرتے ہیں جن سے صرف نظر

کرنا ممکن نہیں ہے۔

حدیث صحیح سے استدلال

امام ابو عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں، جس کے آخر میں ہے:

قالوا یا صاحب رسول الله ﷺ اقبض رسول الله ﷺ قال نعم فعلموا ان قد صدق قالوا یا صاحب رسول الله ﷺ انصلی علی رسول الله ﷺ قال نعم قالوا کیف قال یدخل قوم فیکبرون و یدعون و یصلون ثم یخرجون ثم یدخل قوم فیکبرون و یصلون و یدعون ثم یخرجون ثم یدخل قوم فیکبرون و یصلون و یدعون ثم یخرجون حتی یدخل الناس۔

(الحدیث بطولہ، شمائل ترمذی ص ۲۴)

صحابہ کرام نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے صاحب رسول ﷺ! کیا رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے؟ آپ نے فرمایا: ہاں! پس انہوں نے آپ کے صدق کو جان لیا۔ پھر پوچھا: کیا ہم رسول اللہ ﷺ پر نماز جنازہ پڑھیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں! انہوں نے پوچھا: کیسے؟ آپ نے فرمایا: ایک جماعت داخل ہو کر تکبیر پڑھے، دعا مانگے اور درود شریف پڑھے، پھر وہ چلے جائیں۔ پھر ایک جماعت داخل ہو کر تکبیر پڑھے، درود پڑھے اور دعا مانگے، پھر وہ چلے جائیں۔ پھر ایک جماعت داخل ہو کر تکبیر پڑھے، درود پڑھے اور دعا مانگے، پھر وہ چلے جائیں، یہاں تک کہ سب لوگ داخل ہوں۔

نماز جنازہ میں اصل اور فرض قیام اور تکبیرات اربعہ ہیں، باقی ثناء، صلوٰۃ اور دعا وغیرہ ثانوی حیثیت اور استحباب کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس حدیث صحیح میں تکبیرات کا ذکر موجود ہے اور وہی نماز جنازہ کی اصل ہے۔ باقی دعا اور صلوٰۃ کا بھی ذکر ہے اور یہ واضح رہے کہ دعا سے مراد یہاں وہی ہے جو حضور ﷺ کے شایان شان ہے۔

اصول حنفیہ کی روشنی میں

ائمہ احناف کے نزدیک ولی کی نماز جنازہ پڑھنے کے بعد جنازہ کو دوبارہ نہیں پڑھا جاسکتا۔ چنانچہ امام اجل برہان الدین ابوالحسن علی بن ابوبکر الفرغانی المتوفی ۵۹۳ھ فرماتے ہیں:

ان صلی غیر الولی والسلطان اعاد الولی ان شاء لان الحق للاولیاء وان صلی الولی لم یجز لاحد لان الفرض یتادی بالاول والنفل بها غیر مشروع و لهذا رأینا الناس ترکوا عن اخرهم الصلوة عن قبر النبی ﷺ و هو الیوم کما وضع۔ (ہدایہ ج ۱ ص ۱۴۰)

اگر ولی اور حاکم اسلام کے سوا اور لوگ نماز جنازہ پڑھ لیں تو ولی کو اعادہ کا اختیار ہے کہ حق اولیاء کا ہے اور اگر ولی نے نماز جنازہ پڑھ لی تو اب دوبارہ کسی شخص کو نماز جنازہ پڑھنے کا اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ فرض تو پہلی نماز سے ادا ہو چکا اور یہ نماز بطور نفل پڑھنا مشروع نہیں ہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ کے مزار اقدس پر تمام جہان کے مسلمانوں نے نماز جنازہ پڑھنی چھوڑ دی، حالانکہ حضور آج بھی ویسے ہی (زندہ اور تر و تازہ) ہیں جیسے اس دن تھے جب آپ کو قبر مبارک میں رکھا گیا تھا۔

اور امام کمال الدین بن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

لو کان مشروعا لما اعرض الخلق کلهم من العلماء و الصالحین و الراغبین فی التقرب الیه الصلوة والسلام بانواع الطرق عنه فهذا دلیل ظاهر علیه فوجب اعتبارہ۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۴۵۸)

اگر نماز جنازہ کی تکرار مشروع ہوتی تو مزار اقدس پر نماز پڑھنے سے تمام جہان اعراض نہ کرتا جس میں علماء و صلحاء اور وہ حضرات ہیں جو طرح طرح سے حضور ﷺ کی بارگاہ میں تقرب حاصل کرنے کی رغبت رکھتے ہیں تو سلف سے لے کر

خلف تک تمام مسلمانوں کا حضور کی قبر انور
پر نماز جنازہ نہ پڑھنا نماز جنازہ کے تکرار
کے عدم جواز کی کھلی ہوئی دلیل ہے اور اس
کا اعتبار کرنا واجب ہے۔

"ہدایہ" اور "فتح القدیر" کی عبارت سے ظاہر ہوگیا کہ وہ نماز جنازہ کے عدم تکرار کی مشروعیت اس بنیاد پر رکھتے ہیں کہ کل جہاں کے مسلمان، علماء اور صلحاء آپ کی قبر انور پر نماز جنازہ نہیں پڑھتے اور یہ استدلال اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے کہ نماز جنازہ سے مراد معروف نماز جنازہ ہو اور اگر اس سے مراد محض صلوٰۃ وسلام پڑھنا ہو تو وہ آج تک قبر انور پر پڑھا جاتا ہے۔ اس صورت میں احناف کثرھم اللہ تعالیٰ کا یہ استدلال کس طرح صحیح ہوگا۔

اصول شافعیہ کی روشنی میں

امام شافعی کے نزدیک میت پر متعدد بار نماز جنازہ پڑھنا جائز ہے۔

امام اکمل الدین محمد بن محمود البابرتی المتوفی ۷۸۶ھ تحریر فرماتے ہیں:

قال الشافعی تعاد الصلوۃ علی الجنازۃ مرۃ بعد اخری لما روی ان النبی ﷺ مر بقبر جدید فسال عنہ فقیل قبر فلانۃ فقال ھلا اذنتمونی بالصلوۃ فقیل انھا دفنت لیلا فخشینا علیک ھوام الارض فقام و صلی علی قبرھا و لما قبض رسول اللہ ﷺ صلی علیہ اصحابہ فوجا بعد فوج۔

(عنایہ شرح ہدایہ علی ہامش فتح القدیر ج۱ ص ۴۵۸)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جنازہ پر بار بار نماز پڑھی جا سکتی ہے، کیونکہ حضور ﷺ کا گزر ایک نئی قبر پر ہوا تو آپ نے اس کے بارے میں پوچھا، بتایا گیا کہ فلاں عورت کی قبر ہے، فرمایا: مجھے کیوں نہ خبر دی؟ عرض کیا گیا کہ اس کو رات کو دفن کیا گیا تھا اور ہمیں خوف تھا کہ آپ کو حشرات الارض سے تکلیف نہ پہنچے۔ حضور نے قبر پر اس کی نماز پڑھی اور جب حضور کا وصال ہوا تو صحابہ نے گروہ در گروہ آپ کی نماز جنازہ پڑھی۔

امام شافعی کا یہ استدلال بھی اس وقت تک صحیح نہیں ہوگا جب تک حضور کی نماز جنازہ کو معروف نماز جنازہ پر محمول نہ کیا جائے۔

سابقہ تحریرات سے یہ ظاہر ہو گیا کہ حضور ﷺ کی نماز جنازہ سے حنفیہ اور شافعیہ نے اپنے اپنے موقف پر استدلال کیا ہے۔ احناف نماز جنازہ کے عدم تکرار کے قائل ہیں اور وہ قبر انور پر سلف و خلف کے نماز جنازہ نہ پڑھنے سے استدلال کرتے ہیں اور شافعیہ نماز جنازہ کا تکرار جائز کہتے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے حضور ﷺ کے جنازہ پر صحابہ کرام کے گروہ در گروہ کا بار بار نماز جنازہ پڑھنے سے نماز جنازہ کے تکرار کی مشروعیت پر استدلال کیا ہے اور یہ دونوں استدلال اسی وقت درست ہو سکتے ہیں جب نماز جنازہ سے مراد معروف نماز جنازہ ہو نہ کہ فقط درود و سلام، کیونکہ ما بہ النزاع معروف نماز جنازہ ہے نہ کہ محض درود و سلام۔

آیئے! اب ہم "حدیث ترمذی" کی شرح، حنفی اور شافعی علماء کی تقریرات کی روشنی میں دیکھیں۔

ملا علی قاری حنفی کی شرح

حضرت محدث ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۴ھ فرماتے ہیں:

(قال یدخل قوم فیکبرون) ای اربع تکبیرات وھن الارکان عندنا والبواقی مستحبات (ویدعون ویصلون) ای علی النبی ﷺ والواو لمطلق الجمع اذا الصلوۃ مقدمۃ علی الدعاء ولم یذکر التسبیح لما ھو معلوم من وقوعہ بعد التکبیرۃ الاولی و انما بین الصلوۃ والدعاء المخصوصین فی ھذہ الصلوۃ بعد التکبیرتین من الثانیۃ والثالثۃ

"ایک قوم داخل ہو کر تکبیریں پڑھے" یعنی چار تکبیریں اور یہی نماز جنازہ میں ہمارے نزدیک فرض ہیں اور باقی امور مستحب ہیں "اور دعا اور درود پڑھیں" اس جگہ واؤ مطلقاً جمع کے لئے ہے کیونکہ نماز جنازہ میں پہلے درود پڑھتے ہیں اور پھر دعا مانگتے ہیں اور حدیث شریف میں ثناء کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ ثناء تکبیر اولیٰ کے بعد پڑھی جاتی ہے۔

فیہ ایماء الی عدم الدعاء بعد الرابعۃ واشعار بعدم فرضیۃ قراءۃ الفاتحۃ بعد التکبیرۃ الاولی۔

(جمع الوسائل شرح شمائل ترمذی ج ۲ ص ۲۱۶)

حضرت ابوبکر نے دوسری اور تیسری تکبیروں کے بعد اس نماز جنازہ میں بالخصوص دعا اور درود کا ذکر کیا ہے، اس میں یہ اشارہ ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد نماز جنازہ میں دعا نہیں ہوتی اور نہ ہی پہلی تکبیر کے بعد سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے۔

حضرت ملا علی قاری کی یہ شرح سوائے معروف نماز جنازہ کے اور کسی چیز پر منطبق نہیں ہوتی۔

امام مناوی شافعی کی شرح

حضرت محدث عبدالرؤف المناوی الشافعی المتوفی ۱۰۰۳ھ فرماتے ہیں:

و قال یدخل قوم فیکبرون و یدعون و یصلون ثم یخرجون فیہ وجوب ھذہ الثلاثۃ وھی ارکان عند الشافعی و قدم الدعاء علی الصلوۃ لما تقرران الاستفھام عن الصلوۃ علیہ لتردد فی انہ ھل یحتاج للدعاء و فیہ ان تکریر صلوۃ الجنازۃ غیر ممنوع وان لم یصلوا کلھم بامام واحد۔

(شرح شمائل ترمذی علی ہامش جمع الوسائل ج ۲ ص ۲۱۲)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک گروہ جا کر تکبیر پڑھے، دعا مانگے اور درود پڑھے، پھر آ جائے۔ اس فرمان میں یہ اشارہ ہے کہ یہ تینوں امور واجب ہیں اور امام شافعی کے نزدیک یہی امور نماز جنازہ کے ارکان ہیں اور دعا کا ذکر درود سے پہلے اس لئے کیا ہے کہ سائل کو اس بات میں تردد تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دعا ہوگی یا نہیں اور اس حدیث میں یہ اشارہ بھی ہے کہ نماز جنازہ کا تکرار مشروع اور جائز ہے، خواہ وہ نماز کسی ایک امام کی اقتداء میں نہ پڑھی گئی ہو۔

حضرت محدث عبدالرؤف المناوی الشافعی نے جو اس حدیث کی شرح کی ہے وہ بھی

سوائے معروف نماز جنازہ کے اور کسی چیز پر منطبق نہیں ہوتی۔

احناف کے جوابات

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازہ پر جو صحابہ کرام نے گروہ در گروہ آ کر نماز جنازہ پڑھی اور اس سے ائمہ شافعیہ نے نماز جنازہ کے تکرار کی مشروعیت کو مستنبط کیا۔ ائمہ احناف نے ان کے استدلال کے مسکت جوابات دے کر ان کے اس استشہاد کو اصلاً ساقط کر دیا۔

چنانچہ علامہ سید ابن عابدین شامی المتوفی ۱۲۵۲ھ فرماتے ہیں:

ذکر فی النهایة عن المبسوط بعد ما ذکرہ ان تعلیل الصحابة علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان ابابکر رضی الله عنه کان مشغولا بتسویة الامور و تسکین الفتنة و کانوا یصلون علیه قبل حضورہ و کان الحق له فلما فرغ صلی علیه ثم لم یصل بعدہ۔ (رد المحتار ج ۱ ص ۸۲۵)

حضرت ابوبکر سے پہلے صحابہ کے نماز جنازہ پڑھنے کی تاویل کو صاحب ''عنایہ'' نے ''مبسوط'' سے نقل کرنے کے بعد کہا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ معاملات کو درست کرنے میں اور فتنہ کو دور کرنے میں معروف تھے، اس وجہ سے صحابہ کرام حضرت ابوبکر سے پہلے نماز جنازہ پڑھتے رہے، حالانکہ حق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا تھا۔ کیونکہ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے وہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ولی تھے۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو انہوں نے نماز جنازہ پڑھی اور ان کے بعد پھر کسی نے آپ پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

علامہ شامی کے جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ولی کے پڑھنے سے پہلے احناف کے نزدیک تکرار جائز ہے اور ولی کے بعد جائز نہیں اور صحابہ کرام کا تکرار ولی شرعی حضرت ابوبکر صدیق کے نماز جنازہ سے پہلے تھا۔ اس لئے یہ تکرار اصول حنفیہ سے متصادم نہیں ہے۔

شافعیہ کے اسی استدلال کا جواب دیتے ہوئے علامہ احمد بن اسماعیل الطحطاوی المتوفی ۱۲۳۱ھ تحریر فرماتے ہیں:

و صلوٰۃ الصحابة علیه ﷺ افواجا خصوصیة کما تاخیر دفنه من یوم الاثنین الی لیلة الاربعاء کان کذلک لانه مکروہ فی حق غیرہ بالاجماع اولانها کانت فرض عین علی الصحابة لعظیم حقه ﷺ لا تنفلابها والا یصلی علی قبرہ الشریف الی یوم القیمة لبقائه ﷺ کما دفن طریا بل هو حی یرزق بسائر الملاذ و العبادات و کذا سائر الانبیاء علیهم الصلوٰۃ والسلام و قد اجتمعت امة علی ترکها کما فی السراج و الحلبی والشرح۔

(حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۳۵۷)

صحابہ کرام کا حضور ﷺ کی نماز جنازہ کو فوج در فوج پڑھنا اسی طرح حضور کی خصوصیت کے سبب تھا جیسے آپ کے دفن میں پیر سے بدھ کی رات تک تاخیر، حالانکہ دوسروں کے حق میں تاخیر دفن بالاجماع مکروہ ہے یا حضور کے حق کی وجہ سے کہ تمام صحابہ پر حضور کی نماز جنازہ پڑھنا فرض تھی (اور وہ یکبار پڑھنے سے ممکن نہ تھا) فوج در فوج پڑھنا نفل کی وجہ سے نہ تھا ورنہ قیامت تک حضور ﷺ پر نماز جنازہ پڑھی جاتی، کیونکہ حضور ﷺ دفن کے وقت سے لے کر اب تک اسی حالت میں ہیں، بلکہ آپ زندہ ہیں اور آپ کو تمام لذائذ اور عبادات حاصل ہیں جیسا کہ دیگر انبیاء علیہم السلام ہیں۔ حالانکہ امت نے آپ پر نماز جنازہ پڑھنے کے ترک پر اجماع کر لیا ہے۔

شیخ ابراہیم حلبی نے بھی ''غنیۃ المستملی'' ص ۵۴۲ میں اس قسم کے جوابات دیئے ہیں اور فقہاء اسلام کی ان تمام عبارات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تمام گفتگو حضور ﷺ کے جنازہ پر معروف نماز جنازہ میں ہے نہ کہ محض صلوٰۃ وسلام میں۔ کیونکہ نماز جنازہ کا پڑھنا قبر پر اجماعاً متروک ہو چکا ہے اور صلوٰۃ وسلام تو قبر پر آج تک پڑھا جا رہا ہے اور ان شاء اللہ العزیز تا قیامت پڑھا جاتا رہے گا۔

امام شافعی کا ایک اور استدلال

امام شافعی کے نزدیک نماز جنازہ کے لئے امام کا ہونا ضروری نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں

کہ امام کے بغیر اگر علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لی جائے تب بھی وہ ادا ہو جائے گی۔ ملاحظہ فرمایئے:

ابو عبداللہ محمد بن ادریس الشافعی المتوفی ۲۰۴ھ تحریر فرماتے ہیں:

فقد صلی الناس علی رسول اللہ ﷺ افرادا و لم یومھم احد و ذلک لعظم امر رسول اللہ ﷺ وتنافسھم فی ان لا یتولی الامامۃ فی الصلوۃ علیہ واحد وصلوا علیہ مرۃ بعد مرۃ و سنۃ رسول اللہ ﷺ فی السوق والامر المعمول بہ الی الیوم ان صلی علیہ بامام ولو صلی علیھم افرادا جزاھم الصلوۃ ان شاء اللہ۔

حضور ﷺ پر صحابہ کرام نے علیحدہ علیحدہ نماز جنازہ پڑھی اور کوئی شخص امام نہ ہوا، اس کا سبب حضور کی عظمت تھا اور ان کا یہ چاہنا کہ حضور کی نماز پڑھانے کا حق کسی شخص کو بھی نہ ہو اور وہ گروہ در گروہ حاضر ہو کر نماز جنازہ پڑھانے کا طریقہ اور آج تک کا تعامل یہی ہے کہ نماز جنازہ امام کی اقتداء میں ہونی چاہیے، تاہم اگر بغیر امام کے پڑھی گئی تو وہ ان شاء اللہ ادا ہو جائے گی۔

(کتاب الام جزء ۱ ص ۲۷۵)

امام شافعی کی یہ تقریر اور استدلال بھی اسی وقت صحیح ہو گا جب سرکار دو عالم ﷺ کی نماز جنازہ کو معروف نماز جنازہ پر محمول کیا جائے۔

نماز جنازہ میں امام کا نہ ہونا

حضور ﷺ کی نماز جنازہ میں امام مقرر نہ کرنے کی علمائے کرام نے متعدد وجوہات بیان کی ہیں۔ امام شافعی نے اس کو حضور ﷺ کی عظمت اور خصوصیت قرار دیا اور یہ بھی فرمایا کہ کسی ایک کے امام بن جانے سے ترجیح بلا مرجح لازم آتی۔ علامہ بیجوری نے بیان کیا کہ اس وقت تک کسی ایک کی امامت پر اتفاق نہیں ہوا تھا۔ بعض نے کہا: آپ کا جنازہ مبارکہ حجرہ شریفہ میں موجود تھا اور وہاں اتنی گنجائش نہ تھی کہ تمام صحابہ جماعت کے ساتھ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ لیتے۔ شمس الائمہ سرخسی نے کہا کہ آپ کی نماز جنازہ کی ولایت کا استحقاق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے ثابت تھا لیکن حضرت ابو بکر دوسرے معاملات میں مصروف تھے، اس لئے لوگوں نے فرداً فرداً نماز جنازہ پڑھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

الکریم نے فرمایا کہ حضور ﷺ حالت حیات و وفات دونوں میں مسلمانوں کے یکساں امام تھے۔ پس آپ کی موجودگی میں کسی اور کی امامت کا سوال نہ تھا اور ملا علی قاری نے "جمع الوسائل" میں یہ روایت بھی نقل فرمائی ہے کہ حضور ﷺ نے علیحدہ علیحدہ نماز جنازہ پڑھنے کا خود حکم دیا تھا۔

دعا معروف کی جگہ کلمات طیبہ

عام طور پر نماز جنازہ میں درود شریف کے بعد "اللھم اغفر لحینا" والی دعا پڑھی جاتی ہے۔ لیکن سرکار کی نماز جنازہ میں اس دعا کی جگہ مخصوص دعا و ثنا کے کلمات طیبات عرض کیے گئے جو مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہیں۔

علامہ شہاب الدین احمد قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ نے یہ کلمات نقل کئے ہیں:

لبیك اللهم ربنا و سعدیك صلوة الله البر الرحیم والملئكة المقربین والنبیین والصدیقین والشهداء والصالحین و ما سبح لك من شئی یا رب العلمین علی محمد بن عبدالله خاتم النبیین و سید المرسلین و امام المتقین و رسول رب العالمین الشاهد البشیر الداعی الیك باذنك السراج المنیر و علیه السلام۔ (المواهب اللدنیہ مع شرح الزرقانی ج ۸ ص ۲۹۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ کلمات منقول ہیں:

السلام علیك ایها النبی و رحمة الله و برکاته اللهم انا نشهد ان قد بلغ ما انزل الیه ونصح لامته و جاهد فی سبیل الله حتی اعز الله دینه و نصح لامته و جاهد فی سبیل الله وتمت کلمته اللهم فاجعلنا ممن یتبع ما انزل الیه و ثبتنا بعده واجمع بیننا و بینه۔

(بزار بحوالہ خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۴۹۵)

اے نبی! آپ پر اللہ کا سلام اور اس کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں۔ اے اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ حضور نے ہم تک وہ سب کلام پہنچا دیا جو آپ پر نازل ہوا اور امت کی خیر خواہی چاہی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور اللہ کے دین کو غالب کیا اور امت کی بھلائی چاہی اور جہاد فی سبیل اللہ کیا اور اللہ کا دین کامل ہو گیا۔ اے اللہ! ہم کو بھی

اسلام کا پیروکار بنا جو آپ پر نازل ہوا اور آپ کے بعد ہم کو ثابت قدم رکھ اور آخرت میں ہم کو حضور کے ساتھ جمع کر دے۔

نماز جنازہ کا ثبوت کتب تاریخ وسیر میں

امام محمد بن سعد کاتب واقدی متوفی ۲۳۰ھ تحریر فرماتے ہیں:

عن سعید بن المسیب یقول لما توفی رسول اللہ ﷺ وضع علی سریرہ فکان الناس یدخلون علیہ زمرا زمرا یصلون علیہ ویخرجون ولم یؤمھم احد
(کتاب الطبقات الکبریٰ ج ۲ جزء ۲، ص ۶۰)

سعید بن مسیب سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے تو آپ کا جنازہ رکھ دیا گیا۔ لوگ آ کر فوج در فوج نماز پڑھتے اور چلے جاتے اور کوئی شخص آپ کی نماز جنازہ میں امام نہ تھا۔

امام ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ تحریر فرماتے ہیں:

لما توفی رسول اللہ ﷺ ادرج فی اکفانہ و وضع علی سریرہ فکان الناس یصلون علیہ رفقا رفقا لا یؤمھم احد دخل الرجال فصلوا علیہ ثم النساء۔
(الوفا باحوال المصطفیٰ ص ۷۹۶)

جب رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے تو آپ کو کفن میں لپیٹ دیا گیا اور آپ کا جنازہ رکھ دیا گیا۔ پس لوگ آ کر گروہ در گروہ نماز پڑھتے اور کوئی شخص امام نہ تھا۔ پہلے مردوں نے نماز پڑھی اور پھر عورتوں نے۔

حافظ ابن کثیر متوفی ۷۷۴ھ لکھتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا مَاتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِدْخَلَ الرِّجَالُ فَصَلُّوْا عَلَيْهِ بِغَيْرِ اِمَامٍ اَرْسَالًا حَتّٰى فَرَغُوْا ثُمَّ اِدْخَلَ النِّسَاءُ فَصَلَّيْنَ ثُمَّ اِدْخَلَ الصِّبْيَانُ فَصَلُّوْا عَلَيْهِ ثُمَّ اِدْخَلَ الْعَبِيْدُ فَصَلُّوْا عَلَيْهِ اَرْسَالًا لَمْ يَؤُمَّهُمْ عَلَى الرَّسُوْلِ

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کا وصال ہو گیا تو پہلے مردوں نے جا کر آپ کے جنازہ پر بغیر کسی امام کے علیحدہ علیحدہ نماز پڑھی اور جب وہ فارغ ہو گئے تو عورتوں نے جا کر نماز پڑھی۔ پھر بچوں نے، پھر غلاموں نے، سب نے

ﷺ أفذٰ۔ | الگ الگ نماز پڑھی بغیر کسی امام کے۔

(السیرۃ النبویہ ج ۴ ص ۵۲۷)

حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ تحریر فرماتے ہیں:

اختصاصہ ﷺ بالصلوۃ علیہ افرادا بغیر امام و بغیر دعاء الجنازۃ المعروف۔ (الخصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۲۹۴)	حضور ﷺ کا یہ اختصاص تھا کہ آپ کی نماز جنازہ الگ الگ بغیر امام کے پڑھی گئی اور نہ اس میں نماز جنازہ کی معروف دعا پڑھی گئی۔

علامہ علی بن برہان الدین حلبی متوفی ۱۰۴۴ھ حضور کی نماز جنازہ میں پڑھی ہوئی دعا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی دعا میں عرض کیا:

اللھم انا نشھد انہ ﷺ قد بلغ ما انزل الیہ و نصح لامتہ و جاھد فی سبیل اللہ حتی اعز اللہ دینہ و تمت کلمتہ فاجعلنا الھنا ممن تبع القول الذی انزل معہ واجمع بیننا و بینہ حتی تعرفہ بنا و تعرفنا بہ فانہ کان بالمؤمنین رؤفا رحیما لا نبتغی بالایمان بہ بدلا ولا نشتری بہ ثمنا ابدا فیقول الناس امین امین۔ و ھذا یدل علی انہ المراد بالصلوۃ علیہ ﷺ الدعاء لا الصلوۃ علی الجنازۃ المعروفۃ عندھم والصحیح ان ھذا الدعاء کان فی ضمن الصلوۃ المعروفۃ التی باربع تکبیرات	اے اللہ! ہم گواہی دیتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اس تمام کلام کو ہم تک پہنچا دیا جو ان پر نازل کیا گیا تھا اور امت کی خیر خواہی کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو غالب کر دیا اور اس کا وعدہ پورا ہو گیا۔ پس اے اللہ! ہم کو اس کلام کا پیروکار بنا جو تو نے اپنے رسول پر نازل کیا اور روز حشر ہم کو اور حضور کو جمع کر دے۔ حتیٰ کہ حضور کو ہم سے ملا دے اور ہم کو حضور سے۔ کیونکہ حضور مسلمانوں پر مہربان اور شفیق تھے۔ ہم حضور پر ایمان لانے کا کوئی عوض نہیں چاہتے اور نہ اس کے بدلہ میں کبھی کوئی سودا کریں گے

فقد جاء ان ابابکر رضی اللہ عنہ دخل علیہ ﷺ فکبر اربع تکبیرات ثم دخل عمر رضی اللہ عنہ فکبر اربعا ثم دخل عثمان رضی اللہ عنہ فکبر اربعا ثم طلحۃ بن عبیداللہ و زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما ثم تتابع الناس ارسالا یکبرون علیہ۔ ای وعلی ھذا انما خصوا الدعاء بالذکر لانہ الذی یلیق بہ ﷺ و من ثم استشار و اکیف یدعون لہ فاشیر بمثل ذالک۔

(سیرت حلبیہ ج ۳ ص ۴۷۸)

حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی ان دعاؤں پر لوگ آمین کہتے۔ علامہ حلبی فرماتے ہیں کہ اس روایت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے جنازہ پر صرف یہ دعا مانگی گئی اور معروف نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ دعا اس معروف نماز جنازہ کے ضمن میں تھی جو چار تکبیرات کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابو بکر جنازہ اقدس پر حاضر ہوئے اور چار تکبیریں پڑھیں، پھر عمر داخل ہوئے اور انہوں نے چار تکبیریں پڑھیں۔ پھر عثمان رضی اللہ عنہ گئے اور انہوں نے چار تکبیریں پڑھیں۔ پھر حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور زبیر بن عوام رضی اللہ عنہما گئے، پھر لگاتار لوگ جانے شروع ہو گئے اور الگ الگ تکبیرات پڑھ کر نماز جنازہ ادا کرتے اور اس دعا کا بالخصوص اس لئے ذکر کیا ہے کہ یہی حضور ﷺ کی شان کے لائق تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے آپس میں مشورہ کر لیا تھا کہ نماز جنازہ میں دعا مانگی جائے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ فرماتے ہیں:

روی عن محمد انہ صلی علی النبی ﷺ بغیر امام (ما ثبت بالسنہ ص ۱۰۱)

محمد سے روایت ہے کہ نبی ﷺ کی نماز جنازہ بغیر امام کے پڑھی گئی۔

اس مقام پر شبہ ہو سکتا ہے کہ بعض روایتوں میں جو ”صلی علیہ“ کے الفاظ وارد ہیں ان میں صلوٰۃ سے مراد درود و سلام بھی ہو سکتا ہے۔ جواباً گزارش ہے کہ اس صورت میں امامت کی نفی کا کوئی مفہوم نہیں رہتا، اس لئے کہ صلوٰۃ و سلام پڑھنے کے لئے امامت سرے سے مشروع ہی نہیں ہے، حتیٰ کہ اس کی نفی قابل ذکر ہو۔ عربی عبارات میں ”صلی علیہ، یصلون“ کے صیغے ذکر کئے گئے ہیں۔ جن میں اس وہم کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ صلوٰۃ بمعنی درود و سلام ہو۔ لیکن دوسری کتب میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے صراحتاً ”یصلون“ کی جگہ نماز جنازہ کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اس وہم کا کلیۃً خاتمہ ہو جاتا ہے۔

چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

در وقت چاشت دواز دهم ربیع الاول بدرگاه پروردگار خود باز رفت پس روز سه شنبه اورا اهل بیت غسل دادندو تمام روز طائفه طائفه مسلماناں نماز جنازه گزارند و در شب چهار شنبه دفن کردند۔	چاشت کے وقت بارہ ربیع الاول کو حضور اپنے رب کے پاس تشریف لے گئے۔ پھر منگل کے دن اہل بیت نے آپ کو غسل دیا اور تمام مسلمان جماعت در جماعت آ کر آپ کی نماز جنازہ پڑھتے رہے اور بدھ کی شب کو آپ ﷺ کو دفن کیا گیا۔

(صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین)۔

(جذب القلوب ص۷۱)

نیز شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

و نماز گزارند بر آنحضرت تنها تنها و امامت نه کرد هیچ جماعت آمدند و نماز گزارند۔	اور آنحضرت پر سب نے تنہا تنہا نماز پڑھی اور کسی نے امامت نہ کرائی، تنہا تنہا آئے اور نماز پڑھتے رہے۔

(اشعۃ اللمعات ج۴ ص۶۰۳)

علاوہ ازیں شیخ محقق عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

نماز گزار دن بر آنحضرت ﷺ	نبی ﷺ پر جماعت کے ساتھ نماز نہیں

بجماعت نه بود و جماعت مے در
آمدند بروے و نماز گزاردند بے
جماعة و بیرون می آمدند پس
جماعت دیگر می در آمدند و
میگذاندو جثه شریف هم درخانه بود
که غسل داده بوند در آں نخست
مرداں در آمدن و چوں مرداں فارغ
شد نساء درآمدند و بعد از نساء
صبیان گزاردند هم چنانچه تربیت
صفوف است در جماعت و امامت نه
کردند بر جنازه شریف رسول الله
ﷺ هیچ یکے از امیر المؤمنین
علی رضی اللہ عنہ منقول است کے فرمود در
جنازه رسول خدا ﷺ هیچ کس
امامت نه کرد۔ زیرا که آں حضرت
ﷺ در حیات و ممات امام شما
است و ایں از خواص آنحضرت
است که نمازها متعدد کردند۔ و تنها
تنها گزاردند۔ در روایت آمده اول
کسیکه نماز گزاردند بروے اهل
بیت وے بود علی و عباس و بنو
هاشم پس ازاں در آمدند مهاجران
بعد ازاں انصار پسترمی درآمدند

پڑھی گئی تھی۔ ایک جماعت آتی اور پڑھ کر
چلی جاتی۔ پھر اس کے بعد دوسری جماعت
جاتی اور نماز پڑھتی اور جسم مبارک اسی جگہ
تھا جہاں غسل دیا گیا تھا۔ پہلے مرد داخل
ہوئے اور انہوں نے نماز پڑھی، جب مرد
فارغ ہو گئے تو عورتیں آئیں اور انہوں نے
نماز پڑھی، اس کے بعد بچوں نے نماز
پڑھی جس طرح نماز میں صفوف کی ترتیب
ہوتی ہے۔ اسی ترتیب سے جماعتیں آئیں
اور آپ پر جو نماز جنازہ پڑھی گئی اس کی
امامت کسی نے نہیں کی۔ امیر المؤمنین
حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے منقول
ہے کہ آپ کی امامت کسی نے اس لئے نہیں
کی کہ آپ حیات و ممات دونوں حالتوں
میں خود امام ہیں اور نبی علیہ السلام کے خواص میں
سے یہ ہے کہ آپ پر متعدد بار تنہا تنہا نماز
پڑھی گئی اور ایک روایت میں آیا کہ پہلے
آپ پر اہل بیت سے حضرت علی و عباس و بنو
ہاشم نے نماز پڑھی، پھر مہاجرین آئے، اس
کے بعد انصار، پھر اس کے بعد لوگ فوج در
فوج آتے گئے اور نماز پڑھتے گئے۔

مردم فوج در فوج و نماز می گذاردند۔ (مدارج النبوت طبع جدید مطبع نوریہ رضویہ ج ۲ ص ۴۴۰)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت میں اس مقصد پر وافر روشنی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ ادا کی گئی تھی اور فقط درود شریف نہیں پڑھا گیا تھا۔ چنانچہ شیخ محقق کا ترتیب صفوف کا ذکر کرنا بھی اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ اگر محض درود و سلام پڑھنا تھا تو درود سلام میں نماز کی صفوف کی ترتیب کے التزام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ پر جو نماز پڑھی گئی وہ معروف طریقہ کے مطابق نماز جنازہ تھی یعنی اس کے ارکان چار تکبیریں تھیں، اس میں ثنا بھی تھی، حضور پر درود بھی تھا، معروف دعا کی جگہ مخصوص کلمات طیبات عرض کئے گئے تھے۔ جن کا ہم پہلے تفصیلاً ذکر کر چکے ہیں اور اس نماز میں کوئی شخص امام نہ تھا۔

اور متاخرین میں سے علامہ نور بخش توکلی متوفی ۱۳۶۷ھ تحریر فرماتے ہیں:

شب چہار شنبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دفن کیا گیا، تاخیر کی وجہ کئی امور تھے، چنانچہ مہاجرین و انصار میں بیعت کے بارے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس اختلاف کا فیصلہ ہوتے ہی اس امر میں اختلاف ہوا کہ حضور کو کہاں دفن کیا جائے۔ قبر شریف میں لحد چاہیے یا شق، آخر کار حضرت ابو طلحہ انصاری نے لحد کھودی، نماز جنازہ حجرہ کے اندر بغیر امامت الگ الگ پڑھی گئی، پہلے مردوں نے، پھر عورتوں نے، پھر بچوں نے، پھر غلاموں نے نماز پڑھی۔ بعد ازاں حضور کو بالاتفاق حجرہ شریف ہی میں، جہاں وصال شریف ہوا تھا، دفن کر دیا گیا۔ (سیرت رسول عربی ص ۳۶۹)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ کے باب میں ہم نے کافی طویل بحث کی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ آج کل عوام و خواص اور اچھے اچھے علماء اور واعظین حضرات اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی صرف صلوٰۃ و سلام پڑھا گیا تھا۔ چنانچہ واعظین حضرات تقریروں میں اور عام مدرسین اپنے درس میں بھی یہی بیان

کرتے ہیں۔ حالانکہ نماز جنازہ اسلام کا ایک اہم فریضہ ہے، یہ حقوق العباد سے ہے اور متوفی کا مسلمانوں پر حق ہے، عام مسلمانوں کے حق میں اس کا پڑھنا فرض کفایہ اور حضور کے حق میں فرض عین تھا۔ اسی طرح تبلیغ کی یہ غلط روش بالواسطہ صحابہ کرام کے بارے میں اس بدگمانی کا سبب بنتی ہے کہ انہوں نے حضور کی نماز جنازہ نہیں پڑھی اور فرض عین کو چھوڑ دیا اور حضور ﷺ کا حق ادا نہیں کیا۔ اگرچہ بعض روایات صرف صلوٰۃ وسلام کی بھی وارد ہیں اور ایک جماعت نے اس کا قول بھی کیا ہے لیکن وہ بے سند روایات اور مردود اقوال ہیں۔ آخر اختلاف کس مسئلہ میں نہیں ہوتا، یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مختلف روایات میں سے صحیح روایات کو تلاش کریں اور بلا تحقیق کسی بات کے کہنے سے گریز کریں۔ ہم نے محض اظہار حق اور غلط بیانی کے سدباب کی خاطر حدیث رسول سے لے کر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور علامہ نور بخش توکلی تک کے کثیر علماء کرام کی تصریحات پیش کر دی ہیں اور دلائل و براہین سے اس مسئلہ کو آفتاب سے روشن تر کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مقالہ کو بصیرت عامہ کا سبب بنائے۔

وما ذالك على الله بعزيز۔ و اخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔



رشک ارم

حال ہی میں نعمانی نام کے کسی گمنام دشمن رسول نے ''دعوت اسلام'' نام کا ایک پمفلٹ بغیر پرنٹ لائن کے شائع کیا ہے جس میں رسول اکرم ﷺ فداہ نفسی وابی وامی کو مردہ اور آپ کی قبر انور کو گڑھا قرار دیا ہے اور قبر اقدس میں حضور ﷺ کے سننے اور دیکھنے اور فرشتوں کے درود وسلام اور اعمال امت پہنچانے کو شرک قرار دیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۔

بارگاہ نبوت میں یہ ایسی شدید گستاخی ہے جس کی جرأت چودہ سو سال کے عرصہ میں کوئی بدتر سے بدتر گستاخ رسول بھی نہیں کر سکا۔ یہ عاشقان رسول اور غلامان مصطفیٰ ﷺ کی غیرت اور حمیت کو کھلا چیلنج ہے۔ اس پمفلٹ کو کاروان توحید وسنت پاکستان راولپنڈی نے شائع کیا ہے۔ آج کل جب کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے نام پر ارباب حکومت کرسی اقتدار پر براجمان ہیں۔ ایسے وقت میں اس پمفلٹ کی طباعت واشاعت کی ناپاک جسارت اور اس پر ارباب اقتدار کی معنی خیز خاموشی نہ صرف یہ کہ مقام مصطفیٰ ﷺ کے اعتراف سے کھلی غداری ہے بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کے نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے دعوؤں میں کتنا خلوص ہے۔ اگر حکومت اس بارے میں واقعی مخلص ہے اور یہ محض مسلمانان پاکستان کو بے وقوف بنانے کے لئے کھوکھلے نعرے نہیں ہیں اور ایوان اقتدار میں اگر کسی بھی شخص کے دل میں ایمان کی ادنیٰ رمق موجود ہے تو اس کو اولین فرصت میں اس پمفلٹ کے مصنف اور ناشرین کا سراغ لگا کر انہیں کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے اور اس میں غفلت کر کے عوام کے دینی جذبات کو مجروح کیا جائے اور نہ غضب خداوندی کو دعوت دی جائے۔

اللہ اکبر! جن کی شان یہ ہے کہ اگر ان کی معاونت میں انبیاء علیہم السلام بھی (بفرض محال) کوتاہی کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو علی الاعلان فسق کی وعید سنا دے۔ جن کے فیصلہ کے خلاف

دل میں بھی ناگواری ہو تو ایمان جاتا رہے، جن کی آواز پر آواز اونچی ہو جائے تو ساری نیکیاں برباد ہو جائیں، ان کو مردہ کہا جائے، ان کی آرام گاہ کو گڑھا قرار دیا جائے اور ان کا کلمہ پڑھنے والوں کے خون میں کوئی حرارت پیدا نہ ہو۔ ان کے دل و دماغ میں ہیجان برپا نہ ہو۔ ان کے سینوں میں انتقام کی آگ نہ بھڑکے تو نہ وہ ایمان، ایمان ہے، نہ وہ اسلام، اسلام ہے، نہ وہ کلمہ، کلمہ ہے۔ یہ عبارت حضور ﷺ کی شان اقدس میں ایسی شدید گستاخی ہے کہ اگر قیامت کا وقت مقرر نہ ہوتا تو انہیں کلمات سے قیامت آجاتی۔ آسمان شق ہو جاتا اور زمین ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پاش پاش ہو جاتی۔ تفصیل کا موقع نہیں، آیئے! اجمالی طور پر آپ کو بتائیں کہ حضور ﷺ کی حیات مبارکہ اور قبر انور کا کتاب و سنت کے دلائل کی روشنی میں کیا مقام ہے۔

حیات مبارکہ

یہ صحیح ہے کہ ہر شخص پر موت ایک بار ضرور آتی ہے، حضور ﷺ پر بھی موت آئی، لیکن صرف ایک آن کے لئے، پھر آپ کو حیات ابدی دے دی گئی اور آپ کی روح مبارک آپ کے جسم اقدس میں لوٹا دی گئی۔ کیا دشمنان رسول حیات شہداء کے منکر ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم کی نص صریح ہے:

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ)

"اور ان لوگوں کو جو راہ خدا میں قتل کئے جائیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں اور تم کو ان کی اس زندگی کا شعور نہیں ہے"۔

غور کیجئے! شہید کو زندہ کیوں فرمایا گیا ہے؟ محض اس لئے کہ اس کی موت فی سبیل اللہ ہے تو جن کی صرف موت فی سبیل اللہ ہو وہ تو زندہ کہلائیں اور جن کی موت اور حیات سب کچھ فی سبیل اللہ ہے ان کو مردہ کہا جائے؟ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (الانعام)

"آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور قربانی، میری زندگی اور موت سب کچھ اللہ کے لئے ہے"۔

پس جو شخص از روئے قرآن صرف موت فی سبیل اللہ ہونے کی وجہ سے زندہ کہلایا گیا تو جن کی موت اور حیات اور سب کچھ فی سبیل اللہ ہو ان کی زندگی کا از روئے قرآن کیا عالم ہوگا؟

نیز قرآن کریم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا: وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ: ۱۴۳) حضور تمام مسلمانوں کے اعمال پر گواہ ہیں۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ اور امت کے احوال و اعمال پر سمیع و بصیر نہیں ہیں تو قیامت کے دن ان کے احوال و اعمال پر کیسے گواہی دیں گے نیز قرآن کریم میں ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلَى هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ﴿۴۱﴾ (النساء)

''اے محبوب! اس وقت تمہاری شان کا کیا عالم ہوگا جب ہر امت سے ہم ایک گواہ لائیں گے اور تم کو ان تمام امتوں پر گواہ بنا کر پیش کریں گے''۔

بتلایئے! جس شخصیت کریمہ کو اللہ تعالیٰ ابتداء آفرینش عالم سے لے کر قیامت تک کے انسانوں پر گواہ بنا کر لائے گا وہ ان تمام انسانوں کے احوال کو جاننے اور دیکھنے والا زندہ شخص ہوگا یا گڑھے میں پڑا ہوا مردہ شخص؟ کیا یہ شاتمان رسول ان آیات پر ایمان نہیں رکھتے؟ قرآن کریم کی متعدد آیات سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ثابت ہے؟ لیکن اس مختصر مضمون میں ان سب کو احاطہ تحریر میں لانے کی گنجائش نہیں ہے۔ آیئے! اب احادیث صحیحہ کی طرف رجوع کریں۔

اس گمنام شاتم رسول نے یہ افتراء بار بار دہرایا ہے کہ اسلام میں مرنے کے بعد روح دوبارہ لوٹ کر نہیں آتی۔ اس بد باطن شخص سے کوئی پوچھے کہ اگر روح دوبارہ جسم میں لوٹ کر نہیں آتی تو قبر میں فرشتے کس سے سوال و جواب کرتے ہیں؟ اور فرشتوں کو بے روح مردہ شخص جواب دے گا یا زندہ اور ذی روح؟ اور اگر اسلام میں مرنے کے بعد روح دوبارہ لوٹ کر نہیں آتی تو بعث بعد الموت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟

موت کے بعد قبر میں اعادہ روح کے لئے امام احمد بن حنبل کے حوالہ سے شیخ ولی الدین تبریزی نے حضرت براء بن عازب سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے جس میں ہے:

تُعَادُ رُوْحُهُ فِي جَسَدِهٖ فَيَاتِيْهِ مَلَكَانِ فَيُجْلِسَانِهٖ فَيَقُوْلَانِ لَهُ مَنْ رَّبُّكَ۔ (الحدیث)(مشکوٰۃ ص ۱۴۲)

قبر میں میت کے جسم میں روح لوٹائی جاتی ہے اور اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، اس کو بٹھاتے ہیں، پھر اس سے پوچھتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ (الحدیث)

بالخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم میں اعادہ روح کے لئے یہ حدیث ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَا مِنْ اَحَدٍ يُّسَلِّمُ عَلَيَّ اِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ اَرُدُّ عَلَيْهِ السَّلَامَ۔ (سنن ابی داؤد ص ۲۷۶)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص مجھ پر سلام نہیں پڑھتا مگر اس وقت روح میرے جسم میں موجود ہوتی ہے اور میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

اور حضور کی حیات مبارکہ پر یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَوْسِ بْنِ اَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ مِنْ اَفْضَلِ اَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاَكْثِرُوْا الصَّلٰوةَ فِيْهِ فَاِنَّ صَلٰوتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ قَالَ فَقَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَ كَيْفَ تُعْرَضُ صَلٰوتُنَا عَلَيْكَ وَقَدْ اَرِمْتَ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَنْ تَاْكُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ۔ (سنن ابوداؤد ص ۲۱۴)

حضرت اوس بن اوس بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمام دنوں میں افضل دن جمعہ کا دن ہے، اس دن مجھ پر بکثرت درود پڑھا کرو کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے، صحابہ نے عرض کیا: حضور! آپ پر ہمارا درود کس طرح پیش ہو گا جب کہ وصال کے بعد آپ کا جسم بوسیدہ ہو چکا ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے اجسام کو زمین پر حرام کر دیا ہے۔

اور مخالفین کے مستند ابن قیم جوزیہ متوفی ۷۵۱ھ نے سند صحیح سے اس حدیث کے ساتھ یہ الفاظ بھی روایت کئے ہیں:

لَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يُصَلِّي عَلَيَّ اِلَّا بَلَغَنِيْ صَوْتُهٗ حَيْثُ كَانَ قُلْنَا وَ بَعْدَ وَفَاتِكَ قَالَ وَ بَعْدَ وَفَاتِيْ اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى الْاَرْضِ اَنْ تَاْكُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِيَاءِ (جلاء الافہام ص ۶۳)

جو شخص بھی مجھ پر درود پڑھتا ہے اس کی آواز مجھ تک پہنچتی ہے خواہ وہ کہیں بھی ہو۔ ہم نے پوچھا: حضور! آپ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا: ہاں! وفات کے بعد بھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے اجسام کو کھانا زمین پر حرام کر دیا ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ حضور ﷺ پر امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں؟ اس سلسلہ میں احادیث ملاحظہ فرمایئے۔

حضرت امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ قَالَ عُرِضَتْ عَلَيَّ اَعْمَالُ اُمَّتِيْ حَسَنُهَا وَ سَيِّئُهَا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۰۷، قدیمی کتب خانہ، کراچی)

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھ پر میری امت کے اچھے اور برے تمام اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔

محدث ابن جوزی متوفی ۵۶۷ھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَيَاتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ يَنْزِلُ عَلَيَّ الْوَحْيُ عَنِ السَّمَاءِ فَاُخْبِرُكُمْ بِمَا يَحِلُّ لَكُمْ وَ مَا يَحْرُمُ عَلَيْكُمْ وَ مَوْتِيْ خَيْرٌ لَّكُمْ تُعْرَضُ عَلَيَّ اَعْمَالُكُمْ كُلَّ خَمِيْسٍ فَمَا كَانَ مِنْ حَسَنٍ حَمِدْتُ اللّٰهَ عَلَيْهِ وَ مَا كَانَ مِنْ ذَنْبٍ اَسْتَوْهِبُ اللّٰهَ ذُنُوْبَكُمْ۔

حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میری زندگی میں بھی تمہارے لئے خیر ہے کیونکہ مجھ پر آسمان سے وحی اترتی ہے اور میں تم کو حلال اور حرام کی خبر دیتا ہوں اور میری وفات میں بھی تمہارے لئے خیر ہے کیونکہ ہر جمعرات کو تمہارے اعمال مجھ پر پیش کئے جاتے

(الوفا باحوال المصطفیٰ ص ۸۱۰) ہیں، اچھے اعمال پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور جو تمہارے گناہ ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی التجاء کرتا ہوں۔

انبیاء کرام کی حیات بالعموم اور بالخصوص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کا عقیدہ صرف سواد اعظم اہل سنت کا عقیدہ نہیں ہے بلکہ علماء دیوبند غیر مقلدین اور علماء نجد بھی اصولی طور پر اس عقیدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:

رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قبر شریف میں زندہ ہیں۔ (ہدایت الشیعہ ص ۳۶)

محمد قاسم نانوتوی لکھتے ہیں:

انبیاء علیہم السلام کو اجسام دنیاوی کے اعتبار سے زندہ سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ مثل شہید ان ابدان کو چھوڑ کر اور ابدان سے تعلق ہو جاتا ہے۔ (لطائف قاسمی ص ۳)

خلیل احمد انبیٹھوی متوفی ۱۳۴۶ھ لکھتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبرہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں۔

(بذل المجہود ج ۲ ص ۱۱)

اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

بیہقی وغیرہ نے حدیث انس سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ (نشر الطیب ص ۲۱۱)

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

بنص حدیث قبر میں زندہ ہیں۔ (التکشف ص ۴۴۶)

شبیر احمد عثمانی تحریر کرتے ہیں:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حی کما تقرر وانہ یصلی فی قبرہ باذان واقامۃ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں جیسا کہ اپنی جگہ پر ثابت ہے اور اپنی قبر میں اذان واقامت سے نماز پڑھتے ہیں۔

(فتح الملہم ج ۳ ص ۴۱۹)

حسین احمد مدنی متوفی ۱۳۷۷ھ لکھتے ہیں:

آپ کی حیات نہ صرف روحانی ہے، جو کہ عام شہداء کو حاصل ہے، بلکہ جسمانی بھی اور از قبیل حیات، بلکہ بہت وجوہ سے اس سے قوی تر۔ (مکتوب شیخ الاسلام ج ا ص ۱۳۰)

محمد ادریس کاندھلوی لکھتے ہیں:

تمام اہل سنت و جماعت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام وفات کے بعد اپنی قبروں میں زندہ ہیں اور نماز و عبادات میں مشغول ہیں اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی یہ برزخی حیات اگرچہ ہم کو محسوس نہیں ہوتی لیکن بلاشبہ یہ حیات حسی اور جسمانی ہے، اس لئے کہ روحانی اور معنوی حیات تو عامۃ المؤمنین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے۔ (حیات نبوی ص ۲)

اور غیر مقلدین میں سے شوکانی لکھتے ہیں:

انه صلی اللہ علیہ وسلم حی فی قبره بعد موته۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وفات کے بعد اپنی قبر میں زندہ ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۰۱)

غیر مقلدین حضرات کے استاذ الکل میاں نذیر حسین دہلوی متوفی ۱۳۲۰ھ لکھتے ہیں:

اور حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔ خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو کوئی عند القبر درود بھیجتا ہے میں سنتا ہوں اور دور سے پہنچایا جاتا ہوں۔ (فتاوی نذیریہ ج ۲ ص ۲۰ ضمیمہ)

اور موجودہ غیر مقلدین میں سے عطاء اللہ حنیف لکھتے ہیں:

انهم احیاء فی قبورهم یصلون و قد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعته و من صلی علی نائیا بلغته۔ (التعلیقات السلفیہ علی سنن النسائی ج ا ص ۲۳۷)

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص میری قبر کے پاس مجھ پر درود پڑھتا ہے تو میں خود اس کو سنتا ہوں اور جو دور سے پڑھتا ہے تو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب نجدی لکھتے ہیں:

والذی نعتقدان رتبة نبینا ﷺ اعلی مراتب المخلوقین علی الاطلاق وانه حی فی قبرہ حیوۃ مستقر االبلغ من حیات الشہداء المنصوص علیہا فی التنزیل اذھو افضل منھم بلا ریب وانه یسمع من یسلم علیه۔ (بحوالہ اتحاف النبلاء ص ۴۱۵)	ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کا مرتبہ تمام مخلوقات سے مطلقاً افضل ہے اور آپ اپنی قبر مبارک میں حیات دوام کے ساتھ زندہ ہیں، جو شہداء کی زندگی سے برتر ہے جس کا ثبوت قرآن کریم سے ہے۔ کیونکہ بلاشبہ آپ شہداء سے افضل ہیں اور جو شخص آپ پر سلام پڑھتا ہے آپ اس کو سنتے ہیں۔

ان تمام تفصیلی حوالوں سے ظاہر ہو گیا ہے کہ حضور ﷺ کا قبر میں زندہ ہونا، اسلام کے تمام فرقوں کا مسلم عقیدہ ہے اور اس عقیدہ پر دیوبندیوں، غیر مقلدوں اور مجددیوں کا اہل سنت سے کوئی اصولی اختلاف نہیں ہے۔ پس پاکستان کے تمام دیوبندی اور غیر مقلد حضرات کو اس کتاب کے گمنام مصنف کا سراغ لگانے اور اس کے لکھنے اور چھاپنے والوں کو قرار واقعی سزا دینے کے مطالبہ میں اہل سنت و جماعت کا ساتھ دینا چاہئے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ دیوبندی، غیر مقلد حضرات میں سے بعض کے ہاتھوں میں اس وقت زمام اقتدار بھی ہے۔

حضور کی قبر انور کا مقام

''دعوت اسلام'' کے گمنام مصنف نعمانی نے اپنی زیر بحث مذموم عبارت میں حضور ﷺ کی قبر انور کے لئے بار بار گڑھے کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ بتلایا جائے کہ جس جگہ حضور آرام فرمائیں اس کا کیا مقام ہے۔

حضور ﷺ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں مدفون ہیں اور اس حجرہ مبارکہ کا مقام حضور ﷺ کی زبان حق ترجمان سے سماعت فرمائیے۔

امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ مَا بَیْنَ بَیْتِی وَ مِنْبَرِی رَوْضَةٌ مِّنْ رِّیَاضِ	حضرت ابوہریرہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو جگہ میرے حجرہ اور

الْجَنَّةِ۔ (صحیح البخاری ج ۱ ص ۲۵۳) منبر کے درمیان ہے، وہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔

غور فرمایئے! حضور ﷺ نے اپنی قبر انور کو جنت کا باغ قرار دیا اور جو جگہ جنت کا باغ ہو اس کو گڑھا کہنا جنت کی توہین ہے اور حضور کی بھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر ایک چابک کی مقدار بھی جنت میں جگہ نصیب ہو جائے تو وہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، یہ تو نفس جنت کا مقام ہے، پھر جنت کے جس مقام کو یہ شرف حاصل ہو کہ وہاں محبوب رب کائنات جلوہ افروز ہوں اس پر اگر جنت بھی رشک کرے تو بجا اور برمحل ہے۔

ملا علی قاری رحمہ الباری متوفی ۱۰۱۴ھ اور علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ تحریر فرماتے ہیں:

و نقل القاضی عیاض وغیرہ الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفة حتی علی الکعبة المنیفة وان الخلاف فیما عداہ و نقل عن ابن عقیل الحنبلی ان تلك البقعة افضل من العرش۔

علامہ قاضی عیاض وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ جس جگہ حضور کا جسد اطہر ہے وہ تمام جگہوں حتیٰ کہ کعبہ مکرمہ سے بھی افضل ہے بلکہ ابو عقیل حنبلی نے کہا: وہ جگہ عرش معلی سے بھی افضل ہے۔

(مرقاۃ ج ۲ ص ۱۹۰، ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵۳)

غور فرمایئے! تمام اہل اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ حضور کی قبر انور عرش اعظم سے بھی افضل ہے اور جس مقام کی عظمتوں کو عرش ترستا ہو، جس کی بلندیوں پر جنت کو رشک آتا ہو اس کو بار بار گڑھا لکھنا شعائر اللہ کی کس قدر کھلی توہین ہے اور مسلمانوں کے ملی جذبات کا شرمناک مذاق اور ان کی حمیت دینی پر کاری ضرب ہے۔ کاش! اس قوم میں سے پھر غازی علم الدین ابھرے اور راجپال کی اس معنوی اولاد کو کیفر کردار تک پہنچائے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے واضح ہو گیا کہ سرکار دو عالم ﷺ کا روضہ انور ارشاد رسالت کے مطابق جنت کا ایک حصہ ہے۔ تمام امت مسلمہ کے نزدیک بالاجماع اللہ تعالیٰ کی کائنات میں کعبہ مکرمہ، بیت المعمور، عرش معلی، کرسی قدس، لوح محفوظ، صریف اقلام،

الغرض جتنے بھی مقامات مقدسہ ہیں وہ اس قطعہ ارضی اور روضۃ الجنۃ کے مقدر پر رشک کرتے ہیں جسے محبوب رب کائنات کے جسد اطہر وانور اور جسم مطہر و منور سے لمس کا شرف حاصل ہے۔

ہمارے نزدیک جو شخص روضۂ رسول کو گڑھا سمجھتا ہے یا اس کے لئے اس جیسے نامناسب الفاظ استعمال کرنے کی ناپاک جسارت کرتا ہے یا ایسی مکروہ سوچ رکھتا ہے یقیناً جہنم کا گہرا گڑھا اس شخص کا مقدر بن چکا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر بدبختی کی مہر لگ چکی ہے اور اس کی آنکھوں پر بغض وعناد کے پردے پڑ چکے ہیں اور وہ ان لوگوں میں سے ہے کہ جو دل رکھتے ہوئے حق کی بات کو سمجھنے کی صلاحیت سے محروم رہتے ہیں، جو چشم بصارت رکھتے ہوئے آیات الٰہی کے دیدار سے محروم رہتے ہیں اور جن کے کانوں کو سماعت کی قوت کے باوجود حق بات سننے کی توفیق نہیں ہوتی، بلکہ ارشاد قرآن کے مطابق جن کے قلوب پتھر سے زیادہ سخت ہیں۔ کیونکہ بعض پتھر بھی ایسے ہیں جن کے سوتوں سے پانی کے چشمے ابل پڑتے ہیں، مگر ان لوگوں کے مقدر کے سوتے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو چکے ہیں۔



خلفاء راشدین

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بحیثیت محب رسول

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ عشق و محبت کے پیکر اور ایثار و وارفتگی کا نمونہ تھے، وہ آپ کے غسالہ (وضو کے وقت جسم سے بہہ کر گرنے والا پانی) کو زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے۔ تیروں کی بارش میں سپر بن کر آگے کھڑے ہو جاتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جان و مال نچھاور کرنا ان کی عین تمنا اور ایک نگاہ التفات کو پالینا ان کے لئے زندگی کا حاصل تھا، آنسوؤں سے مسکراہٹ تک انہوں نے حیات رسول کی ایک ایک ادا کو کتاب ذہن میں منقش کر لیا تھا۔ یہ سارے ہی آسمان عشق و محبت کے ستارے تھے۔ مگر جو محبت کا سوز اور عشق کا گداز حضرت ابوبکر کے ہاں نظر آتا ہے وہ تاریخ محبت کے کسی اور صفحہ پر نہیں ملتا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آسمان محبت کے نیر اعظم، وارفتگان رسالت کے مقتداء، حسن نبوت کی تجلیٔ اول اور مظہر انوار رسالت تھے۔

محبت کے ایک مرحلہ میں طالب کے نزدیک مطلوب کا وجود ہی حسن تمام ہوتا ہے، جو وصف اس کے محبوب میں ہو وہ حسن ہے اور جو صفت اس کے محبوب میں نہ ہو وہ قبح سے عبارت ہوتی ہے۔ وہ محبوب کی صرف مدح سن سکتا ہے، برائی کے لئے اس کے کان بہرے ہوتے ہیں۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حبك الشيئ يعمي و يصم'' کسی شے کی محبت تمہیں اس کا عیب دیکھنے سے اندھا اور اس کا عیب سننے سے بہرہ کر دیتی ہے۔ اگر واقع میں محبوب میں نقص ہو تو وہ محب کو نظر نہیں آتا تو جس کا محبوب ہو ہی حسن مطلق اور بے عیب تو اسے اپنے محبوب کی شان میں عیب سننا کب گوارا ہو سکتا ہے۔

ابوجہل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہا: تم سا بدصورت کوئی نہیں۔ تو ابوبکر تڑپ کے بے ساختہ پکار اٹھے: حضور! آپ جیسا تو حسین کوئی نہیں۔

جب محبت شدید ہوتی ہے تو محب کے ذہن میں ہر وقت محبوب کا فکر، زبان پر اس کا

ذکر اور دل میں اس کی یاد رہتی ہے۔ وہ اس کے علاوہ کسی بات کو سوچ نہیں سکتا۔ اس کے بغیر کسی کو دیکھ نہیں سکتا۔ چنانچہ مشہور ہے: "من احب شیئا اکثر ذکرہ" "جس کو جس کسی سے محبت ہوتی ہے وہ اسی کی یاد میں رہتا ہے"۔ تبھی تو جب ابوبکر سے سوال ہوا کہ تمہیں دنیا میں کیا پسند ہے؟ تو وہ بے اختیار بولے: "النظر الی وجه رسول الله ﷺ" "بس حضور کے رخ زیبا کو دیکھنا"۔ (منبہات ابن حجر ص ۲۱) ایک مرتبہ حضور ﷺ نے ابوبکر کو انگشتری دی کہ اس پر اللہ کا نام لکھوا لاؤ۔ انگشتری پر بس اللہ کا نام ہو رسول کا نام نہ ہو عقل محض نے یہ مان لیا، مگر ابوبکر کا مزاج نہیں مانا، بے پناہ محبت نہیں مانی، چنانچہ اللہ کا نام لکھوا کر لائے اور اس کے رسول کا نام بھی لکھوا کر لائے۔ جب انگوٹھی حضور ﷺ کے پاس پہنچی تو اس پر اللہ محمد اور ابوبکر لکھا ہوا تھا۔ پوچھا: تمہیں تو صرف اللہ لکھانے کے لئے کہا تھا؟ ابوبکر نے کہا: حضور! آپ کا نام تو میں نے لکھایا ہے۔ کیونکہ مجھے پسند نہ آیا کہ میں اللہ کے نام سے آپ کا نام جدا کر دوں، اپنا نام میں نے نہیں لکھوایا۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۸۷)

جبریل علیہ السلام نے حاضر ہو کر کہا: اللہ فرماتا ہے: ابوبکر کا نام ہم نے لکھایا ہے، ابوبکر کو ہمارے نام سے آپ کے نام کی جدائی پسند نہیں اور ہمیں آپ کے نام سے ابوبکر کے نام کا فراق ناپسند ہے۔

کمال محبت کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ محبوب کے احکام کی اتباع کی جائے، اس کی رضا جوئی میں منہمک اور مستغرق رہے۔ جس طرح قرآن میں ارشاد ہے: اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (آل عمران: ۳۱) اگر تم اللہ سے محبت کا دعویٰ رکھتے ہو تو حضور کی اتباع کرو۔ اور فرمایا: اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ (توبہ: ۶۲) "اللہ اور اس کا رسول اس کے مستحق تھے کہ انہیں راضی کرتے"۔ تبھی تو حضور ﷺ نے اللہ کی راہ میں مال طلب کیا تو شاہراہ عشق کے سالکین دوڑ پڑے۔ کوئی اپنا چوتھائی مال لے کر آیا، کوئی اپنی آدھی متاع لے کر آیا اور ابوبکر صدیق گھر کا گھر اٹھا لائے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: "ما ابقیت لاهلك" "اپنے اہل کے لئے کیا چھوڑا؟" ابوبکر نے جواب دیا: "ابقیت لهم الله و رسوله" "بس اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔ (مشکوۃ ص ۵۵۵)

قاعدہ یہ ہے کہ اپنے نفس اور اہل کا حصہ رکھ کر صدقہ کیا جائے اور یہ صحیح نہیں ہے کہ اپنا سارا مال صدقہ کر کے خود صدقہ کا مستحق ہو جائے، اس لئے صدقہ میں سارا مال دینا جائز نہیں لیکن محبت کے قانون میں محبوب کے مطالبہ کے بعد مال کو پاس رکھنا صحیح نہیں ہے، اس لئے کاروان عشق کے سالار حضرت ابو بکر نے حضور ﷺ کے ایک ارشاد پر اپنی متاع کل کو لا کر حضور کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

حضور سید عالم ﷺ نے وصال سے پہلے رومیوں سے جنگ کے لئے ایک لشکر ترتیب دیا اور اسامہ بن زید کو اس کا امیر مقرر کیا۔ لشکر کی روانگی سے پہلے حضور ﷺ کا وصال ہو گیا۔ حضور کے وصال کے فوراً بعد عرب کے بعض قبائل مرتد ہو گئے اور اندرون ملک کئی فتنے کھڑے ہو گئے، بعض ارباب عقل کی رائے تھی کہ ایسے میں لشکر کو ملک سے باہر بھیجنا مصلحت کے خلاف ہے، کیونکہ ملک کے اندر فتنہ ہے اور باہر سے حملہ کا خدشہ ہے۔ لیکن ابو بکر کا ایک ہی جواب تھا کہ مجھ سمیت تمام مسلمانوں کا شہید ہو جانا میرے لئے آسان ہے لیکن حضور کے فرمان کو بے عمل چھوڑ دینا میرے لئے مشکل ہے۔

(تحفہ اثنا عشریہ ص ۵۵۰)

صدیق اکبر کا ہر عمل اتباع رسول اور ہر سانس رضائے رسول میں صرف ہوتا تھا، ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ منشائے رسالت کے مطابق اور مزاج رسول میں ڈھلا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ کی مجلس میں صحابہ حاضر ہوئے۔ اچانک حضور نے سوال کیا: آج تم میں سے کون روزہ دار ہے؟ صرف ابو بکر ہی تھے جنہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں روزے سے ہوں۔ حضور ﷺ نے پھر پوچھا: آج تم میں سے جنازے کے ساتھ کون گیا تھا؟ ابو بکر بولے: اے آقا! میں گیا تھا۔ پھر حضور نے استفسار کیا: تم میں سے کسی نے آج مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ ابو بکر نے کہا: میں نے یا رسول اللہ! حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: آج تم میں سے کسی نے مریض کی عیادت کی ہے؟ یہ ابو بکر ہی تھے جو بولے: میں نے یا رسول اللہ! حضور ﷺ نے فرمایا: کسی شخص میں یہ تمام اوصاف مجتمع نہیں ہوں گے مگر وہ شخص جنتی ہوگا۔ (مشکوٰۃ ص ۱۶۷)

حضور ﷺ فرماتے ہیں: میں نے جس شخص پر بھی اسلام پیش کیا اس نے اسلام قبول کرنے میں کچھ نہ کچھ تردد یا توقف کیا سوائے ابوبکر کے۔ (سیرت طیبہ ج ا ص ۴۴۲)

عشق بے تاب دلائل کا تابع نہیں ہوتا، ابوبکر تو توجہ کے منتظر تھے۔ جیسے ہی حضور نے دعوت ایمان دی، ابوبکر صدیق لبیک کہہ کر حرم ایمان میں داخل ہو گئے، پھر ایمان کی جو شمع ابوبکر کے سینہ میں روشن ہوئی اس کی فیض آفرین شعاعوں نے دوسروں کے سینوں کو بھی منور کر دیا۔ چنانچہ عثمان بن عفان، عثمان بن مظعون، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص یہ سب ابوبکر صدیق کی تبلیغ سے مسلمان ہوئے۔ (استیعاب علی ہامش الاصابہ ج ۲ ص ۲۴۶) آپ نے سات ایسے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا، جنہیں اسلام قبول کرنے کی پاداش میں عذاب دیا جاتا تھا، جن میں حضرت بلال اور عامر بن فہیرہ بھی شامل ہیں۔ (الاصابہ ج ۲ ص ۳۴۳)

جب محبت کی عطائیں اور عشق کی نوازشیں ہوتی ہیں تو محبوب کے جلوے فقط محب کے ظاہر پر اثر انداز نہیں رہتے، بلکہ اس کے باطن کو بھی نوازتے ہیں۔ ابوبکر کی سیرت و کردار، فطرت اور مزاج، غرض ہر جگہ تجلیات رسالت فروزاں تھیں، جس طرح رسول اللہ ﷺ کے مزاج میں اللہ پر اتنا عظیم توکل تھا کہ مال دنیاوی نہ ہونے پر بھی مطمئن رہتے تھے۔ یہی مزاج حضرت ابوبکر صدیق کا بن گیا تھا۔ تبھی توکل کا کل مال اطمینان سے راہ خدا میں دے دیا تھا۔ اور یہ کوئی اتفاق نہیں بلکہ حضرت ابوبکر کی محبت کا بے پناہ اثر تھا کہ جس طرح ابوبکر کی حیات، حیات رسول کے مطابق تھی، اسی طرح ابوبکر کی وفات بھی وفات رسول کے مطابق تھی۔ جس طرح خیبر میں حضور ﷺ کے جسم میں یہودیہ کا زہر پہنچا اور فی الفور اس کے اثر سے آپ کا وصال نہیں ہوا، بلکہ کچھ عرصہ کے بعد اس کے اثر سے آپ کی وفات ہوئی۔ اسی طرح غار ثور میں ابوبکر کے جسم میں سانپ کا زہر پہنچا، جس کا فوراً اثر نہیں ہوا اور چند سالوں کے بعد اسی اثر سے حضرت ابوبکر صدیق کا وصال ہوا۔ (مشکوۃ ص ۵۵۶)

جناب ابوبکر صدیق حضور ﷺ کی مجلس سے کبھی غیر حاضر نہیں رہے، ہر غزوہ میں آپ کی ڈھال اور ہر سفر میں پابہ رکاب رہتے تھے۔ ہر خدمت کے موقع پر حاضر رہتے تھے، ہر ضرورت پر کام آتے تھے۔ ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے خود فرمایا: مجھے کسی کے مال

سے وہ نفع نہیں پہنچا جو صدیق اکبر کے مال سے پہنچا ہے۔ ابوبکر نے سنا تو رونے لگے، عرض کیا: حضور! میں بھی آپ کا ہوں، میرا مال بھی آپ کا ہے۔ (مرقاۃ ج ۱۱ ص ۲۸۶) اور ایک بار حضور نے فرمایا: مال اور رفاقت میں میرے لئے سب سے زیادہ موجب امتنان ابوبکر ہیں۔ (مشکوٰۃ ص ۵۵۴)

آں امن الناس برمولائے ما   آں کلیمے اول سینائے ما

مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد جانثار موجود تھے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سفر ہجرت کا قصد فرمایا تو رفاقت کے لئے نگاہ انتخاب صرف حضرت ابوبکر پر پڑی۔ (مشکوٰۃ ص ۵۵۶) اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو غلاموں نے حضور کی خاطر جان کو خطرہ میں ڈالا ہوا تھا۔ علی رضی اللہ عنہ بستر رسالت پر کفار کے نرغے میں تھے اور ابوبکر کا پاؤں سانپ کے منہ میں تھا۔ محبت کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے محبوب کا اعتماد حاصل کرے اور یہ اعتماد آپ کے ان دونوں غلاموں کو حاصل تھا۔ علی کو حضور نے کفار کے اموال کا محافظ بنایا اور ابوبکر کو سرکار نے اپنی جان کا امین بنایا۔ ایک دشمنوں کے گھیرے میں مال کی حفاظت پر مامور تھا، دوسرا موت کے منہ میں قدم ڈالے محبوب کے جلوؤں پر پہرہ دے رہا تھا۔

غار ثور میں تین دن اور تین راتیں اس طرح گزریں کہ تجلیات رسالت بلاشرکت و بلاواسطہ ابوبکر صدیق پر منعکس ہو رہی تھیں۔ رسالت کی خوشبوؤں سے ابوبکر کا دل و دماغ مہک رہا تھا اور انوار رسالت ابوبکر میں اس طرح جذب ہو رہے تھے کہ ابوبکر سراپائے رسول کا مظہر بن گئے تھے، حتیٰ کہ جب حضور ابوبکر کے ساتھ مدینہ پہنچے تو دیکھنے والے دھوکا کھا گئے اور لوگوں نے سمجھا کہ یہ رسول اللہ ہیں۔ کہتے ہیں کہ تلوں کو اگر ایک رات پھولوں میں بسا دیا جائے تو وہ تل پھولوں کے مظہر ہو جاتے ہیں اور ان کا تیل بھی خوشبودار ہوتا ہے۔ جب پھولوں کا قرب ایک رات میں تلوں کو اپنا مظہر بنا دیتا ہے تو جسے تین راتیں رسول اللہ کا قرب حاصل رہا ہو وہ کیونکر مظہر رسول نہ ہو گیا ہوگا؟ تبھی جب ابوبکر مدینہ پہنچے تو اس شان سے پہنچے کہ چہرہ ابوبکر کا تھا جمال رسول اللہ کا، قامت ابوبکر تھی چال رسول کی تھی، گفتار ابوبکر کی تھی انوار رسول اللہ کے۔ ایسا لگتا تھا جیسے حضور اپنے ساتھ آئینہ لے آئے

ہوں جبھی تو لوگوں کو اشتباہ ہو گیا۔ کہ ان دونوں میں سے کون رسول اللہ ہیں (لعبد الرحمن بن عویم فی روایۃ ابن اسحاق اناخ الی نخل ھو و ابوبکر واللہ ما ادری ایھما ھو)۔ پس لوگ ابوبکر کو رسول اللہ سمجھ کر ان سے ملنے لگے۔ اور تب ابوبکر نے چادر ڈال کر حضور پر سایہ کیا تاکہ لوگوں کو پتہ چل جائے۔ (بخاری ج ۱ ص ۵۵۵) اصل یہ ہیں عکس میں ہوں، آقا یہ ہیں، غلام میں ہوں۔ ؎

گلے خوشبوئے در حمام روزے رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

اور محبت کا آخری مرحلہ یہی ہے کہ محبوب محب کی ذات میں اس طرح سما جائے کہ محبت میں اپنا کچھ نہ رہے۔ رنگ و روپ، جمال و کمال سب محبوب کا اور محب اور محبوب "فرق نہیں مابین پیا" کی جیتی جاگتی تفسیر بن جائیں۔ سفر ہجرت کے اس آخری موڑ پر محب رسول حضرت ابوبکر اس معراج پر نظر آتے ہیں جہاں دوئی مٹ جاتی ہے اور وحدت محض رہ جاتی ہے۔ غالباً ایسے ہی مقام کے لئے کہا گیا ہے کہ ؎

تو من شدی من تو شدم من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری



مقام ابوبکر رضی اللہ عنہ

امت کے بہترین افراد وہ ہوتے ہیں جو نبی کے صحابہ کہلاتے ہیں۔ جن کی نظروں کے سامنے نبی پر وحی اترتی ہے، جو روز وشب معجزات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ نبی کی نگاہوں سے جن کی تربیت ہوتی ہے، جن کی آنکھوں میں نبوت کا سراپا، دلوں میں نبی کی سوچ اور سیرت میں نبی کا کردار ہوتا ہے۔

جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گروہ انبیاء میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اسی طرح حضور کے صحابہ کی بھی کسی نبی کے اصحاب میں مثال نہیں ملتی۔ غور کیجئے! ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ تھے جنہوں نے چند روپوں کے عوض اپنے نبی کی زندگی کا سودا کر لیا تھا۔ ایک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ ہیں جو میدان جنگ میں حضور کی طرف آنے والے تیروں کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی سے زیادہ تیروں سے گھائل ہوتے ہیں، مگر حضور کی طرف کسی تیر کو آنے نہیں دیتے، یہ حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہ) تھے اور بعض وہ ہیں کہ جب کفار برہنہ تلواریں لئے کاشانۂ نبوت کا محاصرہ کرتے ہیں وہ جان پر کھیل کر بستر رسول پر لیٹ جاتے ہیں، یہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) تھے اور کچھ وہ ہیں جو اپنے جسم پر سانپ کے پیہم وار برداشت کرتے ہیں لیکن حضور اکرم کو نیند سے جگانا گوارا نہیں کرتے، یہ حضرت صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) تھے۔

یوں تو سارے صحابہ ہی حضور کے پرستار تھے لیکن جانثاری کی جو مثال حضرت ابوبکر نے قائم کی ہے وہ تاریخ محبت میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس۔ یہ ان کی کتاب زندگی کا عنوان تھا اور ان کی پوری شخصیت اسی عنوان کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔

حضرت ابوبکر کی عظمت ان کی سیرت میں ہے اور ان کی شخصیت کا شکوہ رسول اللہ کی رفاقت میں دکھائی دیتا ہے۔ آیئے! اب دیکھیں کہ امت میں حضرت ابوبکر کی حیثیت کیا

ہے۔ صحابہ نے انہیں کیا سمجھا، رسول اللہ نے انہیں کیسا پایا اور رب ذوالجلال انہیں کیا کہتا ہے اور جب ان حقائق سے حجاب اٹھیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ مقام ابوبکر کیا ہے۔

ابوبکر آئینہ رسالت میں

جب محبت درجہ کمال پر ہو تو طبیعت طبیعت میں اور مزاج مزاج میں ڈھل جاتا ہے۔ ابوبکر کی شخصیت میں اپنا کچھ نہیں رہا تھا۔ رنگ و روپ جمال کمال سب رسول اللہ کا تھا، ابوبکر کی شخصیت ایک آئینہ تھی، جس میں رسول اللہ کی سیرت کا عکس نظر آتا تھا، ابوبکر اور رسول اللہ کی شخصیتوں میں کس قدر قوی ارتباط تھا۔ یہ کچھ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو انہیں دیکھنے والے تھے۔ یہ ہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا جو حضور کی سیرت بیان کرتی ہیں، روایت حضرت عائشہ کی ہے بیان حضرت خدیجہ کا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوئی تو بار نبوت سے آپ کے دل میں طبعی اضطراب لاحق ہوا۔ آپ نے حضرت خدیجہ سے اپنی پریشانی اور اضطراب کا ذکر کیا تو حضرت خدیجہ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

والله ما يخزيك الله ابدا انك لتصل الرحم و تحمل الكل و تكسب المعدوم و تقری الضيف و تعين على نوائب الحق۔ (بخاری ج ۱ ص ۳)	قسم بخدا! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز شرمندہ نہ کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، ناداروں کی مدد کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کے کام آتے ہیں۔

اور ایک موقع پر جب حضرت ابوبکر کفار کی سختیوں سے تنگ آ کر مکہ چھوڑنے لگے تو ابن دغنہ نے آپ کا راستہ روک لیا اور کہنے لگا:

ان مثلك لا يخرج ولا يخرج فانك تكسب المعدوم و تصل الرحم و تحمل الكل و تقری الضيف و تعين على نوائب الحق۔ (بخاری ج ۱ ص ۳۰۷)	آپ جیسے شخص کو یہاں سے نہ جانا چاہیے نہ ہم اسے جانے دیں گے، کیونکہ آپ ناداروں کی مدد کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، مہمان

نواز ہیں اور مصیبت زدہ لوگوں کے کام
آتے ہیں۔

غور کیجئے! حضرت خدیجہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جن پانچ صفات کا ذکر کیا تھا، ابن دغنہ نے حضرت ابوبکر کی بھی وہی پانچ صفات بیان کی ہیں۔ احادیث کے ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ابوبکر کی شخصیت میں حضور کی سیرت دکھائی دیتی تھی۔ تبھی تو وہ دونوں کی صفات کا بیان متن واحد کے ساتھ کیا کرتے تھے۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کی سخت اور صبر آزما شرطیں مان لیں تو حضرت عمر بہت مضطرب ہوئے اور آ کر حضور سے عرض کرنے لگے: کیا آپ نبی برحق نہیں ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں، عرض کیا: حضور! کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ فرمایا: کیوں نہیں، عرض کیا: پھر ہم دب کر شرائط کیوں مانیں؟ فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں، اس کی نافرمانی نہیں کرتا، وہ میری مدد فرمائے گا۔ عرض کیا: کیا آپ نے نہیں فرمایا تھا کہ ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ فرمایا: ہاں! لیکن کیا میں نے اس سال طواف کرنے کے لئے کہا تھا؟ عرض کیا: نہیں، پھر فرمایا: میری خبر سچی ہے اور میں (کسی نہ کسی سال) بیت اللہ جا کر اس کا طواف کروں گا۔ (بخاری ج ا ص ۳۸۰)

حضرت عمر کے ذہن سے ہنوز اضطراب دور نہ ہوا تھا، وہ اس گفتگو کے بعد حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور جا کر کہا: اے ابوبکر! کیا یہ اللہ کے برحق نبی نہیں ہیں؟ حضرت ابوبکر نے کہا: کیوں نہیں، کہا: کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ کہا: کیوں نہیں، حضرت عمر نے کہا: پھر ہم دب کر شرائط کیوں مانیں؟ حضرت ابوبکر نے کہا: وہ اللہ کے رسول ہیں، اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اللہ ان کی مدد فرمائے گا، تم اپنے عقیدہ پر قائم رہو۔ حضرت عمر نے کہا: کیا انہوں نے نہیں کہا تھا: ہم عنقریب بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ حضرت ابوبکر نے کہا: کیوں نہیں، لیکن کیا انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ ہم اس سال طواف کریں گے؟ کہا: نہیں، حضرت ابوبکر نے کہا: پھر یقین رکھو ان کی خبر سچی ہے اور وہ (کسی نہ کسی سال) ضرور بیت اللہ جا کر اس کا طواف کریں گے۔ (بخاری ج ا ص ۳۸۰)

غور فرمایئے! حضرت عمر کے ہر سوال کے جواب میں حضرت ابوبکر نے وہی بات کہی جو حضور ﷺ نے فرمائی تھی، گویا کہ حضرت ابوبکر کا ذہن حضور کی فکر کا ترجمان اور حضرت ابوبکر کی زبان حضور کے بیان کی مظہر ہوگئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابوبکر کی نظری اور عملی دونوں حیثیتیں حضور کے افکار و اعمال کا آئینہ بن گئی تھیں۔

اگر کوئی شخص حضرت ابوبکر صدیق کو دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو جاتا تو فرماتے: خدایا! تو ان کے حسن ظن سے مجھے بہتر ثابت کر اور مجھے خدمت خلق کی توفیق عطا فرما اور میرے گناہوں کو بخش دے۔

صدیق اکبر رسول اللہ کی معیت میں

ابوبکر صدیق ہر جگہ حضور کے ساتھ رہتے تھے۔ سفر ہو یا حضر، جنگ ہو یا امن، ابوبکر ہمیشہ مجلس رسول میں حاضر رہے اور جو شخص سفر حیات میں کسی کے ہم رکاب ہوتا ہے اس کی روح بھی عالم ارواح میں اسی کے ساتھ ہوتی ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے:

الارواح جنود مجندة۔

اور جب تمام زندگی ابوبکر صدیق حضور کے ساتھ رہے تو ماننا پڑے گا کہ عالم ارواح میں ابوبکر کی روح بھی حضور کی روح کے ساتھ تھی۔ نیز حضور نے بیان فرمایا کہ میں اور ابوبکر ایک ساتھ قبر سے اٹھیں گے اور ایک ساتھ جنت میں جائیں گے، حاصل یہ ہے کہ عالم ارواح ہو یا دنیا، قبر ہو یا حشر، حوض کوثر ہو یا جنت، ابوبکر ہر جگہ حضور کے ساتھ ہیں۔

صدیق اکبر کی حضور ﷺ کے ساتھ ایسی عدیم المثال رفاقت ہے کہ خدا بھی اس کا پاس رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ ابوبکر کا ذکر حضور کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَ صَدَّقَ بِهٖۤ (زمر: ۳۳) جَآءَ بِالصِّدْقِ سے حضور اور صَدَّقَ بِهٖۤ سے ابوبکر مراد ہیں۔ اسی طرح مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ فرما کر حضور کا ذکر اور وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ فرما کر ابوبکر کا ذکر کیا نیز ''اذ یقول'' میں حضور کا ذکر ہے اور ''لصاحبہ'' میں ابوبکر کا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی مصلحت کی خاطر حضور سرور عالم ﷺ پر چند دن کے لئے وحی

موقوف کردی تو کفار کہنے لگے کہ "ودع محمدا ربه و قلاه" "محمد کو اس کے رب نے چھوڑا اور ناراض ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طعنہ کو دور کرنے کے لئے سورۂ "والضحیٰ" نازل کی اور فرمایا: وَالضُّحٰى ۙ وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى ۙ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝ "قسم ہے چاشت کی اور رات کی جب وہ چھا جائے، آپ کے رب نے نہ آپ کو چھوڑا، نہ آپ پر ناراض ہوا"۔

سورۂ "والضحیٰ" میں اللہ تعالیٰ نے حضور کی نعت بیان فرمائی اور اس سے متصل سورت "واللیل" میں حضرت ابوبکر کی منقبت بیان فرمائی ہے۔ جب حضرت ابوبکر نے غیر معمولی قیمت سے بلال کو خرید کر آزاد کر دیا اور کفار نے حضرت ابوبکر کی اس عظیم نیکی میں تنقیص کا پہلو نکالتے ہوئے کہا: ضرور بلال نے پہلے ابوبکر پر کوئی احسان کیا ہوگا جس کا بدلہ اتارنے کے لئے ابوبکر نے ان کو اتنی بڑی قیمت پر خرید کر آزاد کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طعن کو دور کرنے کے لئے فرمایا:

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (اللیل) تم بلال کی بات کرتے ہو، اس روئے زمین میں ابوبکر پر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے، ابوبکر کی یہ نیکی صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے تھی اور عنقریب وہ اس سے راضی ہو جائے گا۔

ان دونوں سورتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور کے بارے میں کوئی اعتراض سن سکتا ہے نہ ابوبکر کے بارے میں۔ سورۂ "والضحیٰ" میں اللہ تعالیٰ نے حضور سے اعتراض اٹھایا اور سورۂ "واللیل" میں ابوبکر سے کفار کا طعن دور کیا، وہاں حضور کی عزت افزائی کرتے ہوئے فرمایا: وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ یہاں ابوبکر کی شان بڑھاتے ہوئے فرمایا: وَلَسَوْفَ يَرْضٰى ۝۔

سورۂ "واللیل" ابوبکر کی منقبت پر ختم ہوئی ہے اور اس کے متصل بعد حضور کی نعت سے سورۂ "والضحیٰ" شروع ہوتی ہے، اس میں یہ اشارہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح ان کی فضیلتوں کے بیان میں کوئی فاصل نہیں ہے اس طرح ان کی ذوات کے درمیان بھی کوئی

حائل نہیں ہے۔

ابوبکر کا رسول اللہ کی امت میں مقام

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿۱۱﴾ (الواقعہ) یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مقرب شخص وہ ہے جو نیکی میں پہل کرنے والا ہو اور امت محمدیہ میں جتنے لوگ خیرات وحسنات کو حاصل کرنے والے ہیں، ابوبکر ان سب میں پہلے ہیں، ایمان سب سے پہلے لائے، تبلیغ سب سے پہلے کی، دین کی نصرت میں سب پر سبقت لی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اور بعد از وصال مسلمانوں کی امامت اور قیادت کرنے والوں میں سب پر مقدم ہیں۔ روضۂ رسول میں حضور کا قرب حاصل کرنے میں سابق، حشر میں سب سے پہلے، دخول جنت میں سب پر مقدم، الغرض دنیا ہو یا برزخ، میدان محشر ہو یا جنت، ابوبکر ہر جگہ امت میں سب سے آگے نظر آتے ہیں۔

عمل کی قدر و قیمت میں تعداد اور مقدار کا نہیں نسبت اور کیفیت کا لحاظ ہوتا ہے، جس طرح تمام انبیاء کی عبادتیں حضور کی عبادت کو نہیں پا سکتیں اسی طرح تمام امت کی نیکیاں ابوبکر کی کسی ایک نیکی کو نہیں پہنچ سکتیں۔ جب حضرت عائشہ نے آسمان کے ستاروں کو دیکھ کر حضور سے پوچھا: کسی کی اس قدر بھی نیکیاں ہیں؟ فرمایا: عمر کی، حضرت عائشہ نے پوچھا: اور ابوبکر کی نیکیاں؟ فرمایا: ابوبکر کی تو ایک نیکی ہی عمر کی ان ساری نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔ (مشکوٰۃ ص ۵۶۰) اور ایک موقع پر فرمایا: "لو اتزن ایمان ابی بکر مع ایمان امتی لرجح" اگر میری تمام امت کے ایمان کو ابوبکر کے ایمان کے ساتھ تولا جائے تو ابوبکر صدیق کا ایمان بھاری ہوگا۔ (بیہقی و کامل بن عدی و مکتوبات امام ربانی دفتر اول حصہ چہارم ص ۷۸) غرضیکہ ایمان کا باب ہو یا اعمال کا، خیرات وحسنات کا مقابلہ ہو یا تصدیق و تسلیم کا، جو شخص ہر میدان میں امت میں سب سے آگے ہے وہ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق نگاہ صحابہ میں

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے محضر صحابہ میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو دنیا اور

آخرت کے درمیان اختیار دیا تو اس کے بندے نے آخرت کو اختیار کر لیا، حضرت ابوبکر یہ سنتے ہی بے اختیار رونے لگے۔ حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں: میں نے سوچا: آخر انہیں اس بات میں رونے کی کیا ضرورت ہے، بعد میں پتہ چلا کہ اس بندے سے حضور کی مراد خود اپنی ذات تھی "وكان ابوبكر اعلمنا" اور درحقیقت ابوبکر ہی ہم میں سب سے زیادہ عالم تھے"۔ (بخاری ج ۱ ص ۶۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بنو عمرو بن عوف میں صلح کرانے چلے گئے۔ عصر کی نماز کا وقت آ گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہ لائے تو حضرت بلال، حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور آپ سے درخواست کی کہ حضور تو تشریف نہیں لائے ہیں، آپ نماز پڑھا دیجئے۔ (بخاری ج ۱ ص ۹۴)

حضرت بلال کی اس درخواست سے پتہ چلتا ہے کہ صحابہ تو ایک سے ایک بڑھ کر موجود تھے لیکن ان کی نظریں جب قیادت اور امامت کے لئے کسی کی طرف اٹھتی تھیں تو صرف صدیق اکبر کی طرف اٹھتی تھیں۔

جب سقیفہ بنو ساعدہ میں لوگ جمع ہوئے اور بیعت کا سوال اٹھا تو حضرت عمر، حضرت ابوبکر سے کہنے لگے: آپ سے زیادہ بیعت کا اہل کون ہو سکتا ہے۔ "ابسط يدك لابايعك" اپنا ہاتھ آگے لائیے تا کہ میں بیعت کروں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خبر ہوئی تو فرمانے لگے: ہم اپنے دنیاوی امور میں اس شخص کی امامت پر کیوں نہ راضی ہوں جس کی ہمارے دینی امور میں امامت پر رسول اللہ راضی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں: ہم ابوبکر کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ نیز کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کہا کرتے تھے: اس امت میں سب سے افضل ابوبکر ہیں اور محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد یعنی حضرت علی سے پوچھا: حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں سب سے افضل کون ہے؟ فرمایا: ابوبکر۔

حضرت ابوبکر صدیق نگاہ رسالت میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوبکر اس قدر عزیز تھے کہ اگر کسی موقع پر ابوبکر نماز پڑھا رہے ہوتے اور حضور بعد میں آکر نماز میں ملتے تو آپ کی یہی خواہش ہوتی کہ آپ ابوبکر کی اقتداء میں

ہی نماز پڑھتے رہیں۔ حضرت ابوبکر اگر پیچھے ہٹتے بھی تو حضور منع فرماتے، یہ اور بات ہے کہ ابوبکر کی خادمانہ فطرت کو یہ گوارا نہ ہوتا کہ آقا کے ہوتے ہوئے غلام امامت کراتا رہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام علالت میں فرمایا: ''مروا ابابکر ان یصلی بالناس'' ابوبکر سے کہہ دو کہ وہ جماعت کرائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بار بار عرض کرتیں: حضور! کسی اور کو فرما دیجئے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر بار یہی فرماتے کہ ابوبکر نماز پڑھائیں۔ اس بحث و تکرار سے یہ امر بہرحال واضح ہو گیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یونہی سہواً یا اتفاقاً ابوبکر کا نام نہیں لیا تھا، بلکہ پورے استقلال اور اعتماد کے ساتھ ابوبکر صدیق کا انتخاب کیا تھا۔ لہٰذا اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یونہی ابوبکر کا نام زبان پر آ گیا تھا، اگر کسی اور کی طرف توجہ دلائی جاتی تو اسے کہہ دیتے اور اس انتخاب سے یہ امر بھی ظاہر ہو گیا کہ جو شخص صحابہ میں سب سے زیادہ امامت کا اہل ہے وہ ابوبکر ہیں۔ بلکہ آپ نے اس کی تصریح بھی کر دی ہے، چنانچہ فرمایا: ''لا ینبغی لقوم فیھم ابوبکر ان یومھم غیرہ'' جس جماعت میں ابوبکر ہوں اس میں ابوبکر کے سوا اور کوئی شخص امامت کے لائق نہیں ہے۔ (سنن ترمذی ص ۵۲۷) اور ایک مرتبہ حضرت عائشہ سے فرمایا: ''ویابی اللہ والمؤمنون الا ان یکون ابابکر'' اگر ابوبکر کے سوا کسی اور کو امام بنایا گیا تو وہ نہ اللہ کو منظور ہو گا نہ مسلمانوں کو۔ (عمدۃ القاری ج ۵ ص ۱۹۱)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی شے کے ثبوت کے تین طریقے ہیں۔ قول سے یعنی آپ کسی چیز کا حکم فرمائیں، فعل سے یعنی آپ کوئی کام کر لیں اور تقریر سے یعنی آپ کے سامنے کوئی کام کیا جائے اور آپ اس کو مقرر رکھیں اور منع نہ فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابوبکر کی امامت کا اس قدر خیال تھا کہ آپ نے ان تینوں طریقوں سے حضرت صدیق اکبر کی امامت کو ثابت فرمایا ہے، قول کے ذریعہ فرمایا: ''مروا ابابکر ان یصلی بالناس'' فعل کے ذریعہ اس طرح کہ تین مرتبہ ابوبکر کی اقتداء میں نماز پڑھی، ایک مرتبہ عصر کی جب آپ بنو عمرو بن عوف کی صلح کرانے گئے۔ ایک مرتبہ ظہر کی ایام علالت میں، ان دونوں مرتبہ ابوبکر حضور کی آہٹ پا کر پیچھے آ گئے اور پیر کے دن صبح کی نماز کی دوسری رکعت آپ نے ابوبکر کی اقتداء میں پڑھی، پھر آپ کا وصال ہو گیا اور تقریر سے اس طرح کہ حضور کے ایام علالت

میں حضرت ابوبکر نے سترہ نمازیں پڑھائیں اور آپ نے ان کو مقرر رکھا اور اس طرح حضور ﷺ نے اپنے قول، فعل اور تقریر غرض ہر طریقہ سے حضرت ابوبکر کی امامت کو مؤکد اور مقرر کر دیا۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق نے حضور ﷺ سے عرض کیا: میرے اور عمر کے درمیان کچھ رنجش ہو گئی ہے۔ میں نے فوراً ان سے معافی مانگی، مگر انہوں نے معاف نہیں کیا۔ حضور ﷺ نے یہ سن کر تین بار فرمایا: اللہ تمہیں معاف کرے، ادھر بعد میں حضرت عمر کو ندامت ہوئی۔ وہ حضرت ابوبکر کو ڈھونڈنے ان کے گھر گئے، وہاں نہ ملے تو بارگاہ نبوت میں پہنچے، حضور ﷺ نے جب حضرت عمر کو دیکھا تو غصہ سے آپ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ حضرت ابوبکر نے جب یہ رنگ دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئے اور دوزانو ہو کر حضور سے عرض کرنے لگے: حضور غلطی میری تھی، زیادتی میں نے کی تھی۔ حضور ﷺ نے حضرت عمر کی طرف دیکھ کر فرمایا:

مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے، پھر تم لوگ وہ تھے جنہوں نے مجھے جھٹلایا اور جس نے میری تصدیق کی وہ ابوبکر تھے۔ جنہوں نے اپنی جان سے میری غمگساری کی اور اپنے مال سے میری مدد کی۔ پھر دوبارہ فرمایا: کیا اب تم میرے صاحب کو چھوڑنے لگے ہو؟
(صحیح بخاری ج ا ص ۵۱۷)

غور فرمایئے! ابوبکر رسول اللہ ﷺ کو کتنے عزیز تھے کہ اگر حضرت عمر جیسا شخص بھی ابوبکر سے ناراض ہوتا تو حضور ان سے ناراض ہو جاتے۔

سلمہ بن اکوع کہتے ہیں: ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا: "ابوبکر خیر الناس الا ان یکون نبی" ابوبکر تمام لوگوں سے افضل ہیں الا یہ کہ نبی نہیں ہیں۔ (الصواعق المحرقہ ص ۶۹)
حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "ابوبکر منی و انا منہ" ابوبکر مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ (الصواعق المحرقہ ص ۶۹) یعنی ابوبکر کے کمالات کا حصول میری ذات سے ہے اور میرے کمالات کا ظہور ابوبکر کی ذات سے ہے۔ سلمان بن یسار کہتے ہیں: ایک مرتبہ حضور ﷺ نے فرمایا: تین سو ساٹھ اوصاف ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص

ان میں سے ایک وصف بھی حاصل کر لے تو وہ جنت میں چلا جائے گا، حضرت ابوبکر نے دریافت کیا: حضور ان اوصاف میں سے کوئی وصف مجھ میں بھی ہے؟ فرمایا: تم میں وہ سارے اوصاف موجود ہیں۔ (الصواعق المحرقہ ص ۷۴)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہ انبیاء سابقین کے صحابہ میں کوئی ابوبکر سے بڑھ کر تھا۔ نہ میرے صحابہ میں کوئی ابوبکر سے افضل ہے۔ (الصواعق المحرقہ ص ۷۰) نیز حضور نے فرمایا: ابوبکر سے محبت رکھنا اور اس کی تعظیم کرنا میری تمام امت پر واجب ہے۔ (الصواعق المحرقہ ص ۷۴)

ابوبکر نظر الوہیت میں

جب حضرت ابوبکر نے بلال کو خرید کر آزاد کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں یہ آیت نازل فرمائی: وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ (اللیل) ''عنقریب وہ شخص جہنم سے آزاد ہوگا جو اتقی ہے اور خدا کی راہ میں مال خرچ کر کے اس کو پاکیزہ کرتا ہے''۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کو جہنم سے آزاد ہونے کی بشارت دی اور انہیں ''اتقی'' فرمایا، اتقی کے معنی ہیں: سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا۔

انسان کا سب سے بڑا کمال ہے تقویٰ اور خدا خوفی اور یوں تو تمام بزرگان دین کو تقویٰ حاصل ہوتا ہے لیکن اصل اعزاز اس شخص کا ہے، جسے خدا خود متقی کہہ دے، بلکہ متقی بھی نہیں اتقی، سب سے زیادہ متقی۔

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (حجرات: ۱۳) ''تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے'' اور جب اللہ تعالیٰ کے نزدیک امت میں سب سے زیادہ متقی ابوبکر ہیں تو اس کی نگاہ میں مکرم بھی سب سے زیادہ ابوبکر صدیق قرار پائے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے غار ثور کا گوشہ گوشہ صاف کیا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر غار کے اندر پہنچے، حضور، ابوبکر کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئے، جہاں محبت ہوتی ہے وہاں اندیشے بھی بیشمار ہوتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کو فکر تھی کہ کہیں کفار

پیچھا کرتے کرتے غار تک نہ آ پہنچیں اور مبادا حضور کو کوئی تکلیف پہنچے۔ حضور نے فرمایا: اے ابو بکر! فکر نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ ابھی یہ بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونٹوں پر ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ هُمَا فِی الْغَارِ اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (التوبہ:۴۰)

دو میں سے دوسرے جب وہ دونوں غار میں تھے، جب انہوں نے اپنے صحابی سے کہا: غم نہ کرو، اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر کو ثَانِیَ اثْنَیْنِ فرمایا۔ اس کا مطلب ہے جس جگہ حضور اول ہیں ابو بکر وہاں ثانی ہیں۔ چنانچہ ایمان میں، تبلیغ میں، نصرت فی الدین میں، ہجرت میں، امامت میں، امارت میں، روضہ میں، حشر میں، جنت میں، جہاں جہاں حضور اول ہیں، ابو بکر وہاں ثانی ہیں۔

نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابو بکر پر صاحب کا اطلاق کیا اور یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد صحابہ ہیں۔ لیکن حضرت ابو بکر کے سوا کسی کو یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا کہ اسے اللہ نے حضور کا صاحب فرمایا ہو اور نہ ہی گروہ صحابہ میں کوئی اس شان کا صحابی ہے جو عالم ارواح سے لے کر جنت تک ہر مرحلہ میں حضور کا صاحب ہو۔

یہ بھی فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ''اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ اس فرمان میں حضرت ابو بکر کے لئے بشارت ہے کہ ان کی پوری زندگی اللہ کی امان اور اس کی حفاظت میں ہے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ اور متقین کے لئے اپنی معیت کی بالعموم بشارت دی ہے لیکن جس ذات کے لئے بالخصوص معیت کا مژدہ سنایا ہے، وہ صرف حضرت ابو بکر کی ذات ہے۔

سفر ہجرت میں حضرت ابو بکر کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت کا شرف حاصل ہوا۔ انہوں نے جان پر کھیل کر حضور کا ساتھ دیا۔ سانپ کے منہ پر ایڑی رکھ دی، لیکن حضور کے آرام میں خلل نہیں آنے دیا۔ اللہ تعالیٰ ابو بکر کی اس خدمت اور نصرت کو یوں سراہتا ہے:

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ (التوبہ:۴۰)

''اے لوگو! اگر تم رسول کی مدد نہیں کرتے تو (سن لو) اللہ نے خود اپنے رسول کی مدد کر

دی ہے"۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر کی مدد کو اپنی مدد فرمایا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ حضور کی خرید کو اپنی خرید اور آپ کی فروخت کو اپنی فروخت فرما کر حضور کے حال کو اپنا حال قرار دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں حضرت ابوبکر کی مدد کو اپنی مدد فرما کر اللہ تعالیٰ ان کے حال کو اپنا حال قرار دے رہا ہے: اے لوگو! تم رسول کی مدد نہیں کرتے نہ سہی، اللہ نے خود اپنے رسول کی مدد کر دی ہے۔ حضرت حسن بصری نے کہا: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تمام روئے زمین کے لوگوں سے شکوہ کیا ہے کہ وہ اس کے رسول کی مدد نہیں کرتے اور جو ذات اس شکایت سے مستثنیٰ ہے، وہ صرف ابوبکر صدیق کی ذات ہے۔ (روح المعانی ج ۱۰ ص ۱۰۰)

مقامِ ابوبکر

حضرت ابوبکر صحابی تھے اور ایسے صحابی کہ اللہ تعالیٰ نے لِصَاحِبِهٖ فرما کر ان کی صحابیت کا مان رکھا۔ حضور نے "أَنْتَ صَاحِبِي فِي الْغَارِ وَ صَاحِبِي فِي الْحَوْضِ" فرما کر ان کی صحابیت کو فروغ بخشا۔ صحابہ کرام میں بعض خود تو صحابی ہیں، لیکن باپ صحابی نہیں۔ بعض کے باپ صحابی ہیں، مگر بیٹے صحابی نہیں، بعض کے باپ اور بیٹے صحابی ہیں، تو پوتا صحابی نہیں، مگر ابوبکر وہ تنہا صحابی ہیں جن کے والد بھی صحابی ہیں بیٹے بھی صحابی اور پوتے بھی صحابی۔

حضرت ابوبکر صدیق شجاع اور بہادر تھے اور ایسے شجاع کہ سفر ہجرت میں اپنی حفاظت کے لئے حضور نے انہیں منتخب فرمایا۔ نصرت اسلام کی خاطر سب سے پہلے داد شجاعت دی۔ مانعین زکوٰۃ کے خلاف تلوار اٹھائی۔ نبوت کے جھوٹے دعویداروں کا استیصال کیا۔ مرتدین اور باغیوں کا سر کچلا، ان کی ولولہ انگیز قیادت میں اسلامی فتوحات کا دھارا تیزی سے بہتا رہا۔ بعض مواقع پر مصلحت کی خاطر بڑے بڑے جری اور سخت لوگ بھی نرم پڑ گئے۔ لیکن بڑی سے بڑی مصلحت بھی عزم و استقلال کے اس کوہ گراں کو اپنے موقف سے ہٹا نہ سکی۔

حضرت ابوبکر فیاض ہیں اور ایسے فیاض کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر مال پیش کرنے کا موقع آیا تو فیاضی کی مثال قائم کر دی۔ ابوبکر رسول اللہ کے خادم ہیں اور ایسے خادم

کہ مال سے خدمت کی تو رسول اللہ نے فرمایا: "مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِیْ مَالُ اَبِیْ بَکْرٍ" "مجھے کسی کے مال سے وہ فائدہ نہیں پہنچا جو ابوبکر کے مال سے پہنچا ہے"۔ (جامع ترمذی ص ۵۲۶) اور جب جان سے خدمت کی تو رسول اللہ نے فرمایا: کسی شخص نے ہم پر احسان نہیں کیا مگر ہم نے اس کا بدلہ اتار دیا ہے ماسوا ابوبکر کے، ان کے احسان کا بدلہ قیامت کے دن اللہ اتارے گا۔ (صحیح بخاری ص ۵۲۸)

حضرت ابوبکر عالم اور فقیہ ہیں اور ایسے عالم کہ حضور فرمائیں: میرے بعد سوال پوچھنا ہو تو ابوبکر سے پوچھو۔ (صحیح بخاری ص ۵۲۸) رسول اللہ کے محبوب ہیں اور ایسے محبوب کہ جب آپ سے پوچھا جائے کہ آپ کو مردوں میں سب سے زیادہ کون محبوب ہے تو فرمائیں: ابوبکر۔ حضرت عائشہ فرمائیں کہ حضور ہر روز ہمارے گھر آیا کرتے تھے، (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷)۔ دنیا حضور کی طرف جاتی ہے، حضور ابوبکر کی طرف جاتے تھے، ایک زمانہ آپ کا طالب اور آپ صدیق اکبر کے طالب تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے سب سے زیادہ اپنی رفاقت اور مال سے مجھ پر احسان کیا، وہ ابوبکر ہیں۔ آپ نے فرمایا: اگر میں دنیا میں کسی کو خدا کے سوا اپنا خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا۔ (انسان العیون ج ۲ ص ۲۰۳، مدارج النبوت ج ۲ ص ۵۸) ایک مرتبہ ابودرداء حضرت ابوبکر سے آگے چل رہے تھے، آپ نے فرمایا: اے ابودرداء! تم اس شخص سے آگے چل رہے ہو جو دنیا اور عقبیٰ میں تم سے افضل ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں مجھ کی جان ہے، انبیاء اور رسل کے بعد ابوبکر سے بڑھ کر کسی شخص پر سورج نہ طلوع ہوتا ہے نہ غروب ہوتا ہے۔ (انسان العیون ج ۲ ص ۲۱۴)

سفر معراج میں جب سدرہ پر جبریل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دیا تو آگے جا کر تنہائی سے حضور کا دل گھبرانے لگا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ابوبکر کی آواز میں ایک کلام پیدا کیا: "قف یا محمد فان ربك یصلی" (الیواقیت والجواہر ج ۲ ص ۳۶۷، دار احیاء التراث العربی، ۱۴۲۸ھ) یہ آواز سنتے ہی حضور کا مضطرب دل تسکین پا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تنہائی میں اگر کسی سے حضور کا دل بہلتا ہے تو ابوبکر سے بہلتا ہے۔ اسی لئے غارِ ثور کی تنہائی

میں ابوبکر کو ساتھ لیا تھا اور جب جنازہ ابوبکر کو روضہ رسول پر پیش کیا گیا، تو اسی لئے آواز آئی تھی: "اُدْخُلُوا الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ" حبیب کو حرم حبیب میں داخل کردو۔
(تفسیر کبیر ج ۵ ص ۴۶۵)

حضرت ابوبکر نے ایک موقع پر کہا: "یا لیتنی کنت سھو محمد" کاش کہ میں حضور کا سہو ہی ہو جاتا۔ (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول حصہ پنجم ص ۱۶۱) یعنی ابوبکر کو حضور سے اتنی محبت تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں مقبول سے مقبول شخص کا بڑے سے بڑا عمل بھی حضور کے سہو کے برابر نہیں ہو سکتا۔

حضرت عبداللہ بن زبیر کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (النساء: ۶۶) "اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ وہ اپنے آپ کو قتل کر دیں"۔ تو حضرت ابوبکر کہنے لگے: یا رسول اللہ! اگر آپ مجھے حکم دیتے کہ میں اپنے آپ کو قتل کر دوں تو میں خود کو قتل کر دیتا۔ حضور نے فرمایا: "صدقت" "تم نے سچ کہا"۔
(الصواعق المحرقہ ص ۷۳)

جبریل امین رسول ملائکہ ہیں۔ انبیاء کے بعد سب سے افضل ہیں۔ فرشتوں میں سب سے اونچا مقام رکھتے ہیں مگر فرشتوں میں محبت کہاں، محبوب کے اشارے پر جان دینے کا جذبہ کب۔ جبھی تو جبریل سدرہ سے آگے حضور کے بلانے پر نہ آئے اور کہہ دیا: "لو دنوت انملة لاحترقت" اگر میں ایک پور بھی آگے گیا تو جل جاؤں گا۔ جبریل میں تقدس تھا، ملکوتیت تھی، رسالت کی عظمت تھی، سب کچھ تھا۔ مگر جذبہ صدیقی نہ تھا، اگر وہاں ان کی جگہ ابوبکر ہوتے تو ہزار بار جل جاتے، مگر حضور کی بات نہ ٹالتے۔

اہل حق کہتے ہیں کہ جس جگہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، وہ جگہ عرش سے بھی افضل ہے۔ کیونکہ افضلیت کا مدار حضور ہیں۔ آپ عرش پر چلے جائیں تو عرش افضل اور فرش پر ہوں تو فرش افضل ہے اور جب یہ حق ہے تو کہنا پڑے گا کہ ابوبکر کا مقام عرش سے بھی اونچا ہے۔ کیونکہ حضرت ابوبکر اس جگہ فروکش ہیں جہاں حضور آرام فرما ہیں۔

الحاصل، ابوبکر کیا ہیں؟ آئینہ جمال مصطفیٰ، سیرت رسول کا سراپا، اللہ کے محبوب،

رسول اللہ کے مطلوب، جو ان سے بگڑے اس سے رسول اللہ بگڑ جائیں، جن پر نکتہ چینی اللہ کو گوارا نہیں، اطاعت رسول میں جبریل جن کا ہم سر نہیں اور عرش الٰہی کو جن سے مساوات کا یارا نہیں۔



حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ محدثِ خیرِ امم

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ کرام رشد و ہدایت کے پیکر اور نگاہ فراست کے مالک تھے۔ انہوں نے فیضان رسالت سے تربیت پائی تھی۔ حضور پر وحی اترنے کی کیفیت کو دیکھا تھا۔ رموز قرآن کے محرم اور اسرار وحی سے واقف تھے۔ اسی وجہ سے افراد صحابہ تعداد انبیاء کے مطابق اور ان کے اوصاف کے مظہر تھے۔ اسی لئے حضور نے فرمایا تھا: میرے تمام صحابہ آسمان ہدایت کے ستارے ہیں، تم نے ان میں سے جس کو بھی مقتداء بنالیا ہدایت پالو گے، سارے صحابہ ہی رسول کا اسوہ اور نبوت کی تعبیر تھے۔

مگر جس کو نوید فراست ملی، جس نے موافقت وحی کا مرتبہ پایا، جس کی زبان الہام و تحدیث کا مرکز بنی وہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پہلی امتوں میں محدث ہوتے ہیں، اگر میری امت میں کوئی محدث ہے تو وہ عمر ہے، ایک اور مرتبہ فرمایا: تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ ہوتے تھے جو نبی تو نہ تھے مگر صاحب کلام تھے۔ اس امت میں اگر کوئی ایسا ہے تو وہ عمر ہے۔ (صحیح بخاری)

محدث کا مفہوم

مفہوم محدث کے بارے میں اہل علم کے متعدد اقوال ملتے ہیں، بعض نے کہا: محدث، صاحب الہام کو کہتے ہیں۔ تورپشتی نے کہا: محدث وہ شخص ہے جس کی رائے صائب اور ظن صادق ہو۔ ابو احمد عسکری نے کہا: جس کے قلب پر ملاء اعلیٰ سے فیضان ہو اسے محدث کہتے ہیں۔ بعض نے کہا: جس کی زبان ہمیشہ نطق بالصواب کرتی ہو وہ محدث ہے۔ ابن التین نے کہا: محدث صاحب فراست ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا: ملہم بالصواب کو محدث کہتے ہیں۔ ابن حجر عسقلانی نے ایک مرفوع روایت سے بتلایا: محدث کی زبان سے ملائکہ کلام کرتے ہیں۔ ملا علی قاری نے کہا: محدث سے مراد وہ شخص ہے جو کثرت الہام کے سبب درجۂ انبیاء سے واصل ہو۔ ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ محدث کے

قلب و نظر پر ملاء اعلیٰ کا فیضان ہوتا ہے۔ اس کا اجتہاد صحیح اور اس کا کلام صائب اور ربانی تائید سے موید ہوتا ہے۔

محدث کا مصداق

اس امت میں محدث ہے یا نہیں؟ جمہور کی رائے یہی ہے اور یقیناً ہے کہ جب امم سابقہ میں محدث ہوتے تھے تو خیر امم میں محدث کیوں نہ ہوگا۔ نیز پچھلی امتوں میں کسی ایک رسول کی شریعت کی تفہیم کے لئے تسلسل اور تواتر کے ساتھ انبیاء آتے رہتے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے نبوت ختم کر دی تو اللہ تعالیٰ نے نبی کی جگہ محدث کو مقرر کر دیا۔ پس تمام اولیاء محمدیین محدث ہیں۔ لیکن اس گروہ کے سرخیل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں، جنہوں نے نطق رسالت سے محدث کا لقب پایا ہے۔

موافقت خداوندی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے اپنے رب کی تین امور میں موافقت کی ہے۔

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: تین میں حصر کی وجہ سے ان کی شہرت ہے، ورنہ موافقت کی تعداد پندرہ ہے۔ صاحب "ریاض" نے کہا: ان میں سے نو لفظی، چار معنوی اور دو بطور توریہ کے ہیں۔ ابن حجر ہیتمی مکی نے کہا: ایسی آیات سترہ ہیں اور سیوطی نے تتبع کر کے ان کا عدد بیس سے زائد تک پہنچا دیا ہے۔ بعض کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ایک مرتبہ مقام ابراہیم کو دیکھ کر حضرت عمر نے کہا: حضور! ہم مقام ابراہیم کو مصلیٰ نہ بنا لیں؟ تو یہ آیت نازل ہوگئی: وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (البقرہ: ۱۲۵)
"مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنالو"۔

(۲) احکام حجاب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ آپ کی ازواج مطہرات کے سامنے ہر قسم کے لوگ آتے ہیں۔ آپ ازواج کو پردہ کا حکم دیں۔ تو یہ آیت نازل ہوگئی: وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ (الاحزاب: ۵۳)
"جب تم ازواج نبی سے کوئی چیز مانگو تو پردہ کی اوٹ سے مانگو"۔ (بخاری)

(۳) حضور اپنی کنیز ماریہ قبطیہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ جب بعض ازواج کو یہ ناگوار

لگا تو حضرت عمر نے ان سے کہا: اگر حضور نے تمہیں طلاق دے دی تو اللہ حضور کو تم سے بہتر ازواج عطا کر دے گا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ (التحریم: ۵) ''قریب ہے کہ اگر وہ تم کو طلاق دے دیں تو اللہ انہیں تم سے بہتر ازواج عطا کر دے گا''۔ (بخاری)

(۴) اسیران بدر کے بارے میں بعض لوگوں نے فدیہ کی رائے دی۔ اس کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے قتل کی تھی اور اس وقت رائے عمر پر تنزیل ہوگئی: لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِیْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۶۸﴾ (الانفال) ''اگر تقدیر الٰہی میں پہلے سے یہ مقرر نہ ہوتا کہ اجتہادی خطا میں مواخذہ نہیں ہوتا تو فدیہ لینے پر تمہیں عذاب عظیم ہوتا''۔ (مسلم)

(۵) جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں جوئے اور شراب کا دور عام تھا۔ حضرت عمر حضور کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: حضور! ہمیں جوئے اور شراب کے بارے میں ہدایت دیں کیونکہ یہ مال اور عقل کو ضائع کرنے والی چیزیں ہیں۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ ؕ قُلْ فِیْهِمَاۤ اِثْمٌ (البقرہ: ۲۱۹) ''یہ آپ سے شراب اور جوئے کا حال پوچھتے ہیں، کہیے: ان میں بڑا گناہ ہے''۔ (آلوسی)

(۶) ایک دفعہ ایک شخص نے شراب کے نشہ میں نماز پڑھا دی اور قرآن غلط پڑھا۔ اس موقعہ پر حضرت عمر نے حضور سے پھر گزارش کی تو یہ آیت نازل ہوئی: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء: ۴۳) ''نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ''۔ (ابوبکر جصاص)

(۷) اس کے بعد حضرت عمر بار بار خدا سے دعا کرتے رہے: اے اللہ! شراب اور جوئے کے بارے میں کوئی واضح حکم نازل فرما، حتیٰ کہ یہ آیت نازل ہوئی: اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ (المائدہ: ۹۰) ''شراب اور جواء، بت اور پانسے ناپاک ہیں شیطانی کاموں سے، ان سے بچو''۔

(ابوداؤد، ترمذی)

(۸) جب یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم نے انسان کو کیچڑ والی مٹی سے پیدا کیا تو حضرت عمر نے بے ساختہ کہا: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ؈ (مومنون) چنانچہ انہی لفظوں سے یہ آیت نازل ہوئی۔

(۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغی مصالح کے پیش نظر عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی تو حضرت عمر بار بار کہتے رہے، حضور! آپ منافق پر نماز پڑھیں گے؟ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا (توبہ: ۸۴) آئندہ آپ کبھی بھی منافق کی نماز جنازہ نہ پڑھائیں۔ (سیوطی)

یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کا صحیح ہونا عام منافقین کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے بارے میں ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارادہ تبلیغی ضرورت کے سبب بالخصوص عبداللہ بن ابی کے بارے میں تھا اور یہ امر صحیح تھا ورنہ وحی کے ذریعہ حضور کو اس کی نماز جنازہ سے روک دیا جاتا۔ حضور کی اسی نماز کی وجہ سے عبداللہ بن ابی کی قوم کے ایک ہزار افراد اسلام لے آئے تھے اور اس نماز سے یہی سرکار کا منشاء تھا۔ الغرض عمر کی رائے کا صحیح ہونا حضور کے مقابلہ میں نہ تھا۔ کیونکہ حضور کا عمل بالخصوص عبداللہ بن ابی کے بارے میں تھا اور قرآن نے عام منافقین کا حکم بیان کیا ہے۔ (سعیدی)

(۱۰) اسی نماز کے سلسلہ میں حضرت عمر نے عرض کیا: ان کے لئے استغفار کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: "سواء علیهم استغفرت لهم ام لم تستغفر لهم"، "ان کے حق میں برابر ہے آپ استغفار کریں یا نہ کریں"۔
(ابوعبداللہ شیبانی)

(۱۱) میدان بدر میں جانے کے لئے حضور نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ بعض نے منع کیا اور حضرت عمر نے جانے کا مشورہ دیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: كَمَاۤ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَیْتِكَ بِالْحَقِّ ۪ وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَكٰرِهُوْنَ ؈ (الانفال)
"تمہارا رب تمہیں گھر سے (بدر کی طرف) لے گیا اور بے شک مسلمانوں کی ایک

جماعت کو یہ ناپسند تھا"۔(طبرانی)

(۱۲) جب ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بعض منافقین نے تہمت لگائی تو حضرت عمر نے کہا: سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِیْمٌ (نور) پھر انہی لفظوں سے یہ آیت نازل ہوگئی۔(طبرانی)

(۱۳) ابتداء میں رمضان کی راتوں کا بھی روزہ ہوتا تھا۔ایک مرتبہ حضرت عمر سے رات کا روزہ ٹوٹ گیا۔اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ (البقرہ:۱۸۷) اب تمہارے لئے رمضان کی راتیں حلال ہیں۔(ابن حجر مکی)

(۱۴) ایک اسرائیلی نے حضرت عمر سے پوچھا: تم پر وحی کون لاتا ہے: فرمایا: جبرائیل، کہا وہ تو ہمارا دشمن ہے، فرمایا: جو اللہ، فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے وہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ بھی اس کا دشمن ہے۔اس جواب کی تائید میں یہ آیت نازل ہوگئی: مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِیْلَ وَمِیْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ (البقرہ)۔

(۱۵) ایک منافق نے حضور کے فیصلہ پر حضرت عمر کے فیصلہ کو ترجیح دی۔آپ نے اس کو قتل کردیا، لوگوں میں مشہور ہوگیا کہ عمر نے ایک مسلمان کو قتل کردیا۔آپ نے حضور سے عرض کیا: حضور! جو آپ کا فیصلہ نہ مانے وہ مسلمان کب ہے؟ اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى یُحَكِّمُوْكَ (النساء:۶۵)"آپ کے رب کی قسم! وہ مسلمان ہی نہیں جو آپ کا فیصلہ نہ مانتے"۔(فخر رازی)

(۱۶) ایک مرتبہ حضرت عمر سوئے ہوئے تھے، ایک شخص نے بغیر اجازت گھر میں داخل ہو کر آپ کو جگا دیا، آپ نے دعا کی: اے اللہ! بلا اجازت گھروں میں داخلہ کو حرام قرار دے دے۔تو یہ آیت نازل ہوئی: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا (النور:۲۷)"اے ایمان والو! بغیر اجازت دوسروں کے گھروں میں نہ داخل ہو، جب تک اجازت نہ لے لو اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرلو"۔(سیوطی)

ان شواہد سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ حضرت عمر کی زبان وحی وسکینہ کی ترجمان تھی۔ عمر کی زبان پر جب بھی کوئی کلمہ آیا وہ عین حق وصواب تھا اور ان کی فکر اور رائے وحی کے موافق اور کلام الٰہی کے مطابق تھی۔

فراستِ عمر سے اصول اجتہاد کا استخراج

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مختلف مقدمات کا فیصلہ اس بالغ نظری اور صحیح فکر کے ساتھ کیا جس سے صرف ان جزوی معاملوں پر ہی اثر نہیں پڑا بلکہ ان فیصلوں سے فکر و اجتہاد کے اصول معلوم ہوئے اور امت کے لئے استنباط احکام اور استخراج مسائل کی راہیں کھل گئیں۔

ان تمام واقعات کا شمار تو بہت مشکل ہے۔ البتہ چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

(۱) ایک مرتبہ حضرت عمر کی خدمت میں یہ معاملہ لایا گیا کہ مطلقہ عورت کو رہائش اور خرچہ ملے گا یا نہیں؟ آپ نے فیصلہ کیا کہ ملے گا۔ اس وقت فاطمہ بنت قیس نے یہ روایت کی کہ مجھے میرے خاوند نے طلاق دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: تیرے لئے کوئی نفقہ اور سکنیٰ نہیں۔ حضرت عمر نے جواب میں فرمایا: ہم کتاب اور سنت کو محض ایک عورت کے قول کی بنا پر نہیں چھوڑ سکتے۔ خدا جانے وہ سمجھ نہ سکی یا بھول گئی۔

(ابوبکر جصاص)

اس فیصلہ سے یہ اصول معلوم ہوا کہ خبر واحد سے کتاب اور سنت متواترہ کے حکم کو منسوخ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہ نے اکثر احکام اسی اصول سے مستنبط کئے ہیں۔

ملی شعائر کا تحفظ

عہد ابوبکر میں بہت سے قراء اور حفاظ جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے۔ اس وقت حضرت عمر سیدنا ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: مجھے خوف ہے کہ اس طرح ایک ایک کر کے کہیں سارے حافظ اور قاری فوت نہ ہو جائیں اور قرآن ہمارے درمیان نہ رہے، اس لئے آپ تمام قرآن کو جمع کر کے محفوظ کر دیں۔ حضرت ابوبکر نے کہا: میں وہ کام کیسے کر لوں جسے رسول اللہ نے نہیں کیا؟ آپ نے جواب میں کہا: رب کعبہ کی قسم! اس کام میں خیر ہے۔ آپ یوں ہی بار بار فرماتے رہے حتیٰ کہ اللہ نے ابوبکر کے دل میں بھی وہ روشنی پیدا کر دی

جو اس سے پہلے عمر کو عطا کی تھی۔ پھر حضرت ابو بکر نے اس عظیم کام کے لئے قراء صحابہ کی ایک کمیٹی مقرر کی اور تمام قرآن پاک کو ایک جگہ جمع کرا دیا۔ (بخاری)

اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر کو جو ملکوتی زبان اور تعمیری فکر عطا کی تھی، جس کام کے لئے انہیں محدث اور ملہم بنایا تھا، اسی وصف سے حضرت عمر نے اس موقعہ پر حفاظت قرآن کی تحریک کی اور آج جو امت مسلمہ کے ہاتھوں میں صحیفہ قرآن موجود ہے یہ صرف عمر کی نظر صائب اور فکر راسخ کا ثمرہ ہے۔

اوائل عہد فاروقی تک لوگ الگ الگ تراویح پڑھا کرتے تھے، حضرت عمر نے انہیں امام واحد کی اقتداء میں جمع کر دیا اور سب مل کر جماعت سے تراویح پڑھنے لگے اور اس میں ختم قرآن کا اہتمام کر لیا گیا۔ (بخاری و بیہقی)

بظاہر یہ صرف اتنی سی بات تھی کہ حضرت عمر نے تراویح کو با جماعت کرا دیا لیکن حقیقت میں اس میں بہت عظیم اور دوررس فوائد پنہاں تھے، بعض ازاں یہ ہیں:

(۱) تراویح میں قرآن سنانے کے شوق سے لوگ بکثرت قرآن حفظ کرتے ہیں، ایک مسجد میں تراویح ہو تو کئی حافظ شریک ہوتے ہیں، ایک حافظ قرآن سناتا ہے اور بہت سے حافظ قرآن سنتے ہیں اور تجربہ سے یہ امر ثابت ہے کہ جو حافظ قرآن سنانا یا سننا چھوڑ دے اسے قرآن بھول جاتا ہے اور آج دنیا میں جو حفاظ قرآن کی اس قدر کثرت ہے یہ سب تراویح کی برکت اور فراست عمر کا صدقہ ہے۔

الغرض قرآن کریم کے محفوظ رہنے کی صرف دو شکلیں ہیں یا صورت مصحف میں یا سینہ حافظ میں اور قرآن مصحف میں محفوظ عمر کی فکر سے ہوا اور سینہ میں محفوظ عمر کی فراست سے۔

(۲) حضور اکرم ﷺ ہر سال رمضان میں جبرائیل کے ساتھ قرآن کا دور کیا کرتے تھے۔ تراویح کے سبب اب ہر سال رمضان میں حافظ اور سامع قرآن کا دور کرتے ہیں اور حضور کی یہ سنت تازہ رہتی ہے۔

(۳) سال میں ایک مرتبہ پورا قرآن سن لینے سے یہ موقعہ ملتا ہے کہ ہم اپنی ایک سال کی ڈائری کو دستور قرآن کے آئینہ میں دیکھ سکیں اور یہ فیصلہ کر سکیں کہ ہم نے قرآن کے

کتنے احکام کی تعمیل کی ہے اور کتنے احکام کی مخالفت اور پھر قرآن کی روشنی میں ہم اپنے کردار کے بگڑے ہوئے خدوخال کو درست کر سکیں۔

حضرت عمر ہمیشہ امت کی تعمیر اور ملت کے استحکام کی لگن میں رہتے تھے، آپ کی فراست نے امت کو ہجری تقویم دی۔ شراب نوشی پر اسی کوڑے حد مقرر کی۔ خلیفہ رسول کے لمبے چوڑے اضافی نام کی جگہ امیر المؤمنین کا لقب اختیار کیا۔ امیر کے لئے بیت المال سے وظیفہ کی ابتداء کی، ہجو پر تعزیر مقرر کی، رات کو اٹھ کر احوال رعایا کے تجسس کا عمل جاری کیا۔ تادیب کے لئے درہ ایجاد فرمایا، اطراف مملکت میں قضاۃ کا تقرر کیا۔ مساجد میں قنادیل کی روشنی کا انتظام کیا اور ایسے بہت سے کام کئے۔

حضرت عمر کی قد آور اور تاریخ ساز شخصیت کے سامنے ہر فراز نشیب معلوم ہوتا ہے۔ عمر فاروق کی عبقری نظر کا یہ عالم تھا کہ مدینہ میں دوران خطبہ بھی ''نہاوند'' کے امیر لشکر کو ہدایت دیتے رہتے تھے، دشت وجبل کی وسعتیں نگاہ عمر کے سامنے سمٹ جاتی تھیں۔ جزیرۂ عرب سے لے کر ساحل ''مکران'' تک تمام حکام ان کے رعب سے سہمے ہوئے رہتے تھے۔ حضرت عمر کی فہم وفراست اور عقابی نظر نے اس امت کو بہت کچھ دیا ہے۔ عہد عمر کی تہذیب، قانون، معیشت، عوام کی خوشحالی اور فتوحات کی وسعت دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو ایک اور عمر مل جاتا تو آج دنیا میں اسلام کے سوا کوئی اور مذہب نہ ہوتا۔



فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور تحریم متعہ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عبقری شخصیت اسلام کی تاریخ میں ایک زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کا دور خلافت، حکومت کی وسعت، عدل و انصاف کی فراوانی، عوام کی خوشحالی اور اسلامی فنون کی ترویج و ترقی کا دور تھا۔ کفار اور مشرکین کے ایوانوں پر حضرت عمر کی ہیبت اور دہشت و جبل پر ان کی حکومت تھی، ان کے رعب سے حکام لرزہ براندام تھے اور صحرا اور دریا کو بھی حکم عدولی کی جرأت نہ تھی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے محاسن و کمالات جتنے زیادہ ہیں، اسی قدر حاسدین کی بھی کثرت ہے۔ حضرات امامیہ یوں تو تمام صحابہ سے عداوت رکھتے ہیں لیکن جناب فاروق اعظم سے ان کو جس قدر بغض اور حسد ہے اس کا بیان اندازہ سے باہر ہے۔ حضرت عمر کی وہ تمام خدمات جن سے عمارت اسلام کو استحکام ملا انہیں مجموعہ عیوب نظر آتی ہیں۔

حضرت عمر کی ذات گرامی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اسلامی احکام کے علی الرغم محض اپنے رائے سے متعہ کو حرام کر دیا اور ان کی ڈکٹیٹر شپ (Dictatorship) کے سامنے کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حتیٰ کہ حضرت علی بھی تقیہ کا سہارا لے کر خاموش ہو گئے۔ عقل و خرد دم بخود رہ جاتی ہے کہ حضرت علی کو جان اتنی پیاری تھی کہ ان کے سامنے بروایت شیعہ حضرت سیدہ کی بے عزتی کی گئی اور وہ خاموش دیکھتے رہے۔ کلام اللہ میں تحریف کر دی گئی اور ان کے لب نہ ہلے۔ شریعت مصطفوی میں عمر کی رائے سے ترمیم ہوتی رہی اور علی ساکت و جامد رہے، عزت و آبرو کے تحفظ اور ناموس ملت کے لئے اگر جان نہ دی جا سکے تو پھر اس جان کا اور کیا مصرف ہے؟

تقیہ کے موضوع پر اظہار خیال سردست ہمارا موضوع نہیں ہے۔ عنوان گفتگو اس وقت یہ ہے کہ حضرت عمر کے دامن کو تنفیذ حرمت متعہ کے سبب ترمیم دین اور تحریف

شریعت کے غلط الزام سے پاک و صاف کیا جائے، بلکہ ان آنکھوں کے لئے دلائل کی بصیرت مہیا کی جائے جنہیں اس دامن کی پاکیزگی نظر نہیں آتی۔

متعہ کی تعریف اور اس کے احکام

متعہ اس عقد کو کہتے ہیں جس میں مقررہ معاوضہ سے معینہ مدت کے لئے کسی عورت کو قضاء شہوت کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس عقد کے لئے نہ گواہوں کی ضرورت ہے نہ ممتوعہ عورتوں کے لئے تعداد کی کوئی قید ہے۔ نہ نفقہ، نہ سکنیٰ۔ نہ نسب، نہ میراث۔ ایلاء، ظہار، طلاق اور عدت، متعہ ان سب سے آزاد ہے۔ جہاں فریقین راضی ہوئے، مدت اور اجرت طے ہوئی وہیں جنسی تسکین کا عمل شروع ہو گیا۔

رواج متعہ اور حضرت عمر

متعہ زمانہ جاہلیت کی قبیح رسموں میں سے ایک رسم تھی۔ اسلام نے جس طرح تدریجی عمل کے ذریعہ دوسری برائیوں کو رفتہ رفتہ ختم کیا، اسی طرح متعہ کو بھی فتح مکہ کے بعد حرام کر دیا اور کتاب وسنت میں اس کی حرمت کے دلائل پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔

حضرت عمر نے جس طرح شریعت کے دوسرے قوانین پر سختی سے عمل کرایا، شراب و زنا پر حدود جاری کیں، چوروں کے ہاتھ کاٹے، جھوٹے گواہوں کو سزائیں دیں، اسی طرح آپ نے پوری شدت اور تندہی سے حرمت متعہ کی بھی تبلیغ اور تنفیذ کی۔ جو لوگ بے علمی اور غفلت کی بناء پر متعہ کرتے رہے تھے انہیں سخت الفاظ سے تنبیہ اور تہدید کی۔ جس طرح حضرت ابوبکر نے زکوٰۃ نہ دینے والوں کو للکارا اور سختی سے ان کا محاسبہ کیا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ زکوٰۃ کے شارع ہیں، اسی طرح حضرت عمر نے متعہ کرنے والوں کو بروقت ٹوکا اور اپنے دور خلافت میں حدود الٰہی کی حرمت کو پامال نہیں ہونے دیا۔ پس حضرت عمر بھی حضرت ابوبکر کی طرح شارع نہیں مبلغ تھے۔

شریعت اسلامیہ نے متعہ کو قطعی طور پر قیامت تک کے لئے حرام کر دیا ہے۔ ہم اس کے ثبوت میں قرآن کریم کی آیات اور احادیث صحیحہ ہدیہ رقم کریں گے اور امامیہ کی طمانیت کی خاطر ان کی صحاح سے بھی شواہد لائیں گے اور اخیر میں امامیہ کے معرکۃ الآراء دلائل و

براہین پر نقد و نظر کریں گے۔ فنقول وبہ اللہ التوفیق۔

حرمت متعہ کتاب اللہ سے

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ (النساء: ۳)

"جو عورتیں تم کو پسند ہیں ان سے نکاح کرو، دو دو سے، تین تین سے اور چار چار سے اور اگر تمہیں ان کے درمیان ناانصافی کا خدشہ ہو تو صرف ایک سے نکاح کرو یا اپنی کنیزوں پر اکتفا کرو"۔

یہ آیت سورۂ نساء سے لی گئی ہے جو مدنی ہے اور ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل استطاعت سے خطاب فرمایا اور ان کے لئے قضاء شہوت کی جائز صورتیں بیان فرما دیں کہ وہ ایک سے چار تک نکاح کر سکتے ہیں اور اگر ان میں عدل قائم نہ رکھ سکیں تو پھر اپنی کنیزوں اور باندیوں سے نفع اندوزی کر سکتے ہیں اور بس۔ اگر متعہ بھی قضاء شہوت کی جائز شکل ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کا بھی ان صورتوں کے ساتھ ذکر فرما دیتا اور اس جگہ متعہ کا بیان نہ کرنا ہی اس بات کا بیان ہے کہ وہ جائز نہیں ہے اور اس طرح اوائل اسلام سے لے کر فتح مکہ تک متعہ کی جو شکل معمولی اور مباح تھی، اس آیت کے ذریعہ اس کو حرام کر دیا گیا۔

امامیہ حضرات کو اگر یہ شبہ لاحق ہو کہ اس آیت میں لفظ نکاح متعہ کو بھی شامل ہے۔ لہٰذا نکاح کے ساتھ متعہ کا جواز بھی ثابت ہو گیا تو اس کے ازالہ کے لئے گزارش ہے کہ اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ نکاح کی حد صرف چار عورتوں تک ہے اور متعہ میں عورتوں کی تعداد کے لئے کوئی قید نہیں ہے۔ پس جب کہ یہ متضاد حقیقتیں ہیں تو ظاہر ہے کہ ایک لفظ سے ان دونوں کا ارادہ نہیں کیا جا سکتا۔ ورنہ اجتماع ضدین لازم آئے گا اور اللہ تعالیٰ کا کلام اس قسم کی خرافات کا محل بننے سے بلند و برتر ہے۔

اس کی مزید تفصیل یہ ہے کہ نکاح اور متعہ دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ نکاح میں عقد

دائمی ہوتا ہے متعہ میں عارضی، نکاح میں منکوحات کی تعداد محدود ہے اور متعہ میں ممنوعات کی تعداد کی کوئی حد نہیں، نکاح میں نفقہ، سکنیٰ، نسب اور میراث لازم ہوتے ہیں اور ایلاء، ظہار، لعان، طلاق اور عدت عارض ہوتے ہیں اور متعہ میں نہ ان میں سے کوئی لازم ہوتا ہے اور نہ عارض۔ پس نکاح اور متعہ اپنی حقیقت، لوازم اور عوارض کے اعتبار سے دو مختلف چیزیں ہیں۔ البتہ اگر نکاح کا مفہوم متعہ سے عام ہوتا تو اس کو متعہ کو شامل ہونا معقول ہوتا۔ لیکن جب نکاح اور متعہ دو متضاد حقیقتیں ہیں تو ایک ضد کا دوسری ضد کو شامل ہونا قطعاً غیر متصور اور سراسر غیر معقول ہے۔

بعض امامیہ حضرات کہہ دیتے ہیں کہ نکاح کی دو قسمیں ہیں۔ دائمی اور عارضی۔ دائمی نکاح معروف ہے اور عارضی متعہ ہے اور مطلق نکاح دونوں کو شامل ہے، جواباً عرض ہے کہ نکاح کی یہ تقسیم امامیہ حضرات کی محض طبع زاد اور خانہ ساز ہے۔ قرآن کریم نے جس عقد کو نکاح قرار دیا ہے اس میں تعداد منکوحات کی ایک حد ہے اور اسے نفقہ، سکنیٰ، نسب اور میراث لازم ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور عقد پر قرآن نے نکاح کا اطلاق نہیں کیا۔ اس لئے نکاح عارضی محض ایجاد بندہ اور باطل اختراع ہے۔ ایک بے دلیل دعویٰ اور سراسر مخالف قرآن تصور ہے۔

سورۂ نساء کی ایک اور آیت ملاحظہ فرمایئے۔

وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَیٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (الی ان قال) ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِیَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ۔ (النساء:۲۵)	"اور جو شخص تم میں سے آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو مسلمان کنیزوں سے نکاح کرلے اور یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو (غلبہ شہوت سے) اپنے نفس پر زنا کا خوف رکھتا ہو اور صبر کرنا تمہارے لئے بہتر ہے"۔

غور فرمایئے! اس آیت میں غلبۂ شہوت رکھنے والے نادار شخص کے لئے صرف دو طریقے تجویز کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ باندیوں سے نکاح کرے، دوسرا یہ کہ وہ ضبط نفس

کرے اور تجرد کی زندگی گزارے۔ اگر متعہ بھی مشروع ہوتا تو کنیزوں سے نکاح کی طاقت نہ رکھنے کی شکل میں اسے متعہ کی ہدایت دی جاتی، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پس معلوم ہوا کہ کوئی شخص متعہ نہیں کر سکتا، اسے نکاح ہی کرنا پڑے گا خواہ باندیوں سے کرے اور اگر ان سے بھی نکاح کی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اسے صبر کرنا پڑے گا۔ متعہ کے لئے کوئی سبیل جواز نہیں ہے۔

سورۂ نور بھی مدنی سورت ہے، اس کی ایک آیت ملاحظہ فرمایئے:

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (النور: ۳۳)

''اور جو لوگ نکاح کی طاقت نہیں رکھتے ان پر لازم ہے کہ وہ ضبط نفس کریں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے''۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم الفاظ میں دوٹوک فیصلہ فرما دیا ہے کہ اگر نکاح نہیں کر سکتے تو ضبط نفس کرو۔ اب جواز متعہ کی کوئی وجہ نہیں رہی، ورنہ استطاعت نکاح نہ ہونے کی صورت میں متعہ کی اجازت دے دی جاتی اور جب کہ اجازت متعہ کی جگہ ضبط نفس کا حکم دیا تو ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں جواز متعہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔

قرآن کریم کی ان تین آیتوں کی روشنی میں حرمت متعہ کی وضاحت کے بعد ایک منصف مزاج شخص کے لئے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہونا چاہئے کہ حضرت عمر فاروق اعظم نے حرمت متعہ کو قرآن کی ہدایت سے نافذ کیا تھا، اپنی رائے سے نہیں۔

حرمت متعہ صحاح اہل سنت سے

امام بخاری اپنی ''صحیح'' میں روایت فرماتے ہیں:

عَنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ (بخاری ج ۲ ص ۶۰۶)

حضرت علی سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فتح خیبر کے دن عورتوں کے ساتھ متعہ کرنے سے منع فرما دیا۔

غزوۂ خیبر کے بعد فتح مکہ کے موقعہ پر تین دن کے لئے متعہ پھر مباح ہوا، اس کے بعد حضور ﷺ نے قیامت تک کے لئے متعہ کو منسوخ فرما دیا، چنانچہ امام مسلم اپنی ''صحیح''

میں روایت فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِی سَلَمَةَ قَالَ رَخَّصَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَامَ اَوْطَاسٍ فِی الْمُتْعَةِ ثَلَاثًا ثُمَّ نَهَا عَنْهَا وَبِاِسْنَادٍ اٰخَرَ قَالَ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ قَدْ کُنْتُ اَذِنْتُ لَکُمْ فِی الْاِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ وَاَنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ۔ (مسلم ج ا ص ۴۵۱)

ابی سلمہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر تین دن متعہ کرنے کی اجازت دی تھی، پھر اس سے منع فرمادیا اور دوسری روایت میں ہے: اے لوگو! میں نے تمہیں پہلے عورتوں سے متعہ کی اجازت دی تھی اور اب اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے اس کو ممنوع فرمادیا ہے۔

احادیث صحیحہ میں حرمت متعہ کی بکثرت روایات موجود ہیں، لیکن ہم نے طوالت کی وجہ سے ان دو حدیثوں پر اکتفاء کیا ہے۔ فہم مستقیم کے لئے ان میں یہ ہدایت ہے کہ متعہ کے حرام کرنے والے حضور ﷺ ہیں اور عمر تو صرف اس حرمت کو نافذ کرنے والے ہیں۔

حرمت متعہ صحاح امامیہ سے

عن زید بن علی عن آبائه علیهم السلام قال حرم رسول الله ﷺ لحوم الحمر الاهلیة ونکاح المتعة۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے پالتو گدھوں کو اور متعہ کو حرام فرمادیا ہے۔

(الاستبصار ج ۲ ص ۷۷)

"استبصار" کے علاوہ امامیہ کی دوسری کتب صحاح میں بھی حرمت متعہ کی روایات موجود ہیں۔ شیعہ حضرات ان کے جواب میں بے دھڑک کہہ دیتے ہیں کہ حضرت علی نے ایسی روایت تقیۃً بیان فرمائی ہیں اور جان کے خوف سے تقیۃً جھوٹ بولنا عین دین ہے کیونکہ "کافی کلینی" میں ہے: "من لا تقیة له لا دین له" جو وقت ضرورت تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے جب یزید کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا اور ہزارہا مخالفوں کے سامنے تلواروں کے جھنکار اور تیر وتفنگ کی بوچھاڑ میں بیعت یزید سے انکار کیا تو کیا اس وقت امام حسین ترک تقیہ کی وجہ سے (معاذ اللہ) بے

دین ہو گئے تھے؟ اور اگر ایسے شواہد ابتلاء میں بھی تقیہ نہ کرنا ہی حق و صواب تھا تو حضرت علی کا بغیر کسی ابتلاء کے بے حساب روایات تقیۃً بیان کرنا کس طرح حق و ثواب ہوگا؟ کاش! امامیہ حضرات میں سے کوئی شخص اس نکتہ کو حل کر کے لاکھوں انسانوں کی ذہنی خلش کو دور کر سکے۔

حلت متعہ پر امامیہ کے استدلال کا جواب

حضرات امامیہ نے جواز متعہ پر قرآن کی حسب ذیل آیت سے استدلال کیا ہے۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِیْضَةً (النساء: ۲۴) ''جن بیویوں سے تم نے عمل زوجیت کر لیا ہے انہیں ان کا پورا مہر ادا کر دو''۔

امامیہ حضرات کہتے ہیں: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں سے تم نے متعہ کر لیا ہے ان کو اس کی اجرت ادا کر دو اور یہ استدلال متعدد وجوہ سے باطل ہے۔ اولاً اس لئے کہ متعہ کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں مدت متعین ہو اور اس آیت میں تعین مدت کا اصلاً ذکر نہیں ہے، لہٰذا اسْتَمْتَعْتُمْ کا معنی متعہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ اصل میں یہ لفظ ''استمتاع'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے نفع حاصل کرنا اور فائدہ اٹھانا اور آیت کا صاف اور صریح مطلب یہی ہے کہ جن بیویوں سے تم نے عمل زوجیت کر کے جسمانی نفع حاصل کر لیا ہے، انہیں ان کا پورا مہر ادا کر دو، ثانیاً اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات میں نکاح کا بیان اور اس کے احکام ذکر کئے گئے ہیں۔ اب درمیان میں اس آیت کو متعہ پر محمول کرنے سے نظم قرآن کا اختلال اور آیات کا غیر مربوط ہونا لازم آئے گا۔ ثالثاً اس آیت سے متصل پہلی آیت میں فرمایا: اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (النساء: ۲۴) یعنی محرمات کے سوا باقی عورتیں تمہارے نکاح کے لئے حلال کر دی گئی ہیں، تم مہر دے کر ان سے فائدہ اٹھاؤ بشرطیکہ تم انہیں حصن بناؤ اور سفاح نہ کرو۔ حصن کا معنی ہے: قلعہ، یعنی عورت سے نفع اندوزی تب حلال ہے جب وہ تمہارے نطفہ کی حفاظت کے لئے قلعہ بن جائے اور متعہ سے عورت قلعہ نہیں بنتی، ہر ہفتہ دوسرے کے پہلو میں ہوتی ہے، اسی وجہ سے متعہ سے نسب محفوظ نہیں رہتا، اب اگر فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ کا معنی متعہ کر لیا جائے تو قرآن کریم کی دو متصل آیتوں میں کھلا تصادم آئے گا کہ پہلی آیت سے

متعہ حرام ہوا اور دوسری آیت سے حلال اور قرآن کریم اس تضاد کا متحمل نہیں ہے۔ رابعاً سفاح کا معنی ہے: محض قضاء شہوت اور نطفہ گرا دینا اور مطلب یہ ہے کہ عورت سے نطفہ اندوزی حلال ہے، بشرطیکہ تمہارا مقصد محض قضاء شہوت اور جنسی تسکین نہ ہو بلکہ اولاد کو طلب کرنا مقصود ہو اور ظاہر ہے کہ متعہ میں سوائے شہوت اور جنسی تسکین کے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔ پس متعہ جائز نہ رہا اور جب اس آیت سے متعہ حرام ہوا تو اس سے اگلی آیت میں حلت متعہ کا معنی کرنا باطل ہوگا۔

''اِلٰی اَجَلٍ مسمّٰی'' کی قرأت کا جواب

امامیہ حضرات کہتے ہیں کہ بعض روایات میں مذکور ہے کہ بعض قرآت میں فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ کے بعد ''الی اجل مسمی'' بھی پڑھا گیا ہے، اب معنی یوں ہوگا: جن عورتوں سے تم نے مدت معینہ تک فائدہ اٹھایا ان کو اجرت دے دو اور یہ بعینہ متعہ ہے کیونکہ اب آیت میں مدت اور اجرت دونوں کا ذکر آ گیا اور یہی متعہ کے ارکان ہیں، یہ ٹھیک ہے کہ یہ روایت خبر واحد ہے اور اس روایت سے یہ الفاظ قرآن کا جز نہیں بن سکتے۔ لیکن متعہ ثابت کرنے کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ بعض قرأت میں ''الی اجل مسمی'' کے الفاظ موجود ہیں۔

اس استدلال کے جواب میں اولاً معروض ہے کہ ''الی اجل مسمّٰی'' سے استدلال تب ہوگا جب اسے فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ کے ساتھ لاحق کر کے قرآن کا جزو مانا جائے اور شیعہ حضرات کو بھی یہ تسلیم ہے کہ بغیر تواتر کے محض خبر واحد سے کوئی لفظ قرآن کا جز نہیں بن سکتا۔ لہٰذا اس قرأت سے جواز متعہ پر استدلال صحیح نہ رہا۔

ثانیاً تفاسیر میں جہاں اس روایت کو ذکر کیا ہے وہیں تصریح کر دی ہے کہ یہ روایت معتمد نہیں ہے اور قرآن کریم میں اس کی تلاوت کرنا اور اس سے کوئی حکم ثابت کرنا جائز نہیں ہے، چنانچہ ابوبکر رازی الجصاص المتوفی ۳۷۰ھ فرماتے ہیں:

فانه لا یجوز اثبات الاجل فی تلاوته عند احد من المسلمین فالاجل اذا غیر	تلاوت میں اجل پڑھنا کسی مسلمان کے نزدیک جائز نہیں ہے اور یہ لفظ قرآن میں

ثابت فی القران۔ ثابت نہیں ہے۔

(احکام القرآن ج ۲ ص ۱۴۸)

اور ابن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ فرماتے ہیں:

واما ماروی عن ابی بن کعب و ابن عباس من قرأتهما فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی فقرا بخلاف ما جاءت به مصاحف و غیر جائز لاحد ان یلحق فی کتاب الله تعالی شیئا لم یات به الخبر القاطع۔ (تفسیر طبری ج ۳ ص ۱۳)

ابی بن کعب اور ابن عباس کی ایک قرأت میں جو "الی اجل مسمّٰی" کے الفاظ مروی ہیں وہ تمام مصاحف المسلمین کے خلاف ہیں اور کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ کتاب اللہ میں بغیر خبر متواتر کے کسی چیز کا اضافہ کرے۔

ثالثا صرف کسی روایت کا موجود ہونا اس کی ثقاہت کے لئے کافی نہیں۔ روایات توصیح سے لے کر موضوع تک ہر قسم کی موجود ہیں۔ کیونکہ رافضی، قدری، جہمی ہر طرح کے بدعقیدہ لوگوں نے اپنے اپنے مذہب کے موافق روایات وضع کر کے شائع کر دی تھیں۔ یہ محدثین کرام کا ملت اسلامیہ پر احسان عظیم ہے کہ انہوں نے علم اسماء رجال ایجاد کر کے ہر حدیث کی صحت اور وضع پر کھنے کا ذریعہ مہیا کر دیا۔

جس روایت کے سہارے امامیہ حضرات نے "الی اجل مسمی" کی قرأت کو تسلیم کیا ہے، ہم آپ کے سامنے اس روایت کے طرق اور اسانید کا حال بیان کر دیتے ہیں، جس سے روایت کی حقیقت سامنے آجائے گی۔ ابن جریر طبری اس روایت کی سند بیان کرتے ہیں:

حدثنا محمد بن الحسین قال حدثنا احمد بن المفضل قال ثنا اسباط عن السدی فما استمتعتم به منهم الی اجل مسمی فاتوهن اجورهن۔

(تفسیر طبری ج ۵ ص ۱۲)

اس سند کا ایک راوی احمد بن مفضل ہے، ازدی نے کہا: یہ منکر الحدیث ہے اور ابو حاتم نے بیان کیا ہے کہ یہ رؤسا شیعہ سے تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۹۶) اس سند کا تیسرا آدمی اسباط ہے۔ امام نسائی نے کہا: یہ قوی نہ تھا۔ ابن معین نے کہا: "لیس بشیء" یہ کچھ

بھی نہیں۔ ابونعیم نے کہا: بہت ضعیف تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ا ص ۸۱) اس سند کا چوتھا راوی اسماعیل بن عبدالرحمن السدی ہے، جوزجانی نے کہا: یہ کذاب تھا، صحابہ کرام کو سب و شتم کرتا تھا۔ حسین بن واقد نے کہا: میں سماع حدیث کے لئے اس کے پاس آیا، جب دیکھا کہ یہ حضرت ابوبکر و عمر کو برا بھلا کہتا ہے تو میں چلا آیا اور پھر کبھی اس کے پاس نہیں گیا۔ ابن ابی سلیم نے کہا کہ یہ شیخین کی شان میں بدگوئی کرتا تھا۔ طبری نے کہا: اس کی روایات لائق استدلال نہیں ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ا ص ۳۱۷)

اس روایت کی دوسری سند ملاحظہ ہو:

حدثنا ابو کریب قال حدثنا یحیی بن عیسی قال حدثنا نصیر بن ابی الاشعث قال حدثنی حبیب بن ابی ثابت قال اعطانی ابن عباس مصحفا فقال هذا علی قراۃ ابی قال ابوبکر قال یحیی فرایت المصحف عند نصیر فیه فما استمتعتم به منهن الی اجل مسمی۔ (تفسیر طبری ج ۵ ص ۱۲)

اس سند میں ایک راوی ہے یحیٰی بن عیسٰی، نسائی نے کہا: یہ قوی نہ تھا۔ (میزان الاعتدال ج ۴ ص ۴۰۱۔ ۴۰۲) سلمہ نے کہا: اس میں ضعف تھا۔ ابن معین نے کہا: "لیس بشیء" یہ کچھ نہ تھا۔ عجلی نے کہا: اس میں تشیع تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۶۳)

ان دونوں سندوں میں رافضی منکر الحدیث اور کذاب راوی موجود ہیں۔ پس ایسے لوگوں کی بنیاد پر کوئی روایت کس طرح قابل قبول ہو سکتی ہے، ان دونوں سندوں کے بعد ایک اور سند پیش خدمت ہے:

حدثنا ابن المثنی قال ثنی عبد الاعلی قال ثنی داؤد عن ابی نضرۃ قال سالت ابن عباس عن المتعة فذکر نحوه۔ (طبری جز ۵ ص ۱۲)

اس سند کے ایک راوی ہیں عبدالاعلیٰ، ابن سعد نے کہا: یہ قوی نہ تھا۔ ابن حبان اور امام محمد نے کہا: یہ قدریہ عقائد کا حامل تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹۶) اس سند کا ایک اور راوی ہے داؤد بن ابی ہند، اس کے بارے میں تصریح ہے کہ اس کی روایات میں اضطراب تھا اور یہ کثیر الخلاف تھا۔ (تہذیب التہذیب ج ۳ ص ۲۰۵) ان حوالوں سے ظاہر ہو گیا کہ اس

روایت کے طرق میں بکثرت رافضی قدری جیسے بدعقیدہ اور کذاب، منکر الحدیث، کثیر الخلاف اور ضعیف راوی موجود ہیں۔ لہٰذا یہ روایت قطعاً باطل اور جعلی ہے۔

رابعاً ابن عباس اس آیت کو کس طرح پڑھتے تھے اور استمتاع سے ان کی مراد متعہ تھی یا نکاح، اس بارے میں ابن جریر نے جو روایت صحیح سند کے ساتھ ذکر کی ہے وہ یہ ہے:

حدثنی المثنی قال ثنا عبد الله بن صالح قال ثنی معاویة بن صالح بن ابی طلحة عن ابن عباس قوله فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن فریضة یقول اذا تزوج الرجل المرأة ثم نکحها مرة واحدة وجب صداقها کله والاستمتاع هو النکاح۔ (تفسیر طبری جز ۵ ص ۱۱)	حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ انہوں نے "فما استمتعتم به منهن فاتوهن اجورهن" پڑھا (بغیر "الی اجل مسمی" کے) اور اس کی تفسیر میں فرمایا: جب شادی کے بعد کوئی شخص ایک بار بھی عمل زوجیت کرے تو اس پر پورا مہر واجب ہو جاتا ہے اور فرمایا، استمتاع سے مراد نکاح ہے۔

اگر فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ کے بعد "الی اجل مسمی" پڑھا جائے تو استمتاع سے مراد نکاح کسی صورت میں نہیں ہو سکتا۔ متعہ ہی مراد لینا پڑے گا اور جب ابن عباس نے فرمایا: استمتاع سے مراد نکاح ہے اور بغیر "الی اجل مسمی" اس آیت کو پڑھا تو معلوم ہوا کہ "الی اجل مسمی" پڑھنے کی نسبت ان کی طرف کرنا سراسر افتراء ہے اور یہ روایت صحیح السند ہے اور مصاحف مسلمین کے مطابق ہے۔ اسے چھوڑ کر رافضیوں اور قدریوں کی روایت کو لینا جو مصاحف مسلمین کے مخالف اور نظم قرآن سے متصادم ہے، صریح ہٹ دھرمی کے سوا اور کیا ہے۔

ابن عباس کے فتویٰ کا جواب

امامیہ حضرات کہتے ہیں کہ ابن عباس جواز متعہ کا فتویٰ دیتے تھے اور چونکہ اہل سنت کے نزدیک حضرت ابن عباس کی شخصیت واجب التسلیم ہے اس لئے ان پر لازم ہے کہ ان کے فتویٰ کا احترام کریں۔ ہماری گزارش یہ ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مطلقاً جواز کا فتویٰ

نہیں دیا، وہ متعہ کو مردار اور خنزیر کی طرح حرام سمجھتے تھے اور جس طرح حالت اضطرار میں مردار اور خنزیر کھانا جائز ہے اسی طرح ان کے نزدیک حالت اضطرار میں متعہ کرنا بھی جائز تھا۔ چنانچہ علامہ نیشاپوری المتوفی ۷۲۸ھ فرماتے ہیں:

ان الناس لما ذکروا الاشعار فی فتیا ابن عباس فی المتعۃ قال قاتلھم اللہ انی مافتیت باباحتھا علی الاطلاق لکنی قلت انھا تحل للمضطر کما تحل المیتۃ والدم ولحم الخنزیر۔

جب لوگوں نے ابن عباس کے فتویٰ کی وجہ سے ان کی ہجو میں اشعار کہے تو انہوں نے کہا: خدا ان کو ہلاک کرے، میں نے علی الاطلاق متعہ کی اباحت کا فتویٰ نہیں دیا، بلکہ میں نے کہا تھا کہ متعہ مضطر کے لئے حلال ہے جیسے مردار، خنزیر اور خون کا حکم ہے۔

اس روایت کو ابوبکر رازی الجصاص نے "احکام القرآن" ج ۲ ص ۱۴۷ پر اور ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ نے "فتح القدیر" ج ۲ ص ۳۸۶ اور علامہ آلوسی المتوفی ۱۲۷۰ھ نے "روح المعانی" جز ۵ ص ۶ پر ذکر کیا ہے۔

حضرت ابن عباس کا مضطر کے لئے اباحت متعہ کا فتویٰ دینا بھی ان کی اجتہادی خطاء پر مبنی تھا اور جب ان پر حق واضح ہو گیا تو انہوں نے اس فتویٰ سے رجوع کر لیا اور اللہ تعالیٰ سے توبہ کی، چنانچہ علامہ نیشاپوری لکھتے ہیں:

انہ رجع عن ذالک عند موتہ وقال انی اتوب الیک فی الصرف والمتعۃ۔

(غرائب القرآن جز ۵ ص ۱۶)

ابن عباس نے اپنے فوت ہونے سے پہلے اپنے فتویٰ سے رجوع کیا اور کہا: میں صرف اور متعہ سے رجوع کرتا ہوں۔

اور ابوبکر جصاص فرماتے ہیں:

"فالصحیح حکایت من حکی عنہ الرجوع عنھا" "صحیح روایت یہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے جواز متعہ سے رجوع کر لیا تھا"۔

نیز فرماتے ہیں:

"نزل عن قولہ فی الصرف وقولہ فی المتعۃ" (احکام القرآن ج ۲ ص ۱۷۹۔۱۴۷)

''ابن عباس نے صرف اور متعہ سے رجوع کر لیا تھا''۔

علامہ بدر الدین عینی المتوفی ۸۵۵ھ نے ''عمدة القاری'' جز ۱۷ ص ۲۴۶ پر اور علامہ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ نے ''فتح الباری'' ج ۱۱ ص ۷۷ پر حضرت ابن عباس کا متعہ سے رجوع بیان فرمایا ہے اور اہل سنت کے تمام محققین نے اسی پر اعتماد کا اظہار فرمایا ہے، پھر کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ جس بات سے حضرت ابن عباس رجوع فرما چکے ہیں اسے ان کا مسلک قرار دے کر اس کی بنیاد پر اپنے مسلک کی دیوار استوار کی جائے۔

ہم نے بادلائل واضح کر دیا ہے کہ اسلام میں متعہ کا کوئی تصور نہیں ہے اور اللہ اور اس کے رسول برحق نے متعہ کو حرام کر دیا ہے، اللہ کا سلام ہو حضرت عمر پر جنہوں نے حرمت متعہ کو نافذ کر کے اور اس پر عمل کرا کے ملت اسلامیہ کو ایک مکروہ غلاظت سے محفوظ کر دیا ہے۔

یہ متعہ ہی کا تصور تھا جس نے مسلمانوں میں کسبیوں کے رواج کو جنم دیا، اسی اصطلاح نے بازار حسن کو تحفظ دیا اور متعہ کی آڑ میں عصمت فروشی کا چور دروازہ کھول دیا۔ آج قوم جس طرح اخلاقی جرائم اور بدکاری میں مبتلا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ فحاشی اور جنسی ناہمواری کے سارے سہارے ختم کر دیئے جائیں اور ہر وہ قانون جس سے جنسی کجی کو تقویت ملتی ہو مٹا دیا جائے۔ مسئلہ متعہ کا وجود فحاشی کے فروغ کا ضامن ہے۔ فاروق اعظم کی ایمان افروز شخصیت پر خدا کی بے شمار رحمتیں ہوں جنہوں نے حرمت متعہ کی تبلیغ اور تنفیذ کر کے سفینہ ملت کو معصیت کے گرداب سے نکالا۔ آج اس معصیت زدہ اور پنجہ شہوت میں اسیر قوم کو پھر فاروقی بصیرت کی ضرورت ہے۔



حضرت عثمان رضی اللہ عنہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ عموماً اور خلفاء راشدین خصوصاً انسانی عظمتوں کے وہ مینارہ نور ہیں جن سے قیامت تک آنے والی نسلیں رشد و ہدایت حاصل کرتی رہیں گی۔ یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ ہی آسمان ہدایت کے ستارے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جن خصوصیات سے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ممتاز کیا وہ انہی کا حصہ ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حیاء دار ایسے تھے کہ فرشتے بھی ان سے حیاء کرتے تھے۔ فیاض اور جواد ایسے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی فیاضی سے خوش ہو کر ان کو امن اور جنت کی نوید سناتے، حضور کے منظور نظر ایسے کہ آپ نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیاں حضرت عثمان کے حبالہ عقد سے مربوط کیں اور جب دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر میری تیسری بیٹی بھی ہوتی تو وہ بھی عثمان کے نکاح میں دے دیتا۔ (علامہ ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ، اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۷۶) خوش نصیب ایسے کہ زبان رسالت سے زندگی میں شہادت اور وصال کے بعد جنت کی بشارت سنی۔ ایثار کیش ایسے کہ تشنہ لب جان دے دی مگر اپنی زندگی میں مسلمانوں کی تلواروں کو باہم ٹکرانے نہیں دیا۔ آیئے! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کتاب حیات کے چند اوراق الٹ کر اس ہدف جور و جفا اور پیکر صدق و صفا کی بصیرت افروز زندگی کا ایک اجمالی جائزہ لیں۔

نام اور نسب

آپ کا نام عثمان، ابو عبد اللہ اور ابو عمرو کنیت اور ذو النورین لقب تھا۔ والد کا نام عفان بن ابی العاص اور والدہ کا نام اروی بنت کریز تھا۔ حضرت عثمان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں عبد مناف پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل جاتا ہے۔ حضرت عثمان کی نانی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سگی پھوپھی تھیں، اس اعتبار سے آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے۔
(حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، الاصابہ ج ۲ ص ۴۶۲)

خاندانی وجاہت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خاندان ایام جاہلیت میں غیر معمولی اہمیت اور اقتدار کا حامل تھا آپ کے جد اعلیٰ امیہ بن عبد شمس رؤساء قریش میں سے تھے۔ خلفاء بنی امیہ، امیہ بن عبد شمس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے امویین کہلائے۔ ابو سفیان بن حرب، جنہوں نے قبول اسلام سے پہلے تمام غزوات میں رئیس قریش کی حیثیت سے لشکر قریش کی قیادت کی، اموی تھے۔ غرض یہ کہ حضرت عثمان کا خاندان شرافت، ریاست اور غزوات کے اعتبار سے عرب میں نہایت ممتاز تھا اور بنو ہاشم کے بعد کوئی اور خاندان شرف وسیادت میں آپ کے خاندان کا ہم پایہ نہ تھا۔

ولادت اور عام حالات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ولادت نبوی کے چھ سال بعد پیدا ہوئے۔ اہل عرب کے عام معمول کے برعکس انہوں نے بچپن میں پڑھنا لکھنا سیکھ لیا تھا اور عہد شباب میں کاروبار تجارت شروع کر دیا اور اپنی فطری صداقت، دیانت اور نیک روش کے باعث غیر معمولی شہرت حاصل کی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قد متوسط تھا۔ سرخ وسفید چہرہ، گھنگریالے بال، گھنی داڑھی، ملائم جسم اور انتہائی پر وقار شخصیت کے حامل تھے۔

(حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ، الاصابہ ج ۲ ص ۴۶۲)

قبول اسلام

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت کے بعد ابھی صرف تین شخص ہی اسلام لائے تھے کہ ایک دن حضرت عثمان اپنی خالہ سعدی بنت کریز کے گھر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعویٰ نبوت کا تذکرہ چھڑ گیا۔ ان کی خالہ نے کہا: محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، ان کے پاس جبرائیل آتے ہیں، ان کا پیغام سپیدۂ سحر کی طرح روشن ہے، ان کے دین میں خیر ہے، ان کا حکم ماننے میں کامیابی ہے۔ ان کے خلاف محاذ آرائی کرنا دنیا اور آخرت کی ذلت ہے۔ حضرت عثمان کہتے ہیں کہ میں یہ باتیں سن کر جب اپنی خالہ کے گھر سے نکلا تو

میرے دل میں اسلام کی محبت اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میرے دوست تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھے متفکر پایا تو مجھ سے حال دریافت کیا، میں نے اپنی خالہ سے جو باتیں سنی تھیں وہ ان کو بتلائیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے عثمان! تم صاحب فہم وفراست ہو، تم پر حق باطل سے مشتبہ نہیں رہ سکتا۔ تمہاری قوم جن تراشیدہ بتوں کی عبادت کرتی ہے، یہ نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ میں نے کہا: قسم بخدا! ایسا ہی ہے۔ حضرت ابوبکر نے کہا: خدا کی قسم! تمہاری خالہ نے سچ کہا ہے، محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ کیا خیال ہے، تم ان کی خدمت میں حاضر ہو اور ان کا کلام سنو۔ میں حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ اسی وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق نے حضور سے میرے بارے میں عرض کیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے عثمان! اللہ تعالیٰ کی جنت قبول کر لو، میں تمہارا اور تمام مخلوق کا رسول ہوں۔ یہ کلام اثر آفریں سنتے ہی میں نے عرض کیا کہ میں اسلام قبول کرتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، وہ واحد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ (حافظ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ الاصابہ ج ۴ ص ۳۲۸)

ذوالنورین

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منجھلی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے نکاح ہوا تھا، مگر اعلان نبوت کے بعد عتبہ کے باپ ابولہب نے اسلام دشمنی کی وجہ سے اپنے بیٹے پر دباؤ ڈال کر حضرت رقیہ کو طلاق دلوا دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعد میں اپنی ان صاحبزادی کا نکاح حضرت عثمان سے کر دیا۔ قریباً چودہ سال تک حضرت عثمان کو حضور کی صاحبزادی کی زوجیت کا شرف حاصل رہا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت رقیہ بیمار ہو گئیں۔ حضرت عثمان ان کی تیمارداری میں مصروف رہے، اسی وجہ سے حضور کی اجازت سے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کر سکے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان کا اہل بدر میں شمار کیا اور ان

کے حصہ کا مال غنیمت بھی انہیں عطا فرمایا، اس بیماری میں حضرت رقیہ جانبر نہ ہو سکیں اور وصال فرما گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے بعد اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم کا نکاح حضرت عثمان سے کر دیا۔

سیرت اور خدمات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بدر کے سوا تمام غزوات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک رہے۔ حضور کی زاہدانہ زندگی دیکھ کر اکثر ملول رہتے تھے اور جب موقع ملتا حضور کی خدمت میں ہدایا اور تحائف پیش کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا کہ آل رسول چار روز سے فقر و فاقہ کے ساتھ دن گزار رہے ہیں۔ سنتے ہی بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اسی وقت کھانے پینے کا بہت سا سامان اور تین سو درہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نذر کئے۔ (علامہ علاؤالدین علی المتقی متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۶ ص ۳۷۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ جس ہاتھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی تھی اس ہاتھ کو کبھی نجاست یا محل نجاست سے مس نہیں ہونے دیا۔

(علامہ علاؤالدین علی المتقی متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۶ ص ۳۷۱)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر روز صدقہ و خیرات کیا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ایک غلام آزاد کرتے۔ صحابہ کی غربت اور افلاس سے ہمیشہ بے قرار رہتے۔ ایک دفعہ ایک جہاد میں ناداری اور مفلسی کے سبب صحابہ کرام کے چہرے اداس تھے اور منافقین اس وجہ سے ہر طرف خوش خوش اکڑتے پھر رہے تھے۔ حضرت عثمان نے اسی وقت چودہ اونٹوں پر کھانے پینے کا سامان لاد کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا تاکہ حضور یہ طعام صحابہ کرام میں تقسیم فرما دیں۔

(علامہ علاؤالدین علی المتقی متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۶ ص ۳۷۴)

ایک دفعہ حضرت طلحہ نے حضرت عثمان سے پچاس درہم قرض لئے۔ کچھ دنوں بعد واپس دینے آئے تو لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ یہ تمہاری مروت کا صلہ ہے۔

(محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۳۹)

آپ کو کتابت میں بہت مہارت تھی اور بے حد خوش نویس تھے۔ اس لئے قرآن کریم

کی کتابت کا کام آپ ہی کے ذمہ تھا، جب کبھی کوئی آیت نازل ہوتی تو حضور آپ کو بلوا کر وہ آیت لکھوا لیتے۔ ام المؤمنین حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رات کا وقت تھا تو ایک آیت نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے اسی وقت حضرت عثمان سے وہ آیت لکھوائی۔

(علامہ علاؤ الدین علی المتقی متوفی ۹۷۵ھ، کنز العمال ج ۶ ص ۲۷۷)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ نے متعدد بار جنت کی بشارت دی تھی، اس کے باوجود خوف خدا کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی کسی قبر کے پاس سے گزرتے تو اس قدر روتے کہ ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے بھیگ جاتی، کسی نے آپ سے اس قدر گریہ کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ میں نے حضور ﷺ سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی سب سے پہلی منزل ہے، اگر یہاں آسانی ہو تو سب منازل آسان ہو گئیں اور اگر یہاں دشواری ہوئی تو باقی منازل اس سے زیادہ دشوار ہو گئیں۔ (شیخ ولی الدین تبریزی، مشکوٰۃ (ترمذی) ص ۲۶)

باوجود مال و دولت کی فراوانی کے ہمیشہ زاہدانہ زندگی اختیار کی۔ قزنام کا ایک خوبصورت رومی کپڑا تھا جس کو متوسط طبقہ کے لوگ بھی پہنا کرتے تھے۔ لیکن آپ نے وہ کپڑا ابھی نہ خود کبھی استعمال کیا نہ اپنی ازواج کو استعمال کرنے دیا۔

تواضع اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ گھر میں بیسیوں غلام اور باندیوں کے باوجود اپنا کام خود کیا کرتے تھے۔ رات کو تہجد کے لئے اٹھتے اور وضو وغیرہ کا سامان خود مہیا کرتے، کسی خادم کو جگا کر اس کی نیند خراب نہ کرتے۔ اگر کوئی سخت اور ناگوار بات کہتا تو اس کو نرمی سے جواب دیتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اثناء گفتگو میں آپ کے والد کو کسی بات پر طعنہ دیا۔ حضرت عثمان نے انتہائی حلم سے جواب دیا کہ عہد اسلام میں زمانہ جاہلیت کے تذکرہ کا کیا موقع ہے۔

عہد خلافت میں عموماً دن کے وقت کار خلافت میں گزار دیتے اور رات کا اکثر حصہ عبادت میں گزار دیتے۔ کبھی کبھی ایک رات میں پورا قرآن کریم ختم کر دیتے۔ دوسرے اور تیسرے روز عموماً روزہ رکھتے اور کبھی مہینوں روزے سے رہتے اور رات کو صرف اتنا کھاتے جس سے رمق حیات برقرار رہتی۔

رسول اللہ ﷺ سے بے حد محبت تھی۔ ایک بار وضو کر کے مسکرانے لگے۔ لوگوں نے بے موقع تبسم کا سبب دریافت کیا۔ تو فرمایا: میں نے ایک بار حضور ﷺ کو وضو کرنے کے بعد مسکراتے دیکھا تھا۔ (امام احمد بن حنبل، مسند احمد ج ۱ ص ۵۸) ایک دفعہ سامنے سے جنازہ گزرا تو فوراً کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ حضور ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

(امام احمد بن حنبل، مسند احمد ج ۱ ص ۶۸)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں جو سب سے اہم کارنامہ انجام دیا وہ قرآن کریم کو لغت قریش کے مطابق رائج کرنا ہے۔ اس سے پہلے مسلمانوں کو سات لغات پر قرآن پڑھنے کی اجازت تھی۔ معنی کے لحاظ سے اگرچہ ان لغات میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن ساتوں لغات میں بعض الفاظ ایسے تھے جو دوسری لغات سے ملتے نہ تھے۔ اس وجہ سے ناواقف لوگ ایک شخص کی قرأت کو دوسرے شخص کی قرأت کے خلاف سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے۔ اس طرح ہر جگہ قرآن کریم کے قرآن ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ایک ناخوشگوار بحث کھڑی ہو جاتی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے تمام بلاد اسلامیہ سے قرآن کریم کے نسخے منگوائے اور ان کو دھلوا کر سادے کاغذوں کو جلوا دیا اور حضرت ابوبکر کے دور خلافت میں لغت قریش کے مطابق جو نسخہ مرتب کر کے ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس بطور امانت رکھا ہوا تھا۔ اس کی نقلیں تیار کرا کے تمام بلاد اسلامیہ میں بھجوا دیں اور آج جو ہمارے ہاتھوں میں قرآن کریم کا واحد نسخہ موجود ہے، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

۲۴ ہجری میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی کی از سر نو تعمیر کی اور اس میں پہلے کی نسبت بہت وسعت کر دی۔ حتیٰ کہ اس کا طول ایک سو ساٹھ ہاتھ اور عرض ڈیڑھ سو ہاتھ پر مشتمل ہو گیا۔ حضرت عثمان نے نقشین پتھروں سے اس کی دیواریں اور ساگوان کی لکڑی سے اس کی چھت بنوا کر مسجد نبوی کو بے حد حسین و جمیل بنوا دیا۔

(علامہ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ، تاریخ الخلفاء ص ۱۲۰)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات

کا وظیفہ باقی صحابہ کرام کی نسبت دگنا کر دیا۔ ہمیشہ اپنے مال سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنے بارہ سالہ دور خلافت کے اندر بحیثیت خلیفہ کے ایک پیسہ بھی بیت المال سے نہیں لیا اور اپنا مقررہ وظیفہ عام مسلمانوں کے لئے چھوڑ دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سالانہ وظیفہ پانچ ہزار درہم تھا۔ اس حساب سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بارہ سال میں ساٹھ ہزار درہم کی رقم بیت المال میں مسلمانوں کے لئے چھوڑ دی۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہر سال حج کے لئے جاتے تھے اور امیر الحج کے فرائض انجام دیتے تھے۔ البتہ جس سال شہید ہوئے اس سال محصور ہونے کے سبب حج کے لئے نہ جا سکے۔

مقام عثمان

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کاشانہ اقدس میں بے تکلفی سے تشریف فرما تھے اور آپ کی مبارک پنڈلیوں سے چادر ہٹی ہوئی تھی۔ اتنے میں ابوبکر اجازت لے کر آئے اور حضور اسی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ پھر حضرت عمر اجازت لے کر تشریف لائے، حضور پھر بھی اسی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ پھر حضرت عثمان نے اجازت طلب کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر مبارک درست کر کے پنڈلیاں ڈھانپ لیں۔ جب یہ لوگ چلے گئے تو حضرت عائشہ نے پوچھا: حضور! ابوبکر آئے اور آپ نے ان کے آنے پر اپنے بیٹھنے کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی، پھر عمر آئے، آپ نے پھر بھی کوئی پرواہ نہیں کی اور جب عثمان آئے تو آپ نے اپنے کپڑے درست کر لیے اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں اس شخص سے حیاء کیوں نہ کروں جس سے فرشتے بھی حیاء کرتے ہیں۔ (علامہ ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (مسلم و ترمذی) ص ۵۶۱)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حیاء میں حضرت عثمان کا مقام فرشتوں سے بھی اونچا تھا۔ تمام صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حیاء کرتے تھے اور حضور حضرت عثمان سے حیاء کرتے تھے۔ یعنی مقام حیاء میں تمام صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طالب اور حضرت عثمان آپ کے مطلوب تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن خباب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کی تیاری کے لئے صحابہ کرام کو صدقہ کی ترغیب دے رہے تھے۔ حضرت عثمان کھڑے

ہوئے اور عرض کیا: حضور! سو اونٹ مع پالان وغیرہ کے اللہ کی راہ میں پیش کروں گا۔ حضور ﷺ نے پھر ترغیب دی تو حضرت عثمان نے عرض کیا: سرکار! میں دو سو اونٹ مع پالان وغیرہ کے راہ خدا میں پیش کروں گا۔ حضور ﷺ نے پھر ترغیب دی تو حضرت عثمان نے کہا: حضور! میں تین سو اونٹ مع پالان وغیرہ کے اللہ کی راہ میں پیش کروں گا۔ عبدالرحمن کہتے ہیں: میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ (فرط مسرت سے) منبر سے نیچے اتر آئے اور دوبارہ فرمایا: آج کے بعد عثمان جو چاہے کرے، ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

حضرت عبدالرحمن بن سمرہ بیان کرتے ہیں کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عثمان، حضور ﷺ کی خدمت میں ایک ہزار دینار لے کر حاضر ہوئے اور وہ دینار لا کر حضور ﷺ کی گود میں ڈال دیئے۔ عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ (خوشی سے) ان دیناروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں اور دوبار یہ فرمایا کہ آج کے بعد عثمان جو چاہیں کریں ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

(شیخ ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (مسند احمد) ص ۵۶۱)

ان دونوں حدیثوں سے پتہ چلا کہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جتنی مقدار میں حضرت عثمان نے لشکر اسلام کی مدد کی تھی۔ صحابہ کرام میں سے کوئی شخص اتنی مقدار میں لشکر اسلام کی مدد نہ کر سکا۔ بلکہ غزوۂ تبوک کے لیے لشکر کی تیاری کا سہرا در اصل حضرت عثمان ہی کے سر تھا اور وہ اس میدان میں سب سے آگے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کو آج تک "مجھز جیش العسرۃ" "غزوۂ تبوک کے لشکر کو تیار کرنے والے" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں حضور ﷺ نے مکرر سہ کرر فرمایا: آج کے بعد عثمان جو عمل بھی کریں ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اس فرمان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت عثمان کو کھلی چھٹی دے دی ہے کہ حلال یا حرام جو مرضی آئے کرو تم سے کوئی حساب و کتاب نہیں ہوگا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کو حضرت عثمان کی صالحیت پر مکمل اعتماد تھا اور آپ کو کامل یقین تھا کہ عثمان سے کوئی ناجائز اور حرام کام ہو ہی نہیں سکتا۔ یوں تو تمام خلفاء راشدین پر سرکار کو یقین تھا کہ ان میں

کوئی شخص بھی ناجائز یا حرام کام نہیں کرے گا، اسی لئے ان کو جنت کی بشارت دی تھی۔ لیکن یہ شرف اور مقام صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حاصل ہوا کہ حضور نے اپنے اس یقین کا حضرت عثمان کے بارے میں برملا اظہار کر دیا کہ جاؤ جو مرضی میں آئے کرو تم سے کوئی نہیں پوچھے گا، کیونکہ حضور جانتے تھے کہ حضرت عثمان تا حیات اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کریں گے۔ سرکار کا یہ فرمان در حقیقت حضرت عثمان کی اطاعت شعاری اور وفاداری کی سند تھی، مستقبل کے تفکرات اور آخرت کے خطرات سے محفوظ رکھنے کا سہرا تھا اور یہ ایسا سہرا تھا جو حضور نے تمام صحابہ میں سے صرف حضرت عثمان کے ماتھے پر باندھا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بیعت رضوان کا حکم دیا اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مکہ میں تھے، تمام صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر قصاص عثمان لینے کے لئے بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عثمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں مکہ گئے ہوئے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دے کر دوسرے ہاتھ پر رکھا۔ (یعنی حضرت عثمان کی طرف سے بیعت کی) حضرت انس کہتے ہیں کہ عثمان کا ہاتھ اس موقع پر تمام صحابہ کے ہاتھوں سے بہتر تھا کیونکہ ان کا ہاتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ تھا۔

(شیخ ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ، مشکوۃ (ترمذی) ص ۵۶۱)

اس موقع پر تمام صحابہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے طالب تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بیعت میں حضور کے مطلوب تھے یا یوں کہیے کہ تمام صحابہ حضور کے مرید اور حضرت عثمان حضور کی مراد تھے، اول تو یہ فضیلت بھی کچھ کم نہیں کہ حضور نے اپنے ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دیا لیکن اس سے بھی بڑھ کر حضرت عثمان کا مقام یہ ہے کہ بیعت رضوان کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (الفتح: ۱۰) جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں اور جس موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضور کے ہاتھ کو اللہ کا ہاتھ قرار دیا اسی موقع پر حضور نے اپنے ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ

قرار دیا۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ بیعت رضوان کے وقت نگاہ الوہیت میں جو مقام سرکار کے ہاتھ کا تھا۔ نگاہ رسالت میں وہی مقام حضرت عثمان کے ہاتھ کا تھا۔

بیعت رضوان کا پس منظر یہ ہے کہ چھ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے چودہ سو صحابہ کے ساتھ عمرہ کا قصد فرمایا، مکہ کے قریب جب حضور مقام حدیبیہ پر پہنچے تو قریش کی ایک بھاری جمعیت نے راستہ روک لیا اور ان کے تیور بتاتے تھے کہ وہ آمادۂ پیکار ہیں، حضور ﷺ چونکہ اس وقت قریش سے جنگ نہیں چاہتے تھے اس لئے مصالحت کے خیال سے حضرت عثمان کو سفیر بنا کر بھیجا۔ حضرت عثمان جب مکہ پہنچے تو قریش نے ان کو روک لیا اور سخت نگرانی کر دی کہ جانے نہ پائیں۔ جب کئی دن گزر گئے اور حضرت عثمان واپس نہ آئے تو مسلمانوں کو سخت پریشانی ہوئی، اسی حالت میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر سن کر حضرات صحابہ کرام سے خون عثمان کا انتقام لینے کے لئے ایک درخت کے نیچے بیعت لی اور حضرت عثمان کی طرف سے خود اپنے دست مبارک پر دوسرا ہاتھ رکھ کر بیعت کی۔

بیعت رضوان کے اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو یہ غلط فہمی نہیں تھی کہ حضرت عثمان شہید ہو گئے۔ اگر آپ یہ سمجھتے کہ حضرت عثمان شہید ہو گئے ہیں تو یہ کیوں فرماتے کہ عثمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ہیں، اس لئے ان کی طرف سے میں بیعت کرتا ہوں اور اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمان کا ہاتھ قرار دے کر ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھ کر بیعت کی۔

دراصل بیعت رضوان سے حضور ﷺ مقام عثمان کی عظمت اجاگر کرنا چاہتے تھے کہ حضرت عثمان کو ناحق قتل ہو جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ اگر اس کی افواہ پھیل جائے تو مسلمانوں کو اپنی جان پر کھیل کر قصاص عثمان لینے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ چنانچہ قتل عثمان کی محض افواہ سن کر حضور سمیت چودہ سو صحابہ کفار سے آمادۂ پیکار ہو گئے تھے اور قصاص عثمان کے لئے جنگ کی خاطر جو بیعت ہوئی اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور اس کو بیعت رضوان قرار دیا۔ یہ سب کیا تھا، یہ حضرت عثمان کے مقام کی بلندی اور ان کی عظمت تھی، بیعت

رضوان کا واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی نگاہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقام کیا تھا۔

(بالآخر کفار نے صحابہ کے جوش و خروش سے خائف ہو کر مصالحت کر لی اور حضرت عثمان کو چھوڑ دیا۔)

حضرت عثمان کے دور خلافت میں فتوحات

چوبیس ہجری کی ابتداء میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مجلس شوریٰ کے انتخاب سے خلیفہ اور امیر المؤمنین منتخب ہوئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی سنت کے مطابق کار خلافت انجام دیتے تھے۔ آپ کے بارہ سالہ دور حکومت میں اسلامی سلطنت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ۲۴ ہجری میں آپ نے آذر بائیجان اور آرمینیہ پر فوج کشی کر کے وہاں کے باشندوں کو مطیع کیا۔ ۲۵ ہجری میں طرابلس کو فتح کیا۔ ۲۶ ہجری میں الجزائر اور مراکش کے علاقہ فتح کئے۔ ۲۸ ہجری میں بحر روم میں شام کے قریب قبرص (سائپرس) کو بحری جنگ سے فتح کیا۔ ۳۰ ہجری میں طبرستان کو فتح کیا۔ ۳۲ ہجری میں قسطنطنیہ سے متصل علاقوں میں مرودر، طالستان اور جوز جان کو فتح کیا۔ اسلامی فتوحات کا یہ سیلاب حضرت عثمان کی شہادت کے بعد رک گیا اور حضرت علی کی خلافت کے چھ سال تک تعطل رہا۔ اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں فتوحات اسلامیہ کو ایک بار پھر نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی۔

فتنہ اور اس کے اسباب

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے اخیر میں ان کے خلاف بعض لوگوں نے شورش پیدا کر دی اور فتنہ و فساد کا ایک سیلاب امڈ آیا۔ اس شورش کے اسباب یہ تھے۔

(۱) اس وقت کابل سے لے کر مراکش تک تمام علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا جس میں سینکڑوں قومیں آباد تھیں۔ ان محکوم قوموں میں فطرتاً مسلمانوں کے خلاف جذبہ انتقام موجود تھا لیکن مسلمانوں کی قوت اور سطوت کے مقابلہ میں وہ بے دست و پا تھے۔ اس لئے انہوں نے سازشوں کا جال بچھایا جن میں یہودی اور مجوسی سب سے آگے تھے۔

(۲) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چند مناصب پر اموی خاندان کے افراد کو مقرر کیا تھا۔ ان میں سے حضرت معاویہ بن ابی سفیان اموی رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے شام کے گورنر تھے۔ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامری (صحابی) عامل مصر اور عبداللہ بن عامر بن کریز اموی (صحابی) عامل بصرہ تھے اور مروان بن الحکم اموی کاتب تھے۔ ان چار کے علاوہ دو اموی عاملوں کو مقرر کر کے آپ نے انہیں معزول کر دیا۔ جن میں سے ایک ولید بن عقبہ اور دوسرے سعید بن العاص تھے۔ یہ تھے کل وہ اموی افراد جن کے بارے میں مخالفین نے تہلکہ مچا دیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کنبہ پروری اور اقرباء نوازی کر کے اپنے خاندان کے افراد کو حکومت کے عہدے سونپ دیئے اور یہ کسی نے نہ دیکھا کہ اس کے علاوہ قریباً بیس جگہ بلاد اسلامیہ میں گورنری اور دیگر اہم عہدوں پر سب غیر اموی افراد مقرر تھے۔ نہ یہ کسی نے سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانہ میں اسی فیصد عامل اموی خاندان سے لئے تھے۔ چنانچہ اٹھارہ علاقوں میں آپ نے اموی افراد کو مقرر کیا۔ (طبری) پھر اگر پانچ عہدے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امویوں کو تفویض فرمائے تو اس پر شورش اور ہنگامہ کھڑا کرنے کی کوئی اخلاقی اور شرعی وجہ نہ تھی۔

(۳) مجوسی چاہتے تھے کہ ایسا انقلاب پیدا کیا جائے جس میں ان کی مدد سے حکومت ایسے عام خاندانوں کی طرف منتقل ہو جس سے وہ زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر سکیں۔

(۴) یہودی چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں ایسا افتراق پیدا کر دیا جائے جس سے ان کی قوت پاش پاش ہو جائے۔ ان اغراض کے تحت ہر شخص اپنی اپنی کوشش میں مصروف تھا۔ اشتر نخعی، جندب اور صعصعہ نے کوفہ کو اپنی شرارتوں کا مرکز بنایا۔ لیکن سب سے زیادہ خطرناک شخص ایک یہودی النسل نو مسلم عبداللہ بن سبا تھا، جس نے اپنی حیرت انگیز سازشانہ قوت سے مختلف الخیال مفسدوں کو ایک مرکز پر متحد کر دیا۔

عبداللہ بن سبا کے پیروکاروں کا طریقہ کار یہ تھا:

(۱) بظاہر متقی اور پرہیزگار بننا اور وعظ و نصیحت سے لوگوں کو اپنا حلقہ بگوش کرنا۔

(۲) عمال کو تنگ کرنا اور ہر ممکن طریقہ سے ان کو بدنام کرنے کی کوشش کرنا۔

(۳) ہر جگہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اقرباء پروری اور ناانصافی کی داستانیں مشہور کرنا۔

مفسدین کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ پر کنبہ پروری کا اتہام بالکل بے بنیاد ہے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انتہائی امیر و کبیر شخص تھے۔ عہد رسالت میں آپ کی فیاضی کی مثالیں یادگار ہیں۔ آپ نے بیس ہزار درہم دے کر یہودی سے میٹھے پانی کا کنواں خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا۔ بیش بہا رقم خرچ کر کے مسجد نبوی کی توسیع کے لئے زمین خریدی اور بہت سے مواقع پر مسلمانوں کی اپنے مال سے خدمت کی۔ مفسدین کے اعتراض کے جواب میں آپ نے خود وضاحت فرمائی کہ میں اپنے اقرباء کو جو کچھ دیتا ہوں اپنے ذاتی مال سے دیتا ہوں اور بیت المال کا مال نہ اپنے لئے حلال سمجھتا ہوں، نہ کسی دوسرے شخص کے لئے۔ (محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری ج ۳ ص ۳۷۶)

ایک مشہور اعتراض یہ تھا کہ حکم بن العاص کو حضور نے مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں وہ جلاوطن رہا، لیکن حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں اس کو مدینہ بلا لیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عثمان نے حکم کی سفارش کر کے اسے مدینہ بلانے کی منظوری لے لی تھی۔ حضرت ابوبکر اور عمر کے سامنے چونکہ یہ منظوری نہیں لی گئی تھی اور حضرت عثمان کے سوا اس پر کوئی اور گواہ نہ تھا اس لئے انہوں نے اپنے اپنے دور خلافت میں اس کو مدینہ نہیں بلایا۔ حضرت عثمان نے اپنے دور خلافت میں جو حکم کو مدینہ بلایا وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ حضور کی مرضی سے بلایا تھا۔

ایک اور مشہور اعتراض یہ تھا کہ آپ نے طرابلس کے مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ مروان کو بلاعوض دے دیا تھا۔ یہ سراسر لغو بہتان ہے۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں:

ابن زبیر نے فتح کی بشارت اور مال غنیمت کا پانچوں حصہ دارالخلافت روانہ کیا، اس مال کو پانچ لاکھ دینار کے عوض مروان نے خرید لیا اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ یہ مال مروان کو مفت دے دیا گیا تھا، یہ صحیح نہیں ہے۔

(علامہ ابن خلدون متوفی ۸۰۸ھ، تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۲۹)

اصلاح کی کوشش

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسلسل حالات کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ حضرت طلحہ نے مشورہ دیا کہ ملک کے مختلف حصوں میں حالات کی تحقیق کے لئے وفود روانہ کئے جائیں، چنانچہ ۳۵ھ میں محمد بن مسلمہ کوفہ، اسامہ بن زید بصرہ، عمار بن یاسر مصر، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم شام اور بعض اور دیگر صوبہ جات کی طرف روانہ ہو گئے۔ نیز تمام ملک میں گشتی اعلان جاری کر دیا گیا کہ میں عموماً حج کے موقع پر تمام حکام کو جمع کرتا ہوں اور جس حاکم کے خلاف کوئی شکایت پیش کی جاتی ہے، فوراً تحقیق کر کے اس کا ازالہ کر دیتا ہوں۔ اس کے باوجود اگر کسی شخص کو کسی حاکم کے خلاف شکایت ہو تو مجھ سے بیان کرے۔ میں تحقیق کر کے مظلوم کا حق اسے دلاؤں گا۔

نوٹ: ابن خلدون اور طبری نے بیان کیا ہے کہ حضرت عثمان نے تحقیق کے لئے جس قدر صحابہ بھیجے تھے۔ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے سوا سب واپس آ گئے۔ مصر میں عبداللہ بن سباء، خالد بن ملجم اور کنانہ بن بشر وغیرہ شر پسند موجود تھے اور ان لوگوں نے عمار بن یاسر کو واپس آنے نہیں دیا، حتیٰ کہ یہ گمان کر لیا گیا کہ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ (ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ الطبری ج ۳ ص ۹۹)

انقلاب کی کوشش

ابن سباء کے تربیت یافتہ لوگوں نے آپس میں مل کر ایک سازش تیار کی اور بصرہ، کوفہ اور مصر سے تقریباً دو ہزار فتنہ پرداز اپنے اپنے شہروں سے حاجیوں کی وضع میں مدینہ کی طرف چل پڑے تاکہ اپنے مطالبات حضرت عثمان سے بزور تسلیم کرائیں۔ جن میں سے ایک اہم مطالبہ یہ تھا کہ حاکم مصر عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کی جگہ محمد بن ابوبکر (یہ حضرت علی کے پروردہ تھے) کو حکم مقرر کیا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مشورہ کر کے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا اور ابن سرح کی معزولی اور محمد بن ابی بکر کی تقرری کا پروانہ لکھ کر انہیں دے دیا۔ پھر یہ لوگ واپس چلے گئے۔ چند دنوں کے بعد دفعتاً گھوڑوں کی ٹاپوں اور انتقام، انتقام کی صداؤں سے مدینہ کے درو دیوار گونج اٹھے۔ کبار صحابہ گھبرا کر

اپنے گھروں سے نکلے، دیکھا کہ مفسدوں اور باغیوں کی جماعت واپس آ گئی ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں راستہ میں دربار خلافت کا ایک قاصد ملا جس میں والی مصر کے نام یہ ہدایت تھی کہ ان لوگوں کی گردن ماردی جائے۔ حضرت عثمان نے اس واقعہ سے مکمل لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔ باغیوں نے کہا: جس خلیفہ کو اتنی سی بات کی بھی خبر نہ ہو وہ خلافت کا اہل نہیں ہے، لہٰذا حضرت عثمان سے مطالبہ کیا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔

(محمد بن سعد واقدی متوفی ۲۳۰ھ، طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۴۲)

اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تم کو ایک قمیص پہنائے گا۔ لوگ اس کو اتارنے کی کوشش کریں گے، تم اس قمیص کو مت اتارنا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس قمیص سے مراد یہی خلافت کی قمیص ہے۔

(شیخ ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (ترمذی) ص ۲۶۲)

باغیوں کی شورش

حضرت عثمان کے انکار پر قریباً دو ہزار باغیوں نے کاشانۂ خلافت کا نہایت سخت محاصرہ کر لیا جو مسلسل چالیس دن تک قائم رہا۔ باغیوں نے حضرت عثمان تک پانی پہنچانے کو حرام قرار دے دیا تھا۔ ایک دفعہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر حضرت عثمان تک پہنچانے کی کوشش کی، مگر باغیوں نے ام المؤمنین اور حضور کی حرم محترم کا بھی لحاظ نہیں کیا اور بے ادبی سے مزاحمت کر کے انہیں واپس کر دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر آشوب وقت میں اپنے دونوں صاحبزادوں حضرت حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حفاظت کے لئے بھیج دیا تھا اور حضرت عبداللہ بن زبیر بھی ان جانثاروں کے ساتھ حضرت عثمان کے گھر میں موجود تھے۔

باغیوں کو سمجھانے کے لئے متعدد اکابر صحابہ نے مؤثر تقریریں کیں۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے مکان کی چھت سے باغیوں کو مخاطب کر کے فرمایا: کیا تم کو معلوم ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف فرما ہوئے تو یہ مسجد تنگ تھی۔ آپ نے فرمایا: جنت کے عوض کون اس زمین کو خرید کر مسجد کے لئے وقف کرے گا۔

اس وقت میں نے وہ زمین مسجد کے لئے خرید کر وقف کی تھی۔ آج تم اس زمین پر مجھے سجدہ کرنے نہیں دیتے۔ پھر آپ نے فرمایا: قسم بخدا! حضور ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو سوائے چاہ رومہ کے اور کوئی میٹھے پانی کا کنواں نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جنت کے عوض کون اس کنویں کو خرید کر مسلمانوں کے لئے وقف کرتا ہے، اس وقت بھی صرف میں نے حضور کے فرمان پر لبیک کہی اور آج تم مجھے اس کنویں سے پانی نہیں پینے دیتے۔ لیکن باغیوں پر آپ کی اس تقریر کا کوئی اثر نہ ہوا۔

جانثار صحابہ کے مشورے

حضرت امیر معاویہ کی بصیرت افروز آنکھوں نے اس فتنہ کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے عرض کیا: آپ میرے ساتھ شام چلئے، تاکہ آپ کسی ناگہانی خطرہ سے دوچار نہ ہو جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں دیار رسول (ﷺ) کو چھوڑ کر اور کہیں نہیں جانا چاہتا۔ حضرت امیر معاویہ نے عرض کیا: میں حفظ ماتقدم کی خاطر شام سے آپ کی حفاظت کے لئے فوج بھجوا دوں۔ آپ نے فرمایا: میں نہیں چاہتا کہ رسول اللہ کے پڑوسیوں (اہل مدینہ) کو اس لشکر کی وجہ سے کوئی پریشانی ہو۔

(علامہ ابن خلدون متوفی ۸۰۸ھ، تاریخ ابن خلدون ج ۲ ص ۱۴۴)

محاصرہ کے دوران حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے آکر عرض کیا: میری تین باتوں میں سے ایک بات مان لیجئے، آپ کے حامیوں کی عظیم جماعت یہاں موجود ہے، اس کو لے کر نکلیے اور ان باغیوں کا مقابلہ کر کے ان کو نکال دیجئے، دوسری صورت یہ ہے کہ پچھلی طرف سے نکل کر مکہ معظمہ چلے جائیے۔ مکہ حرم ہے، وہاں یہ آپ پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شام میں آپ حضرت امیر معاویہ کی پناہ میں چلے جائیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پہلی صورت کا یہ جواب دیا کہ اگر میں باہر نکل کر ان سے جنگ کروں تو میں اس امت کا وہ پہلا خلیفہ نہیں بننا چاہتا جو اپنی حکومت کی بقاء کے لئے مسلمانوں کا خون بہائے۔ دوسری صورت (یعنی مکہ چلے جانے) کا جواب یہ دیا کہ مجھے ان لوگوں سے یہ توقع نہیں ہے کہ یہ حرم مکہ کی حرمت کا کوئی لحاظ رکھیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ

میری وجہ سے اس مقدس شہر کی حرمتیں پامال ہوں اور تیسری صورت (یعنی شام چلے جانے) کا جواب یہ تھا کہ یہ دار الہجرت اور دیار رسول کو چھوڑ کر میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتا۔ (امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، مسند احمد ج ۱ ص ۶۷)

حضرت عثمان کا گھر بہت وسیع تھا، حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے صحابہ کرام اور تابعین سمیت سات سو افراد موجود تھے جن کی قیادت حضرت عبداللہ بن زبیر کر رہے تھے۔ انہوں نے باغیوں سے لڑنے کی اجازت مانگی تو فرمایا: اگر ایک شخص بھی میری خاطر لڑنا چاہے تو میں اس سے خدا کے لئے کہتا ہوں کہ وہ میری خاطر خون نہ بہائے۔ (امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، مسند احمد ج ۱ ص ۷۲) آپ کے گھر میں اس وقت بیس غلام تھے، ان کو بھی بلا کر آخری وقت میں آزاد کر دیا۔

حضرت زید بن ثابت نے آ کر عرض کیا: امیر المؤمنین! انصار دروازے پر کھڑے اجازت کے منتظر ہیں، فرمایا: اگر وہ جنگ کی اجازت چاہتے ہیں تو انہیں بالکل اجازت نہیں ہے۔ (محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۸)

حضرت ابوہریرہ نے جنگ کی اجازت مانگی تو فرمایا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ مجھ سمیت تمام دنیا کو قتل کر دو؟ عرض کیا: نہیں آپ نے اس فرمان میں اس آیت کی طرف اشارہ تھا: مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَ مَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ: ۳۲) جس شخص نے بغیر قصاص کے یا فساد کے لئے کسی شخص کو قتل کیا، گویا اس نے تمام دنیا کے انسانوں کو قتل کر دیا۔ (محمد بن سعد واقدی متوفی ۲۳۰ھ، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۸) اس آیت سے استدلال اس وجہ سے تھا کہ باغیوں نے ابھی تک نہ کسی شخص کو قتل کیا تھا نہ زمین میں کسی قسم کا فساد کیا تھا۔ صرف حضرت عثمان کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔

شہادت

حضرت مرہ بن کعب رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستقبل میں پیش آنے والے فتنوں کا بیان کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص کا گزر ہوا جو کپڑا اوڑھے جا رہا

تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ فتنوں کے وقت یہ شخص ہدایت پر ہوگا، میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ حضرت عثمان تھے۔ (محمد بن سعد واقدی متوفی ۲۳۰ھ، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۸)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فتنوں کا بیان کرتے ہوئے حضرت عثمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ شخص ان فتنوں میں مظلوم شہید کیا جائے گا۔ (علامہ ولی الدین تبریزی متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (ترمذی) ص ۵۶۲)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق یہ یقین تھا کہ ان کی شہادت مقدر ہو چکی ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان کو ان فتنوں سے مطلع کیا تھا اور صبر واستقامت کی تاکید فرمائی تھی۔ (ترمذی ص ۵۳۳) ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لمحہ بہ لمحہ اس وقت کے منتظر تھے جو ان کے لئے مقدر ہو چکا تھا۔

سترہ ذوالحج ۳۵ ہجری کو جمعہ کا دن تھا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما تشریف فرما ہیں اور حضور ﷺ فرمارہے ہیں: عثمان! جلدی کرو، ہم تمہارے افطار کے منتظر ہیں۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: عثمان! آج جمعہ میرے ساتھ پڑھنا۔ (محمد بن سعد متوفی ۲۳۰ھ، طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۵۳) حضرت عثمان بیدار ہوئے اور اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا: اب وقت قریب آ پہنچا ہے، پھر لباس تبدیل کیا اور قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد باغیوں نے حملہ کر دیا۔ حضرت شہزادہ امام حسن رضی اللہ عنہ مزاحمت کرتے ہوئے زخمی ہو گئے۔ محمد بن ابی بکر (پروردہ حضرت علی) نے آپ کی ڈاڑھی پکڑ کر کھینچی۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ بھتیجے! اگر تمہارے باپ زندہ ہوتے تو وہ اس فعل کو ناپسند کرتے۔ کنانہ بن بشر نے آپ کی پیشانی پر زور سے لوہے کی سلاخ ماری جس سے آپ گر پڑے اور زبان سے یہ کلمات نکلے: "بسم اللہ و توکلت علی اللہ"۔ سواد بن حمران نے دوسری ضرب لگائی جس سے خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ عمرو بن الحمق نے سینہ پر چڑھ کر نیزوں کے پیہم نو وار کئے۔ ایک ازلی شقی نے بڑھ کر تلوار کا ایسا کاری وار کیا جس سے ذوالنورین کی شمع حیات بجھ گئی۔ (علامہ ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ، اسد الغابہ ج ۳ ص ۳۸۲) اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ! شہادت کے

وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے اور اس خون ناحق سے جو آیت رنگین ہوئی وہ یہ تھی: فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾ (البقرہ: ۱۳۷)

''تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ اس جانکاہ حادثہ میں آپ کی اہلیہ محترمہ کی انگلیاں بھی کٹ گئیں تھیں۔ تین دن تک آپ کا جسد مبارک تدفین سے محروم رہا اور قتل کرنے کے بعد ظالموں نے آپ کا گھر بھی لوٹ لیا۔

عظمت عثمان

تمام دنیا کی تاریخ اٹھا کر ایک نظر ڈالیے، تاریخ عالم میں آپ کو کہیں ایسی مثال نہیں ملے گی کہ کسی حکمران کے خلاف کچھ لوگ باغی ہو جائیں اور اس حکمران کو اپنی ذات اور اپنی حکومت کے تحفظ کے متعدد وسائل حاصل ہوں، نہ صرف یہ بلکہ جانثار، رفقاء، ارکان دولت اور تمام افواج سب اس کے حامی ہوں، باغیوں کے قلع قمع کرنے کے لئے بے تاب ہوں اور بار بار اس حکمران سے باغیوں کی سرکوبی کا مطالبہ کر رہے ہوں، لیکن وہ حکمران محض اس سبب سے ان لوگوں کو باغیوں سے جنگ کی اجازت نہیں دیتا کہ کہیں ایک جان کی بقاء کے لئے سینکڑوں جانیں تلف نہ ہو جائیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کرنے والے دو ہزار سے بھی کم افراد تھے اور مکان کے اندر اور باہر ان کے جانثار اس سے کہیں زیادہ تھے۔ آخری وقت تک آپ کے جانثار اور رفقاء آپ سے باغیوں کے مقابلہ اور ان کے محاصرہ کے توڑنے کی اجازت طلب کرتے رہے، لیکن آپ کا صرف ایک ہی جواب تھا کہ اپنی ذات یا اپنی خلافت کی خاطر مسلمانوں کی تلواریں باہم ٹکراتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں ہمارے محترم ہیں، ان سے عقیدت اور محبت ہمارے ایمان کا ایک حصہ ہے، وہ دونوں مجتہد تھے اور اپنے اپنے نزدیک ہر ایک کا مؤقف اخلاص اور للّٰہیت پر مبنی تھا۔ وہ دونوں برحق تھے۔ ہم ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی ایک لفظ سننا نہیں چاہتے۔ ان کی عظمتیں ہمارے دین کا سرمایہ ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ جمل اور جنگ صفین میں قریباً پانچ سال تک محض خلافت

کے تحفظ کے لئے دونوں طرف سے مسلمانوں کا خون بہتا رہا اور شہداء کا انبار لگتا رہا، اس کے برعکس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو دیکھئے جنہوں نے چالیس روز تک محاصرہ میں رہنا، ضرورت زندگی سے محروم ہونا اور خندہ پیشانی سے بھوک و پیاس برداشت کرنا گوارہ کیا۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی خاطر کسی ایک مسلمان کے خون کا قطرہ بھی گرنا گوارہ نہیں کیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد یہ سعادت کسی کے حصہ میں نہیں آئی کہ اس نے دیار رسول کو اپنی خلافت کا مستقر بنایا ہو۔ اسلامی حکمرانوں میں وہ دیار رسول کے آخری خلیفہ تھے۔ انہوں نے اس وقت بھی مدینہ چھوڑنا گوارہ نہیں کیا جب نوک خنجر ان کی شہ رگ کے بہت قریب نظر آرہی تھی۔ تاریخ میں ہمیں یہ کہیں نہیں ملتا کہ کسی عظیم شخصیت کے جانثار اس پر قربان ہونے کی اجازت چاہتے ہوں۔ بار بار بے تابی سے تقاضا کرتے ہوں، مگر وہ کسی کو اس کی اجازت نہ دیتا ہو۔ اس کو اپنی جان بچانے کے لئے خطرہ کی جگہ سے نکل جانے کا موقع ملا ہو مگر وہ عزم و استقلال کا کوہ گراں اپنی جگہ پر قائم رہا ہو۔ اے عثمان! تمہاری عظمتوں کا کیا کہنا، تم نے نہ مکہ کی حرمتوں کو خطرہ میں پڑنے دیا، نہ مدینہ کو میدان جنگ بننے دیا، نہ اپنی جان کے تحفظ کے لئے دیار رسول چھوڑا، نہ اپنے جانثار و رفقاء میں سے کسی کی زندگی کو خطرہ میں پڑنے دیا۔ حتیٰ کہ آخری وقت میں اپنے بیس غلاموں کو بھی آزاد کر کے نکل جانے دیا اور ظلم و ستم کے تمام وار تنہا اپنی جان پر کھیل گئے۔

یوں تو اسلام کے ہر دور میں لوگ شہید ہوتے رہے، ان شہداء میں سے کسی کا خون احد کی گھاٹیوں میں گرا، کسی کا خون کربلا کی سرزمین پر گرا۔ مگر سلام ہو تمہارے خون پر اے عثمان! جو قرآن کریم کی آیات پر گرا۔ جس شہید کا خون جس جگہ گرتا ہے وہ جگہ اس کی شہادت کی گواہی دیتا ہے۔ کسی کی شہادت کی گواہی بدر اور احد کی سرزمین دے گی۔ کسی کی شہادت کی گواہی میدان کربلا دے گا اور اے عثمان! تمہاری شہادت کی گواہی قرآن کریم کے اوراق دیں گے۔ حشر کے دن جو شخص جس حال میں شہید ہوا اسی حال میں اٹھے گا، کوئی شہید احرام باندھے ہوئے اٹھے گا۔ کوئی سجدہ کرتے ہوئے اٹھے گا اور سلام ہو تمہاری عظمتوں پر اے عثمان کہ تم میدان حشر میں اللہ کا کلام پڑھتے ہوئے اٹھو گے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ

پروردۂ رسول، اقلیم ولایت کے تاجدار، عبادت و ریاضت میں مسلمانوں کے پیشوا، زمانۂ رسالت میں بدر سے لے کر آخری غزوہ تک میدان شجاعت کے سربراہ، خصوصاً معرکہ خیبر کے شہسوار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غم خوار، خلفاء ثلاثہ کے خیر خواہ، تمام صحابہ کے محبوب، رسول اللہ کے محب صادق، جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا مژدہ دیا۔ جن سے بغض رکھنا کفر، جن سے محبت کرنا ایمان۔ حضور کی وہ لاڈلی صاحبزادی جو مجلس میں آئیں تو حضور کھڑے ہو جائیں، جن کی سواری میدان محشر سے گزرے تو تمام اہل محشر کی گردنیں جھک جائیں۔ ایسی گرامی مرتب شہزادی خاتون جنت، سیدتنا فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے شوہر، جنت کے جوانوں کے سردار، حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کے والد، سلسلۂ نسل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بانی، جو اگر صدقہ دیں تو قرآن ناطق ہو اور جن کے رکوع اور سجود پر قرآن شاہد۔ حضور کے تربیت یافتہ عم زاد، جن کی سرکار ناز برداری کریں، جن کو تہجد پڑھوانے کے لئے حضور راتوں کو جگانے آئیں، جو اگر روٹھ جائیں تو سرکار انہیں منانے آئیں اور اسی عالم میں سرکار سے ابوتراب کا لقب پائیں، جس سے وہ ناراض ہو جائیں وہ سرکار کا معتوب اور جس سے وہ راضی ہو جائیں وہ سرکار کا محبوب ہو۔ اندھیری راتوں میں ساحل مراد تک پہنچنے کے لئے جہاں آسمان ہدایت کے ستاروں کے بغیر گزارہ نہیں وہاں ان کے سفینہ کے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں۔ وہ پیدا ہوئے تو کعبہ میں، شہادت پائی تو مسجد میں، جن کی زندگی کا محور آغاز سے انجام تک اللہ تعالیٰ کا گھر تھا۔ جب تک دنیا میں رہے تو اللہ کی خاطر، دنیا سے گئے تو اللہ کی خاطر، جنہوں نے اپنے شہزادوں کو تربیت بھی ایسی دی کہ دونوں نے شہادت پائی۔ یہ سارا خاندان ہی شہداء کا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے اور یہ خاتم الخلفاء تھے۔ یہ وہ ہیں کہ جن کی محبت میں جینا عبادت ہے اور جن کی محبت میں مرنا شہادت ہے۔ انہیں کو علی مرتضیٰ کہتے ہیں۔

نام ونسب

آپ کا نام علی بن ابی طالب تھا۔ کنیت ابوتراب اور ابوالحسن تھی اور حیدر آپ کا لقب تھا۔ آپ نجیب الطرفین ہاشمی اور حضور ﷺ کے سگے عم زاد تھے۔

خاندانی وجاہت

خاندان بنو ہاشم کو سرزمین عرب اور قریش کے تمام قبائل میں جو عظمت اور بزرگی حاصل تھی۔ وہ عرب کے کسی اور قبیلہ کو حاصل نہیں تھی۔ اسی باوقار خاندان میں حضرت علی، حضور ﷺ کے اعلان نبوت سے دس سال پہلے پیدا ہوئے۔ حضرت علی کے والد اگرچہ اسلام نہیں لائے، تاہم انہوں نے ہمیشہ حضور ﷺ کی حفاظت کی اور ہر موقع پر آپ کی حمایت کی، حضرت علی کی والدہ فاطمہ بنت اسد مسلمان ہوگئی تھیں اور مستند روایات کے مطابق ہجرت کر کے مدینہ گئیں، جب ان کا انتقال ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی قمیص مبارک سے ان کا کفن بنایا۔ قبر میں لیٹ کر اس کو متبرک کیا اور دفن کے بعد دعا مانگی: "اللہ اغفر فاطمة بنت اسد ووسع عليها مدخلها بحق نبيك والأنبياء الذين من قبلي" "اے اللہ! فاطمہ بنت اسد کی مغفرت فرما، ان کی قبر کو کشادہ کر، اپنے نبی اور تمام پہلے نبیوں کے وسیلہ سے"۔

ابوطالب کثیر العیال تھے اور انتہائی عسرت کے ساتھ گزر اوقات ہوتا تھا۔ اس لئے حضور ﷺ نے حضرت عباس سے فرمایا: ہمیں اس پریشانی میں اچھا خاصا ہاتھ بٹانا چاہئے، چنانچہ حسب ارشاد جعفر کی کفالت حضرت عباس نے اپنے ذمہ لی اور حضور ﷺ کی نگاہِ انتخاب نے حضرت علی کو پسند کر لیا، چنانچہ شروع سے ہی حضرت علی حضور ﷺ کی تربیت اور آغوش پرورش میں رہے۔ (علامہ نبہانی، شواہد الحق (طبرانی، ابن حبان، حاکم) ص ۱۵۴)

قبول اسلام

حضرت علی کی عمر ابھی دس سال ہی کی تھی کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اعلان نبوت کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی نماز بھی فرض ہوگئی۔ ایک دن حضور ﷺ اور حضرت خدیجہ الکبریٰ نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت علی نے حیرت سے اس نئے منظر کو دیکھا۔ حضور ﷺ

سے پوچھا: یہ سب کیا تھا؟ حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی توحید اور اپنے منصب نبوت اور نماز وغیرہ کے بارے میں خبر دی اور ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ ایک دن کے غور وفکر کے بعد حضرت علی مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے اور اس وقت تک اسلام لانے والوں میں حضرت علی تیسرے شخص تھے۔

تبلیغ دین میں حضرت علی کی معاونت

اعلان نبوت کے بعد تین سال تک حضور ﷺ خفیہ طریقہ سے تبلیغ کرتے رہے، خاص خاص لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتے اور ان میں سے اکثر قبول کر لیتے۔ نبوت کے چوتھے سال حضور ﷺ کو حکم ہوا کہ کھلے عام تبلیغ کیجئے اور اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کیجئے۔ حضور نے کوہ صفا پر چڑھ کر اپنے خاندان کے لوگوں کو جمع کیا اور ان کو عذاب الٰہی سے ڈرایا۔ لیکن ابولہب نے حضور ﷺ کی شان میں بدتمیزی کر کے مجمع منتشر کر دیا۔

حضور ﷺ نے ایک بار پھر اپنے اقرباء کو جمع کیا اور چالیس افراد کی دعوت کی۔ جن میں حضرت حمزہ، عباس، ابو طالب اور الولہب بھی تھے۔ دعوت سے فارغ ہونے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: اے بنو عبدالمطلب! میں تمہارے سامنے دنیا اور آخرت کی بہترین نعمتیں پیش کرتا ہوں، بتاؤ اس معاملہ میں کون میرا ساتھ دے گا؟ یہ سن کر ساری محفل پر سکوت طاری ہو گیا۔ اس خاموشی میں اگر کسی کی آواز ابھری تو وہ حضرت علی تھے۔ انہوں نے فرمایا: اگرچہ میری عمر سب سے چھوٹی ہے، میری آنکھیں دکھتی ہیں اور میری ٹانگیں پتلی ہیں۔ لیکن اسلام کی راہ میں میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ حضور بار بار اپنے اقرباء سے اسلام کی راہ میں تعاون کی اپیل کرتے رہے۔ لیکن ہر بار جواب میں صرف حضرت علی کی آواز سنائی دیتی تھی۔

جانثاری اور ہجرت

مکہ میں تیرہ سال گزارنے کے بعد حضور ﷺ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ حضور ﷺ کے کاشانہ اقدس کے گرد کفار نے گھیرا ڈالا ہوا تھا اور اس انتظار میں تھے کہ کب حضور گھر

سے نکلیں اور آپ کو شہید کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انہیں دشمنان جان کی بہت سی امانتیں تھیں۔ آپ نے حضرت علی سے فرمایا: میں جا رہا ہوں، تم ان لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد کر کے مدینہ چلے آنا۔ چنانچہ حضرت علی بے خوف و خطر حضور کے بستر پر سو گئے، صبح کو کفار برہنہ تلواریں لے کر کاشانہ اقدس میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ حضور کے بجائے آپ کا ایک جانثار موت و حیات سے بے پرواہ آپ کے بستر پر سو رہا ہے۔ تین چار دن بعد حضرت علی مدینہ ہجرت کر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے۔

معرکۂ بدر

حضرت علی نے شجر اسلام کی اپنے خون سے آبیاری کی ہے۔ ان کی تیغ بے نیام نے ان گنت کفار کو اسلام دشمنی کی سزا دی۔ وہ ہمیشہ بڑھ کر وار کرتے تھے۔ اسلام کی راہ میں کفار کے بچھائے ہوئے کانٹوں کو وہ ایک ایک کر کے ہٹاتے چلے گئے۔ ان کے غزوات کی ابتداء بدر سے ہوئی۔ قریش کا دستور تھا کہ پہلے فرداً فرداً جوان مقابلہ کے لئے نکلتے، پھر عام لڑائی شروع ہوتی، کفار کی طرف سے امیر لشکر عتبہ، ولید اور شیبہ مقابلہ کو نکلے جن کے مقابلہ میں تین انصاری نوجوان آئے، لیکن کفار نے انصار کو کم تر سمجھتے ہوئے لڑنے سے انکار کر دیا اور کہا: ہمارے ہم سر جوانوں کو مقابلہ میں لاؤ، تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ، علی اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم کو مقابلہ میں بھیجا۔ حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ نے عتبہ کو واصل جہنم کیا اور حضرت علی نے ایک ہی وار میں ولید کو تہ تیغ کر دیا۔ دوسری طرف شیبہ نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو گھائل کر دیا تھا۔ حضرت علی نے آگے بڑھ کر ایک وار کیا اور شیبہ کو بھی قتل کر دیا۔

سیدتنا فاطمہ سے نکاح

غزوۂ بدر کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے حضرت علی سے کہا کہ وہ حضور کی محبوب صاحبزادی سے نکاح کی درخواست کریں۔ جب حضرت علی نے نکاح کی درخواست کی تو حضور نے پوچھا: تمہارے پاس مہر ادا کرنے کے لئے کچھ ہے؟ عرض کیا: ایک گھوڑے اور زرہ کے سوا کچھ نہیں ہے، فرمایا: گھوڑے کو جہاد کے لئے رکھو اور زرہ کو فروخت کر دو۔ حضرت علی نے یہ زرہ چار سو اسی درہم میں فروخت کی اور قیمت لا کر حضور کو پیش کر

دی۔ حضور نے بلال کو حکم دیا کہ بازار سے عطر اور خوشبو خرید کر لائیں۔ اس کے بعد خود نکاح پڑھایا اور خیر و برکت کی دعا دی۔ نکاح کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد رخصتی ہوئی۔ رخصتی کے وقت خاتون جنت کو جو جہیز ملا، اس کی کل کائنات یہ تھی۔ ایک پلنگ، ایک بستر، ایک چادر، دو چکیاں اور ایک مشکیزہ۔ یہی اثاثہ ساری عمر حضرت زہرا کے ساتھ رہا اور حضرت علی اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے۔

دیگر غزوات

بدر کے علاوہ جن غزوات میں حضرت علی نے داد شجاعت دی ان میں غزوۂ احد، غزوۂ خندق، بنونضیر اور بنو قریظہ سے جنگ، بنو سعد کی سرکوبی اور معرکہ خیبر شامل ہیں۔

مسلمان کئی روز سے قلعہ خیبر پر حملہ کر رہے تھے لیکن وہ فتح نہیں ہوا۔ آخر ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کل میں جھنڈا اس کے ہاتھ میں دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ خیبر کو فتح کرے گا۔ وہ ایسا شخص ہوگا کہ وہ اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہوگا اور اللہ اور اس کے رسول کو اس سے محبت ہوگی۔ دوسرے دن تمام صحابہ سرکار کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ کون خوش قسمت ہے جس کو حضور فتح کا جھنڈا دیتے ہیں۔ سب کے دل میں آرزو تھی، سب طالب تھے اور سب کی نگاہیں سرکار کی جنبش لب کو ڈھونڈ رہی تھی اور سرکار کی نگاہیں حضرت علی کو تلاش کر رہی تھیں۔ پوچھا: علی کہاں ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: علی بیمار ہیں، فرمایا: بلاؤ۔ حضرت علی آئے، پوچھا: کیا تکلیف ہے؟ عرض کیا: آنکھیں دکھتی ہیں، حضور ﷺ نے اپنا لعاب دہن حضرت علی کی آنکھوں میں ڈالا، حضرت علی فرماتے ہیں کہ لعاب دہن پڑنے کی دیر تھی۔ ساری تکلیف جاتی رہی اور پھر کبھی دوبارہ آنکھوں میں تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علی کو جھنڈا عطا کیا اور فرمایا: پہلے انہیں اسلام کی دعوت دینا، اس کے بعد ان سے جنگ کرنا۔ (شیخ ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ ص ۵۶۳) یہ وہ موقع تھا جس سے حضرت علی کی عظمت ظاہر ہوتی ہے، کیونکہ تمام صحابہ اس موقع پر حضور کے طالب تھے اور حضور حضرت علی کے طالب تھے اور سرکار صحابہ کے اور حضرت علی سرکار کے مطلوب تھے۔

قلعہ خیبر کا وہ دروازہ جس کو چالیس آدمی بھی مل کر نہ اٹھا سکتے تھے، حضرت علی نے ایک ضرب سے اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ امام رازی لکھتے ہیں کہ یہ حضرت علی کی قوت نہ تھی، بلکہ اس وقت حضرت علی قوت یزدانی کے مظہر تھے اور اس قوت کے سیلاب کے سامنے قلعہ خیبر کا دروازہ تنکوں کی طرح بہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

مقام علی

یوں تو تمام صحابہ حضور کے منظور نظر تھے اور خلفاء راشدین میں سے ہر ایک کی نمایاں خصوصیات تھیں، لیکن حضرت علی کی بعض عظمتیں ایسی ہیں، جن میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔ ایک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔ (شیخ ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ ص ۵۶۴) اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ علی میرے خاندان سے ہیں اور میرے کمالات نبوت کا ظہور علی سے ہوگا اور اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ علی کی ذات میری ذات میں گم ہو چکی ہے۔ میں علی کا آئینہ ہوں اور علی میرے جمال کا پرتو ہیں۔ جو میرا محب ہے وہ علی کا محب ہے اور جو علی کا مخالف ہے وہ میرا مخالف ہے۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ (حجۃ الوداع سے واپسی کے موقع پر) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غدیر خم کے موقع پر پہنچے تو حضور نے حضرت علی کا ہاتھ اٹھا کر صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ تمام مسلمان مجھے اپنی جانوں سے بھی زیادہ محبوب رکھتے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپ نے پھر فرمایا: کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہر مومن مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب رکھتا ہے؟ صحابہ کرام نے عرض کیا: کیوں نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کا میں محبوب ہوں اس کے علی محبوب ہیں۔ اے اللہ! اس سے محبت کر جو علی سے محبت رکھے، اے اللہ! اس سے عداوت رکھ جو علی سے عداوت رکھے۔ بعد میں حضرت عمر کی حضرت علی سے ملاقات ہوئی تو حضرت عمر نے فرمایا: اے علی! تمہیں مبارک ہو تم پر صبح و شام میں سے کوئی وقت نہیں گزرتا مگر مومن کے دل میں تمہاری محبت ہوتی ہے۔ (شیخ ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (مسند احمد) ص ۵۶۵) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے علی کو برا بھلا کہا اس نے مجھ کو برا بھلا کہا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ تم میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مشابہت ہے، یہود نے ان سے بغض رکھا، حتیٰ کہ ان کی ماں پر بہتان باندھا اور نصاریٰ نے ان سے محبت کی اور ان کو عبدیت کے منصب سے اتار لیا اور اس منصب پر فائز کر دیا جو ان کا منصب نہ تھا، پھر حضرت علی نے فرمایا: دو فرقے میری ذات کے بارے میں عقائد بنا کر گمراہ ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو مجھ سے محبت کرنے میں حد سے تجاوز کرے گا، دوسرا وہ جو مجھ سے بغض رکھے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ (شیخ ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (مسند احمد) ص ۵۶۵)

اور ایک روایت میں یوں ہے: میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں دو بار حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنایا، ایک بار جب ہجرت کر کے مدینہ گئے تو کفار کی امانتیں سپرد کرنے کا کام علی کو سونپ آئے، دوسری بار جب غزوۂ تبوک کے موقع پر تشریف لے گئے تو اہل مدینہ کی حفاظت کے لئے حضرت علی کو چھوڑ گئے۔ جہاد میں شرکت سے محرومی اور حضور کی رفاقت میسر نہ ہونے کی بناء پر حضرت علی رنجیدہ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے علی! کیا تم اس بات سے راضی نہیں ہو کہ تم میرے لئے ایسے ہو، جیسے موسیٰ کے لئے ہارون تھے۔ لیکن میرے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہوگا۔ (شیخ ولی الدین تبریزی، متوفی ۷۴۲ھ، مشکوٰۃ (مسند احمد) ص ۵۶۵)

اس حدیث میں حضرت علی کی دو عظمتیں ہیں کہ حضرت علی رنجیدہ ہوں تو حضور ان کو راضی کرتے ہیں۔ غور کیجئے کہ جب سرکار آزردہ ہوں تو رب کائنات انہیں راضی کرتا ہے اور جب علی آزردہ ہوں تو جناب رسالت مآب انہیں راضی کرتے ہیں۔

دوسری عظمت اس وجہ سے ہے کہ حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم تو حضرت ہارون کے قائم مقام ہو، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی ان تمام اوصاف اور خصوصیات کے حامل تھے جو ایک نبی میں ہوتی ہیں، لیکن چونکہ حضور خاتم النبیین ہیں اس لئے حضرت علی کو نبوت نہیں دی گئی۔

علامہ آلوسی بیان کرتے ہیں کہ حاکم وغیرہ نے سند متصل کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ ابن سلام اور ان کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے گھر دور ہیں اور نہ اس مجلس کے سوا ہماری کوئی مجلس ہے، ہماری قوم کو جب معلوم ہوگا کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں تو وہ ہم سے قطع تعلق کرلیں گے، ہمارے ساتھ بات چیت، اٹھنا بیٹھنا، نکاح وغیرہ تمام تعلقات منقطع کرلیں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ اور اس کا رسول تمہارا مددگار ہے۔ آپ مسجد میں تشریف لے گئے، کچھ صحابہ قیام میں تھے اور کچھ رکوع میں۔ حضور ﷺ نے انہیں لوگوں میں سے ایک سائل کو دیکھا، آپ نے پوچھا: تمہیں کسی شخص نے کچھ دیا؟ سائل نے کہا: ہاں! چاندی کی ایک انگوٹھی۔ فرمایا: کس نے دی ہے؟ اس نے حضرت علی کی طرف اشارہ کیا اور کہا: اس شخص نے جو نماز پڑھ رہا ہے۔ حضور نے استفسار فرمایا: کس حالت میں دی؟ سائل نے کہا: حالت رکوع میں، حضور ﷺ نے خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ (المائدہ)	”اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان والے تمہارے مددگار ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور حالت رکوع میں صدقہ دیتے ہیں“۔

(علامہ محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ، روح المعانی ج ۶ ص ۱۶۷)

اس آیت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کئی وجہ سے عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ اولاً اس وجہ سے کہ حضور ﷺ نے حضرت علی کو اس آیت کا مصداق قرار دیا اور اس پر مسرت کا اظہار فرمایا اور خوشی سے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ ثانیاً اس سے یہ معلوم ہوا کہ نگاہِ رسالت میں حضرت علی ایمان والے ہیں۔ یوں تو سارے صحابہ ایمان والے ہیں لیکن جن کو خود سرکار فرمادیں کہ یہ ایمان والے ہیں ان کے ایمان کی کچھ اور بات ہے۔ ثالثاً اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت علی مسلمانوں کے مددگار ہیں اور صرف ابن سلام کی قوم کے نہیں، بلکہ قیامت تک کے مسلمانوں کے مددگار ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ قیامت تک

مسلمانوں کے مددگار ہیں اسی طرح حضرت علی بھی قیامت تک مسلمانوں کے مددگار ہیں۔ چنانچہ آج تک عرف عام میں حضرت علی کو مشکل کشا کہا جاتا ہے۔ رابعاً یہ آیت نازل ہو چکی تھی لیکن ابھی تک اس کا مصداق نہیں پایا گیا تھا۔ حضرت علی نے حالت رکوع میں انگوٹھی کر صدقہ کیا اور وحی الٰہی کی تصدیق کر دی، بھلا اس سے بڑھ کر حضرت علی کا مقام اور کیا ہوگا کہ وہ زبان رسالت سے وحی ربانی کے مصداق قرار پائے۔

عہد خلافت

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد انتہائی ابتر حالات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ منتخب ہوئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پورے دور خلافت میں ایک لمحہ بھی آرام نصیب نہیں ہوا۔ لوگ حکومت کو پھولوں کی سیج سمجھتے ہیں لیکن حضرت علی کے لئے یہ حکومت خار دار وادی سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھی۔ حضرت علی ہی جانتے ہوں گے کہ اس وقت ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی جب ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لشکر کے خلاف انہیں صف آراء ہونا پڑا۔ جب جنگ جمل میں عشرہ مبشرہ میں سے حضرت طلحہ اور زبیر جیسے بزرگ صحابہ کے خون سے قاتلوں کی تلواریں رنگین ہو رہی تھیں تو حضرت علی کے دل پر کیسی چوٹ لگتی ہوگی۔ جب جنگ صفین میں حضرت امیر معاویہ، حضرت عمرو بن عاص، حضرت مغیرہ بن شعبہ اور دیگر متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپ کے خلاف صف آرا ہوئے، جب دونوں طرف سے صحابہ اور تابعین کا خون بہہ رہا تھا، شہداء کا ڈھیر لگ رہا تھا اور جب فرزندان اسلام ایک دوسرے کے ہاتھوں کھیت ہو رہے تھے، اس وقت حضرت علی کے قلب کی کیفیت کا کیا عالم ہوگا؟

ان جنگوں میں کون حق پر تھا اور کون باطل پر؟ یہ فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے، نہ یہ ہمارا منصب ہے نہ ہم اس کے مکلف ہیں۔ جب ہم ان نفوس قدسیہ کے گرد راہ سے بھی کوئی نسبت نہیں رکھتے تو ان کے مابین حکم کیسے بن سکتے ہیں۔ کیا اس امت میں کوئی شخص ہے جو ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور امیر المومنین حضرت علی کے اختلاف میں فیصل اور حکم ہو سکے اور حضرت عائشہ اور حضرت علی کو خود ساختہ مقدمہ میں فریق بنانے کی جسارت کر سکے؟ ہمارے نزدیک تمام صحابہ محترم ہیں۔ فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابہ

ہوں یا فتح مکہ کے بعد اسلام لانے والے صحابہ۔ اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ کے بارے میں فرمایا ہے: وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (الحدید:۱۰) اور اللہ تعالیٰ نے تمام صحابہ سے جنت کا وعدہ کر لیا ہے۔ البتہ جمہور علماء اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اس مناقشہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے صحت اور صواب پر مبنی تھی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے کو خطاء لاحق ہوئی، لیکن یہ اجتہادی خطاء تھی، اس خطاء کی بناء پر حضرت معاویہ کی شان کم کرنا یا ان کو برا کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان کو اپنے اجتہاد پر اجر ملے گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محترم صحابی ہیں، آپ کے برادر نسبتی ہیں اور کاتب وحی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لئے ہدایت پر قائم رہنے اور ہدایت دینے کی دعا کی ہے۔ (جامع ترمذی)

البتہ اس بات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ حضرت علی خلیفہ راشد تھے اور اپنے معاصرین صحابہ و تابعین میں وہ سب سے افضل اور برتر تھے۔ سب سے زیادہ محبوب تھے، علم کا شعبہ ہو یا عمل کا، عبادت و ریاضت ہو یا سخاوت و شجاعت، اس دور میں کوئی شخص کسی شعبہ میں بھی حضرت علی کا ہمسر نہ تھا، وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ قدآور اور بلند و بالا شخصیت کے مالک تھے۔

شہادت

واقعہ تحکیم کے بعد حضرت علی کے بہت سے ساتھی آپ سے کٹ گئے اور علی الاعلان حضرت علی کی مخالفت کرتے تھے، ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ دین کے معاملہ میں حکم مقرر کرنا سراسر کفر ہے۔ چنانچہ یہ لوگ علانیہ حضرت علی، حضرت معاویہ اور عمرو بن العاص کو کافر قرار دیتے تھے۔ یہ خارجی لوگ تھے، انہوں نے ان تینوں بزرگوں کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا۔ حضرت امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما امت کی خوش قسمتی سے بچ گئے۔

اور یہ امت کی انتہائی بدنصیبی تھی کہ ابن ملجم نامی خارجی رمضان کی اکیسویں شب مسجد میں آکر سویا۔ فجر کے وقت جب حضرت علی نماز پڑھانے لگے تو عین سجدہ کی حالت میں ابن ملجم نے زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے آپ کی گردن پر وار کیا اور اکیس رمضان بروز جمعہ چالیس ہجری کو علم و فضل، زہد و تقویٰ، شجاعت و سخاوت اور رشد و ہدایت کا یہ عظیم آفتاب

غروب ہو گیا۔

ظاہری نگاہوں سے حضرت علی اوجھل ہو گئے، لیکن اہل باطن کے سامنے حضرت علی آج بھی رونق افروز ہیں، اہل دل ان سے رابطہ رکھتے ہیں، اولیاء اللہ ان سے فیض پاتے ہیں۔ کعبہ سے لے کر کوفہ کی جامع مسجد تک ان کی زندگی کا ہر دور لائق رشک اور قابل تقلید تھا۔ آج پھر گناہوں اور گمراہیوں کے اندھیروں میں حضرت علی کی سیرت کے چراغ جلانے کی ضرورت ہے۔ اس دور انحطاط میں مسلمانوں کے عروج کے لئے ایک بار پھر ضرب حیدری کی ضرورت ہے۔



حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

حضرت معاویہ بن ابی سفیان بن صخر بن حرب رضی اللہ عنہما، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موقر صحابی، کاتب وحی الٰہی اور تمام مسلمانوں کے ماموں ہیں کیونکہ آپ کی ہمشیرہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا ام المومنین ہیں۔

آپ اعلان نبوت سے پانچ سال پہلے پیدا ہوئے اور پچیس سال کی عمر کو پہنچ کر ے ہجری میں اس وقت اسلام قبول کیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے موقع پر قضاء ہو جانے والے عمرہ کو ادا کرنے کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے۔ اسلام سے مشرف ہونے کے بعد مروہ پہاڑ کے قریب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے بال کاٹنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس وقت چونکہ آپ کے والدین ابوسفیان اور ہند اسلام نہیں لائے تھے، اس لئے آپ نے ان کے خوف سے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ ۸ ہجری میں جب فتح مکہ کے بعد آپ کے والدین اور بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان نے اسلام قبول کر لیا تو آپ نے بھی اپنے اسلام کا اظہار کر دیا۔ ۸ ہجری میں آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ حنین میں شرکت کی۔

حضرت معاویہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عام خط و کتابت اور قرآن کریم کی کتابت پر مامور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو دعا دی اور فرمایا: اے اللہ! معاویہ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت یافتہ بنا اور اس کے سبب سے لوگوں کو ہدایت دے۔ (ترمذی) حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابویعلیٰ کی سند کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ حضرت معاویہ نے کہا: ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرا رہا تھا، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو سے فارغ ہو کر میری طرف دیکھا تو فرمایا: اے معاویہ! جب تمہیں کسی جگہ کا حکم بنایا جائے تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اور عدل سے کام لینا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے اس وقت سے یقین ہو گیا تھا کہ مجھے حکومت کی ذمہ داری سونپی جائے گی۔

حضرت معاویہ کو اکثر و بیشتر حضور ﷺ اپنی بارگاہ میں یاد فرماتے تھے، آپ نے حضور ﷺ سے ایک سوتریسٹھ احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت ابن عباس اور دیگر صحابہ اخیار تابعین آپ سے احادیث روایت کرتے تھے۔

(الاصابہ ج ۳ ص ۴۳۳، اسد الغابہ ج ۴ ص ۳۸۵)

حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر نے جو لشکر شام کی طرف بھیجا تھا، اس میں حضرت معاویہ اور آپ کے بڑے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہم دونوں شریک تھے۔ آپ کے بھائی یزید بن ابی سفیان کو حضرت ابوبکر نے چوتھائی فوج کا امیر مقرر کیا اور دمشق فتح ہونے کے بعد حضرت ابوبکر نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ حدود اسلامیہ میں یہ سب سے پہلے گورنر کا تقرر تھا، جس کی سعادت اموی خاندان کو نصیب ہوئی۔ حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر نے یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر رکھا۔ سترہ ہجری میں جب طاعون عمواس پھیلا تو حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ فوت ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق آپ کی وفات انیس ہجری میں فتح قیساریہ کے بعد ہوئی۔ بہر حال حضرت یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام شام کا علاقہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی تحویل میں دے دیا اور حضرت عثمان کی شہادت تک سترہ یا پندرہ برس تک آپ نے شام کے علاقہ میں کامیاب حکومت کی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۷، ص ۹۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ جب مدینہ میں خلیفہ منتخب ہوئے تو آپ نے ان سے حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ کیا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا دور حکومت تینتالیس سال پر محیط ہے، انہوں نے جتنے طویل عرصہ تک جس قدر وسیع و عریض علاقہ پر کامیاب حکومت کی ہے وہ ان کے کسی پیش رو خلیفہ کے حصہ میں نہیں آئی۔ وہ پانچ سال حضرت عمر کے عہد میں دمشق کے گورنر رہے، بارہ سال حضرت عثمان کے زمانہ میں پورے علاقہ شام کے گورنر رہے، چھ سال حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں حکمران رہے۔ حضرت علی کی شہادت کے بعد حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی اور تمام اسلامی ریاست کے وہ خلیفہ تسلیم کر لئے گئے، ان کے ایام حکومت میں اسلامی فتوحات مشرق اور مغرب میں تیز و تند سیلاب کی طرح بڑھتی جا رہی تھی۔ خلیفہ منتخب ہونے کے بعد انہوں نے بیس سال تک حکومت کی اور بیاسی سال کی عمر گزار کر بائیس رجب ساٹھ ہجری کو جمعرات کے دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح انہوں نے سترہ ہجری سے لے کر ساٹھ ہجری تک مسلسل حکومت کی اور یہ صرف انہیں کا حصہ تھا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۵ ص ۹۵، ج ۸ ص ۱۴۳)

حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہ بہت حسین و جمیل شخص تھے۔ دراز قد اور گورا رنگ تھا، ڈاڑھی میں سرخ اور سیاہ رنگ ملا کر خضاب کرتے تھے، انتہائی بردبار، باوقار، فیاض اور عادل تھے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۱۸)

ابواسحاق فرازی کی سند کے ساتھ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ذکر کی ہے کہ حضرت جبریل امین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: اے محمد! معاویہ کو سلام کیجئے اور انہیں نصیحت کیجئے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی وحی پر امین ہیں اور کیا ہی خوب امین ہیں۔ (البدایہ ج ۸ ص ۱۲۰) حضرت مغیرہ بیان کرتے ہیں کہ جب حضرت معاویہ کے پاس حضرت علی کی شہادت کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہ زار و قطار رونے لگے، ان کی اہلیہ نے کہا کہ زندگی میں تو آپ ان سے لڑتے رہے اور شہادت کی خبر سن کر رو رہے ہیں تو حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کاش! تمہیں معلوم ہوتا کہ لوگوں نے آج کس قدر عظیم علم و فضل اور فقہ کو کھو دیا ہے۔ (البدایہ ج ۸ ص ۱۳۰)

حضرت علی رضی اللہ عنہ جب جنگ صفین سے واپس لوٹے تو آپ نے فرمایا: اے لوگو! معاویہ کی حکومت کو ناپسند نہ کرو، یاد رکھو! اگر تم نے معاویہ کو کھو دیا تو تم دیکھو گے کہ لوگوں کے کندھوں سے ان کے سر اس طرح گریں گے جس طرح اندرائن کے پھل گرتے ہیں۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر کے لوٹے تو سفیان بن لیل نے ان سے کہا: آپ نے مسلمانوں کو ذلیل کر دیا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا مت کہو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ شب و روز کا سلسلہ چلتا رہے گا حتیٰ کہ حکومت معاویہ

کے پاس چلی جائے گی اور مجھے یقین ہو گیا کہ تقدیر الٰہی واقع ہو گئی ہے۔ لہٰذا میں نے دونوں جانب سے مسلمانوں کے درمیان خونریزی کو ناپسند کیا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۳۱)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ متعدد اسانید سے مروی ہے کہ ابو مسلم خولانی ایک جماعت کے ساتھ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ تم علی سے جنگ کر رہے ہو، کیا تم اپنے آپ کو ان کے ہم مرتبہ سمجھتے ہو؟ حضرت امیر معاویہ نے جواب دیا: قسم بخدا! مجھے یقین ہے کہ حضرت علی مجھ سے افضل اور برتر ہیں اور میری نسبت حکومت کے وہ زیادہ مستحق ہیں۔ لیکن کیا تم کو معلوم نہیں کہ حضرت عثمان مظلوماً شہید کئے گئے اور میں ان کا چچازاد ہوں اور ان کے خون کے قصاص کا طالب اور ولی ہوں۔ حضرت علی سے عرض کرو کہ قاتلین عثمان کو میرے حوالہ کر دیں، میں فوراً ان سے بیعت کر لوں گا۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۲۹) حافظ ابن کثیر نے شعبی سے روایت کیا ہے کہ خلیفہ مقرر ہونے کے بعد حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک اجتماع سے فرمایا: اے لوگو! میں تم سب سے افضل نہیں ہوں اور تمہارے درمیان وہ حضرات موجود ہیں جو مجھ سے برتر اور افضل ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہم اور ان کے علاوہ دیگر افاضل صحابہ کرام ہیں، لیکن مجھے امید ہے کہ میری حکومت تمہارے لئے زیادہ نفع آور، تمہارے دشمنوں پر زیادہ غالب اور تمہارے لئے زیادہ خیر کا موجب ہوگی۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۱۳۲)

حافظ ابن کثیر نے یعقوب بن سفیان کی سند کے ساتھ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ذکر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نور کا ایک ستون دیکھا جو میرے سر کے نیچے سے بلند ہوتا ہوا ملک شام پر جا کر ٹھہر گیا اور عبدالرزاق کی سند کے ساتھ بیان کیا کہ ایک شخص نے جنگ صفین کے دن کہا: اے اللہ! اہل شام پر لعنت کر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کو ٹوکا اور فرمایا: اہل شام پر لعنت نہ کرو اور تین بار مکرر کہا: وہاں ابدال ہیں۔ (البدایہ والنہایہ ج ۸ ص ۲۰)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر طعن کرنے کے لئے ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمار کے بارے میں فرمایا کہ ان کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، عمار

اس گروہ کو جنت کی دعوت دیں گے اور وہ عمار کو جہنم کی طرف بلائیں گے اور حضرت عمار حضرت علی کی جانب سے لڑتے ہوئے حضرت معاویہ کے لشکر کے ہاتھ شہید ہوئے، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ حضرت معاویہ باغی تھے۔

صحیح بخاری کے علاوہ دیگر کتب حدیث میں یہ حدیث اسی طرح درج ہے۔ لیکن امام بخاری نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کو اس طرح روایت کیا ہے: عمار لوگوں کو جنت کی طرف دعوت دیں گے اور وہ انہیں دوزخ کی طرف بلائیں گے۔ اس روایت میں "ویح عمار تقتله الفئة الباغية" "افسوس اے عمار! تم کو باغی جماعت قتل کرے گی" کے الفاظ نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی بزار کی سند کے ساتھ، جو "صحیح مسلم" کی شرط پر ہے، ذکر کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ الفاظ نہیں سنے۔ اسی لئے امام بخاری نے اپنی صحیح سند میں یہ الفاظ درج نہیں کئے۔ اس تحقیق کے پیش نظر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: جن احادیث میں "تقتلك الفئة الباغية" "تم کو باغی گروہ قتل کرے گا" کی زیادتی ہے وہ مدرج ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہیں۔ بلکہ راویوں نے اپنی طرف سے یہ زیادتی حدیث میں ملادی ہے۔ (فتح الباری ج ۲ ص ۱۱۲، عمدۃ القاری ج ۴ ص ۲۰۸) جب یہ ثابت ہو گیا کہ اصل حدیث یوں ہے: "عمار لوگوں کو جنت کی دعوت دیں گے اور وہ ان کو دوزخ کی" تو اس کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ مشرکین کی طرف متوجہ ہے یعنی حضرت عمار مشرکین کو جنت کی دعوت دیں گے اور وہ انہیں دوزخ کی طرف بلائیں گے (1)۔

نیز قرآن کریم میں ہے: فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات: ۹) "باغی گروہ سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی طرف رجوع کر لے"۔

1۔ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی نے یہ کہا ہے کہ امام بخاری نے "ویح عمار تقتله الفئة الباغية" کا جملہ روایت نہیں کیا، اس پر یہ اشکال ہے کہ ہماری مطبوعہ "صحیح بخاری" میں تو یہ جملہ موجود ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اس دور کے چھاپنے والوں کی غلطی ہے۔ کیونکہ امام ابن اثیر الجزری المتوفی ۶۰۶ھ نے "جامع الاصول" رقم الحدیث: ۸۷۱۴ میں امام بخاری کے حوالہ سے اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس میں "تقتله الفئة الباغية" والا جملہ نہیں ہے۔ (جامع الاصول ج ۱۱ ص ۱۹۵ مطبوعہ دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۱۸ھ)

اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ باغی ہوتے تو حضرت علی پر لازم تھا کہ وہ ان سے مسلسل جنگ کرتے یہاں تک کہ وہ حضرت علی کی خلافت کو مان لیتے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا نہیں کیا بلکہ جنگ موقوف کر دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی کے نزدیک حضرت معاویہ باغی نہیں تھے۔ ورنہ فاتح خیبر اور اسد اللہ الغالب ان سے کبھی جنگ موقوف نہ کرتے، بلکہ قرآن کریم کے حکم کے مطابق اخیر دم تک ان سے لڑتے رہتے، یہاں تک کہ یا کامیاب ہو جاتے یا راہ حق میں شہید ہو جاتے۔

قرآن کریم کی اس نص صریح اور "بخاری" کی صحیح روایت اور "مسند بزار" کی تصریح سے ثابت ہوا کہ حضرت معاویہ (معاذ اللہ) باغی نہ تھے، بلکہ مجتہد تھے اور وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا "جو شخص مظلوماً شہید ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کا حق دیا ہے" کے بموجب قصاص عثمان کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گرد و پیش مالک اشتر، کنانہ بن بشر اور محمد بن ابی بکر اور ان کے حامیوں کا زبردست جتھہ تھا اور وہی لوگ تھے جن کے ہاتھ قتل عثمان رضی اللہ عنہ سے رنگین تھے اور ان کی بھاری جمعیت حضرت علی کے چاروں طرف تھی۔ ان حالات میں حضرت علی کے لئے قصاص عثمان لینا ممکن نہ تھا، بہر حال حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما دونوں صحابہ اور مجتہد تھے اور آسمان علم کے آفتاب اور ماہتاب تھے اور بعد کے لوگ جو علم وفہم میں ان کی گرد راہ کے برابر بھی نہیں ہیں ان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان میں کسی فریق کو خطاوار قرار دے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت علی ہر میدان اور ہر شعبہ میں حضرت معاویہ سے ہزار بار افضل تھے۔

ابن اثیر لکھتے ہیں کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے وفات سے پہلے وصیت کی تھی کہ ان کو اس قمیص میں کفن دیا جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پہنائی تھی اور اس قمیص کی اندرونی جانب ان کے جسم کے ساتھ ملا دی جائے اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو تراشیدہ ناخن مبارک تھے ان کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی آنکھوں اور منہ پر رکھ دیا جائے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس طرح کفن دینے کے بعد مجھے ارحم الراحمین کی بارگاہ میں اکیلا چھوڑ دینا۔ (اسد الغابہ ج ۴ ص ۳۸۷)

مسائل کلامیہ

اہل سنت و جماعت کی تعریف

اہل سنت و جماعت اس ملک کی غالب اکثریت کا نام ہے جس کو سواد اعظم سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے اور مسلک اہل سنت و جماعت کے حامل عرف عام میں سنی کہلاتے ہیں۔ لیکن عام لوگ نہیں جانتے کہ ان کو اہل سنت و جماعت کیوں کہتے ہیں اور دوسرے فرقوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ وہ کب سے اور کیسے وجود میں آئے؟ ان کا تاریخ میں کیا مقام ہے؟

اہل سنت و جماعت اور دوسرے فرقوں کے درمیان حد فاصل کیا ہے؟ مسلمانوں کی جماعت عامہ سے ہر دور میں کچھ لوگ نئے عقائد بنا کر سواد اعظم سے کٹ کر ایک فرقہ کی شکل اختیار کرتے رہے، ان میں سے مشہور فرقے کون سے ہیں؟ اس مضمون میں اختصار کے ساتھ ان تمام باتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (سعیدی)

اہل سنت و جماعت کا عنوان قرآن کی روشنی میں

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی جانب سے جس دین متین کو لے کر آئے، اللہ عزوجل نے اس دین کو قیامت تک کی نسل انسانی کے لئے لازم قرار دے دیا۔ اس دین متین کا نام اسلام رکھا اور صاف اعلان فرمایا: وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: ۸۵) جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اختیار کرے گا اس کا وہ اختیار کردہ دین ہرگز ہرگز بارگاہ الوہیت میں مقبول نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فداہ نفسی کو روئے زمین کے تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا اور آپ نے تمام دنیا والوں کو اسلام کی دعوت دی۔ جو لوگ سلیم الفطرت تھے انہوں نے اس دعوت کو قبول کیا اور جو شقی القلب تھے انہوں نے اس دعوت کو رد کر دیا۔

اسلام کیا ہے؟ اس کی آسان اور سادہ تعبیر یہ ہے کہ حضور نے جو حکم دیا وہ اسلام ہے، جس کام کو دیکھ کر اس سے منع نہ کیا وہ اسلام ہے اور جس کام سے روک دیا وہ اسلام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر:۷)

"رسول اللہ (ﷺ) جس کام کو حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس کام سے روک دیں اس سے رک جاؤ"۔

نیز فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران:۳۱)

"اے محبوب! ان سے فرما دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع اور پیروی کرو اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب بنا لے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا"۔

اور اس حکم کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱) "رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں تمہارے نظام حیات کے ہر شعبہ میں عمل کے لئے کامل ترین نمونہ ہے"۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے نگاہ نبوت سے تربیت پائی۔ فیضان رسالت سے اپنی زندگیوں کو اسوۂ رسول کے سانچہ میں ڈھالا، خاندانی روابط، والدین کی الفت، اولاد کی محبت، مال و دولت اور وطن سے تعلق کوئی چیز ان کے لئے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے راستے میں رکاوٹ نہ بن سکی۔ ہر امتحان اور ہر ابتلاء میں وہ کامیاب اور سرخرو رہے۔ ان کی اطاعت اور اتباع اللہ کی بارگاہ میں اس درجہ مقبول ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے صحابہ کرام کے چلن اور ان کی طرز زندگی کو معیار حق قرار دیا اور ان کی اتباع پر اپنی رضامندی اور فوز و فلاح کو موقوف فرما دیا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ

"جن لوگوں (صحابہ کرام) نے رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ ہجرت کی اور آپ کی

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (التوبہ:۱۰۰)

نصرت میں پہل کی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جو (بعد میں آنے والے) لوگ ان (یعنی صحابہ کرام) کی اچھے طریقہ سے اتباع کریں گے ان سب سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ عظیم کامیابی ہے"۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے واشگاف طریقہ سے بتلا دیا ہے کہ اگر بعد کے مسلمان فوز وفلاح، جنت اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا یہ طریقہ ہے کہ صحابہ کرام کی اتباع بالاحسان کریں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کا خلاصہ حضور ﷺ کی پیروی اور جماعت صحابہ کے طریقہ سے وابستگی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کی روشنی میں درحقیقت مسلمان کہلانے کا وہی مستحق ہے جو سنت رسول اور جماعت صحابہ کے طریقہ سے وابستہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی صحیح تعبیر اور تشریح اہل سنت و جماعت ہے یعنی وہ لوگ حامل سنت رسول ہوں اور جماعت صحابہ کے طریقہ پر گامزن ہوں۔

اہل سنت و جماعت کا عنوان حدیث کی روشنی میں

حضور ﷺ نے بھی بکثرت احادیث طیبہ میں آنے والی نسلوں سے سنت رسول اور جماعت صحابہ کے ساتھ وابستہ رہنے کو معیار حق اور اسلام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت عرباض بن ساریہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے وصال کے بعد تم لوگ اختلاف کثیر دیکھو گے، اس موقع پر میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کو لازم کر لینا، اسی طریقہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا۔

اس حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحت فرما دی ہے کہ اختلاف کے موقع میں صاف صحیح اور صریح ہدایت صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور جماعت صحابہ کی اتباع اور پیروی میں منحصر ہے۔

اسی مضمون کی ایک حدیث میں ملاحظہ فرمائیں۔ امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ اپنی سند کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت تہتر فرقوں میں منقسم ہوگی اور ان میں سے ایک فرقہ کے سوا سب جہنمی ہوں گے، صحابہ کرام نے پوچھا: حضور! وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپ نے فرمایا: جو میری سنت کا حامل اور میرے صحابہ کے طریقے سے وابستہ ہوگا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ نگاہ رسالت میں مسلمانوں کے متعدد فرقوں اور گروہوں میں وہی فرقہ راشدہ اور مرشدہ ہے جو اہل سنت و جماعت ہے۔

سنت کے عنوان پر یہ دلیل ملاحظہ فرمائیں۔

امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ اور امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ اپنی اپنی اسانید سے بیان کرتے ہیں: ''عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ...... مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ'' ''جو شخص میری سنت سے اعراض کرے وہ میری امت میں سے نہیں ہے''۔

اور بالخصوص صحابہ کرام کے طریقہ کی اتباع یعنی عنوان جماعت پر یہ حدیث ملاحظہ فرمائیں:

محدث رزین بن معاویہ متوفی ۵۳۵ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

''عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم يَدُ اللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ'' ''حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے''۔

امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ بیان فرماتے ہیں:

''عَنْ مَعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم ...... عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَالْعَامَّةِ''۔ ''حضرت معاذ بن جبل بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جماعت

کے ساتھ وابستگی لازم رکھو"۔

اور امام ابوداؤد متوفی ۲۷۵ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

"عَنْ مُعَاوِيَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ...... اِثْنَانِ وَ سَبْعُوْنَ فِي النَّارِ وَ وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَ هِيَ عَلَى الْجَمَاعَةِ"۔ "حضرت معاویہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بہتر فرقے جہنمی ہوں گے اور ان میں سے صرف ایک فرقہ جنتی ہوگا اور وہ فرقہ جماعت صحابہ پر ہوگا"۔

الحمد للہ العزیز! آفتاب سے روشن تر طریقہ سے ثابت ہو گیا کہ مسلک اہل سنت و جماعت کا عنوان کتاب و سنت کے موافق اور اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کے ارشادات گرامی کے عین مطابق ہے۔

سنت کی تشریح

مسلک اہل سنت و جماعت کی توضیح اور تشریح کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سنت کے مفہوم کی وضاحت کر دی جائے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی متوفی ۱۰۵۲ھ سنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والمراد بالسنة الطريقة المسلوكة في الدين و شرائع الاسلام ولو كانت فرضا اوواجبا۔ (اللمعات ج ۱ ص ۲۳۳)	سنت سے مراد وہ راستہ ہے جو دین میں مقرر کر دیا گیا جس کو شریعت اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے، عام ازیں کہ وہ فرائض ہوں یا واجبات۔

خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے عمل کے لئے جس راہ کو متعین کر دیا ہے اس راہ کو سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس تعریف میں تعین عمل کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ اس قید سے حضور ﷺ کے وہ اعمال خارج ہو گئے جن کو حضور ﷺ نے بعد کے احکام یا اعمال سے منسوخ کر دیا، مثلاً نماز کی تکبیر تحریمہ کے بعد رفع یدین، آمین بالجہر یا صبح کی نماز میں قنوت نازلہ پڑھنا وغیرہا اور ہمارے عمل کے لئے اس لئے کہا ہے کہ اس تعریف سے حضور ﷺ کے وہ اعمال خارج ہو جائیں گے جو حضور کی خصوصیات ہیں اور ہمارے لئے جائز

نہیں، مثلاً صوم وصال، بیک وقت نواز واج مطہرات کا نکاح میں رکھنا وغیرہ۔ سنت کی وضاحت کے بعد یہ بھی جان لینا چاہئے کہ حدیث کا مفہوم سنت سے عام ہے، حدیث کا اطلاق حضور ﷺ کے ہر قول، فعل اور حال پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضور ﷺ نے ماضی اور مستقبل کی جو خبریں دی ہیں وہ بھی حدیث ہیں۔ حضور ﷺ نے ابتداء اسلام میں شراب پینے کو مباح رکھا وہ بھی حدیث ہے اور بعد میں منع فرما دیا وہ بھی حدیث ہے، اسی طرح حضور ﷺ کی جو خصوصیات ہیں وہ بھی سب احادیث ہیں۔

اس تشریح سے واضح ہو گیا کہ ایک مسلمان عامل سنت تو ہو سکتا ہے کیونکہ سنت کا مفہوم ہی یہی ہے کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ لیکن ایک مسلمان کبھی بھی عامل بالحدیث نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ احادیث میں پچھلی امتوں کے اعمال بھی بیان کئے گئے ہیں جن میں سے بعض پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، احادیث میں وہ اعمال بھی بیان کئے گئے ہیں جن کو بعد میں منسوخ کر دیا۔ مثلاً حدیث میں نماز میں گفتگو کرنے کا بھی ذکر ہے اور سکوت کا بھی اور ظاہر ہے کہ دونوں حدیثوں پر عمل نہیں ہو سکتا، اسی طرح احادیث میں حضور کی خصوصیات کا بھی ذکر ہے اور ان پر ہمارے لئے عمل کرنا مشروع نہیں ہے۔ اس تفصیل سے آفتاب نیم روز سے زیادہ واضح ہو گیا کہ تمام احادیث پر عمل کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ تمام سنن پر عمل کرنا ممکن ہے، اس لئے ایک مسلمان اہل سنت تو ہو سکتا ہے، اہل حدیث کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہی سبب ہے کہ حضور ﷺ نے کہیں حدیث پر عمل کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ احادیث کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا ہے، مثلاً فرمایا: ”فلیبلغ الشاهد الغائب“ (بخاری) مجھ سے حدیث سننے والا بعد والوں کو میری احادیث پہنچا دے۔ اس کے برخلاف سنت پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

علیکم بسنتی۔ (ترمذی)	میری سنت پر عمل کو لازم رکھو۔
من رغب عن سنتی فلیس منی۔ (بخاری)	جس نے میری سنت سے منہ موڑا وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔
من احیاء سنة من سنتی قد امیتت	جس شخص نے میری کسی ایسی سنت پر عمل کر

بعدی فان له من الاجر مثل اجور من عمل بها من غیر ان ینقص من اجورھم شیئا۔ (الحدیث ترمذی)

کے اس کو زندہ کیا ہو جس کو لوگ ترک کر چکے ہوں تو اس سنت پر عمل کرنے والے کو بعد کے تمام لوگوں کا اجر ملے گا اور ان کے اجر میں بھی کمی نہیں ہوگی۔

بہر حال روایت اور درایت ہر دو طریق سے واضح ہو گیا کہ ایک مسلمان اہل سنت تو ہو سکتا ہے لیکن اہل حدیث کسی حال میں نہیں ہو سکتا۔

استدراک

بعض کتب حدیث یا شرح کتب حدیث یا موضوع حدیث سے متعلق کسی بھی کتاب میں اہل حدیث کا لفظ مستعمل ہوتا ہے، اس لفظ سے یہ غلط فہمی نہ پیدا ہو کہ اہل حدیث کسی مسلک کا عنوان ہے یا اس کے حاملین کا نام ہے، بلکہ اس جگہ اہل حدیث سے حضرات محدثین مراد ہیں، یعنی وہ لوگ جو مشتغل بالحدیث ہوتے ہیں، اس قسم کی کسی کتاب میں لفظ اہل حدیث سے عامل بالحدیث مراد نہیں ہوتا، بلکہ لفظ اہل حدیث سے مشتغل بالحدیث ہی مراد ہوتا ہے۔

مسلک اہل سنت و جماعت کی خصوصیات

متکلمین نے بیان کیا ہے کہ عقائد کی دو قسمیں ہیں: عقائد قطعیہ اور عقائد ظنیہ، اس اعتبار سے حضرات اہل سنت و جماعت کی اصول و فروع میں جو خصوصیات ہیں ان کا یہاں مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

عقائد قطعیہ

اللہ عزوجل کی ذات کو وجوب وجود، استحقاق عبادت اور استقلال بالصفات میں واحد بلاشریک ماننا، اللہ تعالیٰ کی صفات کے لئے حسن و کمال کو واجب اور نقص اور عیب مثلاً کذب اور جہل کو محال ماننا، یہ ماننا کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں، وہ کسی فعل پر جواب دہ نہیں، اس کا نیکوکاروں کو ثواب عطا فرمانا محض اس کا فضل ہے اور عذاب دینا اس کا عدل ہے۔

تمام فرشتوں، کتابوں، انبیاء اور رسل پر ایمان لانا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننا،

قیامت، حشر ونشر اور جزاء وسزا پر ایمان رکھنا، مرتکب کبیرہ گناہ کو مسلمان اور قابل عفو سمجھنا، انبیاء اور ملائکہ معصوم ہیں ان کے سوا کسی کی عصمت ثابت نہیں وغیرھا۔

عقائد ظنیہ

انبیاء کی ملائکہ پر فضیلت، حضور کا تمام انبیاء سے افضل ہونا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا امت کے تمام اعمال پر گواہ ہونا (جس کو حاظر وناظر سے تعبیر کیا جاتا ہے) حضور پر نور کا اطلاق کرنا، حضور کا سایہ نہ ہونا، حضور کو شرعی اور تکوینی امور کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفوض کیا جانا، حضور کو "ما کان و ما یکون" کا عالم جاننا، حوائج اور مشکلات میں حضور سے استمداد اور یا رسول اللہ کے کہنے کو جائز سمجھنا، حضور سے دنیا اور آخرت میں شفاعت کو جائز سمجھنا۔ حضرت ابوبکر کی تمام صحابہ پر افضلیت اور خلفاء راشدین کی خلافت علی الترتیب کو حق اور فضیلت کا معیار سمجھنا۔ خلیفہ کے تقرر کو حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق جائز سمجھنا۔

موزوں کا مسح کرنا، تمام صحابہ، ازواج مطہرات، آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم، سادات کرام اور اولیاء اللہ کا تعظیم سے ذکر کرنا۔ اولیاء اللہ کے مزارات کی زیارت کرنا، ان کے توسل سے دعا مانگنا، ایصال ثواب کی مختلف صورتیں، مثلاً سوئم، چہلم، عرس وغیرہ بطور استحباب کرنا۔ حضور کا ذکر بعنوان میلاد شریف بطور استحسان کرنا، پنج وقتہ نمازوں اور جمعہ کے بعد استحباباً صلوٰۃ وسلام پڑھنا وغیرھا من الاعمال الفرعیۃ۔

ائمہ اربعہ کا اختلاف

امام ابوحنیفہ متوفی ۱۵۰ھ، امام مالک متوفی ۱۷۹ھ، امام شافعی متوفی ۲۰۴ھ، امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ، یہ تمام ائمہ کرام مسلک اہل سنت و جماعت کے حامل تھے۔ سواد اعظم کی اکثریت انہیں کے ساتھ تھی۔ مذکورۃ الصدر اصول اور فروع میں یہ تمام ائمہ متفق تھے۔ بعض فقہی جزئیات میں ان ائمہ کرام کا اختلاف تھا، یہ اختلاف بالکل نیک نیتی کے ساتھ تھا۔ یہ وہی اختلاف ہے جس کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "اختلاف امتی رحمۃ"۔ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔

اس اختلاف کا ایک عام سبب یہ تھا کہ ہر امام کا ایک الگ اصول تھا، مثلاً ایک مسئلہ

میں اگر متعدد، مختلف اور متعارض احادیث وارد ہوں تو اس صورت میں امام شافعی قوت سند کے اعتبار سے فیصلہ کرتے ہیں۔ امام مالک اس حدیث پر عمل کرتے ہیں جس پر اہل مدینہ کا تعامل ہو، امام احمد بن حنبل ایسی صورت میں متقدمین کی اکثریت کا لحاظ کرتے ہیں اور امام اعظم ابو حنیفہ ایسی صورت میں تمام متعارض احادیث کو سامنے رکھ کر منشاء رسالت تلاش کرتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہو ایسی صورت اختیار کرتے ہیں جس میں تمام متعارض احادیث جمع ہو جائیں اور ہر حدیث کا الگ الگ محل متعین ہو جائے۔

اسلام کے متعدد مشہور فرقے

حضرت علی کے دور خلافت کے اوائل میں تمام ملت اسلامیہ ایک مرکز اور ایک مسلک پر جمع تھی اور یہ تمام حضرات مسلک اہل سنت و جماعت کے حاملین تھے۔ بعد میں پھر لوگ نئے عقائد کو وضع کر کے اہل سنت سے علیحدہ ہوتے رہے۔

خوارج

جنگ صفین کے زمانہ میں جب حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما اپنے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لئے دو آدمیوں کو حکم مقرر کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس زمانہ میں حضرت علی کے حامیوں میں سے ایک گروہ اس بات پر بگڑ گیا اور کہنے لگا کہ خدا کے بجائے انسانوں کو فیصلہ کرنے والا مان کر آپ کافر ہو گئے۔ اس کے بعد ان لوگوں کے مزاج میں بتدریج شدت آتی گئی، یہ لوگ خوارج کہلائے، ان کے خاص خاص نظریات یہ ہیں۔

(۱) ان لوگوں کے نزدیک حضرت عثمان اخیر عہد میں عدل وانصاف سے منحرف ہو گئے، حضرت علی مرتکب کبیرہ ہو کر کافر قرار پائے۔ جنگ جمل اور جنگ صفین میں شامل ہونے والے مسلمانوں کو یہ گناہ عظیم کا مرتکب جانتے تھے۔

(۲) ان کے نزدیک جو مسلمان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا اور بلا توبہ مرجائے وہ کفر پر مرا۔

(۳) یہ لوگ قانون اسلامی کی اساس صرف قرآن کریم کو جانتے ہیں اور حدیث کو حجت نہیں مانتے تھے۔

(۴) خوارج اپنے سوا دوسرے تمام مسلمانوں کو کافر گردانتے تھے، ان کے قتل کو جائز اور

ان کا مال لوٹنا مباح سمجھتے تھے۔

شیعہ

حضرت علی کے حامی ابتداءً شیعان علی کہلاتے تھے، لیکن یہ لوگ بتدریج اہل سنت و جماعت کے عقائد سے نکل کر ایک الگ فرقہ کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان کے مخصوص عقائد درج ذیل ہیں:

(۱) امام (خلیفہ) کا مقرر کرنا امت کے انتخاب کی طرف مفوض نہیں ہے، بلکہ رسول کا فرض ہے کہ وہ امام کو مقرر کر کے جائے۔

(۲) ان کے نزدیک امام کا معصوم ہونا ضروری ہے، ہر امام پر لازم ہے کہ وہ اپنے بعد اپنا جانشین مقرر کرے۔

(۳) حضرت علی کو وہ امام معصوم اور منصوص جانتے ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی خلافت کو باطل اور ان کو غاصب قرار دیتے ہیں۔

(۴) چند صحابہ کے سوا باقی تمام صحابہ کو کافر، مرتد اور منافق خیال کرتے ہیں اور ان کو سب و شتم کرنا عبادت گردانتے ہیں۔

(۵) شیعہ حضرات کے بہت سے فرقے ہیں۔ ان میں سے بعض قرآن کریم میں تحریف کے معتقد ہیں، شیعہ حضرات سواد اعظم اہل سنت کی تکفیر کرتے ہیں اور ان کی اقتدا میں نماز کو جائز نہیں سمجھتے۔

مرجیہ

خوارج اور روافض کے انتہائی متضاد نظریات کے برعکس اس کے رد عمل میں ایک تیسرا طرز فکر پیدا ہوا، یہ لوگ بھی مختلف نظریات اختیار کر کے سواد اعظم اہل سنت و جماعت سے علیحدہ ہو گئے ان کے عقائد اس قسم کے تھے:

(۱) ایمان صرف اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی معرفت کا نام ہے۔

(۲) نجات کا مدار صرف ایمان پر ہے، کسی قسم کی معصیت مسلمان کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

(۳) صرف شرک سے مجتنب ہونا اور ایمان پر مرنا مغفرت کے لئے کافی ہے۔

معتزلہ

دولت عباسیہ کے اوائل میں عرب اور عجم کی آویزش اور یونانی علوم کے عربی میں منتقل ہونے کے نتیجہ میں فرقہ معتزلہ کا ظہور ہوا اور اس فرقہ کے بانی واصل ابن عطاء متوفی ۱۳۱ھ اور عمرو بن عبید متوفی ۱۴۵ھ تھے، ان کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ انسان کے حق میں جو کام مفید ہو وہ کرے۔
(۲) انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے۔
(۳) تقدیر کوئی چیز نہیں ہے۔
(۴) قرآن کریم مخلوق ہے۔
(۵) گناہ کبیرہ کے لئے شفاعت جائز نہیں۔
(۶) ملائکہ انبیاء سے افضل ہیں۔
(۷) عذاب قبر اور حساب و کتاب کا ماننا عبث ہے۔
(۸) جنت اور دوزخ کو ابھی پیدا نہیں کیا گیا۔
(۹) اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ صالحین کو ثواب عطا کرے۔
(۱۰) جو شخص گناہ کبیرہ کرے اور بلا توبہ مر جائے وہ نہ مسلمان ہے نہ کافر ہے۔

ظاہریہ (غیر مقلدین)

اس فرقہ کے بانی ابو سلیمان داؤد بن علی بن خلف الاصبہانی المعروف بالظاہری تھے۔ داؤد ظاہری ابتداءً امام شافعی کے حامی تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنا ایک مذہب ایجاد کیا جس کی بنیاد یہ ہے کہ وہ ظاہر کتاب وسنت پر عمل کرتے ہیں، اگر نص نہ ملے تو وہ اجماع پر عمل کر لیتے ہیں اور قیاس کے مطلق قائل نہیں ہیں۔

داؤد ظاہری بعض فقہی مسائل میں جمہور سے منفرد ہیں، مثلاً:

(۱) طلاق صرف ان لفظوں سے واقع ہوتی ہے: طلاق اور فراق۔
(۲) تین طلاقیں بیک وقت دی جائیں تو وہ ایک طلاق شمار ہوگی۔
(۳) اگر کوئی شخص بیوی کی غیر موجودگی میں اسے طلاق دے تو واقع نہیں ہوگی۔

داؤد ظاہری کے پیروکاروں میں آہستہ آہستہ شدت آتی گئی، حتیٰ کہ بعد میں غیر مقلد حضرات علی الاعلان تقلید شخصی کو حرام کہنے لگے۔

وہابیہ

محمد بن عبدالوہاب نجدی متوفی ۱۲۰۶ھ مسلیمہ کذاب کی جائے پیدائش عینیہ میں پیدا ہوئے، ان کے مزاج میں بہت شدت تھی، انہوں نے اپنے زمانے کے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور یہ دعویٰ کیا کہ چھ سو سال قبل سے یہ امت کفر اور شرک میں مبتلا ہے۔ جس شخص سے بیعت لیتے اس سے اقرار کراتے کہ وہ بھی کافر ہے اور اس کے آباء واجداد بھی کفر پر مرے۔ انہوں نے صحابہ کرام کے مزارات منہدم کرا دیئے اور ایک نئے سے مذہب کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ علی طنطاوی متوفی ۱۳۵۸ھ نے لکھا ہے: "اِمَامٌ مُحَمَّدٌ فَهُوَ صَاحِبُ الدَّعْوَةِ الَّتِيْ عُرِفَتْ بِالْوَهَابِيَّهِ" محمد بن عبدالوہاب شیخ نجدی نے جس تحریک کی طرف دعوت دی وہ عرف عام میں وہابیت کہلائی۔

اس مذہب کی چند خصوصیات یہ ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا دیگر انبیاء اور رسل کے وسیلہ سے دعا مانگنا کفر ہے۔

(۲) یا رسول اللہ کہنا اور انبیاء سے استمداد کرنا شرک ہے۔

(۳) جو شخص یہ عقیدہ رکھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شفاعت طلب کرنا جائز ہے وہ اسلام سے خارج ہو گیا اور اس شخص کو قتل کرنا اور اس کے اموال کو لوٹنا جائز اور مباح ہے۔

اسماعیل دہلوی متوفی ۱۸۳۱ء مسلکاً غیر مقلد تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں شیخ نجدی کے افکار کو پھیلایا، چنانچہ مرزا حیرت دہلوی نے لکھا ہے:

جس نے کسی کام میں فیل ہونے پر افسوس نہیں کیا اور ہمیشہ اپنا کامل بھروسہ خداوند حقیقی پر رکھا، وہ پیارا شہید تھا جس نے ہندوستان میں بن عبدالوہاب کی طرح شریعت محمدی کا ٹھنڈا خوشگوار شربت ہندوستانی مسلمانوں کو پلایا۔ (حیات طیبہ ص ۲۸۵)

چنانچہ ہندوستان کے تمام غیر مقلدین نے مسلک وہابیہ کو اپنا لیا اور اب یہ لوگ اپنے آپ کو خود وہابیہ سے تعبیر کرتے ہیں، چنانچہ ہندوستان کے مشہور غیر مقلد عالم نواب صدیق

حسن بھوپالی نے اپنے مسلک کی وضاحت میں ایک کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام انہوں نے "ترجمان وہابیہ" رکھا۔

دیوبندیہ

جناب قاسم نانوتوی دیوبندی نے ۱۲۸۳ھ میں مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی، نانوتوی صاحب، رشید احمد گنگوہی کے شاگرد تھے اور اسماعیل دہلوی کے افکار سے متاثر تھے۔ اس لئے ان کا وہابی عقائد سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ ان کی چند خصوصیات یہ ہیں:

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت اور محبت کے سبب آپ کی عظمت کے اظہار کے لئے جس قدر مستحب کام کئے جائیں یہ ان سب کو بدعت سیئہ قرار دیتے ہیں۔

(۲) سواد اعظم اہل سنت و جماعت کی اقتداء میں نماز کو ناجائز سمجھتے ہیں۔

(۳) فروع میں بالعموم مسلک حنفی کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن بعض جزئیات میں غیر مقلدین کے ہم نوا ہیں۔ مثلاً غائب کی نماز جنازہ پڑھاتے ہیں۔ اقامت کے وقت حی علی الصلوٰۃ تک بیٹھنے کا انکار کرتے ہیں، اسی طرح اذان کے بعد تثویب کے بھی قائل نہیں ہیں۔

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی ہیں، ان کی کتابوں کے پڑھنے سے یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور مودودی صاحب کے سوا کوئی شخص خامیوں سے پاک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ پر تو خیر مودودی صاحب نے کوئی تنقید نہیں کی، ورنہ ملت اسلامیہ کے عام افراد سے لے کر انبیاء علیہم السلام تک ہر شخص ان کی تنقید کے نشانے کی زد پر ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں انہوں نے خامیاں تلاش کی ہیں اور ان پر خدا خوفی سے بے نیاز ہو کر تنقید کی ہے۔ البتہ ایک مودودی صاحب کی ذات ستودہ صفات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ ان کو اپنی ستر سال سے زائد زندگی میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے جو بات ایک بار لکھ دی ہے کبھی اس کو غلط تسلیم نہیں کیا، دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جو لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں ان کے سامنے انبیاء علیہم السلام کی خامیاں بیان کیجئے، ان کے ابرو پر شکن نہیں

آئے گی، صحابہ کی تنقیص کیجئے، ان کو پرواہ نہیں ہوگی۔ مجددین اور اولیاء کرام کی توہین کیجئے، وہ سن لیں گے، لیکن مودودی صاحب کی کسی کتاب کے ایک فقرہ یا ایک لفظ کو بھی غلط کہا تو وہ آگ بگولا ہو جائیں گے اور آپ سے مناظرہ اور مجادلہ کے لئے فوراً تیار ہو جائیں گے۔

ذیل میں ہم انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اور خود مودودی صاحب کے بارے میں ان کی بعض عبارتیں پیش کر رہے ہیں:

(۱) بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر بھی نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی اپنی بشری کمزرویوں سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ حضرت نوح کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس نظارہ سے کلیجہ منہ کو آ رہا ہے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا، اس کو محض اس لئے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے، محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پرواہ ہو کر اس طرز فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضیٰ ہے۔

(تفہیم القرآن سورۂ ہود)

(۲) نبی ہونے سے پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بھی ایک بہت بڑا گناہ ہو گیا تھا۔

(رسائل مسائل ج ا ص ۳، طبع دوم)

(۳) اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں تک کو اس نفس شریر کی رہزنی کے خطرات پیش آئے ہیں۔ چنانچہ حضرت داؤد جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی ہے کہ "لا تتبع الھوی"۔ (تفہیمات)

(۴) یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندی درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤد کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل ان سے صادر ہوا تھا اس کے اندر خواہش کا کچھ دخل تھا، اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا۔ (تفہیم القرآن)

(۵) تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفۂ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے اتنی بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت یونس سے فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہوگئی تھیں اور غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا۔

(تفہیم القرآن سورۂ یونس)

(۶) حضور کو اپنے زمانے میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ ہی کے عہد میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہوگا، لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضور کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا۔ (رسائل مسائل حصہ اول)

(۷) جب یکایک غار حرا کی اس تنہائی میں فرشتہ آیا تو آپ کے اوپر اس پہلے عظیم اور غیر معمولی تجربہ سے وہی گھبراہٹ طاری ہوئی جو لامحالہ ایسے حالات میں ایک بشر پر طاری ہونی چاہئے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ کیسا ہی عظیم الشان بشر ہو۔ یہ گھبراہٹ بسیط نہیں بلکہ مرکب نوعیت کی تھی۔ طرح طرح کے سوالات حضور کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے، جنہوں نے طبع مبارک کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا، کیا واقعی میں نبی ہی بنایا گیا ہوں؟ کہیں مجھے سخت آزمائش میں تو نہیں ڈال دیا گیا۔ الخ

(سیرت سرور عالم ج ۲ ص ۱۳۶)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ علق کی ابتدائی آیات جبرائیل نے نازل کر دیں اور مودودی صاحب کے نزدیک حضور کو اب بھی اپنے نبی ہونے کا یقین نہیں ہوا۔ یہ ایسی عبارت ہے جس سے اسلام کی ساری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تیئس سال تک لگاتار یہی جبرائیل اسی قرآن کو لے کر آتا رہا، جب یہ ابتداءً یقین کا موجب نہ تھا تو بعد میں حضور نے کس سبب سے اپنی نبوت کا یقین کر لیا اور جب خود حضور کو اپنی نبوت کا یقین نہ تھا تو کسی اور کو کیسے آپ کی نبوت کا یقین ہو گیا۔ (سعیدی)

(۸) اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہئے اور اس انتظار میں مراقبہ کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آتا ہے اور میرے پاس پیغام لاتا ہے تو غار

حرا والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے، لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دیکھا تھا اس پر ششدر رہ جاتے ہیں، ذرا دل ٹھہرتا ہے تو بیوی کو چپکے سے بتاتے ہیں کہ آج غار حرا کی تنہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی۔ یہ کیفیت نبوت کے کسی امیدوار سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے، اگر ان کے تجربہ سے پہلے یہ بات آئی ہوتی، میاں نبوت کے امیدوار ہیں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہ نے دیا، وہ کہیں کہ میاں گھبراتے کیوں ہو؟ جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی۔ چلو اب پیری کی دکان چمکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں۔

(سیرت سرور عالم ج ۲ ص ۱۴۷)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے کا پہلے سے علم تھا یا نہیں یہ تو الگ بحث ہے، لیکن مودودی صاحب کی اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نبوت بہر حال پیری کی دکان چمکانے اور نذرانے سنبھالنے سے زیادہ مقام نہیں رکھتی۔ (سعیدی)

(۹) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہر حال غلط ہے، خواہ وہ کسی نے کیا ہو، اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین ہی کا مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔ (خلافت و ملوکیت ص ۱۱۶)

(۱۰) حضرت علی کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس کے بعد بتدریج وہ لوگ ان کے ہاں تقرب حاصل کرتے چلے گئے جو حضرت عثمان کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر انہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے۔ حتی کہ انہوں نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابوبکر کو گورنری کے عہدے

تک دے دیئے۔

قتل عثمان میں ان دونوں صاحبوں کا جو حصہ تھا وہ سب کو معلوم ہے۔ حضرت علی کے پورے زمانہ خلافت میں ہم کو صرف یہی ایک کام ایسا نظر آتا ہے جس کو غلط کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ (خلافت وملوکیت ص ۱۴۶))

حضور ﷺ اور دیگر انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام کے بارے میں قارئین کرام نے ملاحظہ فرمالیا کہ مودودی صاحب کو ان تمام نفوس قدسیہ میں خامیاں اور غلطیاں نظر آتی ہیں۔ اب یہ بھی دیکھ لیجئے کہ خود اپنی ذات کے بارے میں ان کا کیسا نظریہ ہے۔

خدا کے فضل سے میں نے کوئی کام یا کوئی بات جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں کیا اور نہیں کہا۔ ایک ایک لفظ جو میں نے اپنی تقریر میں کہا ہے تول تول کر کہا ہے اور یہ سمجھتے ہوئے کہا ہے کہ حساب مجھے خدا کو دینا ہے نہ بندوں کو۔ چنانچہ میں اپنی جگہ بالکل مطمئن ہوں کہ میں نے کوئی ایک لفظ بھی خلاف حق نہیں کہا۔

(رسائل ومسائل حصہ اول ص ۳۰۶ طبع دوم)

(۱۱) جماعت اسلامی کل پاکستان چار روزہ کانفرنس (۲۵ تا ۱۲۸ کتوبر ۱۹۶۳ء)

مودودی صاحب نے اپنی جماعت کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

میں اپنے سب مخلص بھائیوں کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اللہ کے فضل سے مجھے کسی مدافعت کی حاجت نہیں ہے۔ میں کہیں خلاء میں سے یکا یک نہیں آ گیا ہوں۔ اس سرزمین میں سالہا سال سے کام کر رہا ہوں، میرے کام سے لاکھوں آدمی براہ راست واقف ہیں۔ میری تحریریں صرف اسی ملک میں نہیں دنیا کے اچھے خاصے حصے میں پھیلی ہوئی ہیں اور میرے رب کی مجھ پر یہ عنایت ہے کہ اس نے میرے دامن کو داغوں سے محفوظ رکھا ہے۔ (روزنامہ مشرق لاہور، ۱۲۶ کتوبر ۱۹۶۳ء)

یہ ہے جماعت اسلامی کی تحریک کا خلاصہ کہ صرف اللہ تعالیٰ اور مودودی صاحب ہی خامیوں اور غلطیوں سے محفوظ ہیں۔

ہم نے سابقہ صفحات میں جن مشہور فرقوں کا ذکر کیا ہے، خوارج سے لے کر جماعت

اسلامی تک، یہ سب سواد اعظم اہل سنت و جماعت سے کٹ کٹ کر مختلف گروہوں کی شکل اختیار کرتے رہے۔ بعض فرقے ان میں سے فنا ہو گئے اور بعض کسی نہ کسی شکل میں اب تک موجود ہیں۔

سواد اعظم اہل سنت و جماعت سے علیحدہ ہونے والے فرقے ہر دور میں اہل سنت و جماعت کو اپنے طعن و تشنیع کا ہدف بناتے رہے، خوارج نے اہل سنت و جماعت کو کافر کہا۔ حضرت علی کی توہین کی، روافض نے اہل سنت و جماعت کے بزرگ رہنماؤں یعنی صحابہ کرام پر تبرا کیا۔ معتزلہ نے انہیں ایمان سے خارج کیا، وہابیہ نے ان کو مشرک گردانا۔ دیوبندیوں نے ان کو گمراہ اور بدعتی قرار دیا، لیکن اہل سنت و جماعت کا قافلہ ان تمام دشنام طرازیوں سے صرف نظر کر کے اپنا سفر طے کرتا رہا حتیٰ کہ اہل سنت و جماعت نے عمومی طور پر مسلمانوں کے کسی فرقہ کی تکفیر نہیں کی۔

اہل سنت و جماعت نے سواد اعظم ہونے کے باوجود ہمیشہ وسعت ظرف سے کام لیا، دیگر اقلیتی فرقے ہر دور میں جب بھی کسی نہ کسی مسند اقتدار پر پہنچے انہوں نے اہل سنت و جماعت کے مفاد کو نقصان پہنچایا، پاکستان کی ترپن سالہ تاریخ میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ لیکن کیا اب بھی یونہی ہوتا رہے گا۔ اقلیت اکثریت پر حکومت کرتی رہے گی اور چند فرقے سواد اعظم پر مسلط ہوتے رہیں گے؟ صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے، برداشت کی بھی ایک مقدار ہوتی ہے۔ آخر کب تک اہل سنت و جماعت کا استحصال ہوتا رہے گا؟

اب وقت آ گیا ہے کہ اہل سنت و جماعت کے ذمہ دار افراد تساہل اور چشم پوشی کے روایتی طریقہ کو چھوڑ کر میدان عمل میں آئیں، اس زمانہ میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے جنگ کرنا پڑتی ہے اور یہ جنگ اب ناگزیر ہو گئی ہے۔

اس ملک کی اکثریت اہل سنت و جماعت پر مشتمل ہے اور عدل و انصاف کا بھی تقاضہ ہے، جن لوگوں کی اکثریت ہے حکومت اور قانون سازی کا منصب بھی انہیں کو حاصل ہونا چاہئے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ:

قوانین ملکی تدوین کے سلسلے میں حق ترجیح اسی مسلک کو حاصل ہو گا جس کے حق میں

اکثریت ہو۔ اس لئے کہ یہی ایک قابل عمل صورت ہے۔ (رسائل مسائل ج ۲ ص ۴۲۰)

اہل سنت و جماعت کے عنوان کی شرعی اور ملکی اور ملی حیثیت جاننے کے بعد اور اپنا مقام پہچاننے کے بعد اب ضروری ہو جاتا ہے کہ ملک کے تمام سنی حضرات اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کے لئے اپنی جدو جہد کو تیز سے تیز کر دیں۔



مسئلہ تقدیر

تمام کائنات میں صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کا تصرف ہے، ہر چیز کا وہی خالق ہے۔ وہی تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ زمین و آسمان اور بحر و بر کی کوئی حقیقت اس کے منشاء اور ارادہ کے بغیر حرکت میں نہیں آ سکتی۔ اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں اور انسان کے کسی فعل اور عمل کا ظہور نہیں ہوتا مگر وہ اللہ تعالیٰ کی خلقت سے ظہور میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کا بھی خالق ہے اور اس کے افعال و اعمال کا بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (الانعام: ١٠٢)

وہ اللہ ہی تمہارا رب ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور وہی چیز کو پیدا کرنے والا ہے۔

نیز فرمایا:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ (الصفت)

اللہ تعالیٰ نے ہی تم کو پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال اور افعال کو بھی۔

اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کے پیدا کرنے سے پہلے اس کا علم تھا۔ اسی علم کو تقدیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس طرح ایک انجینئر ایک ڈیم بنانے سے پہلے اس کی تمام جزئیات پر غور کرتا ہے۔ اس کے میٹریل (Material) کی استعداد اور صلاحیت کا جائزہ لیتا ہے اور ڈیم بنانے سے پہلے اس کا تفصیلی نقشہ تیار کرتا ہے۔ پھر اس کی تیاری سے قبل اس میٹریل (Material) کی صلاحیت اور استعداد اور اس کی کارکردگی کی عمر کا اندازہ قائم کر کے پیش گوئی کر دیتا ہے کہ مثلاً یہ ڈیم سو سال تک کارآمد رہ سکتا ہے۔ یا جیسے مختلف مشینیں بنانے والے گارنٹی دیتے ہیں کہ یہ مشین اتنے عرصہ تک بغیر کسی نقص کے کام کرتی رہے گی۔ لیکن انجینئر اور دوسرے فنکار حضرات چونکہ ناقص علم رکھتے ہیں اس لئے ان کا اندازہ غلط بھی ہو

سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ کا علم کامل اور صحیح ہے، اس لیے اس کے اندازہ میں کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اس نے اس کائنات کو پیدا کیا اور اسے اس کائنات کی تمام حقیقتوں کی خلقت سے پہلے اندازہ اور علم تھا کہ بعد میں پیدا ہونے والی یہ تمام حقیقتیں کس نہج پر کام کریں گی، کتنا عرصہ کام کریں گی اور ان کے کیے ہوئے کاموں میں کتنے کام قابل ستائش ہوں گے اور کتنے لائق مذمت۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ (القمر) "ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے (تقدیر یعنی علم سابق) کے مطابق پیدا کیا ہے"۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا ﴿۳﴾ (الطلاق) "اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ (تقدیر) مقرر کیا ہے"۔

مسئلہ تقدیر پر شبہ کا ازالہ

عام طور پر لوگوں کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ جب سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی مقدر کر دیا ہے اور لوح محفوظ پر لکھ دیا ہے اور اس کا لکھا ہوا ٹل نہیں سکتا تو ہماری کوشش اور سعی کا کوئی فائدہ نہ رہا، ہم خواہ نیک عمل کریں یا بد، ہونا بہر حال وہی ہے جو پہلے مقدر ہو چکا ہے۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ امر واقع یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے پہلے جانا یا جو پہلے لکھ دیا وہ ہم نے کرنا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ ہم نے اپنے اختیار اور ارادہ سے کرنا تھا اللہ تعالیٰ کو ازل میں پہلے سے اس کا علم تھا۔ کیونکہ ہمیشہ علم، معلوم اور واقع کے مطابق ہوتا ہے۔ معلوم اور واقع علم کے مطابق نہیں ہوتا۔ جیسے ایک انجینئر کہتا ہے کہ یہ ڈیم ۵۰ سال تک کارآمد رہے گا، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ چونکہ انجینئر صاحب نے ۵۰ سال کی پیش گوئی کر دی ہے اس لئے اب خواہی نخواہی اس ڈیم کو ۵۰ سال تک کام کرنا ہی پڑے گا، بلکہ امر واقع یہ ہے کہ اس ڈیم کے میٹریل، اس کی ساخت اور صلاحیت کے اعتبار سے انجینئر نے پہلے سے یہ جان لیا تھا کہ یہ ڈیم کب تک کارآمد رہ سکتا ہے، بلا تشبیہ و تمثیل اسی طرح اللہ نے انسان کی عقل، اس کی کارکردگی، اس کے ذہنی رجحان اور نیکی یا بدی کے بارے میں اس

کے اختیار اور ارادہ کو پہلے جان لیا، یہی اس کا علم ازلی ہے۔ اسی کو تقدیر کہتے ہیں اور یہی مکتوب لوح محفوظ ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں اس کی وضاحت کردی ہے، فرماتا ہے:

وَ كُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ (القمر) ”ہر وہ کام جو انسان کرتے ہیں وہ لوح میں لکھا ہوا ہے“۔

یعنی ہم اپنے اختیار اور ارادہ سے جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا اور اس نے اس کو لکھا ہوا ہے کیونکہ وہ علام الغیوب ہے، یہ بات نہیں ہے کہ جو کچھ اس کو معلوم تھا اور اس نے لکھا ہوا تھا وہ ہم نے کرنا ہے، کیونکہ علم، معلوم اور واقع کے مطابق ہوتا ہے۔ معلوم اور واقع علم کے مطابق نہیں ہوتا۔

خلق افعال کی توضیح

مسئلہ خلق افعال پر بھی بعض لوگوں کو شبہ لاحق ہوتا ہے کہ جب سب کچھ اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، حتیٰ کہ انسان کے افعال اور اعمال بھی وہی خالق ہے تو پھر انسان کے لئے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا کیا اختیار رہ جاتا ہے اور جب اس کا اختیار نہیں تو جس قسم کے کام بھی وہ کرتا ہے، وہ ان کے کرنے پر مجبور ہے اور جب مجبور ہے تو اس سے گناہوں پر مواخذہ کیسا؟ اس کے جواب میں معروض ہے کہ انسان مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ مجبور کن چیزوں میں ہے اور مختار کس بات میں ہے، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے اس بات پر غور کریں کہ یہاں دو قسم کے امور ہیں۔ امور تکوینیہ اور امور تشریعیہ۔

امور تکوینیہ

امور تکوینیہ کی تعریف میں وہ چیزیں آتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لفظ ”کن“ سے وجود میں آتی ہیں اور انسان کی مشیت اور ارادہ کا اس میں ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہوتا۔ جیسے پیدائش اور موت، مصیبت اور راحت، صحت اور بیماری، غربت اور امارت، بارشوں کا ہونا، آندھیوں کا چلنا، دریاؤں میں سیلاب اور سمندروں میں طوفان کا اٹھنا، سورج کا طلوع اور غروب، یہ سب امور تکوینیہ ہیں جن میں انسان کو رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی اختیار نہیں

ہے اور ان امور میں وہ مجبور محض ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مختلف مواقع پر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے، مثلاً فرماتا ہے:

(۱) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا (الانعام:۲)

''وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر تمہاری زندگی کے لئے ایک وقت مقرر کیا ہے''۔

(۲) وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝ (الفاطر)

''اور کسی عورت کو حمل یا وضع حمل نہیں ہوتا لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی شخص کو درازیٔ عمر ملتی ہے یا کوتاہی عمر لیکن وہ لوح میں محفوظ ہے، بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے''۔

(۳) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران:۱۴۵)

''کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم اور اس کی اجازت کے بغیر مر سکے، ہر شخص کی زندگی کی ایک میعاد مقرر ہے''۔

(۴) يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران:۱۵۴)

''منافقین کہتے تھے کہ ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، آپ کہئے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا، وہ از خود اپنے مقتل کی طرف نکل کر چلے آتے''۔

(۵) أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء:۷۸)

''تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پا لے گی، اگرچہ تم مضبوط اور مستحکم قلعوں میں کیوں نہ ہو؟''۔

(۶) مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ۝

''نہ کسی ملک میں کوئی آفت آتی ہے نہ اس کے باشندوں میں، مگر وہ آفت لوح محفوظ میں ان کی پیدائش سے پہلے مکتوب ہوتی

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۲۳ (الحدید)

ہے اور یہ بات اللہ تعالیٰ پر بے حد آسان ہے، یہ اس لئے بیان کیا ہے تا کہ جو نعمت تمہارے پاس سے چلی جائے اس سے غم نہ کرو اور جو مل جائے اس پر اترایا نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا''۔

(۷) اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الزمر: ۵۲)

''کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ جس شخص پر چاہے رزق کشادہ کر دیتا ہے اور جس پر چاہے تنگ کر دیتا ہے؟''۔

(۸) هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا (الانعام: ۹۹)

''وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے آسمان سے بارش نازل کی تو ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز نکالی، پھر ہم نے اس سے سبز کھیتی پیدا کی، جس سے ہم نیچے اوپر چڑھے ہوئے دانے نکالتے ہیں''۔

یہ وہ امور تکوینیہ ہیں جن کے وجود میں انسان کے ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہے اور ان میں وہ بالکل مجبور محض ہے۔

امور تشریعیہ

امور تشریعیہ وہ ہیں جن کی بجا آوری کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مکلف اور پابند کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خیر اور شر دونوں کو پیدا کیا ہے اور دنیا میں شر پر ابھارنے کے لئے شیطان کو پیدا کیا اور خیر پر برانگیختہ کرنے کے لئے انبیاء اور رسل کو مبعوث فرمایا اور انسان کے اندر بھی دو قوتیں رکھیں کہ ایک قوت وہ ہے جو اس کو نیکی پر ابھارتی ہے۔ جس کو لمہ رحمان یا عرف میں ضمیر سے تعبیر کرتے ہیں اور ایک وہ قوت ہے جو اس کو شر پر اکساتی ہے۔ جس کو

شیطان یا عرف میں ہمزاد کہتے ہیں۔ اس کے بعد اس کو عقل سلیم دی تا کہ وہ خیر اور شر کے دواعی کے درمیان اپنے لئے راستہ منتخب کر سکے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد) "ہم نے انسان کو خیر اور شر کے دونوں راستے دکھا دیئے"۔

پھر فرماتا ہے:

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (المزمل) "اب جو چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے"۔

ایک اور جگہ فرمایا:

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف:۲۹) "جو چاہے اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کرے"۔

نیز فرمایا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا (حم السجدۃ:۴۶) "جو نیک عمل کرے اس کا نفع اس کو ملے گا اور جو بدکاری کرے گا اس کا ضرر بھی اسی کو پہنچے گا"۔

ان تمام آیات کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایمان اور کفر، نیکی اور بدی دونوں راستے دکھا دیئے اور ان کے انجام سے بھی واقف کرا دیا۔ پھر اس کو عقل سلیم دی کہ وہ ایمان اور کفر، نیکی اور بدی میں سے کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، پھر اس کی عقل جو بھی فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ اس کے مطابق ایمان اور کفر یا نیکی اور بدی کے افعال کو پیدا کر دیتا ہے اور اگر انسانی عقل کے لئے یہ اختیار نہ مانا جائے تو نہ صرف یہ خلاف عقل ہے بلکہ صریح قرآن کے بھی مخالف ہے۔ کیونکہ اگر انسان کی عقل کو اپنے لئے بھلائی اور برائی کے خلاف کی قدرت نہ ہو تو انبیاء اور رسل کو بھیجنا، آسمانی کتب اور صحائف کو نازل کرنا اور انسانی اعمال پر جزاء اور سزا کا مرتب کرنا سب ظاہراً عبث اور فضول معلوم ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے، نیز ایک انسان کو قطعی طور پر کسی کام کے کرنے کے لئے مجبور اور بے

دست و پا کرنے کے بعد اس سے اس فعل پر مواخذہ کرنا بظاہر وہ ظلم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے بار بار اپنی برأت بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے: وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ہرگز ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ نیز صریح قرآن کریم میں وارد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ:۲۸۶)

''اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔ جو شخص نیکی کرے گا تو اس کا نفع اس کے لئے ہے اور اگر برائی کرے گا تو اس کا ضرر بھی اسی کو پہنچے گا''۔

جبر کی نفی

اس آیت میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ انسان مجبور محض نہیں ہے اور اس کو نیکی یا بدی کے اختیار کا موقع اور اختیار دیا گیا ہے، ورنہ اگر وہ پتھر کی طرح بے اختیار اور مجبور ہوتو اس کو نیکی کرنے اور برائی سے رکنے کا حکم دینا اس کی طاقت اور وسعت سے بڑھ کر اس کو مکلف کرنا ہوتا اور قرآن واشگاف الفاظ میں فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کو بھی اس کی طاقت سے زیادہ حکم کی تعمیل کا حکم نہیں دیتا۔ اس لئے صاف اور سیدھی بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی عقل کو نیکی اور بدی کے انتخاب کا موقع و اختیار دیا ہے، پھر جو بھی اس کی عقل فیصلہ کرے اللہ تعالیٰ اس کے مطابق اس میں عمل اور افعال پیدا کر دیتا ہے۔

اشتباہ جبر کا ازالہ

اور اگر جبر کا شبہ اب بھی زائل نہ ہو تو میں ایک اور واضح مثال پیش کرتا ہوں، مثلاً ایک بچہ کی خواہش ہے کہ آج باغ میں جا کر ساتھیوں کے ساتھ کھیلے، درختوں پر چڑھے اور تازہ پھلوں اور مہکتے ہوئے پھولوں کو توڑ کر کیف و سرور حاصل کرے۔ لیکن اس کے ماں باپ اس سے کہتے ہیں: اسکول جاؤ، وہ نہیں جاتا تو اس کی خواہش کے خلاف اس کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسکول لے جاتے ہیں اور بچے کا یہ حال ہے کہ جب گرفت ڈھیلی ہو وہ فوراً باغ کی طرف دوڑتا ہے اور ماں باپ پھر اس کو پکڑ کر زبردستی اسکول لے جاتے ہیں، یہ کھلا ہوا جبر ہے۔ اگر ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے کہ ہمارا دل تو چاہتا مسجد میں جا کر نماز پڑھیں اور

کوئی ان دیکھی قوت زبردستی ہماری خواہش کے خلاف ہمیں شراب خانہ لے جا کر شراب پینے پر مجبور کر دیتی تو یہ جبر ہوتا، لیکن جب کہ فی الواقع ایسا نہیں ہوتا، جب ہماری خواہش نماز کی ہوتی ہے تو ہم نماز پڑھتے ہیں اور جب ہماری خواہش نماز کے وقت سونے کی ہوتی ہے تو ہم سو جاتے ہیں اور جب ہر عمل ہماری خواہش پر مرتب ہوتا ہے تو جبر کہاں رہا؟

اور جب انسان مجبور نہیں ہے اور اس کا ہر فعل اور عمل اس کے اختیار اور انتخاب پر مرتب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا اس سے باز پرس کرنا اور مواخذہ کرنا اور جزاء اور سزا کا مرتب کرنا، ان میں سے کوئی چیز بھی عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَ مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝ (الاعراف)

''روز حساب اعمال کا وزن یقینی ہے۔ پس جن کی نیکیوں کا وزن زیادہ ہوگا وہ کامیاب ہوں گے اور جن کی نیکیوں کا پلہ ہلکا ہوگا وہ خسارہ اٹھائیں گے۔ کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظلم کرتے تھے''۔

(۲) فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (الزلزال)

''جس شخص نے ایک ذرہ برابر بھی نیکی کی تو اس کی نیکی کا صلہ ملے گا اور جس نے ایک شمہ برابر بھی برائی کی تو اس کی سزا بھگتے گا''۔

(۳) وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ۝ (النجم)

''اور انسان کو صرف اس کی اپنی کوشش کا پھل ملے گا اور عنقریب اس کی کوشش کو دیکھ لیا جائے گا''۔

(۴) اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ ۚ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (الجاثیہ)

''وہ لوگ جو برے کاموں کو دلیری سے کرتے ہیں کیا یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم ان کو نیکوکاروں کے برابر درجہ دیں گے خواہ زندگی ہو یا موت؟ یہ ان کا قطعاً غلط فیصلہ ہے''۔

ان آیات پر نظر ڈالیے اور سوچئے! اگر انسان کو نیکی اور بدی پر اختیار نہ ہو تو ان آیات کا کیا مفہوم باقی رہ جاتا ہے۔

جبر کا حیلہ آخرت میں کارگر نہیں ہوگا

اپنی برائیوں کے جواز اور ان پر مواخذہ سے بچنے کے لئے تقدیر پر تکیہ کرنا یا جبر کی آڑ لینا وہ عذر ہے جس کو روز محشر کفار بھی اپنی برأت اور نجات کے لئے پیش کریں گے، لیکن ان کا یہ عذر مسموع اور مقبول نہیں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ حشر کے دن کفار کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے فرشتوں کی عبادت کیوں کی تو وہ کہیں گے:

وَ قَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝ (الزخرف)

"کہنے لگے: اگر اللہ چاہتا تو ہم ان کی عبادت نہ کرتے، ان کو اس حقیقت کا علم نہیں، یونہی اٹکل پچو سے باتیں کرتے ہیں"۔

اور جب جبر کا یہ حیلہ ان کے کام نہ آسکے گا تو بعض کفار اور بدکار اپنی برائیوں کو شیطان کے سر تھوپنے کی کوشش کریں گے کہ ہم اس کے بہکانے میں آگئے اور ان کی یہ کوشش بجائے خود اس بات کا اعتراف ہے کہ وہ مجبور نہ تھے، بااختیار تھے، مگر شیطان کے بہکانے میں آگئے۔ لیکن شیطان بھی اس وقت ان کو دھتکار دے گا اور کہے گا:

وَ مَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَ لُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ (ابراہیم: ۲۲)

"میرا تم پر کوئی زور تو نہیں تھا۔ میں نے تم کو برائی کی دعوت دی، تم نے قبول کر لی۔ پس مجھ کو ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو"۔

یہ آیت بھی واضح کر رہی ہے کہ اس حقیقت سے شیطان کو بھی انکار نہ تھا کہ انسان نہ خود مجبور تھا نہ اس کے قبضہ میں تھا۔ اس نے صرف برائی کا راستہ دکھایا اور بدکاروں نے اس راستہ کا اپنے لئے انتخاب کر لیا۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہوگئی

ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے اختیار سے اپنے لئے نیکی یا بدی کسی ایک کا راستہ انتخاب کرتا ہے اور اس کے انتخاب کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کے افعال اور اعمال پیدا کرتا ہے۔ اس لئے وہ اپنے کفر یا فسق پر نہ تقدیر کا حیلہ تراش سکتا ہے اور نہ جبر کو آڑ بنا سکتا ہے۔



اعجاز وکرامت

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں اشیاء کے لئے جو خواص اور تاثیرات معین فرمائی ہیں اور حصول اشیاء کے لئے جن اسباب کو مقرر فرمایا ہے ان کے مطابق خواص اور مسببات کا ترتب ہو تو اسے امور ماتحت الاسباب الظاہرہ اور افعال عادیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اگر اس کے خلاف واقع ہو مثلاً اشیاء سے ان کے معروف اثر کے خلاف کوئی اثر ظاہر ہو۔ یا شئی اپنے عام سبب کے بغیر کسی اور امر سے حاصل ہو جائے تو اسے امور مافوق الاسباب الظاہرہ یا خرق عادت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض طبیعی حضرات خرق عادت کا انکار کرتے ہیں اور خرق عادت کے صدور کو فطرت کے خلاف قرار دیتے ہیں اور آیت کریمہ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ (روم: ۳۰) "اللہ تعالیٰ نے جس فطرت پر انسان کو پیدا کیا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہوگی" سے اس دعویٰ پر استدلال کشید کرتے ہیں، اس کے جواب میں معروض ہے کہ اس آیت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دین حق قبول کرنے کی صلاحیت کے ساتھ پیدا کیا ہے، انسان اپنے اختیار سے یہود و مجوس کا لباس پہن لے پھر بھی اس کے باطن میں صلاحیت اسلام کا جوہر باقی رہتا ہے اور یہ صلاحیت نہ کبھی مٹتی ہے نہ تبدیل ہوتی ہے۔ پس ظاہر ہو گیا کہ آیۂ کریمہ خرق عادت کے ظہور کے منافی نہیں ہے اور قرآن کریم میں خرق عادت کے منافی کوئی امر کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خود قرآن کریم میں متعدد امور خارقہ کا ذکر ہے مثلاً لاٹھی کا سانپ بن جانا، پتھر سے اونٹنی کا نکل آنا، مردوں کا زندہ ہونا، مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کا محض ہاتھ پھیرنے سے ٹھیک ہو جانا وغیرہ۔ اس کے علاوہ عقل کے پرستاروں سے گزارش ہے کہ انسان کی پیدائش کا عام عادی طریقہ مرد و زن کا اختلاط ہے اور جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا وہ یقیناً اس عام عادی طریقہ کے خلاف پیدا ہوا۔ اسی طرح جانوروں میں ہر نوع کے جانور کا پہلا جانور خرق عادت سے پیدا ہوا اور درختوں میں ہر نوع کا پہلا درخت بغیر بیج کے پیدا ہوا اور

پر خرق عادت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشیاء کے حصول کے لئے مخصوص اسباب کو مقرر فرمایا، لیکن اسباب علت تامہ نہیں ہیں۔ کبھی ان اسباب کے بغیر بھی اللہ تعالیٰ مسبب کو ظاہر فرما دیتا ہے۔ جیسے آدم، عیسیٰ اور حوا کی پیدائش اور کبھی یہ اسباب دھرے رہ جاتے ہیں اور مسبب کا ظہور نہیں ہوتا جیسے ابراہیم علیہ السلام کا آگ میں نہ جلنا اور خالد بن ولید کا زہر کھانے کے باوجود صحیح وسلامت رہ جانا۔

افعال خارقہ کی اقسام

متکلمین نے افعال خارقہ کی چھ قسمیں بیان فرمائی ہیں: ارہاص، معجزہ، کرامت، معونت، استدراج اور اہانت۔ دعویٰ نبوت سے پہلے نبی سے جو خرق عادت فعل ظاہر ہو (جیسے دعویٰ نبوت سے پہلے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بادل کا سایہ افگن ہونا) اسے ارہاص کہتے ہیں اور دعویٰ نبوت کے بعد نبی سے جس خرق عادت کا ظہور ہو اسے معجزہ کہتے ہیں اور اگر مسلمان صالح کامل سے خرق عادت کا ظہور ہو اور دعویٰ نبوت سے مقرون نہ ہو اسے کرامت کہتے ہیں اور اگر عام مسلمانوں میں سے کسی سے کوئی امر خارق ظاہر ہو اسے معونت کہتے ہیں اور کافر سے خرق عادت ظاہر ہو اسے استدراج کہتے ہیں اور کافر مدعی نبوت سے جو خرق عادت ظاہر ہو اور وہ امر خارق اس کے دعویٰ کے مخالف ہو تو اسے اہانت کہتے ہیں، جیسے مسیلمہ کذاب کے پاس ایک کانا شخص آیا اور کہا: تم نبی ہو تو خدا سے دعا کرو کہ میری آنکھ ٹھیک ہو جائے اور مجھے دونوں آنکھوں سے نظر آنے لگے۔ مسیلمہ نے دعا مانگی اور اس کی دوسری آنکھ سے بھی بینائی جاتی رہی۔ پس یہاں ایک امر خارق کا ظہور تو ہوا لیکن وہ مسیلمہ کے دعویٰ کا مخالف تھا، اسی طرح مرزا غلام احمد نے محمدی بیگم سے نکاح اور اس کے متوقع خاوند کے مرجانے کی پیشین گوئی کی تھی۔ محمدی بیگم کا نکاح ان کے دیکھتے دیکھتے دوسرے شخص سے ہو گیا اور وہ اس نکاح کی حسرت دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنی زندگی میں اس نے جس کے مرجانے کی پیشین گوئی کی تھی وہ اس کے مرجانے کے بعد دیر تک زندہ رہا۔

افعال خارقہ کی اقسام کی بحث میں یہ امر بتلانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نبوت کے

جھوٹے مدعی کے لئے ایسا امر خارق ظاہر نہیں فرماتا جو اس کے دعویٰ کے موافق ہو اور متکلمین کے نزدیک یہ امر عقلاً محال ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو ہدایت ضلالت سے ملتبس ہو جائے گی نہ صرف یہ کہ بعثت کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا بلکہ اثبات نبوت کا دروازہ بند ہو جائے گا، متکلمین نے الوہیت کے جھوٹے مدعی پر موافق امر خارق کا ظہور جائز رکھا ہے کیونکہ حواس اس کے دعویٰ کی تکذیب کرتے ہیں، اس کا اس عالم حادث میں پیدا ہونا اور پیدا ہو کر ضروریات زندگی کی طرف محتاج ہونا، یہ ایسا امر ہے جو اس کے دعویٰ الوہیت کا مکذب ہے پس اس کے دعویٰ کے موافق امر خارق کو اس پر ابتداءً ظاہر کر دینا چنداں مستبعد نہیں۔ بخلاف نبی کاذب کے۔ کیونکہ حدوث اور احتیاج الوہیت کے منافی ہے، نبوت کے نہیں۔ اس لئے جعلی خدا پر موافق امر خارق ظاہر ہو سکتا ہے، جعلی نبی پر نہیں۔

حقیقت سحر

سحر کے بارے میں علماء کے کلمات مختلف ہیں، بعض نے اسے امور خارقہ میں سے قرار دیا ہے اور وہ آیت کریمہ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ سے استدلال کرتے ہیں۔ کیونکہ کلمات سحر سے مرد و زن کے درمیان تفریق کر دینا خلاف عادت ہے، لیکن یہ استدلال مردود ہے کیونکہ تعلیم و تعلم امور عادیہ میں جاری ہوتا ہے اور اس میں تعلیم و تعلم کا جاری ہونا اس امر کا مظہر ہے کہ جو شخص بھی ان کلمات سحر کی تحصیل کرے گا، وہ اس کے اثرات کے حاصل کرنے پر قادر ہوگا اور بعض حضرات نے سحر کو امور عادیہ محضہ سے قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ اسرائیلی ساحروں کا رسی کو سانپ بنا دینا محض شعبدہ بازی تھا، انہوں نے لاٹھیوں اور رسیوں کے اندر پارہ رکھ دیا تھا جو دھوپ کے اثر سے متحرک ہو گیا اور دیکھنے والوں کو اس پر سے سانپ کا گمان ہوا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کا یہ عمل تخییل اور نظر بندی کے قبیل سے تھا، انہوں نے دیکھنے والوں کی نظروں پر عمل تخییل کیا اور اپنی قوت باطنہ سے ان پر اثر ڈالا، جس سے انہیں رسیاں سانپ کی شکل میں دوڑتی ہوئی دکھائی دینے لگیں، چنانچہ قرآن کریم کا فرمان سَحَرُوا أَعْيُنَ النَّاسِ اس کی تائید کرتا ہے اور اس استدلال میں بھی تامل ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیلی ساحروں کا یہ عمل نظر بندی یا شعبدہ

بازی کے قبیل سے تھا، لیکن اس سے حقیقت سحر کی نفی نہیں ہوئی۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اگر مان لیا جائے کہ سحر سے لاٹھی کو سانپ اور مٹی کو سونا بنایا جا سکتا ہے تو اس سے انقلاب حقائق لازم آئے گا اور یہ محال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر انقلاب حقائق کے استحالہ پر ابطال سحر کی بناء رکھتے ہو تو پھر معجزہ اور کرامت سے بھی ہاتھ دھو لیجئے اور حق یہ ہے کہ انقلاب حقائق ثابت ہے۔ جیسے کہ ابن حجر ہیتمی اور ابن عابدین شامی کی تحقیق ہے اور استحالہ اس امر پر مبنی ہے کہ شئے اپنی حقیقت سابقہ پر برقرار رہتے ہوئے دوسری حقیقت بن جائے اور یہ اجتماع ضدین کو مستلزم ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ بہر حال یہ ظاہر ہو گیا کہ نفی سحر پر عقلی یا نقلی دلائل قائم نہیں ہیں، "صحیح بخاری" و "مسلم" کی روایت میں ہے کہ لبید بن عاصم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کیا جس کا اثر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر ہوا اور آپ کئی کاموں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ آپ نے کئے ہیں، حالانکہ وہ کام آپ نے نہ کئے ہوتے۔

ایک شبہ کا ازالہ

بعض مبتدعہ نے حدیث مذکورہ کا انکار کیا اور کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سحر سے متاثر ہونا، منصب نبوت کے بھی منافی ہے اور ظاہر قرآن سے بھی متعارض ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کفار کا مقولہ نقل فرمایا: اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝ (اسراء) "تم صرف ایک سحر زدہ شخص کے تابع ہو"۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا: اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝ (اسراء) "دیکھئے تو یہ آپ کے لئے کیسی مثالیں گھڑتے ہیں؟ پس یہ گمراہ ہو چکے ہیں اور یہ آپ کی نبوت میں طعن کی کوئی راہ نہیں پاتے"۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ سحر سے نبی علیہ السلام کا متاثر ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر لگنے سے آپ کا دانت شہید ہونا، زہر آلود لقمہ سے آپ کا سر درد کی تکلیف میں مبتلا ہونا اور جس طرح ان احوال کا عارض ہونا آپ کی نبوت کے منافی نہیں، اسی طرح سحر سے متاثر ہونا بھی آپ کی نبوت میں سبب طعن نہیں اور ان احوال سے عارض کرنے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ آپ سے الوہیت کی نفی کر دی جائے اور ان احوال میں آپ کا عمل امت کے احوال کے لئے نمونہ بن جائے اور اس طرح دین کے احکام کی

آپ کی سیرت میں تکمیل ہو جائے۔ کفار عوارض بشریہ اور عام احوال میں آپ کے لیے سحر کے مدعی نہ تھے، بلکہ امور متعلقہ بالوحی میں وہ سحر کا دعویٰ کرتے تھے اور ان امور میں سحر کا اثر ثابت نہیں، بلکہ محال ہے۔ بعض زنادقہ کہتے ہیں کہ جس طرح سحر کے اثر سے آپ نے نہ کیے ہوئے کاموں کو کیا ہوا خیال کیا اسی طرح جائز ہے کہ کسی اثر کے تحت آپ نے خود کو نبی خیال کر لیا ہو اور آپ نبی نہ ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سحر کا اثر آپ کی عقل اور اعتقاد پر نہ تھا۔ بلکہ حواس اور خیال پر تھا اور نبوت کا تعلق عقل اور اعتقاد سے ہے، حواس اور خیال سے نہیں۔ نیز آپ کی نبوت محض آپ کے قول پر تو مبنی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس قسم کے احتمال سے اس کی بنیاد میں رخنہ پڑ جائے، بلکہ اس کی بنیاد بے شمار معجزات اور عقلی دلائل پر ہے۔ ازاں جملہ ایک قرآن کریم ہے، جس کے چیلنج کا آج تک کوئی جواب نہ دے سکا۔

سحر اور اعجاز و کرامت میں فرق

گزشتہ سطور سے یہ امر ظاہر ہو گیا کہ سحر نہ تو افعال خارقہ سے ہے نہ امور عادیہ محضہ سے، بلکہ حقیقت سحر ان دونوں کے درمیان ہے اور یہ ایک ایسا امر ہے جو خرق عادت کے مشابہ ہے اور اس کی تحصیل میں قولاً و عملاً اور اعتقاداً ارتکاب قبائح سے استعانت کی جاتی ہے۔ ہمارے اس بیان سے اعجاز و کرامت اور سحر کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا۔ اولاً اس طور پر کہ معجزہ اور کرامت عین خارق ہیں اور سحر مشابہ خارق۔ ثانیاً اس طور پر کہ معجزہ اور کرامت کا ظہور تقرب الی اللہ سے ہوتا ہے اور سحر کا ظہور تقرب الی شیطان سے، اگرچہ خالق سب کا اللہ عزوجل ہے۔

مقدوریت اعجاز

کرامت اور معجزات میں یہ بحث اہم حیثیت رکھتی ہے کہ یہ امور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء اور اولیاء کے اختیار میں کر دیئے جاتے ہیں یا کرامت اور معجزہ میں ان کے عاملین کا کچھ دخل نہیں ہوتا اور ان کی حیثیت مشیت الٰہی کے سامنے محض ایسی ہوتی ہے جیسے کاتب کے سامنے قلم کی ہوتی ہے۔ جس طرح کتابت میں قلم کا کوئی کسب اور اختیار نہیں ہوتا اور وہ کاتب کی مرضی کے سامنے مجبور محض ہوتا ہے۔ اسی طرح انبیاء اور اولیاء کا معجزات اور

کرامات کے صدور میں کوئی کسب اور اختیار نہیں ہوتا اور وہ اس باب میں مجبور ہیں، چنانچہ علماء دیوبند کا بھی مختار ہے۔ (دیکھئے فتاویٰ رشیدیہ)

محققین علماء اہل سنت کا اس باب میں مسلک یہ ہے کہ افعال خارقہ ہوں یا غیر خارقہ، تمام کا خالق اللہ عزوجل ہے: لقولہ تعالیٰ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ "تمہیں اور تمہارے اعمال کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے" اور کسب اور اختیار بندے کو دیا جاتا ہے، عام انسانوں کو عام افعال کا اختیار دیا جاتا ہے اور عباد خواص (انبیاء و اولیاء) کو خاص افعال (افعال خارقہ) کا اختیار دیا جاتا ہے۔ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں: اس میں راز یہ ہے کہ عباد خواص چونکہ اتباع شریعت بطور نقض عادت کرتے ہیں اس لئے انہیں تصرفات بھی بطور خرق عادت عطا کئے جاتے ہیں اور امور عادیہ ہوں یا غیر عادیہ، بعض احوال انسان پر اس کے کسب اور اختیار کے بغیر طاری کیے جاتے ہیں، مثلاً آنکھ کھولنا انسان کے اختیار میں ہے، بصارت کا طاری کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے، وہ آنکھ کھولنے کے بعد اگر چاہے کہ نہ دیکھے تو اس کے بس میں نہیں ہے۔ بس جس طرح امور عادیہ میں عام انسانوں کے اختیار میں بصارت کا حال نہیں ہے، اسی طرح امور غیر عادیہ میں انبیاء اور اولیاء پر وحی و الہام کی کیفیات کا عروض ان کے اختیار میں نہیں ہوتا، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کرامات از قبیل احوال کیفیات ہیں، ان میں نبی اور ولی کے کسب اور اختیار کا دخل نہیں ہوتا۔ ہماری اس تقریر سے کلمات علماء کے درمیان تطبیق بھی حاصل ہو گئی۔ پس جنہوں نے ان امور میں کسب اور اختیار کی نفی کی ہے وہ بالنظر الی الاحوال ہے اور جنہوں نے اثبات کیا ان کی نظر افعال پر ہے اور جنہوں نے دونوں کا قول کیا ہے ان کی نظر احوال و افعال دونوں پر ہے۔



عبادات

اسلام میں مقام انسانیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی مخلوق کی انواع میں سے مشرف ترین مخلوق قرار دیا ہے، زمین و آسمان کی تمام نعمتیں اس کے نفع کے لئے پیدا فرمائیں، ہوائیں اس کے لئے چلتی ہیں، بادل اُمڈ کر اس کے لئے آتے ہیں، سورج اور چاند اس کے لئے ضیا ئیں بکھیرتے ہیں، بحر و بر اس کے تابع کر دیئے اور کائنات کی ہر حقیقت کو اس کے لئے مسخر کر دیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ رب العزت نے انسان کو زمین میں اپنی نیابت اور خلافت کے لئے چن لیا: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (اسراء: ۷۰) "لاریب ہم نے بنی کو آدم کو مکرم کر دیا" کا تاج اس کے سر پر رکھا لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین) "بیشک ہم نے آدمی کو اچھی صورت پر بنایا ہے" کی اس کو صورت عطا کی "خلقته بیدی" "میں نے اس کو اپنے ہاتھوں سے بنایا" کا اس کو اعزاز بخشا۔ مزید یہ کہ انبیاء اور رسل کو نوع انسانی سے مبعوث فرمایا اور یہ افتخار بھی نوع انسان کو حاصل ہوا کہ انسانیت کا اعلیٰ ترین فرد اس مقام سے بھی آگے گزر گیا جس مقام پر جبرائیل کی بھی رسائی نہیں ہوتی اور حاملین عرش بھی جس جگہ سے آگے نہیں جا سکتے۔ انسان کامل زمان و مکان کی قیود توڑ کر اس سے ماوراء لامکان تک جا پہنچا۔ ؎

ہر یک بقدر خویش بجائے رسیدہ است
آنجا کہ جائے نیست تو آنجا رسیدۂ

تخلیق انسان کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں تمام انسانوں کی روحوں کو جمع کر کے ان سے اپنی ربوبیت کے اقرار کا عہد لیا۔

وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى "اور اے محبوب! یاد کرو جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی نسل

أَنْفُسِهِمْ ۚ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۛ شَهِدْنَا ۛ أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝ (الاعراف)

نکالی، انہیں خود ان کی ذوات پر گواہ کیا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب بولے: کیوں نہیں، ہم گواہ ہوئے (اور یہ گواہ اس لئے بنایا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہمیں اس کی خبر نہ تھی"۔

انسان کے لاشعور میں یہ وعدہ اور عہد و پیمان محفوظ تھا، یہی وجہ تھی کہ ہر دور میں انسان کو اپنے خالق کی تلاش رہی، کبھی چاند کے روپ میں اسے خدائی نظر آئی، کبھی سورج کو خدا سمجھا، کبھی عناصر و کواکب ایسے مظاہر قدرت کو خدا سمجھ کر پوجتا رہا۔ راہ حق سے بھٹکتا رہا لیکن یہ اس کا اپنا قصور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی معرفت کے لئے اس کے اپنے نفس اور اس کے خارجی اور ظاہری عالم میں نشانیاں رکھی تھیں۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، اس خارجی عالم میں اور خود ان کے اپنے نفسوں میں" اور ان نشانیوں سے صاحب نشان تک پہنچنے کے لئے اس کو عقل سلیم عطا کی۔

پھر جس انسان کو پیدا کیا، دین فطرت پر پیدا کیا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ" "ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے"۔ یعنی ہر انسان کے ذہن میں ابتداءً ایسی صلاحیتیں رکھ دی جاتی ہیں اور اس کو ایسی استعداد دے کر پیدا کیا جاتا ہے جس سے وہ احکام اسلامیہ کو قبول کر سکے اور اس کی عقل کو معرفت ذات حق کا امین بنا کر بھیجا جاتا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے حلقہ یاراں، گرد و پیش اور ماحول کے اثر سے اس فطرت کو زنگ آلود کر دے اور معرفت حق کی صلاحیتوں کو مکدر کر دے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا کرم بالائے کرم یہ ہے کہ اس نے انسان کو محض عقل اور اس کی ذہنی صلاحیتوں پر نہیں چھوڑا بلکہ عقل کو متنبہ کرنے کے لئے لگاتار انبیاء اور رسول کو بھیجتا رہا، جو اس کو اس عہد کی یاد دلاتے رہے جو اس کے لاشعور میں محفوظ تھا۔ معرفت خالق اور اس کی اطاعت کی تلاش کا جذبہ تو انسان نے اپنے لاشعور کی مدد سے پہلے پا لیا تھا، لیکن ابھی تک اس راستہ سے ناواقف تھا جو اس کو معرفت خالق کی منزل کی طرف لے جاتا۔ انبیاء اور رسل نے آکر

اس کو وہ راستہ بتایا اور ابلیس اور اس کی ذریات نے اس راستہ سے انسان کو بھٹکانے کے لئے جو اندھیروں کی دیواریں کھڑی کی تھیں، انہوں نے دلائل و براہین اور معجزات کی مشعلیں روشن کر کے کفر و شرک کے ان اندھیروں کو دور کیا اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے توہمات کے حجابات اٹھا کر اس کو آفتاب نیم روز سے زیادہ روشن کیا اور واشگاف الفاظ میں انسان کو اس کی پیدائش کا مقصد اور اس کی زندگی کے نصب العین سے روشناس کرایا اور جتلایا کہ: وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات) ''ہم نے کسی جن اور انسان کو نہیں پیدا کیا مگر اپنی عبادت کے لئے''۔

اس آیت میں انسان کی پیدائش کا مقصد واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد وحید، اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس پر ایمان لا کر اس کی عبادت کرنا اور اس کے بنائے ہوئے نظام کے تحت زندگی بسر کرنا ہے۔

دین و دنیا کا امتزاج

جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کا مقصد حیات محض اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ہے تو اس سے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ شبہ ابھرتا ہے کہ اسلام صرف نماز، روزہ اور تسبیح و سجدہ کا نام ہے، حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دینی اور دنیاوی معاشرت دونوں امور کے بارے میں احکامات اور ہدایات بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (الجمعہ:۱۰) ''جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو فوراً اسباب معیشت اور دنیاوی کاروبار کے لئے زمین میں پھیل جاؤ''۔

اسی طرح ایک جگہ فرماتا ہے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (آل عمران) ''نہ بزدل بنو اور نہ شکست پر رنج کرو تمہیں کو غلبہ حاصل ہوگا، اگر تم مومن کامل ہو''۔

اور دوسری طرف فرماتا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ الخ۔ اسلام کے دشمنوں کے خلاف غلبہ حاصل کرنے کے لئے جس قدر مادی قوت حاصل کر سکتے ہو کرو، ان

قوتوں سے دشمنانِ اسلام کو زیر کرو۔

ان دونوں آیتوں کے باہمی مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام دین اور دنیا اور روحانی اور مادی قوتوں کے درمیان توازن قائم رکھنا چاہتا ہے۔ نہ صرف اللہ پر توکل کر کے مادی اسباب سے صرف نظر کر لینا اسلام ہے اور نہ محض مادی اسباب پر تکیہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نصرت، حمایت اور اس کی طرف رجوع کرنے سے مستغنی ہونا اسلام ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے ایمان وعمل کی قوت کے ساتھ ساتھ مادی اسباب کو بھرپور انداز میں حاصل کر کے نتیجہ کو اللہ رب العزت پر چھوڑ دینا یہ حقیقت میں اسلام ہے۔

انسانیت کے لئے کامل مذہب صرف اسلام ہے

اسلام کو اللہ تعالیٰ نے دین کامل قرار دیا ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ:۳)

''اللہ تعالیٰ نے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اور دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کر لیا ہے''۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق اسلام میں ہدایات موجود ہیں۔ زراعت، تجارت، ملازمت اور عامیانہ کسب کے طریقوں سے لے کر سیاست اور امارت تک انسانی معیشت کے متعلق ہر شعبہ کے لئے کتاب وسنت میں واضح احکام موجود ہیں۔ اسی طرح انسان کی نجی، خاندانی اور تمدنی زندگی، ماں باپ اور اولاد کے حقوق، زن وشوہر کے فرائض، اعزہ واقارب کے استحقاق سے لے کر ہمسایہ اور محلہ داروں تک کے حقوق کے بارے میں انسان کی تمام ذمہ داریوں کے بارے میں کتاب وسنت میں اصول وقواعد اور تفصیلی احکام موجود ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان تمام اعمال کے لئے اسوہ اور نمونہ موجود ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا: ''بعثت لاتمم مکارم الاخلاق'' ''میں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ ادھورے اخلاق کو پورا کروں''۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تجرد کی زندگی گزاری، اس لئے عیسائیوں کے لئے ان کے نبی کی زندگی میں ازدواجیت کا نمونہ نہیں ملتا اور حضرت داؤد اور سلیمان نے حکومت اور بادشاہی کی زندگی گزاری ہے، اس لئے ان

کے پیروکاروں کو ان کی زندگی میں فقر اور مزدوری کا نمونہ نہیں ملتا۔ اس کے برخلاف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شادیاں کی ہیں اور تمدنی زندگی گزاری ہے، تیشہ اور کدال کو ہاتھ میں لے کر خندقیں کھودنے سے لے کر امیر سلطنت تک، عام گھریلو کاموں سے لے کر سیاست اور تجارت تک ہر قسم کے کام کیے ہیں، تا کہ اگر ایک سربراہ مملکت اس بات پر فخر کرتا ہے کہ وہ خلیفۂ رسول ہے تو زمین کھودنے والا ایک معمولی دہقان بھی چھاتی تان کر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں بھی طریقۂ مصطفیٰ کا محافظ اور سنت رسول اللہ کا امین ہوں۔

مقام انسانیت

انسان کے ایک طرف فرشتوں کا عالم ہے جو ہمہ وقت تسبیح و تہلیل، رکوع و سجود اور انواع و اقسام کی عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں اور دوسری طرف حیوانات اور بہائم کا عالم ہے جو کسی قانون اور ضابطہ کے بغیر شکم پر کرنے اور جنسی عمل کرنے میں مشغول رہتے ہیں بغیر اس تمیز کے کہ فلاں چیز کا کھانا اور اس سے جنسی لذت حاصل کرنا اس کا حق ہے یا نہیں، وہ پاک ہے یا ناپاک، حلال ہے یا حرام، جس طرح بن پڑے چھین جھپٹ کر کمزور مخلوق کا گلا دبا کر اپنا مقصد پورا کر لینا یہ حیوانی زندگی ہے اور عام حیوانات میں سوائے اپنی شکم پروری اور اپنی نسل بڑھانے کے اور کوئی مقصد نہیں پایا جاتا۔

اب اگر انسان بھی کسی ضابطہ اور اصول کے بغیر اپنا پیٹ بھرتا رہے اور جنسی عمل کرتا رہے یا اس کا مقصد صرف لذت، کام و دہن اور اپنی نسل کو بڑھانا ہو تو بتلایئے! ایسے انسان میں اور ایک عام حیوان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ یہ شخص اپنے خدوخال اور صورت کے اعتبار سے اگرچہ انسان کیوں نہ معلوم ہوتا ہو، لیکن وہ اپنے کردار اور عمل اور مقصد اور نصب العین کے اعتبار سے ایک جانور کے مقام سے آگے ہرگز نہیں ہے اور اگر کوئی انسان ہمہ وقت عبادت میں مشغول رہتا ہے اور ہر وقت تسبیح و تہلیل اور قیام لیل و نہار میں وقت گزارتا ہے تو وہ یقیناً فرشتوں کی صف میں اپنی جگہ بنا لیتا ہے، اللہ رب العزت نے اس کے سامنے دونوں پہلو رکھ دیئے ہیں، وہ چاہے تو فرشتوں کی پاکیزگی اور تقدس اختیار کرے اور چاہے تو حیوانات کے طرز زندگی کو اپنا لے۔ لیکن سچ پوچھئے تو انسان کا مقام حیوانات اور ملائکہ دونوں

سے بلند تر ہے، اس مفہوم کی بہترین ترجمانی علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یعنی انسان اگر اعمال اور اخلاق کی اعلیٰ روایات کو اپنا کر تسبیح و تہلیل کا پیکر بن کر فرشتوں کی صف میں ابھر آئے، بلکہ فرشتوں کے سردار جبریل امین کا بھی مظہر بن جائے، تب بھی وہ مقام انسانیت تک نہیں پہنچا، کیونکہ جبریل تو نوع انسانی کے اعلیٰ افراد یعنی انبیاء علیہم السلام کی خدمت کرتا ہے۔ اس لئے انسان کا مقام جبرائیل کا مظہر بننا نہیں بلکہ رب جبرائیل کی صفات کا مظہر ہونا ہے۔

معراج انسانیت

حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تخلقوا باخلاق اللہ" اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے متخلق اور اس کے اوصاف سے متصف ہو جاؤ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر انسان محض بھوک کے تقاضا سے کھانا کھائے اور طبعی محبت کے تقاضا سے اپنے بچوں کو پیار کرے تو وہ ایک بکری کے مقام سے آگے نہیں بڑھتا۔ کیونکہ ایک بکری بھی بھوک لگنے سے چارہ کھا لیتی ہے اور طبعی اقتضاء سے وہ بھی اپنے بچوں سے پیار کر لیتی ہے، مقام انسانیت یہ ہے کہ وہ کھانا کھائے تو صرف اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے "کلوا و اشربوا" فرما کر اسے کھانے پینے کا حکم دیا ہے۔ اگر اس کا حکم نہ ہوتا تو اسے ہزار بار بھوک لگتی وہ کبھی کھانا نہ کھاتا۔ اسی طرح بچوں کو پیار کرے تو صرف اس لئے کہ اس کا مولیٰ رحیم ہے اور کسی پر غضبناک ہو تو محض اس لئے کہ اس کا خالق قہار ہے اور قہر و غضب کی بجلیاں اسی پر گرائے جس پر غیظ و غضب کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ غرض یہ کہ انسان جو کام بھی کرے اس کا محرک اور مقتضی نہ اس کی اپنی طبیعت ہو نہ اپنی خواہش، نہ کسی اور کی چاہت اور نہ کوئی دنیاوی تعلق اور غرض بلکہ ہر کام کا داعی اور باعث اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنا اور اس کی صفات سے متصف ہونا ہو، یہاں تک کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگ کر پیکر خلق الٰہی کا نمونہ ہو جائے اور اس میں صفات خالق کی جھلک نظر آئے، انسان کا کردار اور عمل صفات الٰہیہ کا آئینہ بن جائے۔ یہاں تک کہ وہ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً کا مصداق اتم ہو جائے۔

اسلام میں مسلمان کی حیثیت

ایک انسان اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے اور صرف کلمۂ طیبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھنے سے وہ ایک الگ قوم، علیحدہ معاشرہ اور ایک منفرد تہذیب وتمدن کا حامل ہو جاتا ہے اور اس ایک کلمہ کے پڑھ لینے کے بعد اس کا پورا تشخص بدل جاتا ہے اور اس کی شخصیت میں اتنا بڑا انقلاب آتا ہے کہ وہ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں ایک الگ قوم کے فرد اور ان کے مذاہب کے مقابلہ میں ایک چیلنج کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ دنیا میں اس کی معاشرت، سیاست، طریقۂ حکومت اور احکام عبادت سب بدل جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ دنیا میں عزت اور سرفرازی اور آخرت میں عذاب سے نجات اور جنت کے غیر متناہی ثواب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اس لئے غور کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کی حقیقت کیا ہے، اس کی علامتیں اور تقاضے کیا ہیں جن کی وجہ سے اس کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آجاتا ہے اور پھر ہم اپنے ایمان پر غور کریں۔ کیا ہم میں ایمان کی حقیقت اور اس کے تقاضے پائے جاتے ہیں؟ اگر نہیں تو وہ کیا خامیاں اور کمزوریاں ہیں جو ہمارے ایمان میں موجود ہیں اور اس کمی کی وجہ سے ہم دنیا اور آخرت کا کیا نقصان اٹھا رہے ہیں اور اس کا تدارک اور علاج کس طرح ہوسکتا ہے۔

ایمان کی حقیقت

اصطلاح شرع میں ایمان ان تمام خبروں اور احکام کی تصدیق کرنے اور تسلیم کرنے کو کہتے ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونہ حیات کے سانچہ میں ڈھال لے، کیونکہ اسلام کا منبع، معدن اور مصدر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہہ دیا وہ اسلام ہے، جو کر دیا وہ اسلام ہے اور جو کام آپ کے سامنے کیا گیا اور آپ نے اس سے منع نہیں فرمایا وہ بھی

اسلام ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ آفتاب ہیں اور اسلام اس کی شعاعوں کی مانند ہے۔ جس طرح شعاعیں سورج سے الگ نہیں ہوسکتیں اسی طرح اسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت سے علیحدہ نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کسی شخص کے مسلمان ہونے کا اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں ہے کہ اس نے اپنے آپ کو پیکر رسالت کے قالب میں ڈھال لیا ہے۔

حقیقت ایمان میں بنیادی چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی باتوں کی تصدیق اور تسلیم کرنا ہے، خواہ وہ باتیں از قبیل خبر ہوں یا حکم۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماضی، حال اور استقبال سے متعلق جو خبریں بھی بیان فرمائی ہیں، ان کی فوراً دل سے تصدیق کی جائے۔ خواہ وہ خبریں عقل کے نزدیک مستبعد ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں رات کے ایک لمحہ میں کعبہ سے مسجد اقصیٰ اور فرش سے عرش تک کی سیر کر آیا ہوں تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا: حضور! میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ آپ واقعی ایک لمحہ میں یہ عظیم الشان سیر کر آئے ہیں اور آپ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی مثال یہ ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (النساء:٦٦)

"اگر ہم ان پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کر دو"۔

تو یہ آیت سن کر صدیق اکبر فوراً پکار اٹھے کہ حضور! اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی اپنے ہاتھوں سے سر اتار کر رکھ دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

صدقت یا ابابکر "اے ابوبکر! تم نے سچ کہا"۔ (الصواعق المحرقہ)

ہمارے ایمان کی خامیاں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو احکام بیان فرمائے ہیں ان کی تسلیم کا مدار اس چیز پر ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت دونوں پر کامل ایمان ہو۔ مثلاً جب ہم اللہ تعالیٰ کے کسی حکم پر عمل نہیں کرتے، اس وقت یا تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ہماری اس نافرمانی کا علم نہیں ہے۔ اس کی شکل میں اللہ تعالیٰ کے علم پر ہمارا ایمان نہیں ہوا اور اگر ہم مانتے ہیں اور اس کے باوجود اس کی حکم عدولی کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ باوجود علم

کے ہمارا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس صورت میں ہمارا اس کی قدرت پر ایمان نہ ہوگا۔

ٹریفک کے قانون کے تحت بعض سڑکوں پر ون وے ٹریفک ہوتا ہے۔ جب ہمیں معلوم ہو کہ سڑک پر اس وقت ٹریفک کا کوئی سپاہی موجود نہیں ہے تو بسا اوقات ہم قانون کے خلاف سمت بھی اپنی سواریوں کو لے جاتے ہیں کیونکہ ہم کو یقین ہوتا ہے کہ ٹریفک کے سپاہیوں کو اس وقت ہماری اس قانون شکنی کا علم نہیں ہوگا اور جب ہم دیکھ رہے ہوں کہ سڑک پر سپاہی تو ہیں لیکن وہ ٹریفک کے سپاہی نہیں ہیں اور انہیں اس قانون شکنی پر گرفت کرنے کا اختیار نہیں ہے، تب بھی ہم ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے بے دھڑک گزر جاتے ہیں، کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ ان سپاہیوں کو ہماری اس خلاف قانون حرکت کا علم تو ہے لیکن ان کو اس قانون شکنی پر ہم سے مواخذہ کرنے کی قدرت نہیں ہے اور جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ سڑک پر ٹریفک کے سپاہی موجود ہیں تو ہم ٹریفک کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت نہیں کرتے، کیونکہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ٹریفک کے اس سپاہی کو ہماری قانون شکنی کا علم بھی ہے اور سزا دینے کا اختیار اور اس پر قدرت بھی ہے۔ اب سوچئے کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں تو کیا سمجھ کے کرتے ہیں یا تو ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہماری اس نافرمانی کا علم نہیں ہوگا، یا ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علم تو ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو ہمیں سزا دینے پر قدرت نہیں ہے، کیا یہ ستم کی انتہا نہیں ہے کہ ہم دنیا کے ایک ادنیٰ ٹریفک کانسٹیبل کے علم اور قدرت پر جس قدر یقین رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی قدرت پر ہمیں اتنا یقین اور ایمان بھی نہیں ہے۔

ایک اور انداز سے سوچئے کہ ایک چھ ماہ کا ناسمجھ بچہ آگ کے جلتے ہوئے انگاروں میں بے خطر ہاتھ ڈال دیتا ہے، کیونکہ اس کو یہ علم اور یقین نہیں ہوتا کہ یہ آگ اس کو جلا دے گی اور ہم اس جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ اس لئے نہیں ڈالتے کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ یہ آگ ہمارے ہاتھ جلا دے گی۔ پس معلوم ہوا کہ ہم اس دنیاوی آگ کے جلانے پر جتنا ایمان اور یقین رکھتے ہیں، آخرت اور دوزخ کی آگ کے جلانے پر ہم اتنا بھی یقین نہیں رکھتے ورنہ ہم کبھی علی الاعلان فحاشی، معاصی اور منکرات کے ان کاموں میں ہاتھ نہ ڈالتے جو دوزخ کی

آگ میں جلنے کا موجب ہوتے ہیں۔

اس مثال سے یہ واضح ہو گیا کہ ہمارے ایمان میں خامی اور کمزوری ہے۔ کیونکہ ہم دنیاوی عذاب پر تو یقین رکھتے ہیں اور آخرت کے عذاب پر ایمان ہمارے اعمال سے ظاہر نہیں ہوتا۔

ایمان کامل کی ایک مثال

ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! جب سے میں نے آپ سے یہ سنا ہے کہ قبر میت کو دباتی ہے، اس دن سے میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دباتی تو ضرور ہے مگر نیکوکار کو اس طرح دباتی ہے، جیسے ماں بچے کا سر دباتی ہے، کیا اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے؟ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گناہ گار کو قبر اس طرح دباتی ہے کہ دائیں پسلیاں بائیں پسلیوں میں اور بائیں پسلیاں دائیں پسلیوں میں گھس جاتی ہیں۔ (تبراس)

غور کیجئے کہ ہم نے عذاب قبر کے بارے میں بارہا احادیث میں وارد شدہ یہ وعیدیں سنی ہیں، کیا اس خوف سے کوئی رات ہم نے بھی بے چینی میں گزاری ہے؟ کیا کسی رات ہم بھی عذاب قبر کے خوف سے بستر پر کروٹیں بدلتے رہے ہیں اور اگر اس قسم کی احادیث بارہا سننے کے باوجود بھی ہم رات کو بے فکری سے گھوڑے بیچ کر سوئے رہتے ہیں تو کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ حضور کی خبروں کے ساتھ جو تصدیق حضرت عائشہ کو حاصل تھی، حضور کی ان احادیث کے ساتھ وہ تصدیق ہم کو حاصل نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول برحق کے احکام کے ساتھ تصدیق اور ان کو تسلیم کرنے میں بے اندازہ خامیاں اور کمزوریاں رکھتے ہیں۔

ایمان کامل کا ایک معیار

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایمان کے کمال اور اس کے نقصان کی ایک کسوٹی بیان فرمائی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ ''بلاشبہ نماز کا پڑھنا دشوار ہے، سوا ان لوگوں

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ (البقرہ) ''کے جو یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک دن اپنے رب سے ملاقات کرنی ہے اور آخرت میں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نماز پڑھنے کو دشوار اور بھاری سمجھتے ہیں ان کا نہ تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات پر ایمان ہے اور نہ ہی ان کا آخرت پر کوئی یقین ہے۔ ایمان کے نہ ہونے کا معیار اور کسوٹی میری یا آپ کی بیان کردہ نہیں ہے۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے ایمان کا یہ معیار بیان فرمایا ہے۔ آیئے! اب ہم اپنا جائزہ لیں، آیا نماز کا پڑھنا ہم پر گراں اور دشوار ہے یا سہل اور آسان۔ اب اپنی زندگی کا تجزیہ کر لیجئے اور فیصلہ کر لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اس معیار پر ہمارا اور آپ کا ایمان کس حد تک پورا اترتا ہے۔

کمزور اور ناقص ایمان کے نتائج

جب انسان کا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کمزور ہوتا ہے تو وہ بظاہر عبادت کرتا ہے، احکام الٰہی کی اتباع بھی کرتا ہے اور منہیات سے اجتناب بھی کرتا ہے، لیکن اگر ہم اس کی عبادات کا تجزیہ کریں تو اس کی عبادت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے جذبہ اور اس کی فرماں برداری کی نیت سے خالی ہوتی ہے۔ غور فرمایئے! جب محلہ میں کسی بااثر شخصیت یا خاندان کے کسی عزیز فرد کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کی نماز جنازہ میں اس قدر کثیر افراد جمع ہو جاتے ہیں کہ جنازگاہ میں جگہ نہیں ملتی اور یہی تمام لوگ جو اس نماز جنازہ کو پڑھنے کے لئے اس جوش و خروش سے جمع ہوتے ہیں۔ کیا یہ سب لوگ پانچ وقت کی فرض نمازیں بھی اسی جوش و خروش سے پڑھتے ہیں اور اگر نہیں پڑھتے اور فی الواقع نہیں پڑھتے تو آخر اس فرق کی کیا وجہ ہے؟ کیا نماز جنازہ کسی اور خدا نے فرض کی ہے اور روزمرہ کی پانچ نمازیں فرض کرنے والا کوئی اور خدا ہے۔ جب کہ روزمرہ کی پانچ نمازیں فرض عین ہیں اور نماز جنازہ فرض کفایہ ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی اطاعت کا جذبہ ہمارے دلوں میں موجزن ہوتا تو نماز جنازہ کی نسبت روزمرہ کی پانچ نمازوں کو ہم زیادہ جوش و خروش سے پڑھتے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو معلوم ہوا کہ نماز جنازہ میں ہماری یہ کثرت، اژدہام اور

جوش و خروش محض خاندانی رسم و رواج اور محلہ داری کے روابط قائم رکھنے کے لئے ہوتا ہے اور ہمارے اس عمل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کا کوئی جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

اسی طرح عید کی نماز میں لوگوں کا زبردست ہجوم ہوتا ہے۔ زرق برق کپڑے پہن کر خوشبوؤں میں مہکتے ہوئے لوگ جوق در جوق کھلے میدانوں، عیدگاہوں اور شہر کی تمام چھوٹی بڑی مسجدوں میں جوش و خروش سے نماز عید پڑھنے کے لئے پہنچتے ہیں، حتیٰ کہ مساجد تنگ ہو جاتی ہیں اور لوگ سڑکوں پر چادریں بچھا کر نماز پڑھتے ہیں، اس موقع پر لوگوں کی کثرت اور اژدہام کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بعض جگہوں پر ٹریفک کا نظام بھی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عید کی نماز جس جذبہ اور شوق سے لوگ پڑھتے ہیں، وہ ذوق اور شوق اور کثرت و اژدہام روزمرہ کی پانچ نمازوں میں کیوں نظر نہیں آتا۔ کیا عید کی نماز کسی اور خدا نے مشروع کی ہے اور روزمرہ کی پانچ نمازوں کو مشروع کرنے والا کوئی اور خدا ہے؟ جبکہ پنجگانہ نمازیں فرض عین ہیں اور عید کی نماز زیادہ سے زیادہ واجب یا سنت مؤکدہ ہے۔ کیا ہمارے پیدا کردہ اس فرق سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عید کی نماز میں ہماری یہ کثرت و اژدہام، یہ اہتمام اور احتشام، یہ ذوق و شوق اور جوش و خروش اطاعت الٰہی اور اس کی عبادت کے جذبے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عید کا دن ہمارے لئے ایک تہوار کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اس دن کی نماز ہماری معاشرت، ثقافت اور تہذیب و تمدن کا ایک جزو بن چکی ہے۔

ایمان کی کمزوری جس طرح احکامات الٰہی پر اثر انداز ہوتی ہے، اسی طرح اس کمزوری کا اثر منہیات اور ممنوعات سے اجتناب پر بھی پڑتا ہے، مثلاً مسلمانوں کا ایک عام وطیرہ ہے کہ وہ مردار اور خنزیر نہیں کھاتے، لیکن کیا اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کھانے کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر یہ سبب ہے تو پھر شراب، رشوت اور ناجائز ذرائع سے آمدنی کھانا ہم کیوں نہیں چھوڑتے؟ آخر ان چیزوں کے حرام کرنے والا بھی تو وہی خدا ہے۔ جس نے مردار اور خنزیر کو حرام کیا ہے، اشیاء خوردنی میں مضر اشیاء کی ملاوٹ، سود، ذخیرہ اندوزی، قمار بازی، بداخلاقی، گفتگو میں جھوٹ، چغلی اور غیبت یہ سب چیزیں بھی تو اسی خدا نے حرام کی

ہیں۔ جس نے مردار، خنزیر اور غلاظت کو حرام کیا ہے۔ لیکن مردار، خنزیر اور غلاظت کو تو ہم بالکل نہیں چھوتے اور باقی حرام چیزوں کے ساتھ بلا خوف وخطر مشغول رہتے ہیں، تو کیا ہماری اس روش سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مردار، خنزیر اور دیگر نجس اور ناپاک چیزوں کا کھانا ہم نے خوف خدا سے نہیں چھوڑا بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ یہ چیزیں ہم کو طبعاً ناپسند اور مکروہ ہیں اور ان سے اجتناب کا اصل محرک خداوندی نہیں، بلکہ ہماری اپنی طبیعت کا تقاضا ہے۔

ایمان باللہ کا تقاضا

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: ۱۱۱)

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے"۔

جب ہم اللہ تعالیٰ سے اپنی جان اور مال کے بدلہ میں جنت کا یہ سودا کر چکے ہیں تو یہ جان اور مال اب ہماری ملکیت نہیں رہے۔ اب اس جان و مال پر ہمارا قبضہ اور تصرف نہیں رہا، اب ہم آزاد نہیں، بکے ہوئے ہیں۔ اپنے نہیں اس کے ہیں، ہمارا سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، لین دین، خرید و فروخت، زر اور زمین، سیاست و تجارت، سفارت اور حکومت کوئی چیز بھی تو اپنی نہیں رہی۔ ان تمام امور میں اب ہمارا تصرف نہیں رہا، کسی چیز پر ہمارا اختیار نہیں۔ یہ تمام امور اب اس کے تصرف کے تابع ہیں اور اس کے اذن اور حکم کے بغیر اگر ہم ذرہ برابر بھی کسی چیز میں تصرف کرتے ہیں اور اس کی مرضی اور منشاء کے خلاف ان امور میں اپنی رائے اور خواہش کے مطابق عمل کرتے ہیں تو اس کے دو ہی مطلب ہیں یا تو ہنوز ہم نے خدا سے یہ سودا نہیں کیا یا سودا کرنے کے بعد اور اپنی جان و مال کو اس کے ہاتھ فروخت کرنے کے بعد بھی ہم اس کی مملکت میں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر اپنی خواہش سے تصرف کر رہے ہیں۔ بتایئے! کیا ہم خود اس بات پر راضی ہوں گے کہ کسی شخص سے کوئی چیز خریدنے کے بعد بھی وہ شخص اس چیز میں تصرف کرتا رہے؟ کیا یہ ظلم کی انتہا نہیں ہے کہ ایک شخص کوئی چیز فروخت کرنے کے بعد بھی فروخت شدہ چیز پر اپنا تصرف اور قبضہ برقرار رکھے۔ پھر کائنات میں اس سے بڑھ کے اور کوئی ستم کیا ہوگا کہ جس سلوک کو ہم اپنے

لئے جائز نہیں سمجھتے، ظلم و ستم کا وہ رویہ ہم نے مسلسل اور شب و روز خالق کائنات کے ساتھ روا رکھا ہوا ہے۔

ایمان بالرسول کا تقاضا

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے:

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (الاحزاب: ٦)

"یعنی رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کی جانوں اور مالوں پر ان سے زیادہ تصرف کا حق رکھتے ہیں"۔

مثلاً ہم سونا چاہتے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہو کہ اس وقت نماز پڑھو، تو اگر ہم اپنے آپ کو رسول اللہ کا غلام اور انہیں اپنی جان و مال کا مالک سمجھتے ہیں تو ہم اس وقت سو نہیں سکتے۔ بلکہ ہمیں اٹھ کر نماز پڑھنی ہوگی۔ اسی طرح رمضان میں ہم دن کے وقت کھانا چاہیں اور عید کے دن کھانا چھوڑنا چاہیں تو رمضان میں دن کے وقت کھا نہیں سکتے اور عید کے دن کھانا چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمیں اپنے اوپر وہ اختیار نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے اوپر حاصل ہے۔

کسی چیز کو فروخت کرنا ایک عام سا کام ہے۔ لیکن اس کی تفصیل پر غور کیجئے، بظاہر یہ مال اور جنس ہماری ملکیت ہیں، لیکن ہم جس جگہ اس چیز کو فروخت کرنا چاہیں نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مسجد میں بیع و شراء سے حضور نے منع فرمایا ہے۔ جس وقت فروخت کرنا چاہیں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نماز اور جماعت کے وقت خرید و فروخت حرام ہے، جس شخص کو چاہیں فروخت کر دیں۔ یہ بھی ممکن نہیں، کیونکہ پڑوسی اور شریک کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شفعہ کا حق دیا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر ہم اپنی زمین وغیرہ کو فروخت نہیں کر سکتے اور جس قیمت کے عوض فروخت کرنا چاہیں یہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب، مردار اور نجس چیزوں کے عوض کسی چیز کو بیچنے سے منع فرما دیا ہے۔

اب سوچئے کہ مال بظاہر ہمارا ہے، لیکن اگر ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام سمجھتے ہیں تو جس جگہ چاہیں، جس وقت چاہیں، جس شخص کو چاہیں اور جس

قیمت پر چاہیں فروخت نہیں کر سکتے، اسی لئے اپنی خواہش سے نہ سو سکتے ہیں، نہ جاگ سکتے ہیں، نہ اپنی مرضی سے کھانا کھانے کا اختیار ہے، نہ کھانا چھوڑنے کا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی منشاء اور اس کے رسول برحق کی مرضی کے بغیر نہ ہمیں اپنی جان پر اختیار ہے نہ اپنے مال پر۔

اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلات لا الٰہ را

اور یہ بھی کہا ہے:

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

ایمان میں خامی اور اطاعت میں کمی پر مواخذہ

اب آخر میں صرف اس نکتہ کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ ایمان کی خامی اور اطاعت میں کمی پر قدرت کی طرف سے کیا مواخذہ اور داروگیر ہوتی ہے۔ آخرت کی سزا تو الگ رکھئے، دنیا میں مکافات عمل کی ایک مثال سے اپنے شب و روز کے اعمال پر مواخذہ کا اندازہ کیجئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد میں عبداللہ بن جبیر کی قیادت میں پچاس جوانوں کو ایک درہ پر کھڑا کر دیا اور فرمایا کہ فتح ہو یا شکست تم اس جگہ کو نہ چھوڑنا، جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا کر دی اور مسلمانوں نے کفار کے چھوڑے ہوئے مال کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تو عبداللہ بن جبیر کے بعض وہ ساتھی جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے، اپنے امیر کے پیہم منع کرنے کے باوجود مال غنیمت کی طمع میں وہ درہ خالی چھوڑ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو فراموش کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی جیتی ہوئی بازی کو ہار میں تبدیل کر دیا۔ سوچئے کہ پچاس سے کم افراد نے حضور کے ایک حکم کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر کس قدر سخت مواخذہ کیا اور جب لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان دن

رات حضور ﷺ کے بے شمار احکام کی نافرمانیاں کر رہے ہوں تو ان کی یہ بداعمالیاں اللہ تعالیٰ کے غضب کو کس طرح للکار رہی ہوں گی۔

ایمان کی کمی کی وجہ سے دنیاوی نقصان

ایک وقت تھا جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے اور اسوۂ رسول کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اس وقت جزیرۂ عرب سے لے کر ساحل مکران تک مسلمانوں کی سطوت کے پرچم لہرا رہے تھے، بلکہ سلطنت عباسیہ میں اسلامی حکومت تین براعظموں میں پھیل چکی تھی۔ بحر و بر پر ان کی حکومت تھی، دریا ان کے حکم سے جاری ہوتے تھے اور قضاء الٰہی ان کے عزائم کا ساتھ دیتی تھی۔ مسلمان جس طرف نکل جاتے تھے مظلوموں کی فریاد رسی کرتے تھے، ضرورت مند لوگوں میں دھن دولت تقسیم کرتے تھے۔ جہالت کے گوشوں کو ان کے علم کی قندیلوں نے روشن کیا اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں سبقت کے نیزے انہوں نے نصب کیے۔ لیکن جب انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی اطاعت کو چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نصرت نے انہیں چھوڑ دیا اور وہ قوم جو مشرق و مغرب میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ چکی تھی، ہر جگہ پسپا اور مغلوب ہونے لگی۔ جو قوم فقراء اور مساکین میں دولت اور غلہ تقسیم کرتی تھی۔ آج اپنی معاشی ضروریات کے لئے اغنیاء کی طرف کاسۂ گدائی بڑھانے لگی، جو دنیا میں علم و حکمت کے استاد بن کر نکلے تھے، وہ علم کی تلاش میں اغیار کے محتاج ہو گئے اور جو دوسروں کی عزت و ناموس کے محافظ تھے، آج اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لئے غیروں کا منہ تکنے لگے۔

ان کے جو ہم غلام تھے خلق کے پیشوا رہے
ان سے پھرے جہاں پھرا آئی کمی وقار میں

تدارک اور علاج

ہم نے اس سرزمین کو اسلام کی ایک مثالی ریاست بنانے کے نعرے سے حاصل کیا تھا، اس کے لئے ہم نے قربانیاں دیں، جدوجہد کی اور بالآخر انگریز کی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر ہم نے نظام مصطفیٰ نافذ کرنے کے لئے اور ہندوؤں سے اپنا ایک الگ تشخص ثابت

کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عنایت سے یہ خطۂ پاک حاصل کر لیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الانفال:۵۳) ”اللہ تعالیٰ کسی قوم کو نعمت دے کر اس سے اس وقت تک وہ نعمت واپس نہیں لیتا جب تک اپنے چلن سے وہ خود کو اس نعمت کا نااہل ثابت نہ کر دے“۔

ہم نے اس ارض پاک کو حاصل کرنے کے بعد تریپن سال تک اس میں اسلامی قانون اور نظام مصطفیٰ کا نفاذ نہیں کیا۔ نتیجتاً ہم آدھے ملک سے محروم ہو گئے، پھر باقی ماندہ ملک میں اللہ تعالیٰ کی تنبیہات مختلف عذابوں کی شکل میں نازل ہوتی رہیں۔ لگاتار سیلاب آئے، زلزلے آئے، ظالم اور فاسق و فاجر حکمران ہم پر مسلط کئے گئے، جنہوں نے اپنی رنگ رلیوں اور عیاشیوں کی خاطر قومی معیشت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ مہنگائی اور ٹیکسوں کا بوجھ ڈال کر قوم کی رگوں سے خون نچوڑنا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (الحدید:۱۶) (اللہ تعالیٰ کے عذاب کی اس قدر واضح صورتیں دیکھنے کے باوجود) کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ تمہارے دل خوف خداوندی سے پگھل جائیں۔

ضرورت ہے کہ ہم اجتماعی طور پر اصلاح کریں۔ ہر شخص خود نیک بنے اور اپنے زیر اثر لوگوں کو نیک بنائے، ایک فرد دوسرے فرد کو اور ایک محلہ دوسرے محلہ کو نیک بنائے۔ پہلے ہم اپنی ذات میں اور پھر اپنے گھر اور خاندان میں نظام مصطفیٰ کو نافذ کریں حتیٰ کہ قریہ قریہ اور شہر شہر میں اسلام پھیلتا چلا جائے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

”کلکم راع و کلکم مسئول“ تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت لوگوں کی اصلاح کا ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے بارے میں باز پرس ہو گی۔ اس لئے ہر گھر کے بااثر شخص پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ خود بھی نیک بنے اور اپنے گھر والوں کو بھی نیک بنائے، استاذ اپنے شاگردوں میں نیکی پھیلائے۔ کسی محکمہ کا سربراہ اپنے

پورے محکمہ میں نیکی کو فروغ دے۔ اسی طرح انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ تجارت کا ہو یا ملازمت کا، سیاست کا ہو یا سفارت کا، پولیس کا محکمہ ہو یا فوج کا، جو بھی اس شعبہ کا سربراہ ہو وہ اپنے حلقہ اثر میں حقوق اللہ کی ادائیگی اور حقوق العباد کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی تلقین کرے اور اسی طرح چراغ سے چراغ جلتے رہیں، تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ سرزمین پاک کے معاشرہ میں اسلامی اقدار کا فروغ نہ ہو۔ جب ملک کے تمام افراد اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے، تو یقیناً اسمبلیوں میں بھی نظام مصطفیٰ پہنچے گا اور یہ ایک ملک تمام ممالک اسلامیہ کے لئے ایک مثال اور آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر جائے گا اور یہی وہ وقت ہوگا جب علامہ اقبال اور قائد اعظم کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی موسلا دھار برسات ہوگی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی اور رضامندی سے مملکت اسلامیہ کا گوشہ گوشہ اسلامی اقدار اور حسنات اور برکات کی خوشبو سے مہک اٹھے گا۔ فرشتے انسان کی عظمتوں کو سلام کرنے کے لئے آسمان سے قطار در قطار اتریں گے اور ابلیس کسی تاریک گوشہ میں جا کر اپنا منہ چھپا لے گا۔



اسلامی فلسفۂ عدل وانصاف

انصاف کے معنی لغت میں کسی چیز کے دو مساوی حصے کرنے کے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلامی عدل و انصاف کو بعض لوگ اسلامی مساوات یا مساوات محمدی سے بھی تعبیر کرتے ہیں اور اسی تعبیر سے ایک مغالطہ کا دروازہ کھلتا ہے جب بعض لوگ اسلامی مساوات یا مساوات محمدی کی تشریح طبقاتی مساوات سے کرتے ہیں اور یہ تشریح ایک مسلمان کو بتدریج اشتراکیت اور الحاد کی طرف لے جاتی ہے، اس لئے ہم اسلامی فلسفۂ عدل وانصاف بیان کرنے سے پہلے طبقات مساوات پر مفصل گفتگو کرنا چاہتے ہیں، اس کے بعد ہم یہ بیان کریں گے کہ اسلام میں عدل وانصاف کی صحیح تعبیر اور تشریح کیا ہے۔

طبقاتی مساوات

اس کائنات کے فطری نظام پر غور کیجئے، آپ کو ہر چیز ایک جداگانہ مرتبہ اور حیثیت میں نظر آئے گی۔ جس نظام شمسی میں ہم زندگی گزار رہے ہیں اس میں سورج سے زیادہ طاقتور اور کوئی سیارہ نہیں ہے۔ چاند اور زمین اس کے مقابلہ میں کم حیثیت کے حامل ہیں۔ زرعی پیداوار میں پھلوں کی اجناس پر ایک نگاہ ڈالیے، آپ دیکھیں گے کہ تمام پھل مساوی درجہ اور قیمت نہیں رکھتے۔ پھلوں میں جنس تو دور کی بات ہے کسی ایک پھل کی نوع مثلاً آم کو دیکھئے کیا اس کی تمام اقسام درجہ اور قیمت میں برابر ہیں؟ اسی طرح غلہ کی تمام اجناس بھی قیمت اور درجہ میں مساوی حیثیت نہیں رکھتیں۔ جنس تو الگ رہی، غلہ کی کسی ایک نوع چاول کو لے لیں، کیا اس کی تمام اقسام ایک قیمت پر ملتی ہیں؟ یہی حال پھولوں کا ہے۔ ہر ایک پھول کی ایک الگ رنگت، علیحدہ خوشبو اور اس کا اپنا ایک منفرد مقام ہوتا ہے جو کسی دوسرے پھول کو حاصل نہیں ہوتا ہے۔ انسان خود اپنی جسمانی ساخت پر غور کرے، کیا اس کے جسم کے تمام اعضاء مساوی حیثیت اور مرتبہ رکھتے ہیں، کیا دماغ، دل، ہاتھ اور پیر مساوی مرتبہ کے ہیں؟ اگر انسان کے ہاتھ یا پیر کاٹ دیئے جائیں تو اتنا زیادہ نقصان نہیں ہوگا، لیکن اگر

اس کے دل یا دماغ میں گولی لگے جس سے دل و دماغ بے کار ہو جائے تو اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔

ایک اور زاویہ نگاہ سے دیکھیے ایک شخص اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کھیل کود اور آوارہ گردی میں گزار دیتا ہے اور اپنے روشن مستقبل کے لئے تعلیم و تربیت کا حصول اور محنت اور جد و جہد نہیں کرتا اور بالآخر بڑا ہونے کے بعد کسب معاش کے لئے اینٹیں ڈھوتا ہے اور کوئی محنت مزدوری کا کام کرتا ہے، اس کے برخلاف ایک شخص بچپن سے اپنے آپ کو حصول تعلیم کی کٹھن راہوں میں ڈال دیتا ہے اور بڑا ہو کر معاشرہ میں ایک انجینئر، ڈاکٹر یا عالم دین کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ کیا عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ایک غیر تعلیم یافتہ مزدور اور ایک ماہر انجینئر دونوں کی آمدنی اور سماجی مقام کو ایک پیمانہ پر تولا جائے، اس لئے اگر ہم ہوش و حواس کو خیر باد نہیں کہہ چکے تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ طبقاتی مساوات ایک غیر فطری اصطلاح ہے اور اس غیر فطری اصطلاح کا اسلام کے ساتھ کوئی پیوند نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے واضح اور واشگاف الفاظ میں فرمایا ہے: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ''ہر شخص کو اس کی محنت کے مطابق ثمر ملتا ہے''۔

اسی طرح مال و دولت اور عزت و حشمت کے اعتبار سے بھی سب انسان مساوی نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص کفایت شعاری کر کے پیسے بچاتا ہے اور اس کو تجارت میں لگا کر بڑھاتا چلا جاتا ہے اور معاشرہ میں ایک امیر کبیر شخص کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرا شخص اپنی آمدنی کو عیاشی اور رنگ رلیوں میں صرف کر دیتا ہے اور ہمیشہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کا دست نگر رہتا ہے، کیا ان دونوں شخصوں کو ایک مساوی طبقہ میں رکھنا یہی مساوات اور عدل و انصاف کا تقاضا ہے؟ اس قسم کا اقدام نہ صرف یہ کہ عدل و انصاف کا خون ہے بلکہ قرآن کریم کے بھی مخالف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ''اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو دوسرے بعض لوگوں پر رزق میں فضیلت دی ہے''۔ (النحل: ۷۱)

جس طرح مشین کے تمام کل پرزے مساوی حیثیت کے نہیں ہوتے، کوئی پرزہ

معمولی نٹ کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی آرمیچر ہے، کوئی ریکٹی فائر ہے، کوئی موٹر ہے اور کوئی معمولی کاربن ہے۔ لیکن مشین کو کام کرنے کے لئے ان سب پرزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی قیمت، اہمیت اور حیثیت میں فرق ہوگا۔ لیکن مجموعی طور پر مشین کی کارکردگی کے لئے ان سب پرزوں کی اپنے اپنے مقام پر احتیاج ہے اور جب یہ تمام پرزے اپنے اپنے مقام پر فٹ ہوں گے تبھی مشین چل سکے گی اور اگر ان تمام پرزوں کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹا کر سب کو ایک لائن میں لگا دیا جائے تو مشین کبھی کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح معاشرہ میں مختلف صلاحیتوں اور متفاوت قابلیتوں کے حامل افراد جب اپنے اپنے مقام پر رہ کر کام کریں گے اور ہر شخص کو اس کی قابلیت اور استعداد کے مطابق حیثیت دی جائے گی، تب ہی معاشرہ کی گاڑی صحت اور صلاح کے ساتھ چل سکے گی، ورنہ فساد اور تصادم کی وجہ سے انسان کی تمدنی زندگی مفلوج اور عدل و انصاف کے تقاضے تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ ملک کا امن وسکون غارت ہو جائے گا، اسلامی اقدار سے قوم محروم ہو جائے گی اور ایک اسلامی نظریاتی مملکت کی دیواروں میں خاک وخون کی دراڑیں پڑ جائیں گی اور اس ملک کی چھت جھاگ کی طرح بیٹھتی چلی جائے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ہنگامی موقعوں پر بھی کسی شخص سے اس کی ذاتی املاک کو اس سے چھین کر اپنے مصرف میں نہیں لیا۔ غزوۂ تبوک جیسے نازک اور سخت مرحلہ میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارباب ثروت سے امداد و معاونت کی اپیل کی اور باوجود سب سے اعلیٰ اختیار رکھنے کے کسی شخص سے جبراً ایک درہم بھی وصول نہیں کیا۔

جس طرح دوسروں کی جائز املاک کو غصب کر لینا ایک ظالمانہ فعل ہے اسی طرح دولت کی مساوی تقسیم بھی فطرت اور انصاف دونوں کے خلاف ہے۔ کیونکہ فطرت اور انصاف دونوں کا منشاء یہی ہے کہ ہر شخص کو اس کی سعی اور صلاحیت کے مطابق معاشرہ میں عزت ومقام اور مال ودولت سے حصہ ملنا چاہئے اور اگر سعی اور استعداد کا لحاظ کئے بغیر تمام لوگوں میں دولت کی مساوی تقسیم کر دی جائے تو یہ نہ صرف عدل وانصاف اور فطرت کے خلاف ہے بلکہ صریحاً قرآن کے بھی خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ ۞ (الشوریٰ:۲۷)

"اگر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں پر رزق کی کشادگی کر دے تو معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ رزق کی تقسیم اپنی مشیت اور حکمت سے ایک خاص انداز کے مطابق فرماتا ہے اور بلاشبہ وہ اپنے بندوں کی ضرورتوں سے واقف اور ان کی مصلحتوں کو جاننے والا ہے"۔

خوب یاد رکھئے کہ جو نظام، فطرت اور منشاء الٰہی کے خلاف ہوگا، وہ سوائے فساد کے اور کوئی ثمر نہیں لا سکتا، انسان عالم صغیر ہے اور یہ خارجی اور ظاہری کائنات عالم کبیر ہے۔ اس عالم صغیر کی نشوونما، ترقی اور بقاء تب ہی ہو سکتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کے مطابق یہ جسم اپنا کام کرتا رہے گا اور اگر اس نظام کے خلاف بدن انسان میں کوئی انقلاب آ جائے تو انسان کا مزاج اور قوام فاسد ہو جائے گا اور چشم زدن میں اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے بدن انسانی کے لئے نظام بنایا ہے کہ خون رگوں میں گردش کرے، پیشاب مثانہ میں جمع ہو، مغز دماغ میں رہے اور فضلہ بڑی آنت میں جمع ہو۔ فرض کیجئے کہ خون رگوں کی بجائے مثانہ میں چلا جائے اور پیشاب مثانہ کی جگہ رگوں اور شریانوں میں دوڑنے لگے، فضلہ دماغ میں پہنچ جائے اور مغز آنتوں میں چلا جائے تو بتلایئے کہ کیا ایسی صورت میں انسانی جسم کا نظام فاسد نہیں ہوگا اور جب انسان کے جسم میں اس قسم کا انقلاب برپا ہوگا تو بتلایئے کہ اس انقلاب کے بعد وہ جسم کتنی دیر تک زندہ رہ سکے گا؟

جس طرح اللہ تعالیٰ نے عالم صغیر یعنی انسانی جسم کے لئے کچھ اصول، قانون اور ضابطے بنائے ہیں اور جب تک انسانی جسم ان اصولوں اور قوانین کے مطابق عمل کرتا رہے گا، صالح رہے گا اور اگر اس میں بالفرض قانون الٰہی کے برخلاف انقلاب آ جائے تو وہ جسم فاسد ہو جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے عالم کبیر خصوصاً اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک قانون وضع کیا ہے، جب تک وہ ریاست اس قانون کے مطابق چلتی رہے گی، صالح رہے

کی اور جب اس قانون کے خلاف اس میں انقلاب لایا جائے گا تو معاشرہ میں فساد برپا ہوگا اور ریاست اپنا وجود کھو بیٹھے گی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (یوسف: ٦٧) "اس ملک میں حاکمیت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے"۔

اور حضور ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ (النساء: ١٠٥) "ہم نے آپ کو اوپر (آئین اسلام کی شکل میں) کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے، تاکہ آپ لوگوں میں اس آئین کو نافذ کریں"۔ ایک اور جگہ فرمایا: وَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ "ہم نے آپ کے اوپر یہ کتاب نازل کی ہے اور اس کی تبیین اور تفصیل کرنا آپ کا کام ہے"۔

ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب میں اصول اور کلیات بیان فرما دیئے ہیں اور اس کو باقاعدہ ایک آئین اور نظام کی شکل میں ڈھالنا یہ حضور ﷺ کی ذمہ داری ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو نظام مصطفیٰ کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اگر ہم معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس ملک میں اسی نظام کو جاری کیا جائے جو اللہ تعالیٰ نے مسلم سوسائٹی (Muslim Society) کے لئے وضع کیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نظام کے خلاف کسی اور نظام کو لا کر ہم نے ملک میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی تو اس انقلاب کا بھی وہی حشر ہوگا جو انسان کے جسم میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے نظام کے خلاف انقلاب لانے سے ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم کی بقاء اسی وقت ممکن ہے جب وہ آئین الٰہی کے تابع ہو کر کام کرتا رہے۔ اسی طرح انسانی معاشرہ بالخصوص مسلم سوسائٹی (Muslim Society) کی بقاء اور فلاح بھی اس وقت متصور ہو گی، جب وہ آئین الٰہی یعنی نظام مصطفیٰ کے مطابق چلتا رہے۔

ہمیں سخت حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو طبقاتی مساوات ثابت کرنے کے لئے اسلام کے ساتھ اشتراکیت کا پیوند لگاتے ہیں۔ یعنی عبادت تو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے

طریقہ سے کریں گے اور روٹی حاصل کرنے کے لئے ماؤ اور لینن کے دروازے پر دستک دیں گے۔ حالانکہ چاہئے یہ کہ جس کی بارگاہ میں مسلمان سجدہ کرتا ہے، روٹی حاصل کرنے کے لئے بھی اسی کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

اسلامی مساوات

اسلام جس مساوات کو پیش کرتا ہے وہ طبقات کی غیر فطری مساوات نہیں ہے، بلکہ اس کے برخلاف اسلام نے جس مساوات کو پیش کیا وہ اصول اور قانون کی مساوات ہے۔ یعنی قانون اور اصول کی نظر میں سب مساوی ہیں۔ کسی فرد یا شخص کو خواہ وہ کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو، اس کو نہ اصول اور قانون سے برتر قرار دیا جا سکتا ہے نہ مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔

غزوۂ بدر میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بھی گرفتار ہو کر آئے تھے۔ قیدیوں کو زر فدیہ لے کر آزاد کیا جا رہا تھا۔ فدیہ کی عام رقم چار ہزار درہم تھی۔ لیکن امراء سے زیادہ فدیہ لیا جاتا تھا۔ چونکہ حضرت عباس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی رشتہ دار تھے، اسی سبب سے بعض نیک دل انصار نے حضور سے عرض کیا: یا رسول اللہ! اجازت دیجئے کہ ہم اپنے بھانجے (عباس) کا زر فدیہ معاف کر دیں، یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہرگز نہیں۔ ایک درہم بھی معاف نہ کرو، بلکہ حضرت عباس سے ان کی امارت کی وجہ سے حسب قاعدہ ۴ ہزار درہم سے زیادہ وصول کیے جائیں۔ (بخاری کتاب المغازی و باب فداء المشرکین) اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اسوۂ حسنہ سے یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ قانون کے نفاذ کی راہ میں کسی قسم کا رشتہ اور ناطہ حائل نہیں ہو سکتا۔

ایک دفعہ خاندان مخزوم کی فاطمہ بنت اسود نامی ایک عورت نے چوری کی۔ یہ خاندان چونکہ قریش میں عزت اور وجاہت کا حامل تھا اس لئے لوگ چاہتے تھے کہ وہ عورت سزا سے بچ جائے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص منظور نظر تھے۔ لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اس معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کیجئے۔ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معافی کی درخواست کی۔ آپ نے ناراض ہو کر فرمایا: بنی اسرائیل اسی وجہ سے تباہ ہو گئے کہ وہ غرباء پر بلا تامل حد جاری کر دیتے تھے اور امراء

سے درگزر کرتے تھے (یہ تو فاطمہ بنت اسود ہے) قسم ہے رب عظیم کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالتا۔ (بخاری شریف ج ۱ ص ۲)

فتح مکہ کے بعد تمام عرب میں صرف طائف رہ گیا تھا جس نے گردن تسلیم خم نہیں کی تھی۔ حضور ﷺ نے اس کا محاصرہ کیا، لیکن پندرہ بیس روز کے بعد محاصرہ اٹھالینا پڑا، صخر نامی ایک صحابی ذی حیثیت رئیس تھے، ان کو جب یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے خود جا کر طائف کی حصار بندی کی اور اہل شہر پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ بالآخر مصالحت پر راضی ہو گئے اور صخر نے بارگاہ رسالت میں فتح و کامیابی کی اطلاع بھیج دی۔ اس فتح کے بعد مغیرہ بن شعبہ ثقفی حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ صخر نے میری پھوپھی کو قبضہ میں کر رکھا ہے۔ آپ نے صخر کو بلایا اور حکم دیا کہ مغیرہ کی پھوپھی کو ان کے گھر پہنچادو۔ اس کے بعد بنو سلیم آئے اور عرض کیا کہ جس زمانہ میں ہم کافر تھے، صخر نے ہمارے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اب ہم اسلام قبول کر چکے ہیں، اس لئے ہمارا چشمہ ہم کو واپس دلایا جائے۔ آپ نے صخر کو بلایا اور فرمایا کہ جب کوئی قوم اسلام قبول کرتی ہے تو اپنے جان و مال کی مالک ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان کا چشمہ ان کو واپس دے دو۔ صخر کو بارگاہ مصطفوی کی بے لاگ عدالت کا یہ فیصلہ بھی منظور کرنا پڑا۔ راوی کا بیان ہے کہ جب حضور ﷺ کے حکم سے صخر نے دونوں فیصلے منظور کئے تو میں نے دیکھا کہ حضور کے چہرۂ اقدس پر شرم سے سرخی آگئی۔ کیونکہ فاتح طائف حضرت صخر رضی اللہ عنہ کو ان دونوں معاملوں میں شکست ہوئی اور فتح طائف کا انہیں کوئی صلہ نہ ملا۔ (ابوداؤد)

ان تمام واقعات میں حضور ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ اسلام کی نظر میں تمام فرزندان توحید مساوی ہیں اور نظام مصطفیٰ ہر شخص کو اس کا حق حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور یہ کہ اسلام میں قانون نافذ کرنے کی راہ میں نہ کسی شخص کی ذاتی وجاہت اور قرابت حائل ہو سکتی ہے اور نہ اس کی دینی خدمات عدل و انصاف کے راستہ میں کسی قسم کی رکاوٹ بن سکتی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں غسان کا بادشاہ جبلہ بن عسفان مسلمان ہو کر مکہ میں آیا، جس وقت وہ کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا، ناگاہ ایک عرب بدو کا پیر اس کی چادر پر پڑ گیا، جبلہ کی رگوں میں شاہی خاندان کا خون گردش کر رہا تھا، وہ اس بے ادبی کی تاب نہ لا سکا اور اعرابی کے منہ پر زور سے ایک گھونسہ رسید کیا۔ جس کی ضرب سے اس اعرابی کا دانت ٹوٹ گیا، اس اعرابی نے حضرت عمر کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ آپ نے طرفین کے بیانات سنے اور جب جبلہ نے تسلیم کر لیا کہ اس نے اعرابی کا دانت توڑا ہے تو آپ نے فیصلہ سنا دیا کہ اب اس اعرابی کو بھی حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے دانت کے بدلہ میں تمہارا دانت توڑ دے۔ جبلہ نے کہا: کیا ایک اعرابی اور شاہی خاندان کے فرد کے دانت برابر ہو سکتے ہیں؟

حضرت عمر نے فرمایا: قرآن کریم کا فیصلہ ہے:

اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَ الْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَ الْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَ السِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَ الْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ: ۴۵)	"جان کا بدلہ جان ہے اور آنکھ کا بدلہ آنکھ ہے، ناک کا بدلہ ناک ہے، کان کا بدلہ کان اور دانت کا بدلہ دانت اور ہر زخم کا قصاص لیا جائے گا"۔

اسلام نے انسانی حقوق کی محافظت کی ہے اور قانون اسلامی کو تمام مسلمانوں پر یکساں اور مساوی حیثیت سے نافذ کیا ہے۔ اسلام کی نظر میں ایک جاہل بدو کے دانت کی بھی وہی قدر و قیمت ہے جو ایک بادشاہ کے منہ میں لگے ہوئے دانت کی ہے اور جب تم اعرابی کا دانت توڑنا تسلیم کر چکے ہو تو قصاص کے لئے تیار ہو جاؤ۔ جبلہ کہنے لگا: مجھے ایک دن کی مہلت دیجئے، اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ واپس غسان کی طرف بھاگ گیا اور وہاں پہنچ کر اسلام چھوڑ کر عیسائی ہو گیا، لیکن جبلہ کے اس عمل نے یہ بہر حال ظاہر کر دیا کہ شاہی غرور اور نسلی امتیاز کو کلیسا میں پناہ مل جائے تو مل جائے، اسلام کے دامن میں ان کے لئے کوئی پناہ نہیں ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ ظاہر ہو گیا کہ شاہی خاندان کے افراد اور ارباب اقتدار کے مقابلہ میں غریب کسانوں، محنت کشوں اور دہقانوں کو اگر اپنے حقوق کا تحفظ اور عدل و انصاف ملتا ہے تو صرف اسلام کی پناہ میں ملتا ہے۔ (حواشی بیضاوی مع توضیح و تفصیل)

عدل و انصاف کا ایک اہم جز و عام مساوات ہے یعنی دیوان عدالت میں شاہ و گدا، امیر و غریب، شریف و رزیل سب کو برابر حیثیت دی جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک اس امر کی اس قدر اہمیت تھی کہ اس کے تجربہ اور امتحان کے لئے متعدد بار خود عدالت میں فریق بن کر گئے۔ ایک دفعہ حضرت عمر اور ابی بن کعب میں کسی بات پر نزاع تھا۔ ابی بن کعب نے زید بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور حضرت عمر مدعا علیہ کی حیثیت سے حاضر ہوئے، زید نے اٹھ کر آپ کی تعظیم کی۔ آپ نے فرمایا: یہ تمہارا پہلا ظلم ہے، یہ فرما کر ابی ابن کعب کے برابر بیٹھ گئے۔ ابی بن کعب کے پاس اپنے دعویٰ کے ثبوت پر کوئی گواہ نہ تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس کے دعویٰ پر انکار تھا۔ اس لئے قاعدہ کے مطابق حضرت عمر پر قسم لازم آتی تھی۔ زید بن ثابت نے حضرت عمر کی شخصیت اور ان کے رتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے ابی بن کعب سے کہا: امیر المومنین کو قسم سے معاف رکھو۔ حضرت عمر اس طرف داری پر سخت رنجیدہ ہوئے اور فرمایا: جب تمہارے نزدیک ایک آدمی اور سربراہ مملکت دونوں برابر نہ ہوں، تم منصب قضاء کے اہل نہیں سمجھے جا سکتے۔

حضرت عمر نے تمام عمال حکومت کو حکم دیا تھا کہ ہر سال حج کے زمانہ میں حاضر ہوں کیونکہ حج کی تقریب کے سبب سے تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ حضرت عمر کھڑے ہو کر بآواز بلند فرماتے تھے کہ جس شخص کو کسی عامل سے کوئی شکایت ہو تو اس کو پیش کرے۔ چنانچہ ذرا ذرا سی شکایتیں ہوتی تھیں اور تحقیق کے بعد ان شکایات کا ازالہ اور تدارک کیا جاتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمر نے بہت بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: صاحبو! عمال اور گورنروں کا تقرر اس لئے نہیں کیا جاتا کہ وہ بلاوجہ تم کو سزائیں دیں یا تمہارا مال چھین لیں، بلکہ میں ان لوگوں کو اس لئے مقرر کرتا ہوں کہ وہ تم کو اسوۂ رسول کی تعلیم دیں اور معاشرہ میں عدل و انصاف قائم کریں، اقتصادی توازن برقرار رکھیں اور تمہاری تمام جائز ضرورتوں کو پورا کریں۔ پس اگر کسی عامل یا گورنر نے اس کے خلاف عمل کیا ہے تو مجھے بتاؤ تا کہ میں اس کا قصاص لوں۔ یہ سن کر مصر کے گورنر عمرو بن العاص کھڑے ہو کر کہنے لگے: اگر کوئی گورنر یا عامل تادیباً کسی کو مارے گا تب بھی آپ اس کو سزا

دیں گے۔ حضرت عمر نے فرمایا: قسم ہے رب ذوالجلال کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! میں ضرور اس کو سزا دوں گا۔ کیونکہ میں نے خود حضور ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے، خبردار! مسلمانوں کو بلاوجہ مارا نہ کرو۔ ورنہ ان کی عزت وآبرو محفوظ نہ رہ سکے گی۔

ایک دفعہ حسب معمول تمام لوگ حاضر تھے، ایک شخص اٹھا اور کہا کہ آپ کے عامل نے مجھ کو بے قصور سو کوڑے مارے ہیں۔ حضرت عمر نے مستغیث کو حکم دیا کہ وہیں مجمع عام میں اس عامل کو سو کوڑے لگا کر اپنا قصاص لے۔ عمرو بن العاص نے کھڑے ہو کر کہا: یہ فیصلہ عمال پر بہت گراں گزرے گا۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ عزت سو بار مجروح ہو، لیکن عمر سے یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ مجرموں کو سزا نہ دے اور حق دار کو اس کے جائز حق سے محروم کر دے۔

(طبری مع توضیح وتفصیل)

یہ ٹھیک ہے کہ اگر عمال اور گورنروں کو کھلے مجمع میں سزا دی جائے یا ان سے بدلہ لیا جائے تو اس سے ان کے وقار میں کمی آئے گی۔ لیکن حضرت عمر نے یہ ظاہر کیا کہ میں کیا ہوں اور تم کیا ہو اور تمہاری عزت و وقار کیا ہے؟ دو عالم کے سردار اور اللہ کے محبوب حضور ﷺ نے ایک بار مجمع عام میں خود کو قصاص کے لئے پیش کر دیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں حضور صحابہ کی صفیں درست فرما رہے تھے، سواد بن عزیز ایک خوش طبع اور خوش فہم صحابی تھے، وہ اچانک صف سے آگے نکل کر کھڑے ہو گئے، حضور ﷺ کے دست اقدس میں ایک چھڑی تھی۔ آپ نے وہ چھڑی اس کے سینہ پر مار کر فرمایا:

"استویا سواد" "اے سواد! صف کے برابر کھڑے ہو"۔ سواد نے عرض کیا: حضور! آپ نے مجھے چھڑی کے ساتھ مارا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو صفت عدل وانصاف کے ساتھ مبعوث کیا ہے۔ اب آپ مجھے قصاص دیجئے، حضور ﷺ نے اپنا لباس مبارک کو اپنے سینۂ مبارک سے علیحدہ کر کے فرمایا: اے سواد! اسی وقت اپنا قصاص لے لو۔ سواد نے فی الفور اپنا چہرہ حضور کے سینہ پر رکھ کر اس کا بوسہ لے لیا۔ حضور نے فرمایا: ایسا کیوں کرتے ہو؟ عرض کیا: یا رسول اللہ! ممکن ہے جنگ میں میں شہید ہو جاؤں، میں نے چاہا کہ آخری وقت میں میرا جسم آپ کے جسم سے مس ہو جائے۔ (مدارج النبوت ج ۲)

غور فرمائیے! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو نظام دیا ہے اس میں نبی بھی اپنی ذات کو قصاص کے لئے پیش کر دیتا ہے، نظام مصطفیٰ میں عدل و انصاف کا جو معیار پیش کیا گیا ہے اس میں خویش و اقرباء، بندہ و آقا اور شاہ و گدا سب ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں، یہ وہ نظام ہے جس میں گورنر ہو یا کوئی اعلیٰ افسر، قانون کی زد سے کوئی شخص بچ نہیں سکتا اور ان میں سے جو شخص بھی عوام کے کسی فرد کے ساتھ زیادتی کرے تو اس کو برسر عام سزا دی جاتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں قانون کے نفاذ کی راہ میں نہ خویش و اقارب رکاوٹ بنتے ہیں، نہ معاشرہ کے ذی حیثیت افراد اس کے اجراء میں حائل ہوتے ہیں۔ اس نظام میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی حکمرانی نہیں ہے اور یہ صرف نظام مصطفیٰ کا امتیاز ہے کہ اس میں سربراہ مملکت سے لے کر ایک عام دہقان تک جو شخص بھی زیادتی کرے وہ احتساب سے بچ نہیں سکتا۔



نوید شب برات

گناہ انسان سے ہو جاتا ہے، لیکن پیمان وفا باندھنے کے بعد جفا کچھ اور گراں گزرتی ہے۔ اسلام کا احرام باندھنے کے بعد ہوا و ہوس کا طواف، اطاعت خداوندی کے عہد کے بعد اتباع نفس، اغیار کی بیگانگی کے لئے حجت اور اپنوں پر استہزاء کا موجب بن جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی چیز فروخت کر دی جائے اور سودا ہونے کے بعد پھر بیچنے والا یہ کہے کہ اس چیز پر میرا قبضہ ہے، اس کے حقوق میرے ہیں اور اس شئے پر میرا تصرف ہے؟ اگر ایسا ہو تو یقیناً یہ خریدار کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہوگا۔ ایک مہذب معاشرے میں کوئی شخص اس ظلم کو روا نہیں رکھے گا۔ لیکن کیا یہ حیرت کی انتہا نہیں کہ ہم نے ظلم کا یہ سلوک اس ذات کے ساتھ روا رکھا ہے جو ہمارا اور اس ساری کائنات کا مالک و خالق ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبہ: 111) ''اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کے نفوس اور اموال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے''۔

جب ہم نے یہ سودا کر لیا ہے تو یہ جان اور مال اب ہماری ملکیت نہیں رہی، اس پر ہمارا قبضہ اور تصرف نہیں رہا۔ سونا جاگنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، لین دین، خرید و فروخت کسی شئے کے ہم مالک نہیں رہے۔ یہ تمام امور اب اس کے تصرف کے تابع ہیں، ہمارا کسی چیز پر اختیار نہیں۔ لیکن اگر اس کے باوجود ہم جان و مال پر اپنی مرضی سے تصرف کرتے رہیں۔ اس کی مرضی کے خلاف زندگی کے ہر مرحلہ میں ہماری رائے حاکم رہے تو اس کے دو ہی مطلب ہیں۔ یا تو ہم نے خدا سے ہنوز یہ سودا نہیں کیا یا سودا کرنے کے بعد ہم اس کی ملک میں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر تصرف کر رہے ہیں اور اس کائنات میں اس سے بڑھ کر کوئی ظلم ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک شخص مکان بنانے کے لئے زمین حاصل کرے۔ سیمنٹ، بجری، اینٹیں اور لوہا

فراہم کرے۔اسے بنانے کے لئے راج مزدوروں کی خدمات مہیا کرے اور کئی برس لگا کر یہ مکان تیار کرے اور جب یہ مکان بن کر تیار ہو جائے اور وقت آئے کہ وہ اس میں رہائش اختیار کرے، اپنی مرضی اور منشاء سے اس مکان میں زندگی گزارے تو اچانک کوئی دوسرا شخص آ کر اس مکان پر قبضہ کر لے اور کہے کہ اس مکان میں میں اپنی مرضی اور منشاء سے زندگی گزاروں گا، تمہیں نہیں رہنے دوں گا تو کیا یہ ستم نہیں ہے؟ کیا ہم یہ ظلم گوارا کر لیں گے؟ پھر جو بات ہم برداشت نہیں کر سکتے، اسے ہم نے کتنی آسانی سے اس ہستی کے لئے پسند کر لیا ہے جو تمام کائنات کا خالق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے لئے ماں کے رحم میں نطفہ فراہم کیا۔ نو ماہ تک اسے تخلیق کے مختلف مدارج سے گزارتا رہا۔ گندے قطرے کو ہڈیوں اور گوشت کا پاکیزہ لباس پہنایا۔ بے جان لوتھڑے میں حس و حرکت پیدا کی۔ ذہن میں رعنائی خیال اور قلب میں محبت کی گرمی میسر کی۔ آغوش مادر میں اس کے لئے باپ کی شفقت اور ماں کا ایثار مہیا کیا۔ اسے یوں ہی پالتا رہا، بڑھاتا رہا، بدن انسان کی تعمیر کرتا رہا، یہاں تک کہ اس عمارت نے اپنے بلوغ کو پالیا اور جب یہ انسان اس قابل ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اس بنائی ہوئی عمارت میں اس کے احکام کو آباد کرتا، اس منزل میں اس کی مرضی کو مکین بناتا۔ اس نے اللہ کے احکام اور فرامین کو اس عمارت سے نکال باہر کیا اور ہوائے نفس کو اس مکان کا مکین بنا لیا۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ "بے شک وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے"۔

روز و شب معصیت کی تسبیح رولنے والوں کو، وفا کا دم بھر کر پھر اسے بھلانے والوں کو وہ پکار پکار کر بلاتا ہے اور کہتا ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ (الحدید:۱۶) "کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کو یاد کرنے کے لئے موم ہو جائیں"۔

گناہوں پر عذاب دینے سے اسے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ جبھی تو وہ کہتا ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ "خدا تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر

وَاٰمَنْتُمْ (النساء: ۱۴۷) تم اللہ کا شکر بجا لاؤ اور سچے مسلمان ہو جاؤ"۔

اگر تم سے معصیت سرزد ہو گئی ہے یا تم اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے ہو تو یہ ایسا داغ نہیں جو دھویا نہ جا سکے، ایک دو گناہوں کی بات نہیں اگر تم گناہوں کے سمندر بھی لے کر آئے تو وہ معاف کر دے گا۔ کرم خداوندی کے بحر بے کراں کے سامنے ایک دن کی سیاہی کی کیا حقیقت ہے پوری کائنات کی سیاہی بھی ہو تو ڈھل جائے گی۔ تم آؤ تو سہی، دیکھو آغوش رحمت تمہیں لینے کے لئے کس طرح بے تاب ہے؟

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران: ۱۳۳)

"لوگو! دوڑو اپنے رب کے عفو و کرم کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی پہنائی میں زمین و آسمان سما سکتے ہیں"۔

پھر فرماتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ (آل عمران)

"وہ لوگ جنہوں نے کوئی بے حیائی کا کام کیا ہو یا جنہوں نے اپنی جانوں پر کوئی ظلم کر لیا ہو اللہ کو یاد کریں اور اس سے گناہوں پر معافی چاہیں اور اللہ کے سوا کون گناہوں کو بخشے گا اور پھر اس گناہ پر ڈٹے نہ رہیں، حالانکہ وہ جانتے ہیں O تو اللہ کے پاس ان لوگوں کی جزاء بخشش ہے اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے سے دریا بہتے ہیں، جن میں انہوں نے ہمیشہ رہنا ہے اور عمل کرنے والوں کو خوب ہی اجر ملتا ہے"۔

خدا کی مغفرت اور بخشش حاصل کرنے کے لئے اس کی طرف رجوع کرنا ہے۔ اس سے عفو و کرم کی بھیک لینے کے لئے اس کے دربار کا رخ کرنا ہے۔ سدرہ پر ہم جا نہیں سکتے، ارش تک رسائی نہیں، لامکان کی طاق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کرم فرمایا کہ تم جا نہیں سکتے میں

تو آسکتا ہوں۔ رات کو پچھلے پہر جب ایک عالم نیند میں ڈوبا ہوتا ہے، وہ پہلے آسمان پر متوجہ ہو کر صدا دیتا ہے، ہے کوئی سوالی میں اس کی جھولیاں بھر دوں، لینے والے محو استراحت ہوتے ہیں اور دینے والا آواز دیتا رہتا ہے۔

عموماً پیاسے چل کر پانی کے پاس پہنچتے ہیں لیکن کبھی پانی لطف و کرم پر آئے تو وہ خود پیاسوں کے پاس جا پہنچتا ہے۔ یہاں اس ازلی کریم کا کرم دو طرح سے ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ مینائے عفو و کرم لے کر خود تشنگان مغفرت کی طرف متوجہ ہوا، انہیں بلا کر تکلیف میں نہیں ڈالا، دوسرا یہ کہ ساقئ مغفرت نے بخشش کے جام رات کے سناٹوں میں پیش کئے، جب عروس شب اپنے سیاہ گیسو پھیلا دیتی ہے، جب تاریکی اور سکوت ہوتا ہے، کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ دن کے اجالوں میں اس کی خودی کو مجروح اور اس کی ذات کو رسوا نہیں کیا، تاکہ جب اس کے شیشۂ دل سے گناہوں کی سیاہی دھلنے لگے تو رات کے اندھیروں میں وہ کسی کو نظر نہ آ سکے۔ عبد و معبود کے درمیان جو ناز و نیاز ہوں، سراپا خطاء و تقصیر میں جو عجز کے انداز ہوں اس میں کوئی تیسرا نہ آسکے اور بندہ کسی حائل و حاجب کے بغیر اپنے مولا کو پا سکے، اسے راضی کر سکے۔

گناہ گاروں کو بخشنے کے لئے وہ رات کے پچھلے پہر آیا اور گناہ گار سوتے رہے۔ وہ ہر رات آوازیں دیتا رہا، یہ کسی رات اٹھ نہ سکے۔ لیکن اس کی توجہ خالی نہیں گئی۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ کا لقب پانے والے، رکوع و سجود میں راتیں گزارنے والے ہر رات کو اٹھتے ہیں اور پچھلے پہر جب آسمان دنیا پر رب کائنات آواز دیتا ہے، یہ اٹھ کر دریوزہ گری کرتے ہیں۔ مراد پا کر شاد کام ہوتے ہیں۔ رحمت و مغفرت سے جھولیاں بھر لیتے ہیں۔ یہ ہر رات اسی طرح کرتے ہیں۔ ان کی کوئی رات خالی نہیں جاتی۔ ان کی ہر رات نجات کی رات ہوتی ہے۔ قدسیوں کی اصطلاح میں شب برأت ہوتی ہے۔

رب کائنات نے دیکھا کہ کاملین اور واصلین، شب بیدار اولیاء اللہ میدان لے گئے۔ ان عطاؤں اور نوازشوں سے گناہ گاروں نے کچھ نہیں لیا۔ وہ مغفرت کی صدائیں دیتا رہا، یہ پڑے سوتے رہے، ابر کرم برساتا رہا اور یہ محو خواب رہے، مگر تماشا یہ ہے کہ یہ رات کے پچھلے پہر اٹھ نہیں سکتے اور وہ ان پر کرم کئے بغیر رہ نہیں سکتا، ان پر غفلت حاوی ہے، اس

پر رحمت غالب ہے، تبھی تو یہ غلبۂ رحمت اس کا مقتضی ہوا کہ سال کی راتوں میں ایک رات ایسی بھی رکھی جائے جس میں پچھلے پہر کی قید نہ ہو۔ غروب آفتاب سے لے کر سپیدۂ سحر تک تمام شب رب کائنات آسمان دنیا سے بخشش لٹاتا رہے، تاکہ بندوں پر اس کے کرم کی حجت تمام ہو جائے۔ رحمت کی معراج ہو جائے اور یہ بتا دیا جائے کہ اے تن آسان سہل کوش اور غافل بندو! اگر تم ہمارے لئے انتہائے شب میں نہیں اٹھ سکتے تو نہ سہی ہم تمہارے لئے ابتدائے شب میں آ جاتے ہیں مگر تم ہماری مغفرت کی طرف آؤ تو سہی۔ وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (آل عمران: ۱۳۳)

اے خواب غفلت میں پڑے رہنے والے گناہ گاروں! تمہیں مبارک ہو، یہ تمہاری رات ہے۔ نیکوکاروں کے لئے تو ہر رات ہی شب برأت ہوتی ہے۔ مگر اے خطا کارو! شعبان کی یہ پندرہویں شب تمہاری رات ہے۔ اٹھو اے غافلو! کہ اس رات میں تمہیں بشارت (1) ہے۔ دوڑو اے عاصیو! کہ آج سرِ شام سے مغفرت کی نداء جاری ہے، منا لو اپنے رب کو کہ یہ موقعہ ہے، لوٹ لو! اس رات کی عطائیں اور نوازشیں تمہاری ہیں، ساقی تمہارا ہے، مینا تمہارا ہے، بادہ و ساغر تمہارا ہے۔



1۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر رات کو تہائی حصہ گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ آسمان دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور فرماتا ہے: میں بادشاہ ہوں کون مجھ سے دعا مانگتا ہے، تاکہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون مجھ سے سوال کرتا ہے تاکہ میں اسے عطا کروں؟ کون مجھ سے مغفرت چاہتا ہے تاکہ میں اسے بخش دوں؟ اللہ تعالیٰ اسی طرح فرماتا رہتا ہے یہاں تک کہ فجر کی روشنی پھیل جاتی ہے۔

(ترمذی ج ۱ ص ۱۰۰، مطبوعہ سعید اینڈ کمپنی)

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نصف شعبان کی رات میں قیام کرو اور دن میں روزہ رکھو، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس رات میں غروب آفتاب سے لے کر طلوع فجر تک آسمان دنیا کی طرف متوجہ رہتا ہے اور فرماتا ہے: کوئی مجھ سے مغفرت چاہے تو میں اس کو بخشش دوں۔ کوئی رزق طلب کرے تو میں اس کو رزق دوں، کوئی مصیبت سے چھٹکارا چاہے تو اس کی مصیبت دور کر دوں۔

(سنن ابن ماجہ ج ۱ ص ۹۹، مطبوعہ نور محمد)

روزے کے اسرار و رموز

روزے کا انسانی فطرت کے ساتھ ارتباط

انسان کا سینہ جذبات سے بھرپور رہتا ہے اور قلب کا آئینہ مختلف کیفیات سے منعکس ہوتا رہتا ہے۔ کبھی اس دل پر خشیت کا غلبہ ہوتا ہے اور یہ خوف سے کپکپانے لگتا ہے۔ کبھی بے چاروں اور ضعیفوں کو دیکھ کر غم سے بوجھل ہو جاتا ہے اور کبھی یہ مشاہدہ فطرت کے حسین منظر کو مرکز نگاہ بنا کر محو دید ہو جاتا ہے۔ پھر محبت کی جولانیاں اثر دکھاتی ہیں اور یہ اپنی دنیا کی ساری متاع نیاز کسی محبوب کے استغناء پر نثار کر دیتا ہے۔

خوف، غصہ، رحم اور محبت یہ احساس کے وہ مختلف رنگ ہیں جو دل کے آئینے میں جھلکتے رہتے ہیں۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس نے انسان کو عبادات کا ایک حسین اور جامع گلدستہ دیا جس کی خوشگوار مہکوں نے دل کے ہر جذبے میں اپنا مقام بنا لیا۔ ڈرنا اور خوف کھانا انسانی فطرت ہے۔ مگر اسلام نے بتایا کہ دل کی دنیا میں جب خشوع اور خضوع کا غلبہ ہو اور خوف سے دل ہلنے لگے تو نگاہ جھکا کر با قیام دست بستہ حاضر ہو جائے اور جلال کے قدموں میں خشیت اپنا سر جھکا دے، اسی کو اصطلاح شرع میں نماز کہتے ہیں۔ دوسرا جذبہ ترس کھانے کا ہے، انسان کی فطرت میں رحم کا جذبہ ہے۔ مگر اسلام نے بتایا کہ اس کے اس جذبہ کا مرکز ان لوگوں کو ہونا چاہئے جو اولاً تمہارے اقرباء میں ہوں۔ ثانیاً تمہارے ہمسائے اور محلہ والے، پھر عام غرباء اور مساکین اور جذبہ رحم کے اس اظہار کو اسلامی زبان میں زکوٰۃ کہتے ہیں۔ تیسرا جذبہ غضب کا ہے۔ انسان کو غصہ بھی آتا ہے اور وہ جوش سے از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ مگر اسلام نے کہا کہ اس کی یہ برہمی اور از خود رفتگی بھی اللہ کے لئے ہو اور غصہ اور غضب کے جذبے سے ان لوگوں پر قہر و غضب کی بجلیاں گرائی جائیں جو اللہ تعالیٰ کی زمین پر رہتے ہیں اور اس کے آگے سر نہیں جھکاتے، برہمی اور غضب کے اس

جذبے کے اظہار کو اسلام جہاد کہتا ہے۔

انسان کا چوتھا احساس وہ لطیف جذبہ ہے جو کبھی قیس کی صحرا نوردی میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی پروانے کی طرح طلب کی دیوانگی میں اجاگر ہوتا ہے۔ اسلام نے انسان کے عشق کو قیس کی صحرا نوردی بھی دی اور پروانے کی دیوانگی بھی دی۔ عزیز واقارب کو چھوڑ کر اپنے وطن سے دور مکہ کی وادیوں میں گلے میں کفن ڈالے "لبیك اللھم لبیك" کی صدا لگاتے پھرنا بھی عشق کی ایک شان ہے اور ماہ صیام میں کھانے پینے کو ترک کر کے خدا کی صفت بے نیازی کے قریب ہونے کی کوشش کرنا بھی عشق کی دیوانگی کا مظہر ہے۔

کسی کا قرب حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ اس کی کسی صفت کو اختیار کر لیا جائے، اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "تخلقوا باخلاق الله" اللہ کی صفات سے موصوف ہو جاؤ" اور خدا کی بے اندازہ صفات میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ خورد ونوش اور عمل تزویج سے پاک ہے۔ اس لئے خدا کا قرب پانے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہوگا کہ انسان کھانا پینا ترک کر کے بھوک اور پیاس کی صعوبتیں قبول کر لے۔ انسان بھوکا ہو کھانا اس کے سامنے موجود ہو، وہ کھا سکتا ہو، پھر نہ کھائے، عقل کہے گی: یہ دیوانگی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا قرب پانے کا متلاشی انسان اس کی صفت سے ہم آہنگ ہونے کے جنون میں اس دیوانگی کو پروانہ وار قبول کر لیتا ہے اور اسی دیوانگی کا نام اسلام نے روزہ رکھا ہے۔

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ انسان کا دل خوف، رحم، غصہ اور محبت ان احساسات سے معمور رہتا ہے۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے اور اس نے ایسی جامع عبادات پیش کیں کہ انسان ہر جذبہ میں خدا کی پرستش کر سکے۔ نماز، زکوٰۃ، جہاد اور ماہ صیام کے روزے انہیں کیفیات کے مظہر ہیں۔

نماز انسان کے خوف کو ظاہر کرتی ہے اور زکوٰۃ رحم کی حالت کو، جہاد سے غصہ برہمی اور غضب کا اظہار ہوتا ہے اور روزہ بندہ کی اللہ تعالیٰ سے محبت کے راز سربستہ کو چاک کر دیتا ہے۔

روزے کی خصوصیت

باقی عبادات کچھ اعمال کو بجالانے کا نام ہے جنہیں دوسرے بھی جان لیتے ہیں، مثلاً نماز رکوع و سجود کا نام ہے، جہاد کفار سے جنگ کرنے کو کہتے ہیں۔ زکوٰۃ کسی کو کچھ دینے سے ادا ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ تمام عبادتیں کسی نہ کسی پر ظاہر ضروری ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں کسی نہ کسی طرح جان لیتے ہیں، مگر روزہ کچھ کام کرنے کا نام نہیں کہ انسان فلاں کام کرے تو یہ روزہ ہے بلکہ روزہ تو کچھ نہ کرنے کا نام ہے، جو کسی کے بتلانے سے بھی معلوم نہیں ہوتا، اس کو تو بس وہی جانتا ہے جس کے لئے رکھا گیا ہے۔ لہٰذا روزہ بندے اور صرف خدا کے درمیان ایک راز ہے۔

محب صادق کا اپنے محبوب کے حضور میں ایک خاموش نذرانہ ہے جو بالکل چپ چاپ اور پوشیدہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے تو اس کریم ازلی نے اپنے بندے کے اس بے ریا ہدیہ کو قبول کر کے کہا:

''الصوم لی وانا اجزی بہ'' ''روزہ میرے لئے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا''۔

روزے کا تعلق دوسروں کی زندگی سے

اسلام نے معاشرے میں توازن برقرار رکھنے کے لئے مختلف ضابطے مقرر کئے ہیں اور غریبوں اور مفلسوں کی دستگیری کے لئے اغنیاء کے ہاتھوں میں زکوٰۃ و صدقات کے قلم دان تھما دیئے، مگر کسی کی جیب سے پیسہ اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک اس کے دل میں رحم کا جذبہ نہ پیدا ہوا اور یہ احساس اس شخص کو کس طرح ہوگا جو ہمیشہ انواع و اقسام کی نعمتوں اور لذتوں میں زندگی گزارتا ہو۔ جو ہمیشہ داد عیش دیتا رہا ہو وہ افلاس کی تلخیوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ جو عمر بھر شکم سیر ہو کر کھاتا رہا وہ کسی غریب کی بھوک اور پیاس کا احساس نہیں کر سکتا اور جب تک کسی کی تکلیف کا احساس نہیں ہوگا اس کی مدد کرنے کا جذبہ دل میں پیدا نہیں ہوگا۔

نفسیاتی طور پر آدمی کسی کی تکلیف کا اس وقت احساس کرتا ہے جب وہ خود اس پر گزر جائے۔ اسلام نے تمام مسلمانوں پر روزے فرض کر دیئے تا کہ اغنیاء جب روزے کی صعوبتوں سے دوچار ہوں تو انہیں احساس ہو کہ ہمیں ایک دن کھانا نہ ملنے سے اتنی تکلیف

ہوئی تو جو پورے سال ایسے مصائب کا سامنا کرتے ہیں ان کا کیا عالم ہوگا؟ پھر یہ احساس اغنیاء کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور وہ غریبوں کی مدد پر آمادہ ہوتے ہیں۔

روزے کا جہاد کی تربیت دینا

اسلامی عبادات کا ایک اہم رکن جہاد ہے، ہر مسلمان فطرتاً ایک سپاہی ہوتا ہے جو بے آب وگیاہ میدانوں اور لق ودق صحراؤں میں کفر کی چٹانوں سے ٹکراتا ہے، اعلاء کلمۃ اللہ کا عزم لے کر پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتا اور سمندروں کے سینوں کو چاک کر کے شرک کے ایوانوں کو منہدم کر دیتا ہے، مگر یہ عزم تن آسانی اور آرام طلبی سے پیدا نہیں ہوتا۔ مجاہدانہ روح کے اس جذبہ کو پیدا کرنے کے لئے خواہشات کے خون اور نفس کشی کی ضرورت ہے، جو خواہشوں کے گھیرے میں محصور اور روزانہ پیٹ بھر کے کھانے کا عادی ہو وہ جنگ کی ہولنا کیوں کا تصور نہیں کر سکتا۔

اسلام نے سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کر دیئے تا کہ ہر مسلمان اس ماہ میں ضبط نفس اور بھوک و پیاس برداشت کرنے کی مشق بہم پہنچا لے تا کہ میدان جہاد میں اس کے لئے بھوک و پیاس کی شدت کوئی اجنبی بات نہ ہو۔ اسلام کا ہر فرد سپاہی ہے اور وہ اپنے تمام فرزندوں کو ہر سال جہاد کی تربیت دیتا ہے۔

روزے کا انسان کو اس کے مقصد کی طرف متوجہ کرنا

ہر چیز کا ایک مقصد ہوتا ہے، جب تک کوئی شئے اپنے مقصد کے ساتھ ہو اسے مفید سمجھا جاتا ہے اور جب کوئی چیز اپنے مقصد سے خالی ہو جائے تو وہ لغو اور بے کار ہو جاتی ہے۔ ''اذا خلا الشیء عن غایتہ فقد لغا'' انسان کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد ''الا لیعبدون'' اللہ کی عبادت کے سوا کچھ نہیں، مگر دنیا میں آ کر انسان اس کی دلچسپیوں میں اس طرح منہمک ہوا کہ عبادت کو اوڑھنا بچھونا بنانے کی بجائے کھانا پینا اور نفس کے تقاضوں کو پورا کرنا مقصود زندگی بنا لیا اور اس کی تمام توجہات اور کوششیں پیٹ بھرنے اور نفس پروری میں صرف ہونے لگیں۔

اسلام نے ایک ماہ کے روزے فرض کئے اور اس بھولے ہوئے غافل انسان کو بتلایا کہ کھانا پینا ہی مقصود زندگی نہیں ہے اور ایک ماہ میں ایک معین عرصے تک کھانے پینے کو چھڑا

کر یہ سمجھایا کہ محض کھانا التفات کے لائق نہیں، اصل چیز تو اللہ تعالیٰ کی بندگی ہے۔

روزے کے دنیاوی فوائد

ہوشیار حکماء معدے کو اعتدال پر لانے کے لئے مریض کو اسہال دیا کرتے ہیں، جس سے جسمانی نظام معتدل ہو جاتا ہے۔ انتڑیوں کی کثافت صاف ہو جاتی ہے اور جسم کا تنقیہ ہو جاتا ہے۔

اسلام کا روزہ بھی انسانی جسم کے لئے اسہال کا کام کرتا ہے، بھوک و پیاس، بدن کے غلیظ مادوں کو جلا دیتی ہے اور بدن بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں اکثر مرتبہ ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ اسے وقت پر کھانا نہیں ملتا، دیر سے ملتا ہے یا ملتا ہی نہیں، اگر اسے بھوک و پیاس برداشت کرنے کی عادت نہ ہو تو ایسے موقع پر اس سے بڑی بے صبری اور غم وغصہ کا اظہار ہوتا ہے، روزہ رکھنے سے صبر وحلم اور برداشت کی عادت پڑتی ہے اور پھر ایسے مواقع انسان کے لئے اجنبی نہیں رہتے۔

روزے کے فیوض و برکات

اسلام کی ہر عبادت اپنے اندر کریمانہ شان رکھتی ہے۔ گناہ گاروں کی بخشش کا سامان اور نیکوکاروں کی ترقی درجات کا سبب بنتی ہے۔ کریم کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کے پاس محتاج کو چل کر جانا پڑتا ہے۔ جیسے پیاسے کے لئے کنواں، انسان پیاسا ہو کنواں اس کی پیاس بجھا دے گا مگر آ کر نہیں۔ پیاسے کو خود اس کے پاس جانا ہوگا۔ دوسرا کریم وہ ہے کہ محتاج کو اس کے پاس جانا نہیں پڑتا اور وہ خود محتاج کے گھر آ کر خیرات دے جاتا ہے۔ جیسے پیاسے کے لئے بادل، پیاسے کو اس کے پاس جانا نہیں پڑتا، بادل خود ابر رحمت بن کر اس کے گھر آ کر برس جاتا ہے۔

اسلام کی ہر عبادت کریم ہے، مگر انسان کو اس کے مقام تک جانا پڑتا ہے، وہ آ کر کرم نہیں کرتی، نمازی کو مسجد تک جانا پڑتا ہے۔ حاجی کو بیت اللہ شریف تک اور زکوٰۃ دینے والے کو فقیر تک پہنچنا ہوتا ہے، مگر روزہ ایسا کریم ہے کہ کسی کو اس تک جانا نہیں پڑتا، وہ خود رحمت کی بارش بن کر ہر گھر میں برس جاتا ہے، گناہ گاروں پر بخشش کی بارشیں کر جاتا ہے۔

قیامِ رمضان

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور جمہور علماء رمضان شریف میں وتر کے سوا بیس رکعات کے ساتھ قیام کرتے ہیں۔ امام مالک اگرچہ چھتیس رکعات قیام کرتے ہیں، لیکن وہ ہر ترویحہ کے بعد چار رکعات، طواف اور رکعات طواف کے قائم مقام پڑھتے ہیں، اس طرح ان کا مسلک بھی بیس رکعات قیام ہے۔

اہل ظواہر آٹھ رکعات تراویح پڑھتے ہیں اور اس کے بارے میں سنت نبوی کا دعویٰ رکھتے ہیں اور بیس رکعات تراویح کو بدعت اور مخالف طریقۂ رسول قرار دیتے ہیں۔ اس مقالہ میں ہم پہلے بیس رکعات تراویح پر دلیل پیش کریں گے اور اس دلیل پر ظاہریہ کے شبہات کے جوابات رقم کریں گے۔ اس کے بعد اس دلیل کا تجزیہ کریں گے، جس پر ظاہریہ نے آٹھ رکعات تراویح کی اساس رکھی ہے۔

بیس رکعات تراویح

امام عبدالرزاق نے اپنی مصنف اور امام بیہقی نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً سِوَى الْوِتْرِ۔ (شرح النقایہ ج ا ص ۱۰۴)

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ نبی علیہ السلام وتر کے علاوہ رمضان میں بیس رکعات پڑھا کرتے تھے۔

اس حدیث سے اہل ظواہر اعتراض کرتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابوشیبہ ابراہیم بن عثمان ہے، جس کے ضعف پر محدثین کا اتفاق ہے، اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ ابوشیبہ پر بلاشبہ بعض ناقدین سے جرح مبہم منقول ہے، لیکن بعض محدثین نے اس کی تعدیل بھی فرمائی ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ ابوشیبہ حافظ ہے۔ ابن عدی فرماتے ہیں: "له احاديث صالحة"۔ یزید بن ہارون فرماتے ہیں کہ وہ اعدل القضاۃ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اس حدیث کے بارے میں

فرماتے ہیں:

حالانکه ابو شیبة جد ابو بکر آن قدر ضعف ندارد که روایت او مطروح مطلق ساخته می شود۔	ابوشیبہ اس قدر ضعیف نہیں ہے کہ اس کی روایت کو مطلقاً نظر انداز کر دیا جائے۔

(فتاویٰ عزیزی ج ا ص ۱۱۹)

ثانیاً یہ کہ امام عبدالرزاق اور بیہقی کو جس سند سے یہ حدیث پہنچی ہے اس میں بلاشبہ ابو شیبہ موجود ہے، جس کے ضعف کے بعض محدثین قائل ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ جنہوں نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ ابوشیبہ پر مقدم ہیں۔ پس جن کی سند میں ابوشیبہ ہوگا وہ ضعیف ہوگی۔ امام صاحب جو اس پر کثیر مراتب سے مقدم ہیں، ان کے حق میں اس حدیث کی سند ضعف سے کس طرح متصف ہوگی۔ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں:

ان قیل بضعف شیء من ادلة مذهبه فذالک الضعف انما هو بالنظر للرواة النازلین عن سنده بعدموته۔ (میزان الشریعۃ الکبریٰ ج ا ص ۷۰)	اگر امام ابوحنیفہ کے مذہب کی کسی دلیل کی طرف راوی کے ضعف کی نسبت کی جائے تو وہ ضعف بعد کے راویوں کی نظر سے ہے اور امام اعظم نے جس سند سے حدیث لی ہے وہ ان ضعیف راویوں پر مقدم ہے۔

ثالثاً علماء اصول نے تصریح کی ہے کہ "تلقی بالقبول" سے بھی حدیث کو تقویت پہنچتی ہے اور "تلقی بالقبول" کے بعد وہ حدیث احتجاج اور استدلال کی صلاحیت رکھتی ہے اور چونکہ اس حدیث کو جمہور علماء اور مجتہدین نے قبول کیا ہے لہٰذا اس کا ضعف جاتا رہا۔

رابعاً اس حدیث سے بیس رکعات تراویح پر امام ابوحنیفہ اور دوسرے ائمہ مجتہدین نے استدلال کیا ہے اور جب مجتہد کسی حدیث سے استدلال کرے تو وہ استدلال اس حدیث کی صحت کی دلیل ہوتا ہے۔ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں:

وکفانا صحة الحدیث استدلال مجتهد به (میزان الشریعۃ الکبریٰ ج ا ص ۷۰)	کسی حدیث کی صحت کیلئے یہ امر کافی ہے کہ اس سے کسی مجتہد نے استدلال کیا ہو۔

اور علامہ شامی فرماتے ہیں:

ان المجتھد اذا استدل بحدیث کان تصحیحاله کما فی التحریر وغیرہ۔ (ردالمحتار ج ۴ ص ۵۱)

مجتہد جب کسی حدیث سے استدلال کرے تو وہ استدلال اس حدیث کی صحت کی دلیل ہوتا ہے، اسی طرح ابن ہمام نے تحریر میں تقریر کی ہے۔

خامسا یہ حدیث آثار صحابہ سے مؤید ہے کیونکہ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور کثیر اجلہ صحابہ سے مروی ہے کہ وہ بیس رکعات تراویح پڑھا کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمایئے، امام بیہقی نے اپنی "سنن" میں سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے:

عن السائب بن یزید قال کانوا یقومون علی عھد عمر فی شھر رمضان بعشرین رکعۃ۔

(سنن بیہقی ج ۲ ص ۴۹۶، فتح الباری ج ۵ ص ۱۵۷)

سائب بن یزید سے مروی ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں لوگ بیس رکعات تراویح پڑھا کرتے تھے۔

نیز امام ترمذی اپنی "صحیح" میں فرماتے ہیں:

واکثر اھل العلم علی ما روی عن علی و عمر و غیرھما من اصحاب النبی ﷺ عشرین رکعۃ (جامع ترمذی ص ۱۳۹)

اکثر اہل علم کا مسلک حضرت علی، عمر اور دوسرے صحابہ کی روایت کے مطابق بیس رکعات تراویح ہے۔

اور علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

واحتج اصحابنا والشافعیۃ والحنابلۃ بما رواہ البیہقی باسناد صحیح عن السائب ابن یزید الصحابی قال کانوا یقومون علی عھد عمر رضی اللہ عنہ بعشرین رکعۃ و علی عھد عثمان و علی رضی اللہ عنھما مثلہ۔ (عمدۃ القاری ج ۷

ہمارے اصحاب حنفیہ اور شافعیہ وحنابلہ نے بیہقی کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جو سائب بن یزید سے مروی ہے کہ حضرت عمر کے زمانہ میں لوگ بیس رکعات تراویح پڑھا کرتے تھے، اسی طرح حضرت علی اور عثمان کے زمانہ میں۔

ص ۱۷۸)

سادسا حضرت عمر اور دیگر اجلہ صحابہ کا بیس رکعات تراویح پڑھنا، اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے پاس بیس رکعات پر اصل صحیح موجود تھی، ورنہ (العیاذ باللہ) لازم آئے گا کہ ان اجلہ اور افاضل صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہو اور یہ صحابہ کرام سے کبھی متصور نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ علامہ شامی اور شیخ حسن بن عمار فرماتے ہیں:

روی اسد بن عمرو عن ابی یوسف قال سالت ابا حنیفة عن التراویح و ما فعله عمر رضی الله عنه فقال التراویح سنة مؤکدة ولم یخترعه عمر من تلقاء نفسه ولم یکن فیه مبتدعا ولم یامر به الاعن اصل لدیه و عهد من رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۶۵۹، مراقی الفلاح علی ہامش الطحطاوی ص ۲۴۶)

اسد بن عمرو ابو یوسف سے روایت کرتے ہیں کہ ابو یوسف نے امام ابو حنیفہ سے تراویح اور حضرت عمر کے فعل کے بارے میں پوچھا، امام اعظم نے فرمایا کہ تراویح سنت مؤکدہ ہے۔ حضرت عمر نے اسے اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا اور انہوں نے بغیر اصل صحیح اور فرمان نبوی کے تراویح کا امر نہیں فرمایا۔

اس مقام پر یہ شبہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام سے گیارہ رکعات تراویح پڑھنے کی بھی روایت بیہقی اور دوسری کتب میں موجود ہے، اس کا جواب امام بیہقی نے مرحمت فرمایا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اس کو اپنے فتاویٰ میں اس طرح نقل کیا ہے:

''بیہقی نے ان دو روایتوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ پہلے صحابہ کرام نے گیارہ رکعات پڑھیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تہجد کا عدد مشہور گیارہ ہی ہے اور قیام اللیل، تراویح اور تہجد دونوں میں قدر مشترک ہے، پس اس قدر مشترک کی وجہ سے اولاً صحابہ کرام تراویح بھی گیارہ رکعات پڑھتے رہے، پھر جب ان کے نزدیک دلیل سے ثابت ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بیس رکعات تراویح پڑھتے تھے تو انہوں نے تراویح کے لئے بیس اور وتر کے لئے تین کا عدد اختیار کرلیا اور پھر اس پر اجماع منعقد ہوگیا''۔ (فتاویٰ عزیزی ج ۱ ص ۱۲۰)

شاہ عبدالعزیز کے اس کلام سے ظاہر ہوگیا کہ صحابہ کرام کا بیس رکعات کو اختیار کرنا

اپنی اختراع اور ابتداع سے نہ تھا، بلکہ ان کا مختار دلیل اور سنت رسول پر مبنی تھا۔

سابعاً بیس رکعات تراویح قیاس کے بھی موافق ہیں کیونکہ یہ نوافل ہیں اور نوافل زائض اور واجبات کے مکمل اور متمم ہوتے ہیں اور وتر سمیت دن رات میں بیس رکعات زض اور واجب ہیں، پس ان کے مکمل اور متمم کو بھی بیس رکعات ہی ہونا چاہئے۔

ثامناً بیس رکعات تراویح لغت کے بھی مطابق ہیں کیونکہ لغت کے اعتبار سے تراویح ترویحہ کی جمع ہے اور جمع کا اطلاق عربی قواعد کے اعتبار سے دو سے زیادہ پر ہوتا ہے اور ہر چار رکعات کے بعد ایک ترویحہ ہوتا ہے، پس لامحالہ تراویح آٹھ رکعات سے زیادہ ہوں گی اور چونکہ قائل فالفصل کوئی نہیں ہے، اس لئے تراویح کو بیس رکعات پر ہی محمول کیا جائے گا۔

تاسعاً ہم سے اصحاب ظواہر مطالبہ کرتے ہیں کہ بیس رکعات تراویح کے ثبوت میں کوئی صحیح مرفوع متصل حدیث پیش کرو، جس حدیث سے ہم نے بیس رکعات تراویح پر تمسک کیا ہے، گزشتہ سطور میں ہم اس حدیث کا رفع اور صحت دونوں ثابت کر چکے ہیں، اب ہم اصحاب ظواہر سے گزارش کرتے ہیں کہ آپ ہر سال رمضان کی تمام راتوں میں آٹھ رکعات تراویح مساجد میں جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں اور اس میں ختم قرآن کا التزام کرتے ہیں۔ اب معروض یہ ہے کہ ہمارے دلائل تو آپ تسلیم نہیں کرتے، اب جس صحیح اور صریح حدیث سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تراویح پڑھنے کا ثبوت ہے، وہ فقط اتنا ہے کہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے پہلے سال صحابہ کے ساتھ رمضان کی تئیس، پچیس اور ستائیس کی شب کو قیام فرمایا، اس کے بعد جب صحابہ جمع ہوئے تو آپ تشریف نہ لائے اور فرمایا: مبادا یہ فرض ہو جائے۔ (بخاری، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

اور امام بخاری ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک یوں ہی معاملہ رہا، پھر ابوبکر کے تمام دور خلافت میں اور حضرت عمر کے ابتدائی ایام میں لوگ یونہی الگ الگ تراویح پڑھتے رہے۔

عبدالرحمٰن بن عبدالقاری سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں رمضان کی ایک شب حضرت عمر کے ساتھ مسجد میں گیا تو دیکھا لوگ الگ الگ تراویح پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے

فرمایا کہ کیا ہی اچھا ہوا اگر میں انہیں ایک امام کی اقتداء میں جمع کر دوں، پھر جب دوسری رات کو میں حضرت عمر کے ساتھ گیا تو دیکھا کہ لوگ ابی بن کعب کی اقتداء میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا: ''نعمت البدعة هذه'' ''یہ کیا خوب بدعت ہے''۔
(بخاری ج ا ص ۲۶۹)

ان دونوں حدیثوں سے حسب ذیل امور ظاہر ہوئے۔

(ا) صحیح اور صریح حدیث سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف آخری رمضان میں تراویح پڑھنا ثابت ہے۔

(ب) اس آخری رمضان کی بھی صرف تین راتوں میں تراویح پڑھنا ثابت ہے۔

(ج) عہد رسالت میں ان تین راتوں کے سوا تراویح کی جماعت ثابت نہیں ہے۔

(د) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تراویح میں ختم قرآن ثابت نہیں۔

اب اولاً گزارش ہے کہ آپ کے معیار پر صحت اور صراحت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف ایک رمضان میں تراویح پڑھنا ثابت ہے۔ اب آپ جو ہر رمضان میں تراویح پڑھتے ہیں، اس پر صحیح صریح اور مرفوع متصل حدیث پیش کیجئے۔ ثانیاً حضور سے صراحت کے ساتھ صرف تین راتوں میں تراویح ثابت ہے، آپ جو رمضان کی ہر شب میں تراویح پڑھتے ہیں اس پر صحت صراحت رفع اور اتصال سے حدیث لائیے۔ ثالثاً آپ رمضان کی ہر شب کو مسجد میں جماعت کے ساتھ تراویح پڑھتے ہیں۔ حالانکہ نوافل میں اصل یہ ہے کہ گھر میں انفراداً پڑھے جائیں: لقوله عليه السلام ''اَفْضَلُ صَلٰوةِ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهٖ اِلَّا الْمَكْتُوْبَةَ'' (رواہ مسلم) ''مرد کی نماز میں افضلیت یہ ہے کہ گھر میں پڑھے سوائے فرائض کے''۔ پس اب آپ رمضان کی ہر شب کو مسجد میں جماعت سے تراویح پڑھنے سے حدیث صحیح مرفوع متصل پیش کیجئے۔ رابعاً آپ رمضان میں ختم قرآن کا التزام کرتے ہیں، اس امر پر صحت صراحت، رفع اور اتصال سے حدیث لائیے۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔

اور اگر آپ ان چاروں امور پر مذکورۃ الصفات حدیث نہ پیش کر سکیں اور کبھی نہیں پیش کر سکتے تو ان چار وجوہ سے اپنی تراویح کے بدعت ہونے کا اعتراف کر لیجئے۔

عاشرۂ آخر رمضان اور رمضان کی ہر شب کو مسجد میں جماعت اور ختم قرآن کے التزام کے ساتھ تراویح پڑھنے سے سوائے آثار صحابہ کے آپ کے پاس اور کوئی دلیل نہیں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ عملی طور پر آثار صحابہ آپ کے نزدیک بھی اصل اور حجت کا درجہ رکھتے ہیں۔ پس آپ جہاں ان امور میں اس اصل کا اعتبار کرتے ہیں تو رکعات کے عدد میں اس اصل کا اعتبار کرنے سے کون سا امر مانع ہے۔

ایک اشتباہ پر انتباہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت کردہ حدیث جس میں بیس رکعات کو ثابت کیا گیا ہے، اس پر ظاہریہ کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت عائشہ کی اس صحیح روایت کے معارض ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ تراویح آٹھ رکعات ہیں اور اسی حدیث کی اساس پر ظاہریہ نے آٹھ رکعات تراویح کی عمارت قائم کی ہے اور چونکہ بیس رکعات اس حدیث سے متعارض ہیں، اس لئے انہوں نے بیس رکعات کو بدعت سیئہ قرار دیا۔ ہم ذیل میں اس حدیث کو پیش کر کے ظاہریہ کے شبہات کو رفع کریں گے، تاکہ بیس رکعات کا مسلک کلیتاً بے غبار ہو جائے۔ امام بخاری نے اپنی "صحیح" کی "کتاب التہجد" میں ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت کیا:

اَنَّهُ سَأَلَ عَائِشَةَ كَيْفَ كَانَتْ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ رَمَضَانَ فَقَالَتْ مَا كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزِيْدُ فِيْ رَمَضَانَ وَلَا فِيْ غَيْرِهٖ عَلٰى اِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً يُصَلِّيْ اَرْبَعًا فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَ طُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ اَرْبَعًا فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَ طُوْلِهِنَّ ثُمَّ يُصَلِّيْ ثَلٰثًا قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَتَنَامُ قَبْلَ اَنْ تُوْتِرَ فَقَالَ يَا	ابو سلمہ نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں کیسے نماز پڑھتے تھے؟ ام المؤمنین نے فرمایا کہ حضور رمضان ہو یا غیر رمضان کبھی گیارہ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، چار رکعات پڑھتے، نہ پوچھ ان کا حسن اور طول کیسا تھا، پھر چار رکعات پڑھتے نہ پوچھ ان کا حسن اور طول کیسا تھا، پھر تین رکعات وتر پڑھتے۔ ام المؤمنین نے

عَائِشَةُ اِنَّ عَيْنِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۱۵۴)

پوچھا: آپ وتر سے پہلے سو جاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: بلاشبہ میری آنکھیں سو جاتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔

شرذمہ ظاہر یہ کا مقصد یہ ہے کہ حضور نے کبھی رات کو آٹھ رکعات سے زیادہ نماز ادا نہیں فرمائی، پس اگر بیس رکعات تراویح کے سنت رسول ہونے کا قول کیا جائے تو اس صحیح حدیث سے تعارض لازم آئے گا۔

اس شبہ کے حسب ذیل جوابات پیش خدمت ہیں۔

(۱) اس حدیث کو بعض اہل علم نے مضطرب قرار دیا، چنانچہ خاتم الحفاظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

قال قرطبی اشكلت روايات عائشة على كثير من اهل العلم حتى نسب بعضهم حديثها الى الاضطراب۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۲۶۳)

اس باب میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایات کثیر اہل علم پر موجب اشکال ہو گئیں۔ اسی وجہ سے بعض اہل علم نے اس حدیث کو مضطرب قرار دیا۔

پس یہ حدیث اپنے مستدل میں مسلم اور قطعی نہ رہی اور درجۂ استدلال سے ساقط ہو گئی۔

(۲) مسلم نے ابوسلمہ کی اس حدیث کو چار طریق سے بیان کیا ہے، ایک طریقہ میں ابو سلمہ کے جواب میں ام المؤمنین فرماتی ہیں: آپ نے تیرہ رکعات پڑھی ہیں، دوسرے میں فرماتی ہیں: گیارہ رکعات پڑھی ہیں۔ تیسرے میں فرماتی ہیں نو رکعات پڑھی ہیں۔ (مسلم ج ا ص ۲۵۴-۲۵۵) اب وتر کی تین رکعات منہا کر لیں تو ابوسلمہ کی ایک روایت کا مقتضیٰ دس رکعات اور دوسری کا تقاضا آٹھ رکعات اور تیسری کا ثمرہ چھ رکعات ہیں، پس اس قدر تعارض اور اضطراب کے باوجود اس حدیث سے آٹھ رکعات پر استدلال کرنا بوالعجبی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

(۳) مسلم کے علاوہ ابوسلمہ کی یہ روایت ''بخاری'' میں بھی تعارض اور اضطراب سے خالی

نہیں۔ "کتاب التہجد" میں بخاری نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے کہ آپ رمضان ہو یا غیر رمضان آٹھ رکعات سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے اور باب "ما یقرء فی صلوۃ الفجر" میں حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ بشمول وتر تہجد کی تیرہ رکعات ادا فرماتے تھے۔ پھر جب صبح کی اذان سنتے تو دو رکعات سنت فجر ادا فرماتے۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۵۶)

پس وتر منہا کرنے کے بعد حضرت عائشہ کی پہلی روایت کا مقتضیٰ آٹھ رکعات اور دوسری کا تقاضا دس رکعات ہے، ان میں سے ایک روایت کو اپنے مسلک کی اساس بنانا اور دوسری کو بے عمل چھوڑ دینا ہوائے نفس اور بطلان محض کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

(۴) ابو سلمہ کی یہ روایت تہجد کے بیان میں ہے، اس لئے تراویح پر استدلال کرنا قطعاً باطل ہے۔ اس نماز کو تہجد پر محمول کرنے کے لئے حسب ذیل قرائن ہیں:

(ا) امام بخاری اور دوسرے ائمہ حدیث نے اس روایت کو تہجد اور قیام اللیل کے ابواب میں ذکر فرمایا ہے۔

(ب) وتر کو منہا کرنے کے بعد حضرت عائشہ کی روایات سے رکعات کا تعین چھ سے دس تک ہے اور یہ اختلاف تہجد کے مناسب ہے نہ کہ تراویح کے۔

(ج) حضرت عائشہ نے فرمایا کہ حضور رمضان اور غیر رمضان میں آٹھ رکعات ادا فرماتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ کا یہ جواب اس نماز کے بارے میں ہے جو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں مشترک ہے اور رمضان اور غیر رمضان میں تہجد مشترک ہے نہ کہ تراویح۔

(د) اس حدیث کے نفس مضمون سے ظاہر ہو گیا کہ حضور یہ نماز رات کو بیدار ہو کر پڑھتے تھے اور نیند سے بیدار ہو کر نماز پڑھنا تہجد کا خاصہ ہے تراویح کا نہیں۔

(ہ) علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"ان التھجد والوتر مختصۃ بصلوۃ اللیل"۔ (فتح الباری ج ۴ ص ۲۶۳)

علامہ ابن حجر کی یہ عبارت اس مطلوب پر قاہر دلالت ہے کہ یہ نماز تہجد ہے تراویح

نہیں۔

(د) اس روایت کے تمام طرق دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو سلمہ نے حضرت عائشہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رمضان میں تہجد کا سوال کیا تھا۔ لیکن بعض رواۃ نے اختصاراً لیل کا لفظ چھوڑ دیا اور اس حک و حذف پر قرینہ یہ ہے کہ دوسرے راویوں نے لیل کا ذکر کیا ہے۔

(ز) اس حدیث کو ابو سعید سے سعید مقبری، یحییٰ بن ابی کثیر اور عبداللہ بن ابی لبید نے روایت کیا ہے اور رمضان کا لفظ اس روایت میں فقط سعید نے زیادہ کیا ہے۔ (مسلم ج ا ص ۲۵۵) اور یہ زیادتی اصطلاح حدیث میں شاذ ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہ سوال مطلقاً تہجد کے بارے میں تھا اور اب اس نماز کو تراویح پر محمول کرنے کے لئے ظاہریہ کے پاس کوئی سہارا بھی باقی نہیں رہا۔

تراویح اور تہجد میں فرق

اصحاب ظواہر تنگ آ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت عائشہ نے جس نماز کی رکعات بیان فرمائی ہیں وہ تہجد ہے، لیکن تراویح اور تہجد میں کوئی فرق نہیں، جو نماز غیر رمضان میں تہجد ہوتی ہے اسی نماز کو رمضان میں تراویح کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں مندرجہ ذیل امور پر غور فرمائیں۔

(۱) حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام کے کسی فرمان سے یہ بات ثابت نہیں کہ تہجد اور تراویح ایک ہی چیز ہیں، بلکہ آثار و سنن سے جو امر ثابت ہے وہ یہ ہے کہ تہجد رمضان و غیر رمضان میں عام اور مشترک ہے اور تراویح رمضان کے ساتھ خاص اور منفرد ہے اور عام کو خاص کا عین قرار دینا شدید غفلت کھلا بطلان ہے۔

(۲) روزے دو ہجری کو فرض ہوئے اور تہجد اس سے پہلے بھی مشروع تھی اور روزوں کی فرضیت کے بعد حضور نے فرمایا: "جعل اللہ صیامہ فریضۃ و قیامہ تطوعا" (مشکوٰۃ ص ۱۷۳)۔ پس معلوم ہوا کہ تہجد مقدم ہے اور تراویح مؤخر ہے اور مؤخر کو مقدم کا عین قرار دینا محض خود فریبی، باطل اور مردود ہے۔

(۳) تہجد کے عدد میں تعین نہیں، چار سے لے کر دس رکعات تک تہجد کا پڑھنا ثابت اور متفق علیہ ہے اور تراویح کی رکعات کا عدد ہر ایک کے نزدیک معین ہے اور معین کو غیر معین کا عین قرار دینا بداہۃً باطل ہے۔

(۴) بخاری میں ہے: حضرت عمر نے رمضان کی ایک شب تراویح کو دیکھ کر فرمایا: "والتی تنامون عنها افضل من التی تقومون" یعنی تہجد تراویح سے افضل ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان اس امر پر نص ناطق ہے کہ رمضان میں بھی تہجد تراویح کے مغائر ہوتی ہے۔

قیام رمضان کے بارے میں اہل سنت کثرہم اللہ تعالیٰ کے مسلک کے مطابق بیس رکعات تراویح پر دلائل اور مخالفین کے شکوک وشبہات کے جواب میں ایک مختصر مضمون لکھ کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ اسے ہدایت اور ثبات کا ذریعہ بنائیں۔ آمین



حقائق شب قدر

اللہ تعالیٰ نے فرزندان اسلام کو متعدد مقدس اور مبارک راتیں عطا فرمائیں ہیں۔ شب میلاد، شب معراج، شب برأت اور شب قدر، یہ سب ہی قدر و منزلت کی راتیں ہیں، ان راتوں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے انعام و اکرام سے نوازا ہے۔ یوں تو کوئی لمحہ اس کی عطا سے خالی نہیں، اگر اس کی عطا نہ ہو تو عالم ویران ہو جائے، مگر اس کی نوازشوں کا جو انداز شب قدر میں ہوتا ہے، وہ کسی اور رات میں نظر نہیں آتا۔ اس رات میں اس نے اپنا کلام اتارا اور اس نعمت سے کتنی ہی نعمتوں کے دروازے کھلے، زبان انسان نطق یزداں کی محافظ بنی، سینہ بشریت لاہوتی اسرار کا محرم ہوا اور پیکر آب و گل میں وحی الٰہی کے فانوس روشن ہو گئے۔

شب قدر کا معنی اور مفہوم

قدر کے ایک معنی مرتبے کے ہیں۔ اس رات کو شب قدر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ سال کی باقی راتوں کے مقابلہ میں یہ زیادہ بلند پائے اور عظیم مرتبہ کی رات ہے، یا اس لئے کہ اس رات میں عبادت کی قدر و منزلت باقی راتوں کی نسبت ہزار مہینوں کی راتوں سے بھی زیادہ ہے یا اس سبب سے کہ اس رات کے عابدوں کی قدر اللہ کے نزدیک باقی راتوں کے عابدوں سے کہیں زیادہ ہے، قدر کا لفظ قضاء و قدر کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور فرشتوں کو چونکہ اس رات انسان کی ایک سال کی تقدیر کا قلمدان سونپ دیا جاتا ہے اس لئے اس رات کو شب قدر کہتے ہیں۔ قدر کے ایک معنی تنگی کے بھی ہیں، چونکہ فرشتے بڑی کثرت سے اس رات زمین پر اترتے ہیں، یہاں تک کہ زمین تنگ ہو جاتی ہے، اس وجہ سے بھی اس رات کو شب قدر کہتے ہیں۔

حصول شب قدر کا سبب

رسول اکرم ﷺ گزشتہ امتوں کے احوال بیان فرماتے تھے۔ ان کی ریاضتوں کا طول اور عبادتوں کی کثرت بتلاتے تھے، اسی اثناء میں ایک دن فرمایا کہ بنی اسرائیل کے

ایک شخص نے ہزار ماہ جہاد کیا، ایک مرتبہ فرمایا کہ شمعون علیہ السلام ایک ہزار ماہ تک راہ خدا میں کفار سے لڑتے رہے، وہ جو دن رات حصول عبادت اور مسابقت خیر میں کوشاں رہتے تھے، انہوں نے جب ان طویل عبادتوں کا قصہ سنا تو پژمردہ ہو گئے۔ لمبی عبادتوں کی اس دوڑ میں آگے بڑھنے کے لئے شوق کا ایک شرارہ اٹھا اور اپنی عمروں کی تنگ دامانی دیکھ کر سرد پڑ گیا۔ جب حضور فرماتے کہ بنی اسرائیل کے فلاں شخص نے اسی سال عبادت کی اور کوئی گناہ نہ کیا تو اس مقام کے حصول کے لئے دل مچلتے اور منزل کو اختیار سے باہر پا کر آزردہ ہو جاتے، شوق کی لہریں ابھرتیں اور قضاء و قدر کی چٹان سے ٹکرا کر بیٹھ جاتیں۔ رحمت خداوندی سے بندوں کا یہ کرب دیکھا نہ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بتایا تمہاری عمر نہیں بڑھ سکتی، اجر تو بڑھ سکتا ہے، ہزار ماہ کی طویل عمر نہ سہی، ہم تمہیں ایک ہی رات میں ہزار ماہ کا اجر دے دیتے ہیں۔

ماہِ صیام اور شب قدر

قرآن کریم فیاض ہے، اسے نازل کرنے کے لئے رات بھی ایسی ہونی چاہیے تھی جو اپنی فیاضی میں آخری سرحدوں کو پہنچی ہوئی ہو۔ اس لئے قرآن کریم شب قدر جیسی فیاض شب میں نازل کیا گیا۔ رمضان کی کسی ایک طاق رات میں شب قدر آتی ہے، کسی اور ماہ میں بھی آسکتی تھی، مگر اس رات میں اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام اتارنا تھا۔ بندوں کو اپنی صفت کا امین بنانا تھا۔ لہٰذا اس کے لئے وقت بھی ایسا درکار تھا جس میں بندوں کو اپنے رب سے کچھ مناسبت ہوتی۔ رمضان میں بندے اپنے مولا سے قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مادی اقتضاء کے باوصف تجرد کو اپنانے میں لگے رہتے ہیں۔ تنزیہہ و تقدیس کی ایک جھلک کے حصول کی خاطر کھانے پینے اور دوسرے طبعی تقاضوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر جب مادیت کے حجاب اٹھتے ہیں تو سینہ بشریت اسرار وحی کے لائق ہو جاتا ہے۔

شب قدر کی تعیین

شب قدر کی تعیین میں علامہ ابن حجر عسقلانی نے ''فتح الباری'' میں چھیالیس اقوال دلائل کے ساتھ ذکر کئے ہیں۔ ہم ان میں سے ائمہ مذاہب کے اقوال منتخب کر رہے ہیں۔

امام مالک بن انس، امام احمد بن حنبل اور سفیان ثوری کا مذہب ہے کہ شب قدر ہمیشہ ایک تاریخ میں نہیں ہوتی، بلکہ رمضان کے آخری عشرہ میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ امام شافعی کا مذہب ہے کہ شب قدر آخری عشرہ کی پہلی رات میں ہے اور مشہور رائے کے مطابق امام ابو حنیفہ کے نزدیک سال کی کسی تاریخ میں یہ رات ہوسکتی ہے۔ لیکن علامہ بدرالدین عینی حنفی فرماتے ہیں کہ امام اعظم کے نزدیک شب قدر رمضان ہی کی کسی رات میں ہوتی ہے اور امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک یہ رمضان کی ایک معین رات میں ہوتی ہے۔

شب قدر کے تعین میں اس قدر اختلاف کے باوجود جمہور امت کا اس پر اتفاق ہو چکا ہے کہ یہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے اور اکثرین کا مختار یہی ہے کہ شب قدر رمضان کی ستائیسویں شب ہے۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بغیر کسی استثناء کے قسم کھا کر فرماتے تھے کہ یہ ستائیسویں رات ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ عدد طاق ہے اور طاق اعداد میں سات کا عدد پسندیدہ ہے، وہ اس پر سات زمینوں، سات آسمانوں، سات اعضاء پر سجدہ، ہفتہ کے سات دنوں اور طواف کے سات پھیروں سے استدلال کرتے تھے اور جب ثابت ہوگیا کہ سات کا عدد پسندیدہ ہے تو پھر یہ رات رمضان کے آخری عشرہ کی ساتویں رات ہونی چاہئے۔ فخر رازی نے حضرت ابن عباس سے یہ بھی نقل کی ہے کہ لیلۃ القدر کے حرف نو ہیں اور یہ لفظ قرآن کریم میں تین مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، جن کا مجموعہ ستائیس ہے، پس یہ رات ستائیسویں ہی ہونی چاہیے۔

بہرحال یہ سب قرائن ہیں اور زیادہ سے زیادہ ظن کا فائدہ پہنچاتے ہیں اور شب قدر کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کون سی رات ہے۔

شب قدر کے اخفاء کی حکمتیں

اللہ اور اس کے رسول نے صراحتاً شب قدر کی تعیین نہیں فرمائی اور عروس لیلۃ القدر کو ابہام کے حجاب میں مستور رکھا ہے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ شب قدر کو اس لئے آشکار انہیں کیا تا کہ امت میں ذوق تجسس اور گرمی عمل برقرار رہے، نیز لکھتے ہیں کہ اگر لیلۃ القدر کو ظاہر کیا جاتا تو لوگ عام طور پر اسی رات کی عبادت پر اکتفا کر لیتے اور راہ عمل مسدود ہو جاتی۔ یہ بھی

کہتے ہیں کہ اللہ کو اپنے بندوں کا جاگنا اور اسے یاد کرنا زیادہ محبوب ہے۔ عدم تعیین کے سبب لوگ شب قدر کی تلاش میں متعدد راتیں جاگ کر گزاریں گے، اس لئے اس کو مخفی رکھا۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اگر شب قدر کو معین کر دیا جاتا تو جس طرح اس رات میں عبادت کا ثواب ہزار ماہ کی عبادت جتنا ہوتا اسی طرح اس میں گناہ بھی ہزار درجہ بڑھ جاتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس رات کو ابہام اور خفاء میں رکھا تاکہ اگر کوئی شخص اس رات کو پا کر عبادت کرے تو اسے ہزار ماہ کی عبادتوں کا ثواب مل جائے، لیکن اگر کوئی شخص غفلت اور جہالت سے اس رات میں کوئی گناہ کر بیٹھے تو تعیین کا علم نہ ہونے کی وجہ سے لیلۃ القدر کی عظمت مجروح کرنے کا گناہ اس کے ذمہ نہ آئے۔

علم رسالت اور شب قدر

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شب قدر کی تعیین کا علم تھا یا نہیں۔ ہمارے نزدیک تو یہ بحث بھی بے ادبی ہے۔ نبی کو دین کے احکام اور شریعت کے اسرار کا بھی علم نہ ہو تو پھر نبوت کا کیا مفہوم رہ جاتا ہے؟ لیکن اس بے لگام دور میں چونکہ کچھ لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شب قدر کی تعیین کا علم نہیں تھا، اس لئے ہم بھی اس موضوع پر کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک حدیث پیش کی جاتی ہے جسے عبادہ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں لیلۃ القدر بتانے تشریف لائے تو دو مسلمان آپس میں لڑنے لگے، آپ نے فرمایا: میں تم کو لیلۃ القدر کی خبر دینے آیا تھا، پس فلاں فلاں لڑ پڑے اور اس (کی تعیین) کو اٹھا لیا گیا اور شاید یہ تمہارے لئے بہتر ہو۔ پس اس رات کو انتیس، ستائیس اور پچیسویں تاریخوں میں تلاش کرو۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۷۱) اس حدیث کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے نفی علم پر استدلال کیا جاتا ہے۔

قد اریت ھذا اللیلۃ ثم انسیتھا۔ مجھے یہ رات دکھائی گئی تھی، پھر بھلا دی گئی۔

(بخاری ج ۱ ص ۲۷۱)

آیئے! دیکھیں شراح بخاری نے اس حدیث کی کیا شرح کی ہے، یہ ہیں علامہ ابن حجر عسقلانی، لکھتے ہیں:

والمراد انه انسی علم تعیینها فی تلك السنة و سبب النسیان فی هذة القصة فی حدیث عبادة بن صامت۔ (فتح الباری)	مراد یہ ہے کہ لیلۃ القدر کی تعیین کا علم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف اس سال بھلا دیا گیا تھا اور اس کا سبب عبادہ بن صامت کا بیان کردہ واقعہ ہے۔

یہی بات اس حدیث کے تحت علامہ بدر الدین عینی نے "عمدۃ القاری" ج ۱۱ ص ۱۳۴ میں اور جناب انور شاہ کشمیری نے فیض الباری ج ۳ ص ۱۸۴ میں بیان کی ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ (القدر) اور سفیان بن عیینہ سے امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں روایت کیا ہے کہ قرآن کریم میں وَمَآ اَدْرٰىكَ کے ساتھ جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے بتلا دی ہیں۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۷۰) اسکے علاوہ حافظ محمد بن علی شوکانی نے بھی تفسیر "فتح القدیر" ج ۵ ص ۴۷۲ میں اس روایت پر اعتماد کیا ہے اور شارحین "بخاری" نے بھی اس کو تقویت پہنچائی ہے۔

اختلاف مطالع اور شب قدر

طلوع اور غروب کے اوقات، علاقوں کے اختلاف سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ ہمارے وقت کے لحاظ سے عرب ممالک میں دو سے لے کر چار گھنٹوں کا فرق ہوتا ہے، برطانیہ میں یہاں سے پانچ اور کینیڈا میں ۹ گھنٹے پہلے سورج طلوع ہوتا ہے اور امریکہ میں جا کر بارہ گھنٹہ کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لئے تمام دنیا کے لئے ایک رات شب قدر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ جو رات کسی علاقہ کے لئے طاق ہے وہ دوسرے کے لئے جفت ہوگی۔ نیز قطب شمالی و جنوبی میں چھ چھ ماہ کے دن رات ہوتے ہیں، ان علاقوں میں شب قدر کا تعین کیونکر ہوگا؟

اس کی وضاحت میں ایک بات تو یہی کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح نمازوں میں ہر علاقہ کے اپنے اپنے مطلع کا اعتبار ہوتا ہے اور ہر شخص اپنے علاقہ کے حساب سے نماز پڑھتا ہے، اسی طرح شب قدر بھی ہر علاقہ والے اپنے حساب سے تلاش کریں گے اور ہر شخص اپنے مطلع کے حساب سے آخری عشرہ کی طاق رات کا تعین کرے گا اور جس طرح بعد عظیم کی بناء پر دو دنوں میں عید ہو سکتی ہے، اسی طرح اگر دو راتوں میں شب قدر بھی متحقق ہو جائے تو

کچھ بعید نہیں ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شب قدر صرف ایک رات ہو اور جن علاقوں میں اس وقت رات کی جگہ دن ہو، ان میں اسی دن سے متصل رات میں عبادت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ حکمی طور پر یہ ثواب عطا فرما دے۔

ثواب میں اضافہ

شب قدر میں عبادت کا ثواب ہزار ماہ کی عبادت سے زیادہ ہوتا ہے تو کیا اس ایک رات میں عبادت کر لینے کے بعد انسان ہزار ماہ کی عبادتوں سے آزاد ہو جاتا ہے؟

اسی طرح ایک نماز کا ثواب دس نمازوں کے برابر ہے تو کیا ایک نماز پڑھنے کے بعد کوئی شخص دس نمازوں سے بری ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شب قدر کی عبادت نفلی ہے اور ہزار ماہ میں جو فرائض اور واجبات ہیں یہ نفلی عبادت ان کے قائم مقام نہیں ہو سکتی۔ رہا یہ کہ ایک فرض کا ثواب اس کی دس مثلوں کے برابر ہوتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان مثلوں میں سے کوئی ایک مثل اس فرض کے مساوی کیسے ہو سکتی ہے، جو خود اس جیسی دس مثال کے برابر ہے؟ اور انسان دس امثال کے مساوی فرض کے ادا کرنے کا مکلف ہے صرف ایک مثل کا نہیں، لہٰذا ایک نماز پڑھ کر انسان دس نمازوں سے آزاد ہو سکتا ہے اور نہ ہی شب قدر کی عبادت پا کر ہزار ماہ کی عبادت سے بری ہو سکتا ہے۔

گناہ میں اضافہ

ایک بحث یہ بھی غور طلب ہے کہ جس طرح شب قدر میں عبادت کرنے سے ثواب بڑھ جاتا ہے، کیا اسی طرح شب قدر میں گناہ کرنے سے سزا بھی زیادہ ہوتی ہے؟ اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو قطعی طور پر شب قدر کا تعین حاصل ہو جائے اور پھر وہ اس رات میں گناہ کرے تو یقیناً اس کا یہ گناہ اور راتوں کے گناہ سے زیادہ ہوگا۔ یہ کہ قرآن کریم میں ہے: وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا (انعام: ۱۶۰) ''جو شخص برائی کرے اسے اس برائی کے برابر عذاب ہوتا ہے'' زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر جاننے کے بعد شب قدر میں معصیت کرنے والا زیادہ عذاب کا مستحق کیسے ہوگا؟ تو گزارش یہ ہے کہ جو شخص شب قدر معلوم ہونے کے بعد اس رات میں گناہ کرے گا، اس کے دو گناہ ہیں۔ ایک تو فی نفسہٖ کوئی

ناجائز کام کرنا دوسرا شب قدر کی حرمت پامال کرنا، جس طرح گھر میں بدکاری کی نسبت مسجد یا کعبہ میں بدکاری کرنا زیادہ معصیت ہے۔ کیونکہ یہاں ایک فعل معصیت ہے اور دوسرا فعل توہین حرم اور فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا کا مطلب یہ ہے کہ معصیت کے لحاظ سے جس جرم کی جو سزا مقرر کی ہے اس جرم پر اسے ایک سزا ہی ملے گی، دو سزائیں نہیں ملیں گی۔ پس کعبہ یا لیلۃ القدر میں معصیت کا ارتکاب کرنے والا اگرچہ عام جگہ معصیت کی نسبت زیادہ سزا کا مستحق ہے لیکن اس جرم کے لحاظ سے جو سزا مقرر ہے وہ سزا اسے ایک ہی ہوگی دو نہیں۔

نزول ملائکہ

پیدائش آدم کے وقت فرشتوں نے انسان کے بارے میں خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ فتنہ جو، خونریز اور فسادی ہوگا اور اس کے مقابلہ میں اپنی حمد و تسبیح اور عبادتوں کا ذکر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی شاہکار تخلیق کے کمالات فرشتوں پر جتانا چاہتا تھا۔ اضطراری عبادتوں کے خول میں لپٹے رہنے والوں کو سوز و گداز اور ذوق و شوق کے جلووں سے روشناس کرانا تھا اور یہ بتانا تھا کہ حکم وجوبی تو الگ رہا، اگر ہم استحباب کے ذریعہ میں کہیں، بلکہ کہیں نہیں صرف ترغیب ہی دیں تو ہمارے بندے نیند اور آرام چھوڑ کر محض ہماری خاطر ساری رات قیام کرتے رہیں گے۔ معصیت سے خائف، قلت طاعت پر نادم، لبوں پر آہیں، آنکھوں میں آنسو اور سینے میں شوقِ کا طوفان چھپائے فرزندان آدم اس تاریخ کو ساری رات کھڑے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ منظر دکھانے کے لئے فرشتوں کو آسمان سے قطار در قطار نازل فرماتا ہے۔ فرشتے آتے ہیں اور جھک جھک کر انسان کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ شب قدر میں عبادت کرنے والے انسان کو جس وقت روح الامین آ کر سلام کرتا ہے اور اس سے مصافحہ کرتا ہے تو اس پر خشیت الٰہی کی ایک خاص کیفیت طاری ہوتی ہے، آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں اور بدن کا رونگٹا رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں: فرشتوں کا سلام سلامتی کا ضامن ہوتا ہے، سات فرشتوں نے آ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا تو ان پر نار نمرود بردًا و سلامًا ہوگئی۔ لیلۃ القدر کے عابدوں پر جب لاتعداد فرشتے آ کر سلام کرتے ہیں تو کیونکر نہ یہ امید کی جائے کہ ان پر نار جہنم امن و سلامتی ہو جائے گی؟

یادِ اسماعیل علیہ السلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ (الانعام)

”بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور موت اللہ ہی کے لئے ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا“۔

اس آیت کریمہ نے بھرپور جامعیت کے ساتھ اسلام کے مخصوص اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ بندہ کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، مرنا جینا سب کچھ اللہ ہی کی خاطر ہو۔ محسوسات کے طلاطم میں زندگی کا ہر کام اللہ کے لئے ہو اور اعمال کی بھیڑ میں انسان کا ہر عمل اللہ کی خاطر ہو۔

اگر شوق کے ہنگاموں سے دل مچلنے لگے تو عجز کی پیشانیاں اس بے نیاز کی بارگاہ میں جھکنے کے لئے بڑھ جائیں۔ اگر کسی کے نام پر سر کٹانے کا سودا ہو تو اس پر زندگی نثار کی جائے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اسی کے حکم پر سر چھری کے نیچے رکھ دیا۔ بدر کی تپتی ہوئی زمین پر بے شمار صحابہ نے اسی کا نام بلند کرنے کے لئے برچھیاں کھائی تھیں اور کربلا کے سلگتے ہوئے ریگ زاروں میں اس کی خاطر حسین رضی اللہ عنہ نے گلا کٹایا تھا۔ یہ عشق و محبت کی مہربانیاں اور حسن ازلی کی بے نیازیاں ہیں کہ وہ اپنے بندے کی لگن کو جانتا ہے اور اس کے شوق تپش کو پہچانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ یہ امتحان کے موقع پر ڈگمگانے والے قدم اور مظالم سے اشک اگلنے والی آنکھیں نہیں ہیں، مگر پھر بھی وہ امتحان لیتا ہے۔ کبھی آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے ابراہیم علیہ السلام کے صدق کو آزماتا ہے اور کبھی زیر خنجر آئے ہوئے حسین کے صبر کو دیکھتا ہے۔ حسن و عشق کا یہی پیچ و تاب اسلام کے تمام احکام کی اصل روح اور واقعی فلسفہ ہے۔

قربانی کرنے سے روحانیت کو جلا ملتی ہے

انسان کا سینہ ہوس اور ایثار سے موجزن ہے۔ ہوس ایک حیوانی جذبہ ہے اور ایسے

جذبات جب ابھرتے ہیں تو وہ بس اپنے ہی لئے سوچتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اپنا پیٹ بھرے اور اپنی ضروریات کو رفع کرے۔ خواہ اس میں کسی کو نفع ہو یا نقصان، جیسے ایک حیوان محض اپنی شکم سیری کے لئے دوسروں کا خون کر دیتا ہے اور اسے کوئی تاسف نہیں ہوتا اسی طرح انسان بھی اسی حیوانی جذبہ کے تحت اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کی تمناؤں کا خون کر دیتا ہے اور اسے کوئی افسوس نہیں ہوتا۔ دوسرا احساس ایثار و قربانی ہے جو ایک ملکوتی جذبہ ہے، جب ایسے جذبات غالب ہوتے ہیں تو انسان خود تکلیف میں رہ کر دوسروں کو آرام دینے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ اس وقت اس کی تمنا ہوتی ہے کہ وہ بھوکا رہ کر کسی کو کھانا کھلا دے، خود تشنہ محروم رہ کر کسی کو سیراب کر دے۔

اگر کسی کیاری سے دو پودے غذا حاصل کرتے ہیں تو ایک کاٹ دینے سے دوسرا زیادہ غذا حاصل کر سکتا ہے اور اس کی قوت رعنائی اور بالیدگی بڑھ جاتی ہے، اسی طرح انسانی سسٹم (System) کے دو جذبوں میں سے اگر ایک کا انقطاع کر دیا جائے تو دوسرا ارتقاء پذیر ہوگا۔ حیوانیت کا جس قدر انصرام و انقطاع ہوگا، ملکوتیت اور روحانیت کو اتنی ہی مدد ملے گی۔

قربانی کرنے سے انسان کو سال میں یہ موقع ملتا ہے کہ وہ بے نوا غرباء جو کبھی کبھی ہی گوشت کھاتے ہیں، کثرت سے گوشت کھا سکتے ہیں اور اپنے مال و متاع کو دوسروں پر خرچ کرنے کا ایثار اس حیوانی خواہش پر چھری پھیر دیتا ہے، ہوس دم توڑنے لگتی ہے، ہمدردی اور اخلاص کے جذبات جگمگانے لگتے ہیں اور ملکوتیت اور روحانیت انسان کے سینہ میں ایک نیا جنم لیتی ہے۔

قربانی جہاد کی تربیت دیتی ہے

فدا کارانہ جذبہ اور قربانی کا عزم انسان کو زندگی کے ہر میدان میں فتح اور نصرت عطا کرتا ہے اور محض جلب منفعت کا حیوانی جذبہ کمزور کے مقابلہ میں بربریت اور قوی کے سامنے کم ہمتی اور بزدلی عطا کرتا ہے۔ ہول اور دہشت کے میدان جنگ میں جہاں قدم قدم پر مجاہدوں کی سخت کوشیاں لبیک کہتی ہیں۔ جہاں خاک و خون میں لتھڑی ہوئی لاشوں اور

زخمیوں کی آہ و بقا سے خوف کا بدن کپکپانے لگتا ہے، وہاں اس شخص کا گزر غیر متوقع نہیں ہوتا۔ جس کے جسم میں قربانی کی روح موجود ہو، جہاد کی فضا میں زخمیوں کو سنبھالنا اور گرتوں کو اٹھانا اس سے متصور ہو سکتا ہے جس کے دل میں اخلاص و ایثار کا جذبہ ہو۔

کافروں اور مشرکوں کا محاسبہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنی زندگی میں کبھی خاک و خون سے کھیل چکا ہو۔ جس شخص نے کبھی کسی جانور کے گلے پر چھری نہ پھیری ہو، جو ایک حیوان کو ذبح کرنے سے بھی ڈرتا ہو، اس سے جہاد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اسلام نے سال میں ایک مرتبہ ایک حیوان کی قربانی کرنے کا حکم دیا تا کہ ظاہری طور پر اس کا گلا کاٹنے سے مسلمان کے اندر جرأت، ولولہ اور خاک و خون سے مناسبت پیدا ہو اور باطنی طور پر اسے پیسہ خرچ کرنے اور غرباء کو گوشت کھلانے سے اخلاص اور ایثار کی عادت پڑے۔

اسلام کا ہر فرد فطرتاً سپاہی ہوتا ہے اور وہ اسے مختلف پیرایوں سے ہر سال جہاد کی تربیت دیتا ہے۔ جانور کی قربانی کے ذریعہ اسلام اپنے فرزندوں کو سمجھاتا ہے کہ جس طرح اللہ کی رضا کے لئے تم آج اس جانور کا خون بہا رہے ہو، کل اسی طرح خدا کے نام کی سربلندی کے لئے نے خود اپنا لہو پیش کرنا ہے۔



حقائق قربانی

اسوۂ ابراہیم (علیہ السلام) تازہ کرنے کے لئے فرزندان اسلام ہمیشہ دس ذی الحج کو قربانی کیا کرتے ہیں۔ اسلامی فرقوں میں عقائد وافکار کے اختلاف کے باوصف یہ ایک خوشگوار ہم آہنگی تھی، لیکن مادہ پرستی کے اس دور میں یہ نقطۂ اتحاد بھی قائم نہ رہ سکا اور کچھ دیر سے یہ آواز آنے لگی ہے کہ قربانی صرف حجاج کے لئے ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے نہ یہ سنت ابراہیمی ہے نہ سنت محمدی۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قربانی کی وجہ سے ہر سال لاکھوں جانور ضائع ہو جاتے ہیں اور بے حساب روپیہ برباد ہو جاتا ہے۔ اسی رقم کو اگر رفاہی امور پر صرف کیا جائے تو ملک وملت کے بہت سے بگڑے ہوئے کام سنور سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں قربانی کی ادائیگی کے سلسلہ میں غیر مقلد حضرات ہر سال امت مسلمہ کو اس مغالطہ میں مبتلا کرتے ہیں کہ قربانی چوتھے روز بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ قربانی کا شرعی ثبوت، شبہات کا ازالہ، قربانی کے فضائل وفوائد اور اس کے ایام کی تحقیق پر مختصر اور اجمالی گفتگو کر لی جائے۔

قربانی کا شرعی ثبوت

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ (کوثر) ''نماز پڑھ اپنے رب کے لئے اور قربانی ادا کر''۔

''نحر'' کا لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جمہور مفسرین نے اس آیت میں ''نحر'' کو قربانی پر محمول کیا ہے، چنانچہ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

وقوله فصل لربك وانحر حث على مراعاة هذين الركعتين وهما الصلوة ونحر الهدى فانه لابد من تعاطيهما فذالك واجب في كل دين وفي كل ملة۔
(المفردات فی غرائب القرآن ص ۴۸۵)

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ؔ میں نماز اور قربانی پر برانگیختہ کیا گیا ہے اور ان دونوں کوادا کرنا ضروری ہے اور یہ ہر دین اور ہر ملت میں واجب رہی ہے۔

امام فخر الدین رازی، محمود آلوسی اور دیگر مفسرین نے اس آیت میں نحر کو قربانی پر محمول کرنے کی حسب ذیل وجوہ بیان فرمائی ہیں۔

(ا) قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ نماز اور زکوۃ کا ساتھ ساتھ ذکر فرماتا ہے اور قربانی عبادت مالیہ ہونے کی وجہ سے بمنزلہ زکوۃ ہے۔ پس جب فَصَلِّ سے مراد نماز ہے تو وَانْحَرْ سے قربانی مراد ہونی چاہیے۔

(ب) مشرکین اپنے بتوں کے لئے نماز اور قربانی دونوں ادا کرتے تھے، پس جس طرح فَصَلِّ سے نماز کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص کیا گیا یہ، چاہیے کہ وَانْحَرْ سے قربانی کو اللہ کے ساتھ خاص کرلیا جائے۔

(ج) تمام عبادات کا رجوع دو چیزوں کی طرف ہے۔ خالق کی عظمت اور مخلوق پر شفقت اور نحر کو قربانی پر محمول کرنے سے یہ دونوں امر حاصل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ نماز عظمت خالق کی مظہر ہے اور قربانی مخلوق پر شفقت کو ظاہر کرتی ہے۔

(د) نحر کا لفظ باقی معانی کی نسبت قربانی کے معنی میں زیادہ مشہور ہے اور لفظ کو اس کے اشہر اطلاق پر محمول کرنا چاہیے۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیث مبارکہ میں بھی قربانی کے ثبوت پر دلائل کثیرہ موجود ہیں، بعض یہ ہیں:

امام عبدالوہاب شعرانی فرماتے ہیں کہ حاکم نے مرفوعا روایت کیا ہے:

من وجد سعة لان یضحی فلم یضح فلا یحضرن مصلانا۔
جو شخص قربانی ادا کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آئے۔

(لواقع الانوار القدسیہ ص ۲۰۹)

حضرت زید بن ارقم فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے عرض کیا: "ما هذه الاضاحی" "حضور یہ قربانیاں کیا ہیں؟" آپ نے فرمایا: "سنة ابیکم ابراهیم" "یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم کی سنت ہیں"۔ (مشکوۃ ص ۱۲۹) اور حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ پورے دس سال مدینہ طیبہ میں اقامت پذیر رہے اور ہر سال قربانی کرتے رہے۔ (ترمذی ج ا ص ۱۸۲) ان حدیثوں سے ظاہر ہو گیا کہ قربانی کرنا سنت ابراہیم بھی ہے اور سنت محمدی بھی۔ اس مقام پر سنت طریقہ جاریہ کے معنی میں ہے یعنی حضرت ابراہیم سے لے کر رسول اللہ تک اس پر عمل جاری رہا۔ عہد رسالت سے لے کر آج تک تمام مسلمان اس پر عمل کرتے ہیں اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء)

"جو حق واضح ہونے کے بعد رسول کے خلاف کرے اور مسلمانوں سے جدا راستہ پر چلے ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے اور جہنم میں داخل کر دیں گے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے"۔

اس آیت میں غور کی جگہ ہے ان لوگوں کے لئے جو تمام مسلمانوں کے طریقہ کے علی الرغم قربانی کا انکار کرتے ہیں۔

ازالہ شبہات منکرین

منکرین قربانی کہتے ہیں کہ قربانی صرف حجاج کے لئے مشروع ہے اور ہر سال اور ہر شہر میں قربانی کرنا نہ سنت ابراہیمی ہے نہ سنت محمدی۔ اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قربانی ادا کرنے کا امر عموم اور اطلاق سے فرمایا ہے۔ حج کے ساتھ مقید نہیں کیا، چنانچہ ارشاد ہوا: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ؕ (کوثر) "اپنے رب کے

لئے نماز پڑھ اور قربانی کر"، اور احادیث رسول میں اس عموم کی تائید موجود ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے ہجرت کے بعد صرف ایک بار حج کیا اور مدینہ میں قیام کی پوری مدت میں ہر سال قربانی ادا فرماتے رہے۔ (ترمذی) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ہمیں عید کی نماز پڑھائی، نماز سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے دیکھا کہ بعض لوگوں نے نماز عید سے پہلے ہی قربانی کر لی ہے تو آپ نے فرمایا: تمہیں دوبارہ قربانی کرنی ہوگی۔ (مسلم) حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اپنے دست اقدس سے مدینہ طیبہ میں دو مینڈھوں کی قربانی کی ہے۔ (بخاری) پس ظاہر ہو گیا کہ قربانی کا حکم حجاج اور مکہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہ حکم ہر صاحب نصاب مسلمان کے لئے ہر شہر میں ہے۔ ثانیاً چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی غذا اور دوسرے فوائد کے لئے جانوروں کو مسخر کر دیا ہے، اس لئے اس نعمت کے شکر کے طور پر جانوروں کی قربانی کا حکم دیا اور یہ نعمت چونکہ حجاج وغیر حجاج دونوں پر ہے، اس لئے قربانی کا حکم بھی دونوں کے لئے ہے۔ ثالثاً قربانی سنت ابراہیم ہے لقولہ علیہ السلام "سنة ابیکم ابراهیم"۔ اور سنت ابراہیم کی پیروی حجاج وغیر حجاج دونوں کے لئے لازم ہے لقولہ تعالیٰ: فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا (آل عمران: ۹۵) "ملت ابراہیم کی پیروی کرو"۔ پس قربانی بھی حجاج وغیر حجاج دونوں پر لازم ہے۔

رہا مال کو ضائع کرنے کا شبہ تو اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرنے میں جو مال خرچ ہوتا ہے وہ اسی شخص کے نزدیک ضائع کہلا سکتا ہے جو خدا اور آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو، ثانیاً قربانی کا گوشت خود کھایا جاتا ہے، احباب کو کھلایا جاتا ہے اور غرباء کو صدقہ کیا جاتا ہے۔ اب اس میں ضائع کیا چیز ہوئی، اپنے کھانے کو تو ضائع نہیں کہہ سکتے اور احباب کے ہدیہ اور غرباء پر صدقہ کو ضائع وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کے دل میں نہ اپنے رشتہ داروں کی محبت ہو اور نہ غرباء کے لئے ہمدردی۔

قربانی کے فضائل

(۱) قربانی کے دن اللہ تعالیٰ کو قربانی کا خون بہانے سے زیادہ مسلمان کا کوئی عمل پسند نہیں ہے۔ (ترمذی وابن ماجہ)

(۲) قربانی کا خون زمین پر گرنے سے پہلے مقبولیت کے لئے اللہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

(۳) قربانی کے خون کے ہر قطرہ کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ ایک گناہ بخش دیتا ہے۔ (لوامع الانوار القدسیہ)

(۴) قربانی کے گوشت اور خون کو ستر درجہ بڑھا کر میزان میں وزن کیا جاتا ہے۔ (اصبہانی)

(۵) قربانی کے ہر بال کے بدلہ میں ایک نیکی کا ثواب دیا جاتا ہے۔ (مسند احمد و ابن ماجہ)

(۶) قربانی کا جانور میدان محشر میں اپنے صاحب کے لئے سواری بن کر آئے گا۔ (مرقات)

(۷) خون کے پہلے قطرہ کے ساتھ قربانی کرنے والے کے گزشتہ گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ (بزار و ابن ماجہ)

قربانی کے اسرار و رموز

(۱) قربانی کے ذریعہ سنت ابراہیم کو زندہ اور اسوۂ اسماعیل کو تازہ کیا جاتا ہے۔

(۲) اسلامی سال کا آغاز محرم سے اور اختتام ذوالحج پر ہوتا ہے اور دس محرم کو حضرت حسین کی اور دس ذوالحج کو حضرت اسماعیل کی قربانی ہے، پتہ چلا اسلام ابتداء سے انتہاء تک قربانیوں کا نام ہے۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستان حرم
نہایت اس کی حسین ابتداء ہے اسماعیل

(۳) اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں ہمیں اپنی مرضی سے تصرف کے لئے دی ہیں، وہ چاہتا ہے کہ ان نعمتوں کا کچھ حصہ اس کی مرضی سے بھی خرچ کیا جائے، سال بھر ہم اپنی خواہش سے جانور ذبح کرتے ہیں، اللہ نے چاہا سال میں ایک مرتبہ ہم یہ جانور محض اس کی مرضی سے ذبح کر دیں۔

(۴) اپنے ہاتھ سے جانور ذبح کرنے سے خاک و خون سے مناسبت پیدا ہوتی ہے اور اس سے جہاد کی استعداد حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ جو شخص ایک جانور کو بھی ذبح نہ کر سکے

اس سے کفار کو ہلاک کرنے کی توقع کب کی جا سکتی ہے۔

(۵) قربانی کے ذریعہ ہمیں یہ عادت ڈالی جاتی ہے کہ جس طرح اللہ کے حکم سے ہم نے آج اس جانور کی جان پیش کی ہے، وقت آنے پر اپنی جان کو بھی اللہ کے حضور پیش کر دیں۔

(۶) جس طرح بدن کا شکر نماز سے، مال کا زکوٰۃ سے اور قوت کا شکر جہاد سے ہوتا ہے اسی طرح جانوروں کا شکر قربانی سے ادا ہوتا ہے۔

(۷) کفار اپنی قربانیاں بتوں کے لئے کرتے ہیں۔ ہم قربانی اللہ کے لئے کر کے ان کے لئے صحیح راہ عمل متعین کرتے ہیں۔

(۸) قربانی اور تکبیرات تشریق کی وجہ سے غیر حجاج کو بھی حجاج سے مناسبت حاصل ہوتی ہے۔

(۹) قربانی سے وحدت ملی کو تقویت ملتی ہے۔ اس دن تمام مسلمان ایک عمل اور ایک کھانے میں متحد ہوتے ہیں۔

(۱۰) قربانی اقارب اور احباب سے ملاقات، ضیافت اور صلہ رحمی کا سبب بنتی ہے۔

(۱۱) احباب کو قربانی کا تحفہ دینے سے یگانگت بڑھتی ہے اور صدقہ دینے سے غرباء کا پیٹ پلتا ہے اور ان کی دعائیں ملتی ہیں۔

(۱۲) انسان کی جسمانی نشو و نما کے لئے گوشت ایک ضروری عنصر ہے، بہت سے لوگ ناداری کی وجہ سے گوشت سیر ہو کر نہیں کھا سکتے، قربانی کے ایام میں ان کی یہ ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

(۱۳) قربانی کے ذریعہ ان کفار کے عقیدہ پر ضرب لگتی ہے جو جانوروں کی پرستش کرتے ہیں۔

(۱۴) قربانی یہ سبق دیتی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اس خارجی حیوان کو آہنی چھری سے ذبح کیا ہے، اسی طرح شریعت کی قربان گاہ پر اپنے داخلی حیوان کو بھی مخالفت نفس کی چھری سے ذبح کر ڈالو تا کہ باطن ظاہر کے موافق ہو جائے اور

آیات آفاق کی معرفت کا مقتضیٰ حیوان ظاہر کی قربانی سے اور آیات انفس کی معرفت کا مدعیٰ حیوان باطن کی قربانی سے پورا ہو جائے۔

قربانی کے احکام و مسائل

جو شخص ایام قربانی میں نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو اس پر قربانی کرنا واجب ہے۔ اونٹ گائے اور بکری ان اجناس کے جانوروں سے قربانی کرنا جائز ہے۔ اونٹ پانچ سال کا، گائے دو سال کی اور بکری ایک سال کی ہونی چاہیے، دنبہ اگر چھ ماہ کا اس قدر فربہ ہو کہ ایک سال کا معلوم ہوتا ہو تو یہ بھی جائز ہے، گائے اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں۔ جانور صحیح سالم اور توانا ہو، جو جانور ایسا کمزور ہو کہ مذبح تک چل نہ سکے، جس کی ہڈیوں میں مغز نہ ہو، کانا، اندھا یا لنگڑا ہو یا جس کی آنکھ کان یا دم کا اکثر حصہ کٹا ہوا ہو یا جس کے خلقتاً کان یا دانت نہ ہوں یا جو پستان بریدہ ہو۔ ایسے تمام جانور قربانی کے اہل نہیں، ان کی قربانی ناجائز ہے۔

دس ذوالحج کو نماز عید کے بعد سے ۱۲ ذوالحج کے دن غروب آفتاب تک قربانی کرنا جائز ہے۔ ان ایام میں دن کو قربانی کرنی چاہیے۔ رات کو قربانی کرنا مکروہ تنزیہی ہے۔ افضل اور مستحب یہی ہے کہ اپنے ہاتھ سے قربانی کرے۔ ورنہ کم از کم ذبح کے وقت حاضر رہے۔ ذبح کے وقت یہ دعا کرے:

انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ وبذالک امرت وانا من المسلمین اللھم منک ولک۔

قربانی کے گوشت یا کھال کو قصاب کی اجرت میں دینا جائز نہیں، نہ اس کے کسی حصہ کو بیچا جا سکتا ہے، اگر فروخت کر دیا تو قیمت کا صدقہ کرنا واجب ہے۔ مستحب یہ ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصص کئے جائیں، ایک اپنے لئے، ایک رشتہ داروں کے لئے اور ایک غرباء کے لئے۔ قربانی کا گوشت کافر حربی کو نہیں دیا جا سکتا، ذمیوں کو دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں رہنے والے غیر مسلم ذمیوں کے حکم میں ہیں، انہیں دیا جا سکتا ہے۔ قربانی کی

کھال کو اپنے استعمال میں لا سکتے ہیں۔ احباب کو ہدیہ اور فقراء کو صدقہ دے سکتے ہیں، رفاہی امور، مساجد اور مدارس کے لئے بھی دے سکتے ہیں۔

قربانی کے ایام

ایام قربانی کی مقدار میں ائمہ اور مجتہدین کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل اور سفیان ثوری صرف تین دن تک جواز قربانی کے قائل ہیں۔ تیسرا دن گزر جانے کے بعد چوتھے دن قربانی کرنا جائز نہیں ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور غیر مقلد حضرات کے نزدیک چوتھے دن بھی قربانی ہو سکتی ہے۔ روایات کے تتبع اور چھان پھٹک کے بعد جو حقیقت سامنے آتی ہے، اس سے جمہور کی تائید ہوتی ہے اور عقل و نقل سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ چوتھے دن جانور کو ذبح کرنا محض خون بہانا اور گوشت فراہم کرنا ہے۔ قربانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پس قرآن کریم، حدیث صحیح اور آثار صحابہ سے جو کچھ صحت اور اعتماد کے ساتھ ثابت ہے وہ یہی ہے کہ قربانی صرف تین دن تک جائز ہے، چار دن قربانی کے بارے میں جو روایات ہیں وہ یا موضوع ہیں یا مطعون۔

ایام ثلاثہ پر استدلال قرآن سے

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (الحج: ۲۸)	”اور وہ ایام معلومات میں جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیں“۔

اس آیت کے تحت امام ابوبکر رازی الجصاص فرماتے ہیں:

لما ثبت ان النحر فيما يقع عليه اسم الايام و كان اقل ما يتناوله اسم الايام ثلثة وجب ان يثبت الثلاثة و ما زاد لم تقم عليه الدلالة فلم يثبت۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۲۵)	جب کہ یہ امر ثابت ہے کہ ایام معلومات سے مراد ایام ذبح ہیں اور لفظ ”ایام“ کی دلالت کم از کم تین دنوں پر ہے تو تین دن تو یقیناً ثابت ہو گئے اور تین دن سے زیادتی پر کوئی دلیل نہیں، پس وہ ثابت نہیں۔

ایام ثلاثہ پر استدلال حدیث سے

ابوبکر جصاص کے مذکورۃ الصدر استدلال کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے:

عَنْ سَلْمَةَ بْنِ اَكْوَعٍ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ مَنْ ضَحّٰى مِنْكُمْ فَلَا يُصْبِحَنَّ بَعْدَ ثَالِثَةٍ وَفِي بَيْتِهٖ مِنْهُ شَيْءٌ۔ (بخاری ج ۲ ص ۸۳۵)

سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو آدمی قربانی کرے اس کے پاس تیسری رات کے بعد قربانی کا گوشت نہ ہو۔

اس کے علاوہ "بخاری" اور "مسلم" کی متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے تین دن سے زیادہ قربانی کا گوشت رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اگر قربانی چار دن تک جائز ہوتی تو آپ چار دن تک کی اجازت دیتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر کوئی شخص تیسرے دن قربانی کرتا تب بھی اسے تین دن تک گوشت رکھنے کی اجازت تھی اور اب یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے، تاہم ابتداءً تین دن کی تخصیص کرنا اس امر پر کافی دلیل ہے کہ قربانی صرف تین دن تک جائز ہے، چنانچہ ابن قدامہ حنبلی نے اس حدیث سے تین دن قربانی پر استدلال کیا ہے۔

ایام ثلاثہ پر استدلال آثار سے

اصول حدیث میں یہ مقرر ہے کہ جس چیز کو قیاس سے نہ بتایا جا سکے، جب اس کی صحابہ خبر دیں تو وہ حکماً مرفوع ہے اور ایام کی مقدار قیاس سے نہیں متعین کی جا سکتی۔ پس صحابہ کرام نے ایام کی مقدار جو بھی بیان کی ہے، وہ حدیث رسول کے حکم میں ہے۔

(۱) محدث بالصواب حضرت عمر بن الخطاب فرماتے ہیں:

عن ماعز بن مالك الثقفي ان اباه سمع عمر يقول انما النحر في هذه الايام الثلاثة۔ (مختصر الکرخی بحوالہ بنایہ ج ۴ ص ۱۷۷، المحلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷)

ماعز بن مالک ثقفی سے روایت ہے کہ ان کے باپ نے حضرت عمر سے سنا کہ قربانی ان تین دنوں میں ہے۔

(۲) اور مبین الحقائق والمطالب حضرت علی بن ابی طالب فرماتے ہیں:

عن ابن ابی لیلی عن المنهال بن عمرو

حضرت علی نے فرمایا: قربانی تین دن ہے

عن زر عن علی قال النحر ثلاثۃ ایام افضلھا اولھا۔ (عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۱۴۸، محلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷، روح المعانی ج ۱۷ ص ۱۴۵، موطا امام مالک ص ۱۸۸)

اور ان میں افضل پہلا دن ہے۔

اس حدیث کے دو راویوں پر ابن حزم ظاہری نے اعتراض کیا ہے، ابن ابی لیلیٰ اور منہال بن عمرو، ابن ابی لیلیٰ پر ابن حزم کا یہ اعتراض ہے کہ وہ بدحافظہ تھے، اس کے جواب میں اولاً گزارش یہ ہے، ابن ابی لیلیٰ صحاح کے راوی ہیں۔ ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ان کی احادیث کو روایت کیا ہے۔ ثانیاً علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ زائدہ نے کہا کہ ابن ابی لیلیٰ تمام اہل دنیا سے زیادہ فقیہ تھے۔ امام عجلی نے کہا: ابن ابی لیلیٰ، فقیہ، صاحب سنت، بے حد سچے اور جائز الحدیث تھے۔ قرآن کے عالم اور لوگوں میں حسب کے اعتبار سے سب سے بہتر تھے۔ (تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۰۲) اور منہال پر ابن حزم کا اعتراض یہ ہے کہ وہ مجروح ہیں۔ اس کے جواب میں عرض ہے کہ اولاً تو امام بخاری، نسائی، ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ یہ سارے ائمہ منہال سے روایت کرتے ہیں۔ ابن معین اور نسائی نے تصریح کی ہے کہ وہ ثقہ ہیں، ابو الحسن القطان نے کہا کہ جب عجلی اور ابن معین جیسے ائمہ منہال کی توثیق کر چکے ہیں تو ابن حزم ظاہری کی جرح کا کیا اعتبار ہے۔

(تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۳۲۰)

(۳) اور مفسر قرآن حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

عن وکیع عن ابن ابی لیلی عن المنھال عن سعید بن جبیر عن ابن عباس النحر ثلاثۃ ایام۔ (احکام القرآن ج ۳ ص ۲۳۳، محلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷)

اس حدیث کی سند میں بھی ابن ابی لیلیٰ اور منہال ابن حزم کو کھٹکتے ہیں اور جواب ظاہر ہو چکا۔

(۴) اور فقیہ امت حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں:

عن اسماعیل بن عیاش عن عبید اللہ

حضرت عبد اللہ بن عمر فرماتے ہیں قربانی

بن عمر عن نافع عن ابن عمر الاضحی یوم النحر و یومان بعدہ۔ (موطا امام مالک ص ۱۸۸، محلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷)

عید اور اس کے دو دن بعد ہے۔

اس سند میں اسماعیل بن عیاش پر ابن حزم کا اعتراض ہے کہ یہ ضعیف ہیں۔ لیکن یہ اعتراض ساقط ہے، کیونکہ اولاً تو اسماعیل بن عیاش پر ترمذی، نسائی، ابوداؤد اور ابن ماجہ کا اعتماد ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ یعقوب بن سفیان نے کہا: اسماعیل ثقہ اور عادل ہے اور یزید بن ہارون نے کہا: میں نے اسماعیل سے بڑھ کر کسی کو حافظہ والا نہ پایا۔

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۶۱)

(۵) اور رئیس الحفاظ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں:

عن یزید بن الحباب عن معاویۃ بن ابی صالح حدثنی ابو مریم سمعت ابا ھریرۃ یقول الاضحی ثلاثۃ ایام۔

حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں: قربانی تین دن ہے۔

(محلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷)

حدیث ابوہریرہ کی سند میں ایک راوی ہیں معاویہ بن ابی صالح، ابن حزم کہتے ہیں کہ وہ قوی نہیں، ہم کہتے ہیں کہ بلا ریب یہ کذب صریح ہے۔ اس لئے کہ مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ صحاح کے یہ سارے امام معاویہ ابن ابی صالح سے احادیث روایت کرتے ہیں۔ نیز ابوطالب اور ابن معین نے کہا کہ یہ ثقہ ہیں، عجلی اور نسائی نے توثیق کی، ابن فراش نے کہا کہ یہ صدوق ہیں، ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا، بزار نے کہا: ثقہ ہیں اور بہتوں نے کہا۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۰۹ تا ۲۱۱)

(۶) اور یہ ہیں خادم رسول اللہ ﷺ حضرت انس:

عن وکیع عن شعبۃ عن قتادۃ عن انس قال الاضحی یوم النحر و یومان بعدہ۔

حضرت انس نے فرمایا: قربانی عید اور دو دن بعد ہے۔

(سنن بیہقی بحوالہ بنایہ ج ۴ ص ۱۷۷، محلی ابن حزم

ج ۷ ص ۳۷۷)

اور یہ وہ سند ہے جس کی صحت پر ابن حزم ظاہری کو بھی ایمان لانا پڑا، چونکہ لکھتے ہیں:

"ولا یصح شئی من هذا کله الاعن انس وحده"۔ (محلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷)

(۷) صاحب استذکار نے ذکر کیا ہے کہ جَراءت حضرت عبداللہ بن مسعود نے بھی بیان کیا ہے کہ قربانی تین دن ہے۔ (عینی علی الهدایہ ج ۴ ص ۱۱۷)

ایام اربعہ کے تمسکات اوران کا احتساب

(۱) عن معاویہ بن یحییٰ عن الزهری عن ابن المسیب عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ قال ایام التشریق کلها ذبح۔

ابو سعید خدری حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں: تمام ایام تشریق میں ذبح ہے۔

اس حدیث کی سند میں معاویہ بن یحییٰ ہے اور نسائی، ابن معین اور علی بن مدینی نے کہا کہ یہ ضعیف ہے اور ابن ابی حاتم نے "کتاب العلل" میں بیان کیا: یہ حدیث اس سند کے ساتھ موضوع ہے۔ (بنایہ علی الهدایہ ج ۴ ص ۱۱۷، عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۱۴۸)

معاویہ بن یحییٰ کے بارے میں ابن حجر فرماتے ہیں:

جوزجانی نے کہا: یہ ذاہب الحدیث ہے، ابوزرعہ نے کہا: قوی نہیں، اس کی احادیث منکرہ ہیں، ابوحاتم نے کہا: ضعیف ہے، ابوداؤد اور نسائی نے کہا: غیر ثقہ ہے، نسائی نے ایک جگہ کہا: ضعیف ہے، دوسرے مقام پر کہا: "لیس بشیء" ابن حبان نے کہا: یہ اپنے وہم سے حدیث بیان کرتا تھا۔ ساجی نے کہا: اس کی احادیث بہت ضعیف ہیں۔ بخاری نے ضعفاء میں شمار کیا۔ زہری نے کہا کہ اس کی احادیث منکرہ اور موضوعات کے مشابہ ہیں۔ (تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۲۱۹۔ ۲۲۰)

اور اس حدیث کے بارے میں ابن حجر فرماتے ہیں:

ابن عدی نے اس حدیث کو ابو سعید خدری سے روایت کیا ہے اور کہا: یہ معاویہ بن یحییٰ کی وجہ سے ضعیف ہے اور ابن ابی حاتم نے کہا: یہ حدیث اس سند کے ساتھ موضوع ہے۔

(۲) عن سوید بن عبدالعزیز عن سلیمان بن موسی عبدالرحمن بن ابی حسین عن جبیر بن مطعم قال قال رسول الله ﷺ کل ایام التشریق ذبح۔

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تمام ایام تشریق میں ذبح ہے۔

(موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان ص ۲۴۹)

اس حدیث کی سند میں سوید بن عبدالعزیز ہے، اس کے بارے میں ابن حجر فرماتے ہیں:
امام احمد بن حنبل نے کہا: یہ متروک الحدیث ہے، ابن معین نے کہا: "لیس بشیء" "یہ کچھ بھی نہیں" مزید کہا: ضعیف ہے اور احکام قربانی میں اس کی روایت جائز نہیں۔ بخاری اور ابن سعد نے کہا: اس کی احادیث منکرہ ہیں۔ یعقوب بن سفیان نے کہا: ضعیف ہے، دارمی نے کہا: یہ حدیث میں غلط بیانی کرتا تھا، ترمذی نے کہا: کثیر الغلط تھا۔ نسائی نے کہا: غیر ثقہ تھا، خلال نے کہا: ضعیف تھا، بزار نے کہا: حافظ نہ تھا۔

(تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۲۷۷)

اس حدیث کے بارے میں حافظ عینی سے سنیے۔
بزار نے اس کو اپنی مسند میں روایت کیا اور کہا: ابی حسین کی جبیر بن مطعم سے ملاقات ثابت نہیں، لہٰذا یہ حدیث منقطع ہے۔ (بنایہ علی الہدایہ ج ۴ ص ۱۱۷)

علامہ ابن حجر سے سنیے۔
احمد، ابن حبان اور بزار نے اس حدیث کو جبیر بن مطعم سے روایت کیا اور بزار نے کہا: یہ حدیث منقطع ہے، دارقطنی نے دو مختلف سندوں سے اس حدیث کا اخراج کیا اور کہا: دونوں میں ضعف ہے، بیہقی نے اس کو ایک سند سے روایت کیا اور کہا کہ یہ منقطع ہے۔

(درایہ علی الہدایہ الاخیرین ص ۴۴۶)

(۳) عن عبیداللہ بن موسی عن ابن ابی لیلی عن الحکم بن عتیبۃ عن مقسم

حضرت ابن عباس نے فرمایا: ایام معلومات عید اور اس کے بعد تین دن ہیں۔

عن ابن عباس قال الایام المعلومات

یوم النحر و ثلاثة ایام بعدہ۔

(محلی ابن حزم ج ۷ ص ۳۷۷)

اس سند کے ایک راوی ہیں: ابن ابی لیلیٰ۔ یہ وہی ابن ابی لیلیٰ ہیں جو علی اور ابن عباس کی سندوں میں تھے، جنہیں جمہور نے پیش کیا تھا، وہاں ابن حزم نے ان سندوں کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ ابن ابی لیلیٰ بد حافظہ ہیں۔ حیرت ہے کہ اس قدر جلد ابن ابی لیلیٰ پر کیا ہوا اعتراض ابن حزم کے حافظہ سے کیسے نکل گیا۔

چلئے ابن ابی لیلیٰ کو جانے دیجئے۔ یہ ہیں اس سند کے ایک اور راوی عبید اللہ بن موسیٰ۔ ان کے بارے میں علامہ ابن حجر تحریر فرماتے ہیں:

احمد بن حنبل نے کہا: عبید اللہ بن موسیٰ احادیث میں خلط کرتا تھا، اس نے روایات سوء اور احادیث ردیہ بیان کی ہیں۔ صاحب مناکیر تھا، میں نے اس کو مکہ میں دیکھا اور اعراض کر لیا، ابن سعد نے کہا: وہ تشیع کو ثابت کرنے کے لئے احادیث منکرہ روایت کرتا تھا، اس وجہ سے اکثر لوگوں نے اس کو ضعیف قرار دیا، ابو مسلم بغدادی نے کہا: عبید اللہ بن موسیٰ متروکین میں سے تھا، امام احمد نے اس کے تشیع کی وجہ سے اس کی روایت کو ترک کر دیا تھا۔

(تہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۱ تا ۵۳)

مجروح السند ہونے کے علاوہ یہ حدیث ابن عباس کی اس صحیح السند حدیث کے معارض ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ قربانی صرف تین دن ہے۔

برمحل تنزیل

ایام ثلاثہ کے دلائل کی صحت اور قوت اور ایام اربعہ کی روایات کے وضع، جرح اور ضعف سے صرف نظر بھی کر لیا جائے تو بھی احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ قربانی ان ایام میں ادا کی جائے جن میں سب کے نزدیک قربانی ادا ہو جائے اور وہ ایام عید اور اس کے دو دن بعد تک۔ ثانیاً یہ کہ دلائل کے تعارض کی وجہ سے چوتھا دن کم از کم مشکوک ضرور ہو گیا، پھر کیوں نہ قربانی ان دونوں میں کی جائے جن میں قربانی کی ادائیگی یقینی اور قطعی ہے؟

فقہیات

ضرورت اجتہاد

انسان چند متضاد عناصر کا مجموعہ ہے۔ وہ روح بھی ہے اور مادہ بھی، مجبور بھی ہے اور مختار بھی، ذریعہ بھی ہے اور مقصود بھی، اس میں نفس امارہ بھی ہے اور نفس لوامہ بھی، اس میں تغیر بھی ہے اور ثبات بھی، تغیر و ثبات ان آئین و قوانین میں موجود ہوتا ہے جن کے مطابق کوئی قوم زندگی بسر کرتی ہے۔ مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی قومیت کی بنیاد دوسری قوموں سے الگ ہے اور یہ قوم جن اصولوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتی ہے یا کرنا چاہیے وہ بھی دوسری اقوام کے اصولوں سے مختلف ہیں۔ ہماری قومیت کی بنیاد نسل، وطن، رنگ، زبان یا پیشے وغیرہ پر قائم نہیں ہے، بلکہ خاص تصورات و نظریات پر مبنی ہے۔ اس طرح ہمارے نظام زندگی کی بنیاد انسانی قوانین نہیں، بلکہ اللہ کی ہدایت ہے اور اس ہدایت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغیر و ثبات کا یکساں لحاظ رکھتی ہے۔ جو آئین صرف ثبات کا لحاظ رکھتا ہو اور تغیر سے بے نیاز ہو وہ بھی ناقص ہے اور جو قانون صرف تغیر پذیر ہو اور ثبات کا حامل نہ ہو وہ بھی نامکمل ہے اور جو آئین تغیر اور ثبات دونوں کا جامع ہو وہی مکمل آئین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔

دین اسلام میں دو قسم کی اقدار ہیں۔ ایک مستقل اور ازلی و ابدی اور ایک غیر مستقل اور عبوری، مستقل اقدار میں سے بعض یہ ہیں: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت، کتاب و سنت کی حاکمیت، تمام نبیوں، رسولوں اور فرشتوں پر ایمان، تقدیر، مبدأ، معاد اور جزا و سزا پر ایمان وغیرہا۔

دوسری اقدار عبادات ہیں جن میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد ہیں، پھر حدود و تعزیرات اور اس کے بعد دیگر معاملات ہیں۔ جن میں بیع، شراء، اجارہ، مزارعت وغیرہا شامل ہیں۔ یہ ہر نبی کے دور میں مختلف رہی ہیں۔ جن اقدار کو ہم نے پہلے ذکر کیا ہے یہ اسلام کی اٹل اور انمٹ اقدار ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی متصور نہیں ہے۔

یہ وہی اقدار ہیں جو حضرت آدم علیہ السلام کے دور سے حضور کے زمانہ نبوت تک تمام ادوار میں مشترک رہی ہیں اور انہی اقدار کو دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ باقی رہیں عبادات اور معاملات تو یہ ہر نبی کے زمانہ میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف انداز سے مختلف اطوار اپناتی رہی ہیں اور انہی مختلف اقدار کو شریعت کہا جاتا ہے۔

اجتہاد کا دائرہ کار

عبادات اور معاملات کے بارے میں قرآن کریم کی ہدایات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث رہنما اصول ہیں، لیکن قرآن کریم کے بعض الفاظ متعدد معانی پر دلالت کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض جگہ قرآن کریم نے ایک حکم کو بغیر کسی قید کے بیان کیا بعد میں اس کو منسوخ کر دیا۔ یہی حال احادیث شریفہ کا ہے، ایک ہی معاملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد معمولات اور اقوال موجود ہیں۔ پھر تمام احادیث بھی صحت اور قوت کے اعتبار سے ایک درجہ کی نہیں ہیں، اس لئے امت کو احکام کی ترتیب اور تدوین کے لئے ایک ایسے مجتہد کی ضرورت ہوئی جو قرائن اور دلائل سے قرآن کریم کے متعدد معانی میں سے کسی ایک کا تعین کر سکے، مطلق اور مقید آیات میں یہ فیصلہ کر سکے کہ مطلق اور مقید کو اپنے حال پر رکھا جائے گا یا مطلق کو مقید پر محمول کر دیا جائے گا، آیات کے اسباب نزول اور ان کی تقدیم و تاخیر پر نظر ہو اور اس کی روشنی میں ناسخ اور منسوخ کو متعین کر سکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد معمولات اور اقوال میں سے قرائن اور دلائل سے کسی ایک قول اور عمل کا تعین کر سکے اور اس سلسلہ میں سند کے اعتبار سے حدیث کی قوت اور ضعف کو جان کر فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ ایسے ہی شخص کو فقہاء کی اصطلاح میں مجتہد مطلق کہا جاتا ہے۔

مجتہد کی تعریف

علامہ محب اللہ بہاری نے ذکر کیا ہے کہ مجتہد وہ مسلمان فقیہ ہے جو حکم شرعی کا استخراج کرنے کے لئے اپنی تمام علمی صلاحیت کو بروئے کار لائے اور انہوں نے مجتہد کے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے دلائل پر کم سے کم اجمالی نظر رکھتا ہو اور احکام سے متعلق قرآن کریم کی آیات کے معانی، فصاحت و بلاغت اور صرف ونحو اور

قرأت کی باریکیوں اور اصول استخراج کے علم کا ماہر ہو۔

اسباب نزول اور ناسخ و منسوخ کا علم رکھتا ہو، اس طرح جو احادیث احکام سے متعلق ہیں ان تمام احادیث پر اس کی نظر ہو، ان احادیث کی سند پر راویوں کے احوال سے باعتبار قوت اور ضعف کے واقف ہو، تعداد اسانید کے اعتبار سے متواتر، مشہور، مستفیض اور غریب کے فرق سے واقف ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد معمولات اور اقوال میں منشاء رسالت تلاش کر کے ان میں تطبیق دینے یا نسخ کا فہم رکھتا ہو، آثار صحابہ سے واقف ہو اور یہ جانتا ہو کہ صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کون سے عمل کو آخری عمل قرار دیا۔ کس عمل کو خصوصیت قرار دیا اور متعارض احادیث کی کس طرح توجیہ کی۔ جس مسئلہ پر اہل علم کا اجماع ہو چکا ہو، اس پر مطلع ہو اور جس پیش آمدہ مسئلہ کا حل صراحتاً کتاب، سنت، آثار اور اجماع سے نہ حاصل ہو سکے، اس کو اس مسئلہ کے اشباہ و نظائر پر قیاس کر کے حاصل کر سکے۔ ایک مجتہد جب قرآن یا حدیث کے متن سے استدلال کرتا ہے تو عموماً اس کے استدلال کے چار طریقہ ہوتے ہیں، کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔

فقہ کی تعریف

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ انسان اپنے نفع و ضرر کو پہچان لے یہ فقہ ہے اور جمہور کے نزدیک فقہ احکام شرعیہ فرعیہ کے اس علم کو کہتے ہیں جو دلائل تفصیلیہ سے مکتسب ہو۔ دلائل تفصیلیہ کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً نماز فرض ہے۔ اب مجتہد اس حکم کو اس طرح حاصل کرے گا کہ نماز ''مامور بہ'' ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ اور مامور بہ فرض ہے، کیونکہ امر فرضیت کے لئے ہے، لہٰذا نماز فرض ہے۔ اس طرح قتل ولد حرام ہے۔ دلیل یہ ہے کہ قتل ولد منہی عنہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لا تقتلوا اولادکم'' اور منہی عنہ حرام ہے، کیونکہ نہی تحریم کے لئے ہے، لہٰذا قتل ولد حرام ہے۔

طبقات فقہاء

(۱) مجتہد فی الشرع: یہ وہ لوگ ہیں جو قواعد و اصول مقرر فرماتے ہیں اور احکام فرعیہ کو اصول اربعہ سے مستنبط کرتے ہیں اور اصول و فروع میں کسی کے تابع نہیں ہوتے

جیسے ائمہ اربعہ۔

(۲) مجتہد فی المذہب: یہ صرف اصول میں اپنے امام کے تابع ہوتے ہیں اور ادلہ اربعہ سے فروع کے استخراج پر قدرت رکھتے ہیں اور مسائل فرعیہ میں بعض جگہ اپنے امام سے اختلاف بھی کرتے ہیں، جیسے اصحاب ابی حنیفہ وغیرہ۔

(۳) مجتہد فی المسائل: یہ اصول و فروع میں اپنے امام کے تابع ہوتے ہیں اور جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہیں ہوتی ان میں امام کے اصول کے مطابق استخراج کرتے ہیں، جیسے ابوجعفر طحاوی۔

(۴) اصحاب تخریج: انہیں اجتہاد پر قدرت نہیں ہوتی۔ لیکن اصول میں اس کے ماخذ پر انہیں مکمل عبور ہوتا ہے۔ اس لئے یہ قول مجمل کی تفصیل پر قدرت رکھتے ہیں، جیسے ابوبکر رازی، ابوبکر جصاص اور کرخی۔

(۵) اصحاب ترجیح: یہ بعض روایتوں کو بعض دوسری روایتوں پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب ہدایہ۔

(۶) ممیزین: یہ وہ لوگ ہیں جو روایات میں سے صحیح، اصح، قوی، ضعیف اور ظواہر و نوادر وغیرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور انہیں روایات کو باہم متمیز کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، جیسے صاحب "کنز" اور صاحب "شرح وقایہ" وغیرہا۔

ضرورت اجتہاد

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ تتبع اور استقراء سے یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ علم و فضل میں اب اس پائے کے لوگ نہیں ہیں جو اجتہاد کے اصول کلیہ وضع کر کے مجتہد فی الشرع کا مقام پاسکیں یا فروع میں وہ مقام پاسکیں جو اصحاب ابی حنیفہ کا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانہ میں ایسے پختہ اور ثقہ اصحاب فتویٰ علماء موجود ہیں جو دور حاضر میں پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل کا اصول و فروع میں اپنے امام کی اتباع کرتے ہوئے حل تلاش کر سکیں اور ایسے لوگ مجتہد فی المسائل کہلانے کے مستحق ہیں۔ جس طرح امام ابوجعفر طحاوی اور امام قاضی

خان نے اپنے اپنے دور میں پیش آنے والے مسائل کا اصول وفروع کی پابندی کرتے ہوئے استخراج اور استنباط کیا، کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج کے ارباب حل وکشاد انفرادی طور پر یا علماء کا ایک بورڈ بنا کر موجودہ دور کے مسائل کے لئے فقہ اسلامی سے رہنمائی نہ مہیا کر سکیں۔ مثلاً لاؤڈ سپیکر پر نماز، ریل گاڑی اور طیارہ میں نماز، ریڈیو پر رویت ہلال کا اعلان، اعضاء کی پیوندکاری، انگریزی دواؤں سے علاج، مردے کا پوسٹ مارٹم، قطبین میں نماز اور روزے کا مسئلہ، نئے اوزان کی اوزان شرعیہ سے تطبیق، غیر سودی بنکاری، چور کے کٹے ہوئے ہاتھ سے انتفاع، بیمہ کا جواز یا عدم جواز، پراوڈنٹ فنڈ پر زکوۃ، انعامی بانڈ لینے کا جواز یا عدم جواز، ایک شخص شہر میں عید کر کے آیا اور دوسرے شہر میں رمضان پایا تو روزہ رکھے یا نہیں، کسی شخص نے تیس سال پہلے ایک ہزار روپیہ قرض لیا، اب تیس سال بعد وہ قرض خواہ کو ایک ہزار ہی ادا کرے گا جب کہ اس کی مالیت اب سو روپیہ رہ گئی ہے یا ڈالر یا پونڈ کے حساب سے زیادہ رقم، نوٹوں پر زکوۃ کی ادائیگی کے لئے سونا معیار ہوگا یا چاندی، اس قسم کے سینکڑوں مسائل بیسویں صدی میں ایجادات زمانہ کی تیز رفتار ترقی اور بدلتے ہوئے حالات نے پیدا کر دیئے ہیں اور ان کو حل کرنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اور مجتہد فی المسائل قسم کے علماء ہی اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔

اجتہاد کے مسلم اصول

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اجتہاد، کتاب، سنت، اجماع اور قیاس کی بنیاد پر ہوتا ہے، اس مقام پر ہم چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان ارکان اربعہ سے اجتہاد کے مسلم اصول اور قواعد کیا ہیں۔

کتاب اور سنت میں اجتہاد کے وقت عبارت النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص سے مسائل کا استنباط کیا جاتا ہے۔ اس لئے سطور ذیل میں ہم ان کی وضاحت کر رہے ہیں۔

عبارت النص

عبارت النص کا مطلب یہ ہے کہ لفظ معنی کے مقصود اصلی یا غیر اصلی پر دلالت

اصلی وغیر اصلی کی تقسیم کا مطلب یہ ہے کہ کبھی لفظ کا ایک معنی ہوتا ہے اور وہی مقصود بھی ہوتا ہے، اس کو مقصود اصلی کہتے ہیں اور کبھی اس لفظ سے ایک اور مفہوم حاصل ہوتا ہے جو مقصود ہوتا ہے لیکن مقصود اصلی نہیں ہوتا۔ ان دونوں طرز کی دلالتوں پر عبارت النص کا اطلاق ہوتا ہے، اس کی مثال یہ ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (النساء: ۳) "اپنی پسند کی عورتوں سے نکاح کرو خواہ دو دو سے، تین تین سے یا چار چار سے"۔

اس آیت کا سیاق وسباق یہ بتلاتا ہے کہ یہ آیت نکاح کی تحدید اور حصر پر دلالت کرتی ہے لیکن اس سے ضمناً یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نکاح کرنا جائز ہے، اس صورت میں تحدید نکاح مقصود اصلی ہوگا اور جواز نکاح مقصود غیر اصلی۔

اشارۃ النص

اشارۃ النص کا مطلب یہ ہے کہ وہ معنی لفظ کا صراحتاً مقتضی نہیں ہوتا، بلکہ غور وفکر سے ذہن اس معنی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ مثلاً یہ آیت وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرۃ: ۲۳۳) "بچہ کے باپ پر ان کی ماؤں کا کھانا اور کپڑا رواج کے مطابق لازم ہے"۔

عبارت النص سے اس آیت سے یہ معنی سمجھ میں آتا ہے کہ جو مائیں دودھ پلاتی ہیں اگر وہ مطلقہ ہو جائیں تو ان کا خرچ باپ کے ذمے ہے۔ لیکن غور وفکر سے اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ نسب کے ثبوت کا تعلق باپ سے ہوتا ہے، ماں سے نہیں ہوتا۔

دلالۃ النص

دلالۃ النص کا مطلب یہ ہے کہ آیت میں ایک حکم مذکور ہے اور ایک مسکوت عنہ اور جو مسکوت عنہ ہے وہ زیادہ اہم ہے، مثلاً والدین کے متعلق مذکور ہے:

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا (بنی اسرائیل: ۲۳) "ماں باپ کو نہ اف کہو اور نہ جھڑکو"۔

اس آیت میں بظاہر والدین کو جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ حکم اس بات پر

دلالت کرتا ہے کہ ماں باپ کو زدوکوب کرنا بطریق اولیٰ ممنوع ہوگا اور یہ دلالۃ النص ہے۔

اقتضاء النص

اقتضاء النص میں بھی مذکور کی مسکوت عنہ پر دلالت ہوتی ہے بایں طور پر اگر مسکوت عنہ کو مقدر نہ مانا جائے تو کلام کی تکذیب لازم آئے گی جیسے اس حدیث میں ہے:

"رُفِعَ عَنْ اُمَّتِی الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ" "میری امت سے خطاء، نسیان اور جبر اٹھالیا گیا ہے"۔ بظاہر اس حدیث کا مقصد یہ ہے کہ اب میری امت سے خطاء و نسیان کبھی سرزد نہیں ہوگا یا کوئی شخص اس کو مجبور نہ کر سکے گا۔ لیکن یہ معنی کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اس لئے یہاں لفظ "حکم" مقدر ماننا ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ خطاء، نسیان اور اکراہ کی حالت میں مواخذہ کا حکم اٹھالیا گیا ہے اور یہ اقتضاء النص ہے۔

اجماع

کتاب وسنت کے بعد مجتہد اجماع سے استدلال کرتے ہیں، مثلاً پہلے حد خمر میں صحابہ کرام کا اختلاف تھا، بعد میں اسی کوڑوں پر اجماع ہوگیا۔ اسی طرح متعہ کے بارے میں بعض روایات کی بناء پر بعض صحابہ کرام کا اختلاف تھا، لیکن حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اس کی حرمت پر اجماع ہوگیا۔ اسی طرح پہلے نماز جنازہ کی تکبیروں میں اختلاف تھا، بعد میں چار تکبیروں پر صحابہ کرام کا اجماع ہوگیا۔

قیاس

اجماع کے بعد مجتہد قیاس سے مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔ قیاس کے لئے انہوں نے چار ارکان مقرر کیے ہیں:

(۱) اصل: جس پر کسی مسئلہ کو قیاس کیا جائے۔

(۲) فرع: وہ مسئلہ یا جزی جس کو قیاس کیا جائے۔

(۳) حکم: حلت وحرمت یا اباحت وجواز سے متعلق وہ بات جو اس سلسلہ میں کہی جائے۔

(۴) علت: وہ جامع وصف جو مقیس علیہ اور مقیس دونوں میں پایا جائے، جیسے خمر اصل ہے، بھنگ یا کوئی اور مشروب فرع ہے، سکر کو علت سے تعبیر کرتے ہیں جو بھنگ اور خمر

دونوں میں پائی جاتی ہے اور تحریم کو حکم کہیں گے۔

قیاس کی بعض شرائط یہ ہیں:

(۱) وہ حکم جس کو فرع میں متعدی فرض کیا جائے اس کی اصل کتاب وسنت سے ثابت ہو، کیونکہ اگر وہ حکم ثابت نہیں ہوگا تو وہ منسوخ ہوگا اور قیاس کا منشاء ہی فوت ہو جائے گا۔

(۲) اس کا حکم دینی وشرعی ہونا ضروری ہے۔

(۳) مقیس علیہ کے لئے یہ لازمی ہے کہ کسی دوسرے اصل کی فرع نہ ہو۔

(۴) وہ حکم متفق علیہ ہو، کیونکہ اگر مختلف فیہ ہوگا تو اس صورت میں اسی نسبت سے اختلاف فرع میں منعکس ہوگا۔

(۵) وہ حکم کوئی استثنائی حیثیت نہ رکھتا ہو، جیسے عام حالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات دعویٰ کے لئے دو گواہوں کا نصاب مقرر فرمایا ہے۔ لیکن خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو اس ضابطہ سے مستثنیٰ قرار دیا اور ان کی اکیلی گواہی کو دو گواہوں کے برابر قرار دیا۔

قیاس کی ایک اور قسم ہے جس کو استحسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

استحسان

استحسان دراصل قیاس ہی کی ایک صورت ہے، بعض صورت میں استحسان کسی باریک نکتہ پر مبنی ہوتا ہے، بعض جگہ تعامل اور عرف پر، بعض جگہ ضرورت اور مصلحت پر اور بعض جگہ رفع مشقت پر مبنی ہوتا ہے۔ مثلاً قاعدہ یہ ہے کہ معدوم چیز کی بیع وشراء باطل ہے، اور اس کی اصل کتاب وسنت سے ثابت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اجارہ (کرایہ پر چیز دینا) کو جائز رکھا گیا ہے۔ حالانکہ اجارہ کے ذریعہ جن منافع کا عقد ہوتا ہے وہ بوقت عقد معدوم ہوتے ہیں، لہٰذا قیاس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اجارہ فاسد ہو، لیکن چونکہ عہد رسالت اور صحابہ سے اس کا تعامل ثابت ہے اس لئے اجارہ کو استحساناً جائز رکھا گیا ہے۔

استصحاب

یہ بھی قیاس کی ایک نوع ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی حکم کو اس کی اصل پر باقی رکھا جائے جب تک کہ کوئی مانع عارض نہ ہو۔ مثلاً کسی عورت کا خاوند گم شدہ ہو تو اس کو اس وقت

تک اس کی بیوی تصور کیا جائے گا جب تک کہ اس کے خاوند کی موت کی خبر مصدقہ ذرائع سے یقینی طور پر معلوم نہ ہو جائے۔

تعامل

مجتہد کسی دور کی عادت اور رسوم سے بھی استدلال کرتے ہیں، اس کی شرائط یہ ہیں:

(۱) جس عادت پر فیصلہ کیا جائے وہ ایسی معقول ہونی چاہئے کہ طبائع سلیمہ کے نزدیک مقبول ہو۔

(۲) ان عادات اور رسوم کا متکرر اور شائع ہونا ضروری ہے۔

(۳) اگر عرف کہیں بدل گیا ہو اور ایک عادت کے بعد دوسری عادت نے رواج حاصل کر لیا ہو تو عرف سابق کو دیکھا جائے گا یا اس عادت کا اعتبار کیا جائے گا جو اس وقت کے معاملہ سے مقارن ہو، مابعد کی عادت کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۴) عرف کی رعایت اس وقت غیر ضروری ہو جائے گی جب کہ معاملہ میں کوئی شرط ایسی مان لی جائے جو اس کے منافی ہو۔

اس کی مثال یہ ہے کہ آپ کو درزی سے کام لینا مقصود ہو تو آلات خیاطت یعنی مشین، سوئی اور دھاگہ اور بٹن وغیرہ عرفاً اس کے ذمہ ہوں گے۔

اشباہ ونظائر

فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا مبنی یا اصل یہ ہے کہ اشباہ ونظائر یا باہم متشابہ یا ملتے جلتے کاموں میں نفیاً اور اثباتاً ایک ہی طرح کا حکم دائر وسائر رہتا ہے یہ وہی اصول ہے جسے مقایسہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً حدیث میں تو صرف اس قدر مذکور ہے کہ کسی بھائی کے معاملہ میں بیع وشراء کے پختہ ہو جانے یا رشتہ کی سلسلہ جنبانی کے اثناء میں دوسرے بھائی کو مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ مگر فقہاء نے اجارہ (کسی چیز کو کرایہ پر دینا) کو بھی اسی پر قیاس فرمایا ہے۔ کیونکہ جو فساد بیع میں مداخلت سے ہوتا ہے وہ اجارہ میں بھی ہے۔

طریق اجتہاد

جب کوئی شخص یا ادارہ کسی مذہب کے اصول کے تابع ہو کر پیش آمدہ مسائل میں

اجتہاد کرے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ اپنے امام کے وضع کردہ اصول کا لحاظ کرے۔

مثلاً امام اعظم ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ پہلے کسی مسئلہ کا حل قرآن سے تلاش کرتے ہیں، پھر احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، پھر آثار سے، آثار صحابہ میں خلفاء راشدین اور عبادلہ اربعہ کی روایت کو دوسرے صحابہ کی روایات پر مقدم رکھتے ہیں، اس کے بعد اجماع سے فیصلہ کرتے ہیں اور اس وقت تک قیاس سے کام نہیں لیتے جب تک کہ کسی مسئلہ پر حدیث ضعیف بھی نہ مل سکے۔

قرآن کریم سے مسائل کے استنباط کے لئے امام اعظم کا اصول یہ ہے کہ:

(۱) اگر قرآن کریم میں ایک حکم ایک جگہ مطلق بیان کیا گیا ہے اور دوسری جگہ مقید تو وہ مطلق کو مقید پر محمول نہیں کرتے، بلکہ مطلق اپنے محل پر رکھتے ہیں اور مقید کو اپنے محل پر۔

(۲) قرآن کریم میں جو حکم اطلاق اور عموم سے وارد ہوا ہو وہ اس کو خبر واحد یا قیاس سے مقید کرنا جائز نہیں سمجھتے۔

(۳) خبر مشہور سے قرآن کریم کے عموم پر زیادتی کو جائز رکھتے ہیں۔

(۴) نکرہ حیز نفی میں ہو تو اس کو عموم اور اگر اثبات میں ہو تو خصوص پر محمول کرتے ہیں۔

(۵) قران فی الذکر کو قران فی الحکم کے لئے مستلزم نہیں مانتے۔

(۶) اگر کسی اسم پر کوئی خاص حکم لگایا جائے تو اس خصوصیت کو باقی افراد کی نفی کے لئے مستلزم نہیں مانتے۔

(۷) جب کوئی حکم کسی وصف خاص یا شرط خاص کے ساتھ مقید ہو تو اس وصف یا شرط کی نفی سے حکم کو منتفی نہیں سمجھتے۔

(۸) جب کسی شخص کے حق میں کوئی حکم عام بطور جزاء کے واقع ہو تو ان کے نزدیک وہ عموم کا فائدہ دیتا ہے۔

(۹) جب مدح اور ذم کے ساتھ کسی جماعت کو موصوف کیا جائے تو وہ عموم کا فائدہ نہیں دیتا۔

(۱۰) کسی شئے کا امر اس کی ضد کی کراہت کو مستلزم ہے اور نہی سنت کو۔

(۱۱) امر میں حقیقت وجوب ہے، البتہ قرائن سے ندب یا اباحت کے لئے بھی آسکتا ہے۔

احادیث و آثار سے استدلال کرنے کے لئے امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے مندرجہ ذیل اصول ہیں:

(۱) امام اعظم اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ صحابہ کرام سے روایت کرنے والے ایک یا دو شخص نہ ہوں بلکہ اتقیاء کی ایک جماعت نے صحابہ سے اس حدیث کو روایت کیا ہو۔

(۲) معمولات زندگی سے متعلق عام احکام میں امام ابوحنیفہ یہ ضروری قرار دیتے ہیں کہ ان احکام کو ایک سے زیادہ صحابہ نے روایت کیا ہو۔

(۳) جو حدیث عقل کے قطعی کے مخالف ہو (یعنی اس سے اسلام کے مسلم اصول کی مخالفت لازم آتی ہو) وہ امام اعظم کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔

(۴) جو خبر واحد صریح قرآن کے مخالف ہو وہ بھی مقبول نہیں۔

(۵) اگر راوی پر اپنا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو تو وہ روایت مقبول نہیں ہوگی۔

(۶) جب ایک مسئلہ میں مبیح اور محرم دو روایتیں ہوں تو امام اعظم مبیح پر محرم کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۷) ایک ہی واقعہ کے بارے میں اگر راوی کسی امر زائد کی نفی کرے اور دوسرا اثبات تو اگر نفی دلیل پر مبنی نہ ہو تو نفی کی روایت قبول نہیں کی جائے گی۔

(۸) اگر ایک حدیث میں کوئی حکم عام ہو اور دوسری حدیث میں چند خاص چیزوں پر اس کے برخلاف حکم ہو تو امام اعظم حکم عام کو مقدم رکھتے ہیں۔

(۹) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح قول یا فعل کے خلاف اگر کسی ایک صحابی کا قول و فعل ہو تو وہ مقبول نہیں ہے۔

(۱۰) خبر واحد سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی قول یا فعل ثابت ہو اور صحابہ کی ایک جماعت نے اس سے اختلاف کیا ہو تو اس صورت میں آثار صحابہ پر عمل ہوگا اور حضور کا وہ قول یا فعل نسخ پر محمول ہوگا۔

(۱۱) ایک واقعہ کے مشاہدہ کے بارے میں متعارض روایات ہوں تو اس شخص کی روایت کو قبول کیا جائے گا جو ان میں زیادہ قریب سے مشاہدہ کرنے والا ہو۔

(۱۲) اگر دو متعارض حدیثیں ایسی سندوں کے ساتھ مروی ہوں کہ ایک میں قلت وسائط سے ترجیح ہو اور دوسری میں کثرت تفقہ سے تو کثرت تفقہ کو قلت وسائط پر ترجیح ہوگی۔

(۱۳) جو حدیث حد یا کفارے کے بیان میں وارد ہو اور وہ صرف ایک صحابی سے مروی ہو تو مقبول نہیں ہوگی۔

(۱۴) کسی ایک مسئلہ میں حضور کے متعدد افعال مروی ہوں تو ان میں منشاء رسالت تلاش کر کے تطبیق دی جائے گی، ورنہ دلائل سے آخری فعل متعین کر کے باقی کو منسوخ سمجھا جائے گا۔



بلا سود معیشت

سود کو عربی میں "ربوٰ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ربوٰ کی دو قسمیں ہیں۔ ربوٰ النسیئہ اور ربوٰ الفضل۔ ربوٰ النسیئہ کو ربوٰ القرآن اور ربوٰ الفضل کو ربوٰ الحدیث بھی کہا جاتا ہے۔
ربوٰ النسیئہ کی حرمت قطعی ہے، ان کو حرمت اعتقادی بھی کہا جاسکتا ہے اور ربوٰ الفضل کی حرمت ظنی ہے، اس کو حرمت عملی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس کی پوری تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے۔

ربوٰ النسیئہ

زمانہ جاہلیت میں دو قسم کے سود رائج تھے۔ سود مفرد اور سود مرکب۔ قرآن کریم نے سود کی ان دونوں قسموں کو حرام کردیا۔
سود مفرد یہ ہے کہ ایک شخص کسی شخص کو ایک مدت معینہ کے لئے معین رقم قرض دے اور مدت پوری ہونے کے بعد اس سے ایک معین رقم بطور سود اصل رقم کے علاوہ وصول کرے۔ مثلاً زید ایک شخص کو ایک ہزار روپیہ ایک سال کے لئے ادھار دیتا ہے اور یہ شرط لگا کر دیتا ہے کہ سال پورا ہونے کے بعد وہ اس سے ایک ہزار کے علاوہ ایک سو روپیہ وصول کرے گا، یہ ایک سو روپیہ سود قرار پائے گا۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت کے ربا کی تفسیر کرتے ہوئے امام ابوبکر احمد بن علی الرازی الجصاص المتوفی ۳۷۰ھ فرماتے ہیں:

والربا الذی کانت العرب تعرف و تفعله انما کان قرض الدراهم والدنانیر الی اجل بزیادة علی المقدار ما استقرض علی ما یتراضون به۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۴۶۵)	سود کی وہ شکل جس کو عرب جانتے اور اس پر عمل کرتے تھے، وہ یہ تھی کہ درہموں اور دیناروں کو ایک معین مدت کے لئے کسی کو قرض پر دیا جائے اور مدت پوری ہونے کے بعد اصل رقم پر باہمی رضامندی سے ایک زیادتی بھی وصول کی جائے۔

سود کی دوسری شکل جس کا اس دور میں رواج تھا وہ سود مرکب تھا۔ یعنی ایک شخص کسی دوسرے شخص کو ایک معین مدت کے لئے ایک رقم قرض دے اور ماہ بماہ اس سے ایک معین رقم وصول کرتا رہے اور مدت پوری ہونے کے بعد اصل رقم کا مطالبہ کرے اور اگر وہ مدت پوری ہونے کے بعد اصل رقم ادا نہ کر سکے تو شرح سود میں اضافہ کر دیا جائے، مثلاً زید ایک شخص کو ایک سال کے لئے ایک ہزار روپیہ قرض دیتا ہے اور ہر ماہ بطور سود کے دس روپیہ وصول کرتا ہے، سال کے بعد اس کو اگر مدیون ہزار روپیہ نہ دے سکا تو وہ شرح سود میں اضافہ کر کے بیس روپیہ ماہانہ کر دے گا۔

چنانچہ امام فخر الدین رازی المتوفی ۶۰۶ھ ربا الجاہلیہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

واما ربا النسيئة فهو الامر الذي كان مشهورا متعارفا في الجاهلية و ذالك انهم كانوا يدفعون المال على ان ياخذوا كل شهر قدرا معينا و يكون راس المال باقيا ثم اذا حل الدين طالبوا المديون براس المال فان تعذر عليه الاداء زادوا في الحق والاجل فهذا هو الربا الذي كانوا في الجاهلية يتعاملون۔

ربوٰ النسیئہ وہ چیز ہے جو زمانہ جاہلیت میں مشہور متداول تھی، اہل عرب کسی شخص کو ایک معین مال اس شرط پر دیتے تھے کہ وہ ہر ماہ ایک معین رقم ادا کرے گا اور جب مدت پوری ہو جاتی تو وہ اس سے اصل رقم کا مطالبہ کرتے، اگر وہ ادا نہ کر سکتا تو شرح سود میں زیادتی اور مدت ادائیگی میں توسیع کر دیتے۔

(مفاتیح الغیب المعروف بتفسیر کبیر ج ۲ ص ۳۵۱)

قرآن کریم نے سود کی ان دونوں قسموں کو حرام فرما دیا، قسم اول کے بارے میں فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (البقرہ: ۲۷۸)

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور سود کی باقی ماندہ رقم چھوڑ دو اگر تم واقعی ایمان دار ہو"۔

اور سود کی دوسری قسم کے بارے میں فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰٓوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً (آل عمران: ۱۳۰)

"اے ایمان والو! سود کو دوہرا چوہرا کر کے نہ کھاؤ"۔

ربوٰ الفضل

سود کی دوسری قسم ربا الفضل ہے۔ اس کو ربا الحدیث سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھ چیزوں کی اپنی جنس سے بیع میں تفاضل اور زیادتی کو حرام فرما دیا، چنانچہ امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج القشیری المتوفی ۲۶۱ھ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:

عَنْ عِبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةُ بِالْفِضَّةِ وَالْبُرُّ بِالْبُرِّ وَالشَّعِيْرُ بِالشَّعِيْرِ وَالتَّمْرُ بِالتَّمْرِ وَالْمِلْحُ بِالْمِلْحِ مِثْلًا بِمِثْلٍ سَوَاءً بِسَوَاءٍ يَدًا بِيَدٍ فَاِذَا اخْتَلَفَتْ هٰذِهِ الْاَصْنَافُ فَبِيْعُوْا كَيْفَ شِئْتُمْ اِذَا كَانَ يَدًا بِيَدٍ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۵)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سونے کو سونے کے عوض، چاندی کو چاندی کے عوض، گندم کو گندم کے، جو کو جو کے، کھجور کو کھجور کے اور نمک کو نمک کے عوض فروخت کرو، دست بدست اور برابر برابر اور جب یہ اقسام آپس میں مختلف ہوں تو جس طرح چاہے فروخت کرو، بشرطیکہ دست بدست بیع ہو۔

چونکہ اس حدیث میں صرف چھ ہم جنس چیزوں کو دست بدست زیادتی کے ساتھ فروخت کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لئے ائمہ مجتہدین نے غور کیا کہ ان چھ چیزوں میں وہ کون سی چیز علت مشترکہ ہے جس کی وجہ سے حرمت کے اس حکم کو دوسری ہم جنس اشیاء میں زیادتی کے ساتھ فروخت کرنے پر لاگو کیا جا سکے، پس امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے جنس اور قدر کو اور امام شافعی نے طعم (یعنی کھانے پینے والی اشیاء) اور نقدیت کو اور امام مالک نے لائق غذائیت اور قابل ذخیرہ اشیاء کو علت مشترکہ قرار دیا اور امام احمد کے دو قول ہیں ایک قول امام ابوحنیفہ کے مطابق ہے، ایک قول امام شافعی کی طرح ہے۔

(بدایۃ المجتہد لابن راشد المتوفی ۵۹۵ھ، ج ۲ ص ۹۷، تفسیر کبیر للرازی ج ۲ ص ۳۵۲، کتاب الفقہ علی

المذاہب الاربعہ للعبد الرحمن جزری ج ۲ ص ۲۴۹)

اس جگہ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب علت حرمت میں اختلاف ہوا تو ایک چیز میں زیادتی ایک امام کے نزدیک حرام ہوگی اور دوسرے کے نزدیک حلال، حالانکہ حرام کو حلال کرنا کفر ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ جن چھ ہم جنس چیزوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نص فرمادی ہے ان کو زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا تو سب کے نزدیک حرام ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ان کے علاوہ باقی جن چیزوں کی حرمت مجتہد کے اجتہاد سے ثابت ہے وہ حرمت ظنی اور حرمت عملی ہے۔ اس کی نظیر ایسے ہی ہے جیسے مسح کی، کیونکہ نفس مسح جو قرآن کریم سے ثابت ہے فرض قطعی ہے اور اس کی مقدار جو مجتہدین کے اجتہاد کرنے سے متعین ہوئی، مختلف ہے۔ اس کو فرض عملی اور فرض ظنی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حرام قطعی کو حلال کرنا کفر اور بدعقیدگی ہے نہ کہ حرام ظنی کو، کیونکہ اس کی حرمت مجتہد کے اجتہاد کے تابع ہوتی ہے۔

دراصل ربوٰ الفضل کی حرمت ایک انسدادی نوعیت کا حکم ہے۔ چونکہ عرب میں عام رواج تھا کہ وہ ہم جنس اشیاء کا دست بدست تبادلہ کرتے تھے اور اس میں کمی بیشی کو جائز رکھتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش بندی کے طور پر ہم جنس اشیاء میں تفاضل اور قرض کو بھی حرام فرمادیا تاکہ یہ معاملہ کہیں ربا النسیئہ کی طرف متعدی نہ ہوجائے جو حرام قطعی ہے۔ اس کی تاکید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ "کنز العمال" کی روایت میں اس حدیث کے ساتھ یہ الفاظ بھی وارد ہیں۔ "فانی اخاف علیکم الربا" "مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں اس دست بدست زیادتی سے تم سود کی لعنت میں نہ گرفتار ہو جاؤ" اور اس کی مزید تاکید امام بخاری کی اس روایت سے ہوتی ہے جو وہ حضرت اسامہ سے روایت کرتے ہیں:

قال ابن عباس اخبرنی اسامة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ربٰو الا فی النسیئة۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۹۱)	حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت اسامہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سود نہیں ہے مگر ادھار میں۔

اس حدیث کا صحیح محمل یہی ہے کہ جو ربا حرام قطعی ہے اور جس پر عذاب کی وعید شدید

ہے وہ ربا النسیئہ ہے، جس کو ربا القرآن کہتے ہیں اور ربوٰ الفضل جس کا حدیث شریف میں ذکر ہے اس کی حرمت ظنی اور انسدادی نوعیت کی ہے۔

ربوٰ الفضل کے احکام

احناف نے ہم جنس اشیاء میں حرمت کی علت پیمائش اور وزن کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ علامہ برہان الدین اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں: دو چیزوں میں مماثلت صورت اور معنی کے اعتبار سے ہوتی ہے اور مقدار (پیمائش یا وزن) سے معیار میں مساوات حاصل ہوتی ہے، یہ صوری مماثلت ہے اور اتحاد جنس سے معنوی مشاکلت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اتحاد جنس سے معنوی مماثلت حاصل ہوئی۔ نیز اس کی مزید تائید میں وہ اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ بعض روایات میں گندم وغیرہ کے ساتھ "کیلا بکیل" وارد ہے اور سونے چاندی کے ساتھ "وزن بوزن" وارد ہے اور یہ نص ہے اس بات پر کہ علت مشترکہ پیمائش اور وزن یعنی مقدار ہے۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۷۹۔ ۷۸)

امام مسلم اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:

لا تبیعوا الذھب بالذھب ولا الورق بالورق الا وزنا بوزن مثلا بمثل سواء بسواء۔ (مسلم ج ۲ ص ۲۷)

سونے کو سونے کے ساتھ چاندی کو چاندی کے ساتھ مت فروخت کرو، مگر برابر وزن کے ساتھ۔

اس حدیث میں اتحاد جنس کے ساتھ وزن کی تصریح کر دی گئی ہے۔

اور اتحاد جنس کے ساتھ کیل کی تصریح کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔ ابو عبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی، المتوفی ۲۷۴ھ اپنی سند کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

عَنْ اَبِی سَعِیْدٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لا یَصْلُحُ صَاعُ تَمْرٍ بِصَاعَیْنِ۔

حضرت ابو سعید سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک صاع کھجور کی بیع دو صاع کھجور کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔

علامہ برہان الدین فرماتے ہیں: جب چیزیں نہ ہم جنس ہوں اور نہ وزنی اور نہ ماپ والی ہوں تو بیع میں زیادتی اور ادھار دونوں جائز ہیں اور دو چیزوں میں قدر اور جنس متحد ہوں

تو زیادتی اور ادھار دونوں حرام ہیں اور جب ایک وصف ہو اور دوسرا نہ ہو تو بیع میں زیادتی جائز ہے اور ادھار حرام ہے، مثلاً جب دو عدی چیزیں ہوں، یعنی وصف قدر اور اتحاد جنس نہ ہو تو بیع میں زیادتی اور ادھار دونوں جائز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک انڈا دو انڈوں کے عوض دست بدست بیچا جا سکتا ہے اور ادھار نہیں اسی طرح اگر دو ہم جنس چیزیں نہ ہوں اور مقدار ہونے میں متحد ہوں تو زیادتی جائز ہے اور ادھار منع ہے۔ مثلاً ایک صاع گندم کے عوض دو صاع جَو دست بدست فروخت کئے جا سکتے ہیں اور ادھار نہیں۔

(ہدایہ ج ۳ ص ۷۹ مع توضیح)

سود پر عذاب کی وعید

قرآن کریم میں جس شدت کے ساتھ سود لینے پر وعید کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور معصیت کے ارتکاب پر نہیں ملتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (البقرہ)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو اگر تم سچے مسلمان ہو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ قبول کر لو''۔

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (البقرہ)

''جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچ گئی اور وہ سودی کاروبار سے رک گیا تو اس کے گزشتہ معاملات معاف ہوں گے اور اس کا حساب اللہ کی طرف مفوض ہے اور جس شخص نے پھر دوبارہ سودی کاروبار کیا وہ جہنمیوں میں سے ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے''۔

اس آیت کا تعلق اس دور سے ہے جب احکام بتدریج نازل ہو رہے تھے، اس

صورت میں پچھلا سود معاف ہونے کا حکم نازل ہوا تھا۔ اب یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص سودی کاروبار چھوڑ دے تو اس کا پچھلا گناہ معاف ہو، ایسے شخص پر توبہ لازم ہے اور توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے توبہ قبول کرے یا نہ کرے، تاہم اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو شخص توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمالیتا ہے۔

بینکنگ (Banking) کا نظام

اس عنوان کے تحت ہم موجودہ بینکاری کے نظام کا تازہ ترین (UP TO DATE) اجمالی خاکہ پیش کر رہے ہیں۔ اس خاکہ میں ہم وہ شرح سود بیان کریں گے جو بینک نے رقم جمع کرنے والوں کے لئے مقرر کی ہے اور وہ شرح سود بھی بیان کریں گے جو بینک قرض حاصل کرنے والوں کے لئے مقرر کرتا ہے اور اس کے بعد ان وجوہ کی نشاندہی کریں گے جن سے بینک اور سرمایہ دار ل کر عوام اور صارفین کا استحصال کرتے ہیں۔

بینک میں رقم جمع کرانے والوں کے لئے شرح سود

(۱) چلت کھاتے (Current Account): جس کھاتے میں ۵۰۰ روپے سے کم عمومی بیلنس رہتا ہے اس کھاتے کے اخراجات وضع کرنے کے لئے بینک چھ ماہ بعد پانچ روپے کھاتے سے کاٹ لیتا ہے، لیکن یہ بینک آفیسر کی صواب دید پر موقوف ہے۔ ۵۰۰ روپے یا اس سے زیادہ رقم ہو تو بینک نہ اپنا خرچ وصول کرتا ہے نہ سود فراہم کرتا ہے۔

(۲) سپیشل نوٹس اکاؤنٹ (الف) (Special Notice Account-A): خاص ہدایت کے کھاتے جن سے سات دن سے انتیس دن تک رقم نکلوائی جا سکتی ہے، اس پر سود کی شرح ۱/۲ ۵ فی صد ہے۔

(۳) سپیشل اکاؤنٹ (ب): ایسے خاص کھاتے جن سے رقم انتیس دن یا زائد مدت کے نوٹس پر نکلوائی جا سکتی ہے، اس کی شرح سود ۱/۲ ۶ فی صد ہے۔

(۴) سیونگ بینک اکاؤنٹ (الف) (Saving Bank Deposits-A): اس میں چیک کاٹنے کی سہولت حاصل ہے لیکن ۱۵ ہزار روپے سے زیادہ کا چیک نہیں

کاٹ سکتا۔ نیز دس دن کے دوران دو چیک نہیں کاٹے جا سکتے۔ اس کی شرح سود ۱/۲ ۷ فی صد ہے۔ لیکن اگر رقم ایک لاکھ سے زیادہ ہو جائے تو رقم جتنی بھی ہو اس پر بینک سود ادا نہیں کرے گا۔

(۵) سیونگ اکاؤنٹ (ب)(Saving Bank Deposits-B): اس کھاتے میں بینک چیک بک فراہم نہیں کرتا۔ اس کھاتہ کی شرح سود ۱/۲ ۸ فی صد ہے۔

(۶) فکسڈ ڈیپازٹ (الف)(Fixed Deposits-A): تین ماہ سے چھ ماہ تک (یعنی اس عرصہ میں رقم نہیں نکلوائی جا سکتی) اس کی شرح سود ۹ فی صد ہے۔

(۷) فکسڈ ڈیپازٹ (ب)(Fixed Deposits-B): چھ ماہ سے ایک سال تک، شرح سود ۱/۲ ۹ فی صد۔

(۸) فکسڈ ڈیپازٹ (C): ایک سال سے دو سال تک، شرح سود ۱/۲ ۱۰ فی صد۔

(۹) فکسڈ ڈیپازٹ (D): دو سال سے تین سال تک، شرح سود ۱۱ فی صد۔

(۱۰) فکسڈ ڈیپازٹ (E): تین سال سے چار سال تک، شرح سود ۳/۴ ۱۱ فی صد۔

(۱۱) فکسڈ ڈیپازٹ (F): چار سال سے پانچ سال تک، شرح سود ۱/۴ ۱۲ فی صد۔

(۱۲) فکسڈ ڈیپازٹ (G): پانچ سال اور اس سے زائد عرصہ کے لئے، ۳/۴ ۱۲ فی صد۔

(۱۳) سود مرکب اکاؤنٹ (Cumulative Deposits Certeficate): اس رقم کا کھاتہ دار بینک سے سرٹیفکیٹ خریدتا ہے۔ مثلاً سو روپے کا سرٹیفکیٹ لیا تو پہلے سال اس پر سود مفرد لگے گا۔ پھر اصل مع سود پر سود لگے گا۔ اس طرح یہ سو روپیہ کی رقم چھ سال میں ۸۳۔۲۰۹ روپے ہو جائے گی اور اگر دس سال بعد وہ رقم نکلواتا ہے تو ۱۸۔۳۴۴ روپے ہو جائے گی، پندرہ سال بعد ۵۴۔۶۳۸ روپے ہو جائے گی اور بیس سال بعد وہ رقم ۶۳۔۱۱۸۴ روپے ہو جائے گی۔

بینک جو رقم قرض دیتا ہے اس پر شرح سود

(۱) عارضی قرضہ (Temporary Derdraft): بینک کا منیجر اپنی صوابدید سے چند

یوم کے لئے قرض جاری کرتا ہے اور اس پر ۱۴ فی صد سود لیا جاتا ہے۔

(۲) مستقل قرضہ (الف) (Permanent Over Draft): فکسڈ ڈیپازٹ کو گروی (Pledge) رکھ کر اسی کی اصل رقم کا ۶۰ فی صد قرضہ دیا جا سکتا ہے، اس صورت میں بینک ۱۲ فی صد سود وصول کرے گا۔

(۳) مستقل قرضہ (ب) (Letter of Lien): سیونگ اکاؤنٹس کی بنیاد پر اصل رقم کا ۶۰ فیصد قرض دیا جا سکتا ہے، اس صورت میں بینک ۱۳ فیصد سود وصول کرے گا۔

(۴) (S.O.D) Secured Over Draft: خام اشیاء اور مختلف اجناس کے مال کو گروی رکھ کر قرض حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جس قدر مال گروی رکھا جاتا ہے اس کی قیمت کا بازاری نرخ (Market Value) سے تعین کر کے اس کے ستر فی صد رقم تک قرض دیا جا سکتا ہے اور اس پر ۱۴ فیصد سود وصول کیا جاتا ہے۔ گروی رکھنے کی صورت یہ ہے کہ بینک اپنے گودام میں یا کرایہ پر گودام حاصل کر کے سامان رکھ کر تالہ لگاتا ہے اور چوکیدار بٹھا دیتا ہے اور مال کی انشورنس کراتا ہے۔ گودام کا کرایہ، چوکیدار کی تنخواہ اور انشورنس کا خرچ سب بذمہ مقروض ہوتا ہے۔

(۵) معمولی نوعیت کے کاروباری قرضے (Small Loan Scheme): کاروباری مقاصد کے لئے مکان یا زمین گروی رکھ کر کاروبار کے لئے قرض دیا جاتا ہے بشرطیکہ جس جنس کے ساتھ کاروبار ہو رہا ہے، اس کا سٹاک قرض کی رقم سے دگنا ہو، اس سٹاک کو انشورنس کیا جاتا ہے۔ بینک کا ایک افسر ہر پندرہ دن بعد سٹاک (Stock) کا جائزہ لیتا ہے۔ جس جائیداد پر قرض حاصل کیا جاتا ہے وہ بینک کے نام عدالت میں گروی ہوتی ہے اور جائیداد کی مالیت کا اندازہ گورنمنٹ کی طرف سے سند یافتہ ماہر (Valvator) لگاتا ہے اور وہ اپنا سرٹیفکیٹ بینک کو مہیا کرتا ہے اور ان تمام معاملات کے جملہ اخراجات بذمہ مقروض ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ بینک قرض پر ۱۴ فیصد سود وصول کرتا ہے۔

(۶) صنعتی قرضہ (Industrial Loan): صنعت کاروں کو بھی بینک مندرجہ بالا

شرائط کے تحت قرض دیتا ہے، لیکن صنعت کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے سود ۱۲ فیصد وصول کرتا ہے۔

(۷) زراعتی قرضے (Agriculture Loan): تحصیل دار زمین کی مالیت کی کتاب کسان کو دیتا ہے اور کسان وہ کتاب بینک میں گروی رکھ کر اس کی مالیت کے کم و بیش ۶۰ فیصد پر ٹریکٹر وغیرہ کی خریداری کے لئے قرض لیتا ہے اور بینک ۱۴ فیصد سود وصول کرتا ہے۔

(۸) درآمد برآمد کے لئے بینک کا کام (Foreign Exchange): اگر کسی کاروباری شخص نے ایک لاکھ کا مال باہر سے منگوانے کے لئے گورنمنٹ سے درآمد کا لائسنس (Import Licence) لیا تو وہ لائسنس اور رقم کا ۴۰ فی صد حصہ بینک میں جمع کر کے (Letter of Credit) (L.C) کھول لیتا ہے، اب مال منگوانے کی ذمہ داری بینک پر ہوگی اور دوسرے ملک سے مال کی روانگی سے پہلے بینک اس ملک کے بینک میں مکمل ادائیگی کر دے گا اور جس تاریخ کو بینک رقم ادا کرے گا اس تاریخ سے مال منگوانے والا بینک کا مقروض ہوگا۔ جس دن مال پہنچے گا بینک مقروض کو اطلاع دے گا اور مال چھڑانے تک کے عرصہ پر اپنی رقم کا ۱۴ فیصد سود وصول کرے گا۔ نیز اس سال میں ہر دو بینک کے اخراجات کا کمیشن، کسٹم ڈیوٹی سے مال واگزار کرانے کے اخراجات اور جتنا عرصہ مال گودام میں رہے گا اس کے سب اخراجات بذمہ مقروض ہوں گے۔

نوٹ: بینک جس قدر قرضہ جاری کرتا ہے مقروض سے بونڈ لکھا لیتا ہے کہ وہ جس وقت چاہے اپنا قرض مقروض یا اس کے ورثاء سے وصول کر سکتا ہے۔

قومی معیشت کے استحصال میں بینک کا کردار

آڑھتی حضرات اپنی کاروباری ساکھ کی بنیاد پر بینک سے قرض حاصل کر کے سیکڑوں ٹن غلہ اور کپاس خرید کر بینک کے گوداموں میں رکھوا دیتے ہیں، اسی طرح صنعتی ادارے اپنی مصنوعات کی تیاری (Production) کے لئے بینک سے قرض حاصل کر

کے اس کو بینک کے گوداموں میں رکھوا دیتے ہیں اور جب بازار میں اجناس اور مصنوعات کی قلت ہوتی ہے تو صنعت کار اور آڑھتی حضرات گوداموں سے مال نکال کر کھلے بازار میں لاتے ہیں، لیکن اس عرصہ میں ان پر جو چودہ (۱۴) فیصد گودام کا کرایہ اور اس سے متعلقہ اخراجات اور انشورنس کا خرچہ لاگو ہوتا ہے اپنے منافع سمیت وہ سب اس جنس کی قیمت پر ڈال دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ۱۵ روپے والی لاگت کی چیز ۷۵ روپیہ پر بھی بمشکل دستیاب ہوتی ہے اور اس پانچ گنا زیادہ خرچ کا بار نہ بینک پر پڑتا ہے، نہ آڑھتی یا صنعت کار پر، اس تمام زائد خرچ کا بار عوام اور صارفین پر پڑتا ہے اور سرمایہ دار بینک کے قرض کے سہارے ایک کارخانہ سے دوسرا کارخانہ لگاتا ہے اور بینک اس سے سود در سود وصول کر کے ساڑھے چار سال میں اپنے قرض کی رقم دگنی کر لیتا ہے اور دولت سمٹ کر چند بڑے بڑے صنعت کاروں اور بینکوں میں جمع ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے بیس سال کے عرصہ میں بینکوں کی شاخوں کی تعداد سو سے بڑھ کر ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ اسی طرح صنعت کاروں اور بڑے بڑے آڑھتیوں کے کاروبار بھی بڑھتے جا رہے ہیں اور یہ تمام سرمایہ عوام اور صارفین کی جیبوں سے کھینچ کھینچ کر بینک اور سرمایہ داروں کے پاس پہنچ رہا ہے اور ایک طبقہ امیر تر اور دوسرا غریب تر ہوتا جا رہا ہے اور اس کی وجہ صرف اور صرف سود کی لعنت ہے۔ یہ سود ہی کی لعنت ہے جو عوام کے جسم سے آہستہ آہستہ خون نچوڑ کر سرمایہ داری کو پروان چڑھا رہی ہے۔

بینک سے سود لینے کا حکم

بینک قرض پر جو سود ادا کرتا ہے وہ ربا النسیئہ کی تعریف میں آتا ہے اور ربا النسیئہ حرام قطعی ہے۔ جس طرح خنزیر اور مردار کا کھانا حرام ہے اسی طرح سود کی رقم لے کر کھانا حرام ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سود کی رقم لے کر کسی غریب کو دے دی جائے، یہ تجویز دو وجہ سے باطل ہے، اولاً تو جب اس نے سود لے لیا تو اس نے حرام قطعی کا ارتکاب کیا اور اگر اس کو حلال سمجھ کر لیا تو فقہاء کی تصریح کے مطابق کافر ہو گیا۔ کیونکہ حرام قطعی کو حلال سمجھنا کفر ہے اور اگر حرام سمجھ کر لیا تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا اور جب بالقصد یہ سود کی رقم کسی غریب

شخص کو دی تو از روئے حدیث "لعن اللہ علی اکل الربا و موکلہ" "سود کے کھانے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت ہے"۔ یہ سود کی رقم کھلانے والا لعنت کا مستحق قرار پایا۔

علامہ علاؤ الدین الحصکفی المتوفی ۱۰۸۸ھ فرماتے ہیں:

فی شرح الوھبانیۃ عن البزازیۃ انما یکفر اذا تصدق بالحرام القطعی۔ (درمختار علی حامش ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵)	شرح وہبانیہ نے بزازیہ سے نقل کیا ہے کہ جب کوئی شخص حرام قطعی سے مال صدقہ کرے تو وہ کافر ہو جائے گا۔

اور علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ فرماتے ہیں:

رجل دفع الی فقیر من مال الحرام شیئا یرجوبہ الثواب یکفر ولو علم الفقیر بذالک فدعا لہ وامن المعطی کفرا جمیعا۔ (ردالمحتار ج ا ص ۳۵)	کسی شخص نے اس مال سے صدقہ کیا جو حرام قطعی ہے اور ثواب کی امید رکھی تو وہ کافر ہو گیا اور اگر فقیر کو مال کی حرمت کا علم ہو گیا اور اس نے دینے والے کو دعا دی اور اس نے آمین کہی تو دونوں کافر ہو گئے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا: بالقصد مال حرام کو حلال سمجھ کر دینا کفر ہے اور حرام سمجھ کر لینا گناہ کبیرہ ہے اور بالقصد لے کر اسی شخص کو کھلانا گناہ کبیرہ بھی ہے اور لعنت کا مصداق بھی۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے شامت اعمال سے سود لے لیا ہے اور اب وہ اس فعل پر نادم اور تائب ہے اور اس کا مداوا کرنا چاہتا ہے تو وہ کیا کرے؟ اس کا حل فقہاء نے یہ بتایا ہے کہ وہ سود کی رقم مقروض کو واپس کر دے اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو مقروض کی طرف سے صدقہ کی نیت کر کے وہ رقم کسی غریب شخص کو دے دے۔ تا کہ وہ اپنے ذمہ سے سبکدوش ہو جائے۔

چنانچہ علامہ شامی فرماتے ہیں:

والحاصل انہ ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیھم والافان علم عین الحرام لا محل لہ و یتصدق بہ بنیۃ	خلاصہ یہ ہے کہ جس کے پاس مال حرام ہو اگر وہ اس مال کے مالک کو جانتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ مال اس کے مالک کو دے

صاحبہ۔ (رد المحتار ج ۴ ص ۱۸۰) دے اور اگر مالک کا علم نہ ہو تو یہ مال اس کے لئے حلال نہیں ہے، وہ اصل مالک کی طرف سے نیت کر کے وہ مال کسی غریب آدمی کو بطور صدقہ دے دے۔

مودودی صاحب ربا النسیئہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

ربا دراصل اس زائد رقم یا فائدے کو کہتے ہیں جو قرض کے معاملہ میں ایک دائن راس المال کے علاوہ شرط کے طور پر اپنے مدیون سے وصول کرتا ہے۔ اصطلاح شرع میں اس کو ربا النسیئہ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ ربا جو قرض کے معاملہ میں لیا اور دیا جائے، قرآن مجید میں اسی کو حرام کہا گیا ہے۔ اس کی حرمت پر تمام امت کا اتفاق ہے، اس میں کبھی کسی شک وشبہ نے راہ نہیں پائی۔ (سود اشاعت ہشتم، ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۳)

مودودی صاحب نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی ہے۔ مذکورہ بالا تفصیل اور مودودی صاحب کے اقتباس سے یہ ظاہر ہو گیا کہ بینک سے جائز سمجھ کر بالقصد سود لینا کفر ہے اور حرام سمجھ کر کسی غریب کو دینے کے لئے بینک سود لینا گناہ کبیرہ اور لعنت کا مصداق ہے۔ لیکن ہمیں سخت حیرت ہوئی جب مودودی صاحب نے بینک کے اسی سود کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ:

بینک یا انشورنس کمپنی یا پراویڈنٹ فنڈ سے سود کی جو رقم ان کے حساب میں نکلتی ہو اس کو سرمایہ داروں کے پاس چھوڑنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ان مفسدوں کے لئے مزید تقویت کا موجب ہو گی۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس رقم کو لے کر ان مفلس لوگوں پر خرچ کر دیا جائے جن کی حالت قریب قریب وہی ہے جس میں حرام کھانا انسان کیلئے جائز ہو جاتا ہے۔

اس عبارت پر حاشیہ دے کر مودودی صاحب لکھتے ہیں:

اس تجویز کو میں اس لئے بھی صحیح سمجھتا ہوں کہ حقیقت میں سود غریبوں کی جیب ہی سے آتا ہے۔ حکومت کا خزانہ ہو یا بینک، یا انشورنس کمپنی سب کے سود کا اصل منبع غریب کی جیب ہی ہے۔ (سود اشاعت ہشتم جو ۱۹۷۵ء، ص ۲۰۴)

مودودی صاحب کا فقہی اجتہاد مندرجہ ذیل وجوہ سے صحیح نہیں ہے:

(۱) بینک اور پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود ملتا ہے وہ ربا النسیئہ ہے جو نص قرآن سے حرام قطعی ہے، اس کا لینا حرام اور گناہ کبیرہ ہے، اس عبارت میں اس کار حرام اور گناہ کبیرہ پر تحریص اور ترغیب دلائی گئی ہے جو بجائے خود گناہ کبیرہ ہے۔

(۲) مولانا مودودی صاحب کے نزدیک سود کی رقم بینک میں چھوڑنا جائز نہیں ہے اور جس کام کا ترک ناجائز ہو اس کا فعل واجب ہوتا ہے اور فقہاء کی تصریحات کے مطابق حرام قطعی کو حلال کرنا کفر ہے اور اس حرام قطعی کو واجب قرار دینا گویا کفر کو واجب کرنا ہے۔ مودودی صاحب نے اپنے اجتہاد سے کفریہ کام کرنے کو واجب قرار دے دیا ہے۔

(۳) اس عبارت میں بالقصد سود لے کر غریبوں کو کھلانے کا حکم دیا ہے اور یہ حضور ﷺ کے فرمان صریح ''لعن الله علی اکل الربا و موکله'' ''سود کھانے اور کھلانے والے دونوں پر لعنت ہے'' سے متصادم ہے۔

(۴) مودودی صاحب نے کہا ہے کہ جن لوگوں کو سود کی یہ رقم کھلائی جائے گی ان کی حالت قریب قریب وہی ہے جس میں حرام کھانا انسان کے لئے جائز ہو جاتا ہے۔ مودودی صاحب کا یہ خیال واقعات اور حقائق کے بالکل برعکس ہے۔ پاکستان میں الحمدللہ ابھی تک بدحالی اور قحط سالی کا ایسا دور نہیں آیا (اور نہ خدا وہ دن لائے) جس میں ملک کے عوام اضطرار کی صورت میں مردار اور خنزیر جیسی حرام اشیاء کھانے پر مجبور ہو جائیں۔ اگر آپ پاکستان کی غریب آبادی کا سروے (Survey) کریں تو آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو اضطرار کی حالت میں مردار یا خنزیر کھانے پر آمادہ ہو حتیٰ کہ اس کو سود جیسی حرام رقم کا مستحق سمجھ لیا جائے۔

(۵) اگر بالفرض کوئی ایسا مضطر اور مجبور شخص ہو بھی تو اس کے لئے حرام کھانا گناہ نہ ہوگا۔ لیکن جو شخص بینک سے سود لے رہا ہو وہ تو مضطر اور مجبور نہیں ہے، اسے کس بنیاد پر یہ جواز حاصل ہو گیا کہ وہ سود جیسی حرام قطعی رقم کو حاصل کرے۔

(۷) اگر یہ کہا جائے کہ وہ حرام خود نہیں کھاتا غریب کو کھلائے گا تو میں یہ کہتا ہوں کہ جس شخص کا بینک میں کھاتہ (Account) ہے کیا وہ بھی ایسا مضطر ہے کہ کسی غریب کو وہ مال حلال سے صدقہ نہ کر سکے؟ آخر جب وہ کسی غریب کو بکرے اور گائے کا حلال گوشت کھلانے کی وسعت رکھتا ہے تو وہ اسے مردار اور خنزیر کا گوشت کیوں کھلاتا ہے اور جب مال طیب سے کسی غریب کی امداد کر سکتا ہے تو سود جیسی حرام رقم لے کر کیوں کسی غریب کے پیٹ کو حرام غذا سے پر کرتا ہے؟

یہ کہنا کہ سود کی رقم اصل میں غریب کی جیب سے ہی جاتی ہے محض ایک بے بنیاد قیاس ہے، اس پر کیا دلیل ہے کہ جس غریب کو سود کا مال کھلایا جا رہا ہے سود کی یہ رقم اسی کی جیب سے گئی تھی؟ یہ رقم سرمایہ دارانہ استحصال کی وجہ سے کسی بھی غریب اور متوسط طبقہ کے فرد کی ہو سکتی ہے اور اس بات کا کوئی یقین نہیں ہے کہ جس غریب کو سود کی یہ رقم دی جا رہی ہے اسی کی جیب سے یہ رقم نکلی تھی، بلکہ اس کے برعکس اس بات کا یقین ہے کہ یہ بینک کی رقم ہے جو کسی بھی استحصال کے ذریعہ اس بینک کو حاصل ہوئی اور جب یہ غیر کی رقم ہے تو غریب شخص پر کس طرح حلال ہو گئی؟ کیا مودودی صاحب کے نزدیک غربت اتنا بڑا جرم ہے کہ ایک غریب شخص کو علانیہ حرام کھلانے کا فتویٰ دے دیا جائے اور اگر بالفرض پاکستان کے غرباء کی واقعی یہی حالت ہے جس میں حرام کھانا جائز ہو جاتا ہے تو فقط سود پر کیوں اقتصار کیا جاتا ہے؟ صاف کھل کر کیوں نہیں کہا جاتا کہ مردار اور خنزیر بھی تمہارے لئے جائز ہے بلکہ چوری اور ڈاکہ ڈالنا بھی تمہارے حق میں حلال وطیب ہے۔

(۸) پھر میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا اس بے بنیاد قیاس میں اتنی طاقت ہے کہ قرآن کی نص قطعی اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا (بقرہ: ۲۷۵) ''اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کر دیا'' اور حدیث صحیح ''لعن اللہ اکل الربا و موکلہ'' ''سود کھانے والا اور کھلانے والا دونوں لعنتی ہیں'' سے متصادم ہو سکے بلکہ اس پر غالب آ سکے؟ اگر مودودی صاحب اپنے اجتہاد کو قرآن اور حدیث کے صریح احکام سے بالا نہیں سمجھتے

تو ان کو چاہیے کہ اپنے اس غلط اجتہاد سے فوراً رجوع کر لیں اور اس عبارت کو اپنی کتاب سود سے نکال دیں۔ (یہ مقالہ ۱۹۷۷ء میں لکھا گیا تھا، اس وقت مودودی صاحب بقید حیات تھے)

ہم نے دلائل کے ساتھ مودودی صاحب کی اس عبارت پر تعمیری تنقید کی ہے اور چونکہ موصوف خود آزادی رائے کے اظہار کے قائل ہیں اور انبیاء علیہم السلام سے لے کر تمام صلحاء امت کے بعض افعال اور اقوال کو برملا غلط کہتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ کسی بزرگ کے غلط کام کو غلط کہنے سے اس کی بزرگی میں فرق نہیں آتا، اس لئے ہم بھی سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب ہماری اس تنقید کا برا نہیں مانیں گے اور نہ ہی موصوف کے عقیدت مندوں کو اس تنقید پر برا منانا چاہیے، کیونکہ جب وہ شرح صدر اور اطمینان قلب سے بغیر تیوری پر شکن ڈالے انبیاء سے لے کر صحابہ اور صلحاء امت سب کے حق میں مودودی صاحب کی نکالی ہوئی غلطیاں سکون قلب سے سن لیتے ہیں تو ان کو اسی اسپرٹ (Spirit) سے مودودی صاحب پر تنقید بھی سنی چاہیے، آخر مودودی صاحب، انبیاء علیہم السلام، صحابہ کرام اور عام صلحاء امت سے بلند و بالا مرتبہ تو نہیں رکھتے اور اگر اس وضاحت کے باوجود کوئی شخص ہماری اس تنقید پر برا منائے تو ہمیں یہ سمجھنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا کہ اس مودودی صاحب سے عقیدت غلو سے بھی آگے بڑھ کر پرستش کی حد میں داخل ہو چکی ہے۔ العیاذ باللہ

سود پر غضب الٰہی

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (البقرہ)

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود کو چھوڑ دو اگر تم مومن ہو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کر دیا"۔

یہ ایسی سخت اور شدید وعید ہے جو کسی بے دین مشرک ہی کو دی جا سکتی ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ احادیث شریفہ میں بھی سودی کاروبار پر سخت قسم کی وعید کا

اظہار کیا گیا ہے۔ امام ابوالحسین مسلم بن حجاج القشیری التوفی ۲۶۱ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عَنْ جَابِرٍ قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اٰكِلَ الرِّبَا وَ مُؤْكِلَهٗ وَ كَاتِبَهٗ وَ شَاهِدَيْهِ وَ قَالَ هُمْ سَوَاءٌ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والوں، سود کھلانے والوں، سودی معاملات لکھنے والوں اور سود پر گواہی دینے والوں سب پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا کہ یہ تمام لوگ گناہوں میں برابر کے شریک ہیں۔

اور امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی التوفی ۲۷۳ھ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلرِّبَا سَبْعُوْنَ جُزْءًا اَيْسَرُهَا اَنْ يَّنْكِحَ الرَّجُلُ اُمَّهٗ۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۶۴)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سودی کاروبار کرنا اپنی ماں کے ساتھ زنا کرنے سے ستر درجہ زیادہ بدتر گناہ ہے۔

سودی کاروبار پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جو اس قدر سخت وعیدوں کا ذکر کیا ہے، غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ملک میں کرنسی کی گردش رک جاتی ہے اور سود کی لعنت کی وجہ سے تمام ملک کی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتی ہے۔ ملک کے عوام معمولی سے سود کے لالچ میں اپنی ضروریات روک کر جو بچت بینک میں حفاظت کی خاطر رکھواتے ہیں، بینک اسی روپیہ کو صنعت کاروں اور تاجروں کو زیادہ شرح سود پر قرض دیتا ہے اور پھر یہ تاجر اور صنعت کار اس سود کو اپنی مصنوعات اور تجارتی اشیاء کی قیمتوں میں شامل کر دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں گرانی بڑھتی ہے اور عوام اپنے ہی سرمایہ سے بنائی ہوئی اشیاء کو مہنگے داموں سے خرید کر افلاس کے گہرے گڑھے میں گرتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح لاشعوری طور پر عوام اپنی رگ جان سے خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنا خون نکال کر سرمایہ

داری کو پروان چڑھاتے ہیں اور یوں سرمایہ داری کا نظام فروغ پاتا ہے۔ ایک طبقہ امیر تر اور دوسرا طبقہ غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ غربت کا یہ مواد پک کر ایک پھوڑے کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس سے اشتراکیت پھوٹ پڑتی ہے۔

چنانچہ اس کی تائید میں امام ابن ماجہ کی یہ روایت ملاحظہ فرمائیں۔

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَا اَحَدٌ اَكْثَرَ مِنَ الرِّبٰوا اِلَّا كَانَ عَاقِبَةَ اَمْرِهٖ اِلٰى قِلَّةٍ۔ (سنن ابن ماجہ ص ۱۶۵)

حضرت عبداللہ بن مسعود بیان فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سود کی کثرت کا بالآخر انجام سرمایہ کی قلت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

یہ تو انفرادی اور شخصی طور پر سود کی تباہ کاری ہے۔ آیئے! اب قومی اور اجتماعی طور پر سود کی تباہ کاریوں کو ملاحظہ کریں۔ چنانچہ اس وقت ہمارا ملک سات ارب ڈالر کا مقروض ہے اور ملک کے بجٹ کا کافی حصہ غیر ملکی سود کی رقم ادا کرنے میں صرف ہو جاتا ہے اور اصل رقم سود در سود کی شکل میں بڑھتی رہتی ہے اور بھٹو کی حکومت نے جب اپنی کرنسی کی قیمت آدھی سے بھی زیادہ کم کر دی تو اصل رقم اور اس کا سود اپنے آپ دگنے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ پھر حکومت کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے عوام اور صارفین پر ٹیکسوں کی بھرمار کرنی پڑی ہے۔ جس کا نتیجہ اشیاء صرف کی قیمتوں میں دن بدن گرانی اور مہنگائی کی صورت میں ظاہر ہوا اور ملک کے عوام کی قوت خرید کم سے کم تر ہوتی چلی گئی، جس کا انجام سوائے سرمایہ کی قلت اور غربت میں اضافہ کے اور کچھ ظاہر نہیں ہوا۔

اس سلسلہ میں امام سلیمان بن اشعث ابو داؤد السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ اپنی سند سے روایت کرتے ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِيْنَةِ وَاَخَذْتُمْ اَذْنَابَ الْبَقَرِ وَ رَضِيْتُمْ بِالزَّرْعِ وَ تَرَكْتُمُ الْجِهَادَ سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهٗ حَتّٰى

حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم حیلے بہانے سے سود لینا شروع کر دو گے اور زراعت میں متفرق ہو کر جہاد فی سبیل اللہ

ترجعوا الی دینکم۔(سنن ابی داؤد ص ۴۹۰) چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تم پر ایسی ذلت مسلط کرے گا جس سے نجات کی اس کے سوا اور کوئی شکل نہیں ہوگی کہ تم اس نظام کی طرف لوٹ آؤ جو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔

غور فرمایئے! جب حیلہ جوئی سے سود لینے پر بھی حضور ﷺ نے ذلت کی وعید سنائی ہے تو جب ہم علی الاعلان سود کا لین دین کریں گے تو پھر کیوں نہ قہر خداوندی اور ذلت و رسوائی کے مستحق ہوں گے؟ غور کیجئے کہ آج جو مسلمان قوم تمام دنیا میں خوار و زبوں حال ہو رہی ہے اور صنعت و حرفت، اقتصادیات اور اپنی سرحدوں کے تحفظ اور سائنسی ترقی میں تمام اقوام سے پیچھے ہے اور بڑی طاقتوں کے رحم و کرم پر سسک سسک کر جی رہی ہے اور تمام دنیا میں سب سے پیچھے ہے، کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں ہے کہ ہم اعلانیہ سودی کاروبار کرتے ہیں اور اسی طرح گویا ہم نے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف حکماً اعلان جنگ کر دیا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں ہم نے سود کی شرعی حیثیت، اس کی تعریف، اس کی اقسام اور بینکنگ کا مروجہ نظام بیان کیا ہے۔ اب ہم اختصاراً ان توجیہات کا جائزہ لیتے ہیں جن کو عقلی اعتبار سے سود کے جواز کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ہم نجی ضروریات کے قرضوں اور کاروباری قرضوں دونوں پر بحث کریں گے۔

نجی ضروریات کے قرضے

کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص کسی کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس کو قرض دیتا ہے تو اولاً تو وہ اپنی رقم کو اس خطرہ میں ڈالتا ہے کہ ممکن ہے مقروض اس کو قرض واپس کر سکے یا نہ کر سکے۔ ثانیاً جب قرض دینے والا مقروض کو اپنی رقم سے فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچاتا ہے تو کیوں نہ قرض خواہ کو بھی اس رقم سے سود کی شکل میں فائدہ اٹھانے کا موقع دیا جائے؟ ثالثاً جب بعض اشیاء کو کرایہ پر دیا جاتا ہے تو کیوں نہ کرنسی کو بھی اس مد میں شامل کر لیا جائے۔ رابعاً جب قرض دینے والا اپنی ضرورتوں کو روک کر مقروض کو اس کی ضرورت کے مطابق روپیہ مہیا کر کے ایثار و قربانی سے کام لیتا ہے تو کیوں نہ مقروض بھی اسی جذبہ سے

کام لے کر اس کو سود کی شکل میں رقم فراہم کرے۔

اس سوال کے جواب میں پہلی گزارش تو یہ ہے کہ نجی قرضوں سے سود لینا قیام پاکستان سے پہلے مہاجنی سود میں مروج تھا اور اب پاکستان میں نجی ضروریات کے قرضوں پر سود کی مثال شاذ و نادر ہی کہیں مل سکتی ہے۔ عام طور پر جن قرضوں پر سود لیا جاتا ہے وہ کاروباری نوعیت کے قرضے ہوتے ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں ہم کو نجی ضروریات کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ ایک شخص مکان بنانے کے لئے قرض حاصل کرتا ہے، سوال یہ ہے کہ جب اس کی استعداد، حیثیت اور آمدنی مکان بنانے کے قابل نہیں ہے تو وہ مکان بنا کر کیوں قرض کے جنجال میں پھنستا ہے؟ اس کو اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلا کر کرایہ کے مکان میں رہ کر گزارا کرنا چاہیے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شادی بیاہ کی فضول رسومات کے لئے قرض حاصل کیا جائے، یہ بھی ایک غلط اور ناروا ضرورت ہے۔ غریب اور نادار شخص کو اپنے جیسے لوگوں ہی میں سادگی سے شادی کرنی چاہیے اور فضول رسومات میں روپیہ خرچ کرنے کیلئے قرض کی مصیبت نہیں مول لینی چاہیے۔ قرض ایک ایسی تکلیف دہ چیز ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں میں قرض سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے، چنانچہ امام ابوالفرج عبدالرحمن بن الجوزی المتوفی ۵۹۷ھ فرماتے ہیں کہ حضور نے دعا مانگی:

اللھم انی اعوذ بک من غلبۃ الدین۔ اے اللہ! میں قرض کے غلبہ سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ (الوفاء باحوال المصطفیٰ ص ۵۵۰)

اس کے بعد اب رہ جاتے ہیں وہ قرض جو کسی بے روزگار یا تنگ دست شخص کو اپنی معاش کے سلسلہ میں یا کسی بیمار کو اپنے علاج کے واسطے یا کسی طالب علم کو اپنی تعلیمی ضروریات کے در پیش ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کے قرضے یقیناً جائز قرضوں کی مد میں آتے ہیں اور ہم مسلم معاشرہ (Society) سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے ضرورت مند رشتہ داروں، ہمسایوں اور عام جاننے والوں کو اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قرضہ حسنہ فراہم کریں گے۔

اس کے باوجود بھی کوئی شخص اس قسم کے قرضوں پر سود لینے کے لئے مذکورہ بالا دلائل فراہم کرے تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ:

یہ صحیح ہے کہ قرض خواہ، مقروض کو قرض دے کر اپنی رقم کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ کیونکہ ماہ بماہ یا سال بہ سال سود وصول کرنے کے باوجود بھی یہ خطرہ باقی رہتا ہے کہ مقروض میں اتنی سکت ہی نہ رہے کہ وہ آئندہ اصل رقم کی واپسی تو کجا مقررہ سود بھی ادا کر سکے۔ اس لئے اس کا صحیح اسلامی حل یہ ہے کہ قرض دینے والا جتنی رقم قرض دیتا ہے اتنی مالیت کی کوئی چیز مقروض سے لے کر رہن رکھ لے۔ رہا یہ سوال کہ مقروض کو جب قرض خواہ کی رقم سے فائدہ پہنچتا ہے تو قرض خواہ کو بھی سود کی شکل میں فائدہ پہنچنا چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ فائدہ تو ضرور پہنچنا چاہیے، لیکن اگر قرض دینے والا واقعی مسلمان ہے تو اس کو اس دنیاوی حرام فائدہ کے بجائے اجر آخرت کی توقع رکھنا چاہیے۔ کیونکہ حضرت عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، ایک مسلمان اپنے بھائی پر ظلم نہ کرے نہ اس کو رسوا کرے اور جب تک ایک مسلمان اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں مشغول رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجات پوری کرتا رہتا ہے اور جو مسلمان کسی مسلمان بھائی کی دنیاوی مشکل دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی مشکلات دور کر دے گا اور جو مسلمان کسی مسلمان کے عیب کو چھپاتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیوب کو چھپائے گا۔ (بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ص ۴۲۲)

جس شخص کے سامنے یہ حدیث ہو اور وہ کسی ضرورت مند مسلمان کو اس حدیث کے پیش نظر قرض دے کر اس کی دنیاوی ضرورت پوری کر دے تو نہ صرف یہ کہ وہ اجر آخرت کا مستحق ہو گا اور اس بھلائی کے سبب اس کی آخرت کی مشکلات حل ہوں گی، بلکہ فرمان رسول کے مطابق اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی اس کی ضرورتوں کو پورا فرمائے گا اور اگر کوئی شخص دنیاوی مفاد میں مستغرق ہو کر آخرت کو بالکل خیر باد کہہ چکا ہے، تب بھی اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ تمدنی معاشرت ہے جس میں ہر شخص دوسرے شخص سے مل جل کر رہتا ہے اور جس طرح آج وہ کسی ضرورت مند کو قرض دے رہا ہے، کل اس کو بھی کسی شخص سے قرض لینے کی ضرورت پڑ

سکتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ قرض پر کرایہ وصول کیا جائے تو یہ بالکل لغو ہے۔ جن چیزوں کا کرایہ لیا جاتا ہے (مثلاً سائیکل، فرنیچر اور کراکری وغیرہ) وہ کرایہ دار کے استعمال میں رہتی ہیں۔ ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہیں اور بتدریج استعمال کرنے سے ان کی عمر کم ہوتی رہتی ہے۔ مالک ان اشیاء کی حفاظت کرتا ہے۔ ان کی مرمت پر اپنا وقت، محنت اور پیسہ خرچ کرتا ہے۔ اس لئے مالک کا یہ جائز حق ہے کہ وہ چیزوں کے استعمال پر کرایہ وصول کرے۔ لیکن جو روپیہ قرض دیا جاتا ہے وہ جوں کا توں قرض خواہ کو واپس مل جاتا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ قرض کو کرایہ پر قیاس کیا جائے۔

باقی رہا ایثار اور قربانی کا سوال تو جب قرض خواہ نے اصل رقم سے زائد سود کی شکل میں وصول کر لی تو ایثار اور قربانی کہاں رہی؟ ایثار اور قربانی تو اس صورت میں تھی کہ وہ ضرورت مند شخص کو محض صدقہ یا ہدیہ کے طور پر رقم فراہم کرتا۔ آخر یہ موجودہ نسل انہیں اسلاف کی تو وارث ہے جو اپنے بچوں کو بھوکا سلا کر اور چراغ بجھا کر اپنے اور اپنے بچوں کے حصہ کا کھانا مہمانوں کو کھلایا کرتے تھے، یہ حضرت ابوطلحہ تھے۔ (بخاری و مسلم بحوالہ روح المعانی ج ۲۸ ص ۵۳) اور وہ جن کے گھر میں کبھی بکری کی سری آجاتی تو وہ اپنے پڑوسی کے گھر بھیج دیتے کہ پتہ نہیں انہوں نے کب سے گوشت نہ کھایا ہو اور وہ پڑوسی بھی اسی جذبہ کے تحت اپنے پڑوسی کے گھر وہ سری بھیج دیتا۔ حتیٰ کہ سات گھروں میں گردش کرنے کے بعد وہ سری پھر اسی پہلے گھر میں پہنچ جاتی۔ (حاکم، بیہقی بحوالہ روح المعانی ج ۲۸ ص ۵۳) یہ وہ لوگ تھے جن کے ایثار کو سراہتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹) ''وہ لوگ جو اپنی اشد ضروریات پر بھی دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں''۔ آخر وہ بھی تو ہمارے ہی اسلاف تھے جو پیاس سے جاں بلب ہونے کی حالت میں بھی پانی کا پیالہ اپنے زخمی اور پیاسے ساتھی کی طرف بڑھا دیتے تھے۔

آج اگر ہم اپنے اسلاف کی ان روایات کو زندہ نہیں کر سکتے تو کم از کم قرض پر سود لے کر کسی محتاج، مجبور اور مصیبت زدہ شخص کا مزید استحصال تو نہ کریں۔

کاروباری قرض

کاروباری قرضوں میں سود کی ایک شکل وہ ہے جو بینک روپیہ جمع کرانے والوں سے رقم لے کر فکسڈ ڈپازٹ (Fixed Deposit) کی شکل میں ان کو چھ سے سات فی صد تک سالانہ سود ادا کرتا ہے اور جن کا کرنٹ اکاؤنٹ (Current Account) ہوتا ہے ان کو کچھ نہیں دیتا، سود کی دوسری شکل وہ ہے جو بینک اس جمع شدہ سرمایہ سے تاجروں، آڑھتیوں، صنعت کاروں اور مزارعین کو چودہ فیصد سے لے کر سود در سود کی صورت میں اس سے زائد شرح تک سود لیتا ہے اور ساڑھے چار سال میں سود اصل رقم کے برابر ہو جاتا ہے۔

کاروباری قرضوں پر سود لینے کے جواز میں یہ کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے شخص کو کاروبار کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے اور اسے اپنے پیسے سے اس کے لئے نفع اندوزی کا موقع فراہم کرتا ہے تو آخر اس شخص کو بھی اس نفع میں سے کچھ حصہ ملنا چاہیے اور سرمایہ فراہم کرنے والے شخص کو جو اس کی رقم پر ایک معین نفع دیا جاتا ہے اسی کو سود سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مودودی صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

فائدہ اٹھانے کا موقع دینا اگر کسی صورت میں کوئی مالی قیمت رکھتا ہے تو صرف وہ صورت ہے جب کہ روپیہ لینے والا اسے کسی کاروبار میں لگا رہا ہے، اس صورت میں روپیہ دینے والا یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ مجھے اس فائدہ میں سے حصہ ملنا چاہیے جو میرے روپے سے دوسرا شخص اٹھا رہا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ سرمایہ بجائے خود کوئی منافع پیدا کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا، بلکہ وہ منافع صرف اس صورت میں پیدا کرتا ہے جب انسانی محنت و ذہانت اس پر کام کرے۔ انسانی محنت و ذہانت اس کے ساتھ لگتے ہی منافع پیدا کرنا نہیں شروع کر دیتی بلکہ اس کے نفع آور ہونے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ مزید برآں اس کا نفع آور ہونا یقینی نہیں ہے۔ اس میں نقصان اور دیوالیہ کا بھی امکان ہے اور نفع آور ہونے کی صورت میں بھی یہ پیشگی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کس وقت کتنا نفع پیدا کرے گی۔ اب یہ بات کس طرح معقول ہو سکتی ہے کہ روپیہ دینے والے کا منافع اسی وقت سے شروع ہو جائے جب کہ انسانی محنت و ذہانت نے اس روپے کو ابھی ہاتھ ہی لگایا ہو اور اس کے منافع

اور شرح کی مقدار بھی معین ہو جب کہ سرمایہ کے ساتھ انسانی محنت کے ملنے سے نفع پیدا ہونا نہ تو یقینی ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ اس سے فی الواقع کتنا نفع پیدا ہوگا۔

معقولیت کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جو شخص اپنا پس انداز کیا ہوا روپیہ کسی نفع آور کام میں لگانا چاہتا ہو اسے محنت کرنے والوں کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرنا چاہیے اور نفع نقصان میں ایک طے شدہ تناسب کے مطابق حصہ دار بن جانا چاہیے۔ نفع کمانے کا آخر یہ کون سا معقول طریقہ ہے کہ میں ایک شخص کا شریک بننے کی بجائے اسے سو روپیہ قرض دوں اور اس سے کہوں کہ چونکہ تو اس رقم سے فائدہ اٹھائے گا اس لئے تجھ پر میرا یہ حق ہے کہ مجھے مثلاً ایک روپیہ ماہوار اس وقت تک دیتا رہے جب تک میرے یہ روپے تیرے کاروبار میں استعمال ہو رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب تک اس سرمایہ کو استعمال کر کے اس کی محنت نے نفع پیدا کرنا شروع نہ کیا ہو اس وقت تک آخر وہ کون سا منافع موجود ہے جس میں سے حصہ مانگنے کا مجھے حق پہنچتا ہو؟ اگر وہ شخص کاروبار میں فائدے کے بجائے نقصان اٹھائے تو میں کس عقل و انصاف کی رو سے یہ ماہوار منافع اس سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہوں اور اگر اس کا منافع ایک روپیہ ماہوار سے کم رہے تو مجھے ایک روپیہ ماہوار لینے کا کیا حق ہے؟ اور اگر اس کا کل منافع ایک ہی روپیہ ہو تو کون سا انسان یہ جائز رکھتا ہے کہ جس شخص نے مہینہ بھر تک اپنا وقت، محنت، قابلیت اور ذاتی سرمایہ سب کچھ صرف کیا وہ تو کچھ نہ پائے اور میں جو صرف سو روپیہ اس کو دے کر الگ ہو گیا تھا اس کا سارا منافع لے اڑوں؟ ایک بیل بھی اگر تیلی کے لئے دن بھر کولہو چلاتا ہے تو کم از کم اس سے چارہ مانگنے کا حق تو ضرور رکھتا ہے، مگر یہ سودی قرض ایک کاروباری آدمی کو وہ بیل بنا دیتا ہے جسے کولہو تو دن بھر میرے لئے چلانا چاہیے اور چارہ کہیں اور سے کھانا چاہیے۔

(سود اشاعت ہشتم جون ۱۹۷۵ء، ص ۶۹-۷۱)

مودودی صاحب نے کاروباری سود کے قرضے کی رد میں جو یہ طویل تقریر کی ہے یہ ایک گونہ معقول تو ضرور ہے لیکن عصر حاضر کے کاروباری قرضوں پر یہ تقریر منطبق نہیں ہوتی، کیونکہ اس تقریر سے یہ تاثر ملتا ہے کہ سرمایہ فراہم کر کے اس سرمایہ پر سود وصول کرنے

والا (یعنی بینک) ظالم اور سود دینے والا (یعنی تاجر اور صنعت کار) مظلوم ہے۔ آج کل بینک کاروبار کرنے والے لوگوں کو کاروبار کے لئے سرمایہ دیتا ہے اور سود وصول کرتا ہے اور کاروباری ادارے اس کو سود ادا کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی فریق بھی مظلوم نہیں ہے اور فی الواقع یہ دونوں ہی ظالم ہیں اور اگر کوئی مظلوم ہے تو وہ عوام اور صارفین ہیں جو سود کی لعنت کی وجہ سے بینک اور کاروباری اداروں دونوں کے استحصال کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بینک تاجروں اور صنعت کاروں کو چودہ فی صد سالانہ اور سود در سود کی شکل میں اس سے زائد سود پر قرض دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بینک کا اس سے سراسر فائدہ ہے، کیونکہ عوام جو اپنی بچت کی رقم جمع کراتے ہیں ان کو وہ چھ فی صد سود دیتا ہے اور کرنٹ اکاؤنٹ میں سود نہیں دیتا۔ بعض نیک لوگ جو حفاظت کے خیال سے رقم جمع کراتے ہیں از خود سود نہیں لیتے، بہرحال عوام کے اس روپیہ کو بینک تاجروں اور صنعت کاروں کو قرض دے کر بغیر کسی محنت یا کاروبار کے چودہ فیصد یا اس سے زائد سود حاصل کر لیتا ہے۔ باقی رہے تاجر اور صنعت کار تو ان کو بھی کوئی گھاٹا نہیں کیونکہ چودہ فیصد سود وہ بینک کو ادا کرتے ہیں، اس رقم کو وہ اپنی مصنوعات اور مال تجارت کی قیمت میں شامل کر کے اس کو تجارتی اور صنعتی منڈیوں میں لے آتے ہیں، پھر سود کا یہ وبال کس پر پڑتا ہے؟ ظاہر ہے یہ عوام اور صارفین کی جیبوں پر پڑتا ہے، عوام مہنگائی کے بوجھ تلے پستے چلے جاتے ہیں اور سرمایہ دار بینک سے سود کی بنیاد پر قرض لے کر ایک کارخانہ سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا لگاتا چلا جاتا ہے اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ بینک سرمایہ دار کو رقم بطور قرض دیتا ہے، یہ وہ رقم ہوتی ہے جس کو عام اور متوسط لوگ آمدنی سے پس انداز کر کے بینک میں جمع کراتے ہیں اور اپنی ہی دی ہوئی رقم سے مہنگے داموں مصنوعات اور مال تجارت خریدتے ہیں۔ اس طرح بینک اور سرمایہ دار دونوں ہی عوام اور صارفین پر ظلم کرتے ہیں، یہ دونوں فریق ہی ظالم ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی مظلوم نہیں ہے۔

سود کا ایک اور حیلہ

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر بلا سود قرض دینے کا رواج ہو جائے تو مثلاً ایک شخص کسی

کو دس سال کے لئے ایک ہزار روپیہ اس کی نجی ضرورت میں قرض دیتا ہے اور چونکہ افراطِ زر کی وجہ سے دن بدن کرنسی کی قیمت گھٹ رہی ہے، لہٰذا دس سال بعد اس ایک ہزار روپیہ کی قیمت صرف سو روپیہ رہ جائے گی۔ اس لئے قرض دینے والے کو سود لینے کا حق ملنا چاہیے، اس کا جواب یہ ہے کہ اس مشکل کا حل سود نہیں ہے، بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ قرض دینے والا مقروض کو ایک ہزار روپیہ کی پاکستانی کرنسی کے بجائے ایک ہزار روپیہ کی مستحکم کرنسی مثلاً ڈالر، پونڈ یا ریال دے یا کوئی جنس مثلاً غلہ یا چاول دے اور دس سال بعد اتنی ہی غیر ملکی کرنسی یا غلہ اور چاول وصول کرے اور مقروض اس کو اس کی پیش کش کرے، اس صورت میں قرض خواہ کو کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا اور وہ سود کی لعنت سے بھی محفوظ رہے گا اور اگر وہ شخص کسی نجی ضرورت کے لئے قرض نہیں لے رہا، بلکہ کوئی کاروبار کرنے یا کسی صنعتی منصوبہ کی تکمیل کے لئے قرض لیتا ہے تو قرض خواہ اس رقم پر حرام سود لینے کے بجائے اس کے کاروبار میں شریک ہو کر جائز نفع کیوں نہ حاصل کرے۔ یعنی جب رقم سے کوئی فائدہ حاصل کرنا ہی ہے تو بجائے سود کی شکل کے منافع کی شکل میں فائدہ کیوں نہ حاصل کرے۔ دوسرے لفظوں میں جب گوشت کھانا ہی ہے تو گائے یا بکری کے حلال گوشت کی جگہ وہ مردار اور خنزیر کا حرام گوشت کیوں کھاتا ہے؟

جوازِ سود کا دوسرا حیلہ

سود کے مجوزین ایک بات یہ بھی کہتے ہیں کہ اقتصادیات میں ترقی جبھی ممکن ہو سکتی ہے جب لوگ اپنی فاضل آمدن کو جمع کریں، بلکہ کفایت شعاری اختیار کریں اور اپنی ضرورتوں کو روک کر اور اپنی خواہشات پر قابو پا کر رقم پس انداز کریں اور بینک میں جمع کرائیں اور ظاہر ہے بینک میں اپنی رقم جمع کرانے کا محرک سود ہی ہو سکتا ہے اور اگر سود کا لالچ نہ دیا جائے تو کسی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اپنی ضرورتوں کو روک کر بینک میں رقم جمع کرائے جب کہ اس کو اس ضبطِ نفس اور ایثار اور قربانی کا کوئی صلہ نہ ملے؟ مولانا مودودی صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

اولین غلط فہمی یہ ہے کہ معاشی زندگی کے لئے افراد کی کفایت شعاری اور زر اندوزی کو

ایک ضروری اور مفید چیز سمجھا جاتا ہے، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ درحقیقت ساری معاشی ترقی و خوشحالی منحصر ہے اس پر کہ جماعت بحیثیت مجموعی جتنا کچھ سامان زیست پیدا کرتی جائے وہ جلدی جلدی فروخت ہوتا چلا جائے تا کہ پیداوار اور اس کی کھپت کا چکر توازن کے ساتھ اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہے۔ یہ بات صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب کہ لوگ بالعموم اس امر کے عادی ہوں کہ معاشی سعی و عمل کے دوران میں جتنی کچھ دولت ان کے حصہ میں آئے اسے صرف کرتے رہیں اور اس قدر فراخ دل ہوں کہ اگر ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ دولت آ گئی ہو تو اسے جماعت کے کم نصیب افراد کی طرف منتقل کر دیا کریں، تا کہ وہ بھی بفراغت اپنے لئے ضروریات زندگی خرید سکیں۔ مگر تم اس کے برعکس لوگوں کو یہ سکھاتے ہو کہ جس کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت پہنچی ہو وہ بھی کنجوسی برت کر (جسے ضبط نفس اور زہد اور قربانی وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہو) اپنی ضروریات کا ایک اچھا خاصا حصہ پورا کرنے سے باز رہے اور اس طرح ہر شخص زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی کوشش کرے، لیکن درحقیقت اس کا نقصان یہ ہوگا کہ جو مال اس وقت بازار میں موجود ہے اس کا ایک بڑا حصہ یوں ہی پڑا رہ جائے گا۔ کیونکہ جن لوگوں کے اندر قوت خرید پہلے ہی کم تھی وہ تو استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سا مال خرید نہ سکے اور جو بقدر ضرورت خرید سکتے تھے انہوں نے باوجود پیداوار کے اچھا خاصا حصہ نہ خریدا۔ الخ

(سود اشاعت ہشتم جون ۱۹۷۵ء، ص ۹۳-۹۴)

ہمارے خیال میں مودودی صاحب کا یہ جواب صحیح نہیں ہے، کیونکہ کفایت شعاری بہر حال ایک مفید اور ضروری چیز ہے، رقم کا پس انداز کرنا مستقبل کی ضروریات کے لئے کارآمد ہے۔ البتہ جواب کے اس حصہ سے ہم متفق ہیں کہ اپنی فاضل آمدنی سے ضرورت مند افراد کو ان کی ضرورت کے مطابق دینا چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رقم کو سرے سے پس انداز نہ کیا جائے اور صرف منڈیوں کو مصنوعات سے خالی کرنے کے لئے آدمی خرید پر خرید کرتا چلا جائے، کیونکہ اس سے اسراف اور تبذیر کا دروازہ کھلتا ہے جو بہر حال غیر مستحسن ہے، بلکہ شرعاً ناجائز ہے، باقی رہا یہ سوال کہ لوگ جب منڈیوں سے

بلا ضرورت مال نہیں خریدیں گے تو اس مال کی کھپت کہاں ہوگی اور کارخانے ٹھپ ہو جائیں گے اور مزدوروں کے لئے روزگار کا دروازہ بند ہو جائے گا تو یہ ایک غیر تعمیری سوچ ہے، ہم کو بلاشبہ کفایت شعاری کرنا چاہیے اور زائد از ضرورت خریداری سے احتراز کرنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ پھر ہماری منڈیوں کی مصنوعات کا کیا ہوگا؟ تو اس کا جواب یہ کہ غیر ملکی منڈیوں میں خصوصاً مسلم ممالک میں ہماری مصنوعات کی زبردست مانگ موجود ہے۔ ہمیں اپنی خریداری کم کر کے تاجروں اور صنعت کاروں کو یہ موقع فراہم کرنا چاہیے کہ وہ ملکی مصنوعات کو برآمد کر کے پاکستان کے لئے زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ حاصل کریں۔

اب رہا یہ سوال کہ لوگ کفایت شعاری اور اپنی بچت کو کیا کریں، بینک میں جمع کرا کے سود لیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا ہرگز ہرگز نہ کریں، بلکہ سود کا کلیتاً خاتمہ کر کے اپنی اس فاضل بچت کو بینک میں فکسڈ ڈیپازٹ کی شکل میں جمع کرائیں اور مضاربت کے اصول پر بینک کے ساتھ معاملہ کریں، تاکہ ان کی کفایت شعاری اور بچت کارآمد ہو، جس سے صنعت و حرفت اور تجارت میں فروغ حاصل ہو اور ہم زیادہ سے زیادہ زراعتی اور صنعتی پیداوار حاصل کر کے اس قابل ہو جائیں کہ ملکی ضرورت پوری کرنے کے بعد اپنے ملک کا غلہ اور مصنوعات بیرون ممالک میں برآمد کرنے کے قابل ہو سکیں اور ملک کے لئے زیادہ سے زیادہ زرمبادلہ حاصل کر کے ملکی معیشت کو زیادہ سے زیادہ استحکام بخشیں۔

اس صورت حال کو درست کرنے کے لئے اسلامی اصول شرکت اور مضاربت کو اپنانا چاہیے جس کی پوری تفصیل آئندہ سطور میں آرہی ہے۔ شرکت اور مضاربت کے اصولوں کو اپنانے کے بعد دولت کی یہ غیر منصفانہ تقسیم ختم ہو جائے گی۔ بینک میں اپنی بچتیں جمع کرانے والوں کو چھ یا سات فیصد معین نفع پر نہیں ٹرخایا جا سکے گا، بلکہ بینک جو بھی کاروبار کرے گا اس کے نفع کا مثلاً ۲/۱ حصہ بینک میں پیسہ جمع کرانے والے کو ملے گا اور کاروباری اداروں کو بینک جو روپیہ فراہم کرے گا وہ بطور شرکت کے ہوگا، بینک اس کے نفع و نقصان میں برابر کا شریک ہوگا اور اس صورت میں بینک کو صرف ۱۴ فیصد نہیں ملے گا، بلکہ جس قدر نفع بھی ہو گا وہ اس کو لگائی ہوئی رقم کے حساب سے ملے گا۔ بینک جس قدر نفع کمائے گا اس کا وہ تنہا

مالک نہیں ہوگا، بلکہ بینک اور بینک میں فکسڈ ڈیپازٹ کی شکل میں جمع کرانے والے تمام افراد کے درمیان ان کی رقم کے تناسب سے وہ نفع برابر برابر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہو سکے گی اور ملک کے تمام افراد زراعت، صنعت اور تجارت میں بالواسطہ شریک ہو جائیں گے اور ہر شخص کو اس رقم کے حساب سے نفع ملتا رہے گا۔

کیا غیر سودی اقتصادی نظام ممکن ہے؟

مدتوں سے سود کی لعنت میں گرفتار رہنے سے یہ حرام عنصر ہر شخص کے منہ کو اس طرح لگ چکا ہے کہ آج کے پڑھے لکھے لوگ اور اقتصادیات سے شغف رکھنے والے حضرات اس تردد کا شکار ہو چکے ہیں کہ سود کے بغیر اقتصادی نظام کس طرح چلے گا؟ سخت حیرت ہوتی ہے کہ جس نسل کے آباؤ اجداد نے دنیا میں سب سے پہلے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ''اللہ تعالیٰ نے تجارت حلال کی ہے اور سود کو حرام کر دیا'' کا فلک شگاف نعرہ لگایا، جس نسل کے وارثوں نے سب سے پہلے دنیا میں سودی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا، جس کے اسلاف دنیا کے تین براعظموں میں پھیلی ہوئی سلطنت کے اقتصادی نظام کو صدیوں تک بغیر سود کے چلاتے رہے، آج اسی قوم کے فرزند سود کو اقتصادیات کا جز ولاینفک سمجھ رہے ہیں۔

اسلام ایک صاف اور سیدھا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اگر قرض دینا ہے تو سیدھی طرح قرض دو اور جتنی رقم دی ہے اتنی ہی وصول کرو اور اگر نفع کمانا ہے تو باقاعدہ کاروبار کرو اور نفع و نقصان دونوں کی ذمہ داری قبول کرو۔ یہ اس قدر روشن اور سچا اصول ہے کہ اس کی صداقت کو ذی فہم شخص رد نہیں کر سکتا۔ ہمارے معاشرہ میں سود سے پاک اقتصادی نظام کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے، اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم پہلے شرکت اور مضاربت کی تعریفات، شرائط اور احکام پر غور کر لیں۔ اس کے بعد اس امر پر غور کیا جائے کہ موجود بینکنگ سسٹم (Banking System) میں اس کو کس طرح جاری کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی ہدایات کی روشنی میں بینکنگ کے نظام کو مضاربت کے اصول پر چلایا جا سکتا ہے۔ بینک میں رقم جمع کرانے والے رب المال اور بینک کا ادارہ مضارب کی حیثیت میں ہوگا اور بینک اپنے حاصل شدہ سرمایہ سے مضاربت اور شرکت دونوں طرح کاروبار کر سکتا

ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم شرکت کی تعریف اور اس کے احکام بیان کریں اور اس کے بعد مضاربت کے۔

شرکت

شرکت کی کئی اقسام ہیں، ہم شرکت کی جس قسم سے بحث کر رہے ہیں اس کو احناف، شوافع اور حنابلہ شرکت عنان سے اور مالکیہ شرکت مفاوضہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ مالکیہ کے نزدیک شرکت مفاوضہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دو شخصوں کا ایک کاروبار میں ہر لحاظ سے مساوی حیثیت سے شریک ہونا اور شرکت عنان کا خلاصہ یہ ہے: دو یا دو سے زیادہ اشخاص کا کسی کاروبار میں شرکت کرنا عام ازیں کہ ان کی شخصی حیثیت اور سرمایہ مساوی ہو یا نہ ہو۔ شرکت عنان کے ثبوت میں فقہاء نے مندرجہ ذیل دلائل فراہم کیے ہیں۔

شیخ برہان الدین ابوالحسن علی بن ابی بکر الفرغانی المتوفی ۵۹۳ھ فرماتے ہیں:

الشرکة جائزة لانه ﷺ بعث والناس یتعاملون بها فقررهم علیه۔
(ہدایہ ج ۲ ص ۶۲۴)

شراکت کے ساتھ کاروبار کرنا جائز ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کی جب بعثت ہوئی (یعنی آپ نے اعلان نبوت فرمایا) اس وقت لوگ شراکت کے ساتھ کاروبار کرتے تھے اور حضور ﷺ نے ان کے اس کاروبار کو مقرر رکھا۔

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ القزوینی المتوفی ۲۷۳ھ اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

عن السائب قال للنبی ﷺ کنت شریکی فی الجاهلیة فکنت خیر شریك کنت لاتداری ولاتماری۔
(سنن ابن ماجہ ص ۱۶۵)

حضرت صائب رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا: آپ میرے ساتھ قبل از اسلام شراکت کا کاروبار کیا کرتے تھے، آپ بہترین شریک تھے، آپ نے مجھے نہ کبھی علیحدہ کیا اور نہ مجھ سے جھگڑا کیا۔

امام کمال الدین بن الہمام المتوفی ۷۹۰ھ امام احمد بن حنبل کے حوالہ سے سائب کی اسی روایت کا ذکر فرماتے ہیں:

عن السائب ان النبی ﷺ شارکہ قبل الاسلام فی التجارۃ فلما کان یوم الفتح جاء فقال علیہ الصلوۃ والسلام مرحبا باخی و شریکی کان لایداری ولا یماری یا سائب قد کنت تعمل اعمالا فی الجاھلیۃ لا تقبل منک و ھی الیوم تقبل منک۔ (فتح القدیر ج ۵ ص ۳ مصری)

سائب بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ ان کے ساتھ قبل از اسلام شراکت کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ فتح مکہ کے دن وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا: میرے بھائی اور میرے شریک کو خوش آمدید ہو، جو میرے ساتھ تجارت میں نہ جھگڑا کرتے تھے اور نہ کاروبار سے روکتے تھے۔ اے سائب! تم زمانہ جاہلیت میں جو عمل کرتے تھے وہ نامقبول تھے اور اب تمہارے اعمال مقبول ہوں گے۔

اور محمد بن محمد شوکانی الظاہری المتوفی ۱۲۵۰ھ اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

الحدیث اخرجہ ایضا النسائی و صححہ واللفظ لابی داود و ابن ماجہ ان السائب المخزومی کان شریک النبی ﷺ قبل البعثۃ فجاء یوم الفتح فقال مرحبا باخی و شریکی لاتداری ولا تماری و فی لفظ ان السائب قال اتیت النبی ﷺ فجعلوا یثنون علی و یذکرونی فقال رسول اللہ ﷺ انا اعلمکم بہ فقلت صدقت بابی و امی

اس حدیث کو نسائی نے بھی اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کو صحیح قرار دیا ہے اور ابو داؤد اور ابن ماجہ نے اس طرح روایت کیا ہے کہ سائب مخزومی نبی ﷺ کی بعثت سے قبل آپ کے (تجارت میں) شریک تھے، وہ فتح مکہ کے وقت حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپ نے فرمایا: میرے بھائی اور شریک کو مرحبا ہو، جو تجارت میں میرے ساتھ نہ جھگڑا کرتے

الشریک لاتداری ولاتماری۔ (نیل الاوطار شرح منتقی الاخبار ج ۵ ص ۲۹۷-۲۹۸)

تھے نہ کاروبار سے روکتے تھے اور ایک روایت میں یوں ہے کہ سائب کہتے ہیں کہ میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ میرا ذکر کر کے مجھے سراہنے لگے، حضور نے فرمایا: میں سائب کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں نے عرض کیا: آپ پر میرے ماں باپ فدا ہوں آپ نے سچ فرمایا، آپ میرے بہترین شراکت کار تھے آپ نہ مجھے کاروبار سے منع کرتے اور نہ جھگڑا کرتے۔

شوکانی اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

واستدلال لهذا الحديث على جواز الشركة فى الدراهم والدنانير و هو اجماع۔ (نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۹۸)

اس حدیث سے شرکت کے ساتھ کاروبار پر استدلال کیا گیا ہے اور اس پر اجماع ہو چکا ہے۔

امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ فرماتے ہیں:

عن ابى هريرة رفعه قال ان الله تعالى يقول انا ثالث الشريكين ما لم يخن احدهما صاحبه فانه اذا خانه خرجت من بينهم۔ (سنن ابی داؤد ص ۴۸۰)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ میں دو شریکوں کا تیسرا ہوں جب تک ان میں سے کوئی شخص دوسرے سے خیانت نہ کرے، پس جب کوئی شخص خیانت کرے تو میں ان کے درمیان سے نکل جاتا ہوں۔

شراکت کے ثبوت میں تفصیلی بحث ذکر کرنے کے بعد اب ہم اس کی فقہی تعریف اور احکام ذکر کرتے ہیں۔ "عالمگیری" میں شراکت کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

اما شركة العنان فهي ان يشترك اثنان في نوع من التجارات براو طعام او يشتركان في عموم التجارات ولا يذكران الكفالة خاصة كذا في فتح القدير و صورتها ان يشترك اثنان في نوع خاص من التجارة او يشتركان في عموم التجارة ولا يذكران الكفالة و المفاوضة فيها فضمنت الوكالة دون الكفالة حتى تجوز هذه الشركة بين الرجال والنساء والبالغ والصبي الماذون والحر والعبد الماذون في التجارة والمسلم والكافر كذا في فتاوى قاضي خان۔

شراکت کی تعریف یہ ہے کہ دو شخص کسی خاص جنس مثلاً گندم یا جو کی تجارت میں یا کسی عام کاروبار میں شریک ہوں اور ان شرکاء میں سے ایک فریق کے معاملہ میں دوسرا ذمہ دار نہ ہوگا۔ (فتح القدیر) اور اس کی صورت یہ ہے کہ دو شخص کسی خاص یا عام کاروبار میں شریک ہوں اور ایک دوسرے کے معاملہ کا ذمہ دار نہ ہو اور نہ ہی مغالطہ ہو البتہ ایک فریق دوسرے کی طرف سے بطور وکالت کے کاروبار کر سکتا ہے اور یہ شراکت مرد اور عورت، بالغ اور سمجھ دار بچے، آزاد اور اجازت یافتہ غلام، مسلمان اور کافر سب کے درمیان جائز ہے۔

(فتاویٰ عالمگیری ج ۴ ص ۳۱۹)

کاروبار میں نفع اور نقصان کے بارے میں علامہ برہان الدین الفرغانی المتوفی ۵۹۳ھ ایک حدیث مرفوع کا ذکر فرماتے ہیں:

الربح على ما شرط والوضيعة على قدر المالين۔ (ہدایہ ج ۲ ص ۶۴۹)

نفع شرکاء کی شرائط کے مطابق تقسیم ہوگا اور نقصان سرمایہ کے تناسب سے برداشت کرنا ہوگا۔

نفع اور نقصان کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لو كان المال منهما في شركة العنان والعمل على احدهما ان شرط الربح على قدر راس اموالهما جاز و يكون ربحه

اگر کاروبار میں روپیہ دونوں فریقوں کا ہو اور کام صرف ایک فریق کرے اور اصل مال کی نسبت سے نفع آپس میں تقسیم کرلیا

له وضيعته عليه وان شرط الربح للعامل اكثر من راس ماله جاز على الشرط ويكون مال الدافع عند العامل مضاربة۔ (فتاویٰ عالمگیری ج ۲ ص ۳۴۰)	جائے اور نقصان کے دونوں فریق ذمہ دار ہوں تو یہ جائز ہے اگر کام کرنے والا اصل رقم کی نسبت سے زیادہ نفع کا طالب ہو تو یہ بھی جائز ہے اور کام کرنے والا جو زائد رقم لے گا وہ بطور مضاربت ہوگی۔

ان عبارات کا خلاصہ یہ ہے کہ شراکت اس کاروبار کو کہتے ہیں کہ جس میں دو یا دو سے زائد افراد کسی کاروبار میں متعین سرمایہ کی مقدار سے شریک ہوں اور نفع اور نقصان میں اپنی اپنی لگائی ہوئی اصل رقموں کے ساتھ شریک ہوں گے۔ اس کاروبار میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو فریق روپیہ لگانے کے ساتھ نفس کاروبار میں بھی باقاعدہ کام کرے اس کا نفع زیادہ ہوگا جو اس کو بطریق مضاربت حاصل ہوگا۔

اس وقت پاکستان میں جو بڑے بڑے کاروباری ادارے کام کر رہے ہیں، مثلاً نیشنل شپنگ کارپوریشن، داؤد، کوہ نور اور آدم جی وغیرہ ان کا کاروبار شراکت کے اسی اسلامی اصول کے مطابق ہے۔ کیونکہ مثلاً داؤد دس لاکھ روپیہ سے ایک مل قائم کرنے کا منصوبہ بناتا ہے تو اس میں پانچ لاکھ روپیہ اس کا ہوتا ہے اور پانچ لاکھ کے حصص (Shares) عوام میں فروخت کر دیئے جاتے ہیں اور سال گزرنے پر اخراجات منہا کرنے کے بعد جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کا ایک متعین حصہ داؤد لیتا ہے اور باقی نفع حصہ داروں (Share Holders) کے درمیان ان کے حصص (Shares) کی مناسبت سے شرکت کے اصول کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ادارہ بینک سے سود پر قرض حاصل کر کے کاروبار کرے تو پھر اس کے حصص کی خریدنا جائز ہوگی۔

اصول شراکت پر مکمل گفتگو کرنے کے بعد اب ہم آپ کے سامنے مضاربت کے موضوع پر گفتگو کریں گے اور اس کے بعد آپ کو بتلائیں گے کہ موجود بینکنگ کے نظام میں مضاربت کو کس طرح رائج کیا جا سکتا ہے۔

مضاربت

مضاربت کے لغوی معنی ہیں دوسرے کے مال سے تجارت کرنا۔ اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دلائل ملاحظہ فرمائیے۔

عقلی طور پر مضاربت کے ثبوت میں یہ کہا جاتا ہے کہ بعض لوگوں کے پاس سرمایہ ہوتا ہے مگر وہ کاروبار کی صلاحیت نہیں رکھتے اور بعض لوگ کاروبار کی اہلیت اور قابلیت رکھتے ہیں مگر ان کے پاس سرمایہ نہیں ہوتا تو ان کا باہم مل کر اس طور پر کاروبار کرنا کہ سرمایہ ایک شخص کا ہو اور محنت دوسرے شخص کی اور نفع کو وہ پہلے سے طے کردہ شرائط کے مطابق تقسیم کرلیں تو یہ تمدنی زندگی کے مقتضی کے عین مطابق ہے۔

مضاربت کے شرعی ثبوت پر شمس الائمہ محمد بن احمد اللہ حسنی المتوفی ۴۸۳ھ نے قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

وَ اٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ (المزمل:۲۰) (مبسوط ج ۲۲ ص ۱۹)	اور دوسرے وہ لوگ جو زمین میں بصورت مضاربت کاروبار کرتے ہیں اور اس کاروبار میں اللہ کا فضل تلاش کرتے ہیں۔

اور امام برہان الدین الفرغانی المتوفی ۵۹۳ھ مضاربت پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم والناس یباشرونه فقررهم علیه وتعاملت به الصحابة۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۵۷)	حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور لوگ مضاربت کرتے تھے اور حضور نے ان کے اس کاروبار کو قائم رکھا اور صحابہ کرام نے بھی مضاربت کو اختیار فرمایا۔

اور علامہ ابو محمد علی بن احمد سعید بن حزم الاندلسی المتوفی ۴۵۶ھ مضاربت پر استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

القراض کان فی الجاهلیة و کانت قریش اهل تجارة لا معاش لهم من	قبل از اسلام قریش بصورت مضاربت کاروبار کرتے تھے اور ان کے گزران کے

نہرھا و منھم الشیخ الکبیر الذی لا یطیق السفر والمرأۃ والصغیر والیتیم و ذوالشغل والمریض فکانوا یعطون المال مضاربۃ لمن یتجربہ بجزء مسمی من الربح فاقر رسول اللہ ﷺ ذالک فی الاسلام و عمل بہ المسلمون عما متیقنا لاخلاف علیہ ولو وجد فیہ خلاف ما التفت الیہ لانہ نقل کافۃ بعد کافۃ الی زمن رسول اللہ ﷺ بذالک و قد خرج رسول اللہ ﷺ فی قراض بمال خدیجۃ رضی اللہ عنھا۔ (محلی لابن حزم ج ۸ ص ۲۴۷)

لئے اس کے سوا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ ان میں ایسے بوڑھے جو سفر کرنے کے قابل نہ ہوں، عورتیں، بچے، یتیم، مصروف لوگ اور بیمار بھی شامل تھے۔ وہ اپنا مال کسی شخص کو تجارت کرنے کے لئے اصول مضاربت پر دیتے اور اس کے لئے نفع میں سے ایک رقم مقرر کر لیتے اور یہ کاروبار ظہور اسلام کے بعد بھی جاری رہا اور مسلمان اس میں بلا کسی اختلاف کے یہ کاروبار کرتے رہے، اس کے جواز کے خلاف کوئی روایت نہیں ملی اور اگر بالفرض ملی بھی تو مردود ہوگی۔ کیونکہ دور رسالت سے قرن بعد قرن یہ کاروبار مسلمانوں میں جاری رہا ہے اور خود حضور ﷺ نے بھی حضرت خدیجہ کے مال سے بصورت مضاربت کاروبار کیا ہے۔

امام ابوداؤد السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن عروۃ یعنی ابن ابی الجعد البارقی قال اعطاہ النبی ﷺ دینارا یشتری بہ اضحیۃ او شاۃ فاشتری شاتین فباع احدھما بدینار فاتاہ بشاۃ و دینار فدعا لہ بالبرکۃ فی بیعہ۔ (سنن ابی داؤد ص ۴۸)

عروہ بن ابی الجعد بارقی بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ان کو ایک دینار عطا کیا اور فرمایا کہ اس سے قربانی کا ایک جانور یا بکری خرید لو۔ انہوں نے اس دینار سے دو بکریاں خرید لیں اور ان میں سے ایک بکری ایک دینار میں فروخت کر دی اور حضور کی خدمت میں ایک دینار اور ایک

بکری پیش کر دی، حضور ﷺ نے ان کو ان کی اس بیع میں برکت کی دعا دی۔

اور شمس الائمہ سرخسی متوفی ۴۸۳ھ مضاربت کے ثبوت میں تحریر فرماتے ہیں:

عن القاسم بن محمد قال کان لنا مال فی ید عائشة رضی الله عنها و کانت تدفعه مضاربة فبارك الله لنا فیه سعیها و کان عمر رضی الله عنه یدفع مال الیتیم مضاربة علی ماروی محمد رحمه الله و بدء به الکتاب عن حمید بن عبدالله بن عبیدالله انصاری عن ابیه عن جده ان عمر رضی الله عنه اعطاه مال یتیم مضاربة۔	قاسم بن محمد سے روایت ہے کہ ہمارا مال ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اور وہ اس مال کو مضاربت پر دیتی تھیں اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو حضرت عائشہ کی اس مضاربت میں برکت عطا فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یتیم کے مال کو مضاربت پر دیا۔ چنانچہ امام محمد نے اپنی سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یتیم کا مال مضاربت پر دیتے تھے۔

(مبسوط ج ۲۲ ص ۱۸)

اور امام دار الہجرت امام مالک بن انس الاصبحی المتوفی ۱۷۹ھ مضاربت کے ثبوت میں اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں:

مالك عن زید بن اسلم عن ابیه انه قال خرج عبدالله و عبید الله ابنا عمر بن الخطاب فی جیش الی العراق فلما قفلا مرا علی ابی موسی الاشعری و هو امیر البصرة فرحب بهما و سهل ثم قال لو اقدر لکما علی امر انفعکما به لفعلت ثم قال بلی ههنا مال من مال الله ارید ان ابعث به الی امیر المؤمنین	اسلم بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو صاحبزادے حضرت عبداللہ و عبیداللہ عراق کی طرف بھیجے جانے والے لشکر میں گئے، واپسی پر ان کی ملاقات حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہوئی جو اس وقت بصرہ کے گورنر تھے، حضرت ابو موسیٰ نے ان کو ''اهلاً و سهلاً و مرحبا'' کہا۔ پھر فرمایا کہ اگر میں تم کو کوئی فائدہ پہنچا سکتا تو

فاسلفكما فتبتايعان به متاعا من متاع العراق ثم تبيعانه بالمدينة فتؤديان راس المال الى امير المؤمنين فيكون لكما الربح فقال و ددنا ففعل و كتب الى عمر بن الخطاب ان ياخذ منهما المال فلما قدما باعا فاربحا منهما رفع ذالك الى عمر بن الخطاب قال اكل الجيش اسلفه مثل ما اسلفكما قالا لا فقال عمر بن الخطاب ابنا امير المومنين فاسلفكما اديا المال و ربحه فاما عبدالله فسكت واما عبيدالله فقال ما ينبغى لك يا امير المؤمنين هذا لو نقص المال او هلك لضمناه فقال عمر ادياه فسكت عبدالله و راجعه عبيدالله فقال رجل من جلساء عمر يا امير المؤمنين لو جعلته قراضا فقال عمر قد جعلته قراضا فقال فاخذ عمر راس المال و نصف ربحه و اخذ عبدالله و عبيد الله نصف ربح المال۔ (موطا امام مالک ص ۶۱۶۔۶۱۷)

ضرور پہنچاتا، پھر فرمانے لگے: کیوں نہیں میرے پاس بیت المال کو بھیجنے کے لئے مال ہے، جس کو میں نے امیر المؤمنین کے پاس بھیجنا ہے، یہ مال میں تم کو قرض دیتا ہوں، تم عراق سے کچھ سامان خرید کر مدینہ لے جاؤ اور وہاں اس کو فروخت کرنا اور اصل مال امیر المؤمنین کو دے دینا اور نفع تم خود رکھ لینا۔ حضرت عمر کے دونوں صاحبزادوں نے اس تجویز کو پسند کیا اور ایسا ہی کیا، اس کے ساتھ ہی حضرت ابو موسیٰ اشعری نے امیر المؤمنین حضرت عمر کے نام ایک مکتوب بھیجا کہ بیت المال کی اتنی رقم ان سے وصول کر لی جائے، حضرت عبداللہ و عبید اللہ رضی اللہ عنہما نے مدینہ میں مال فروخت کر کے نفع کمایا اور اصل رقم حضرت عمر کو پیش کر دی۔ حضرت عمر نے ان سے پوچھا کہ کیا ابو موسیٰ اشعری نے اور لشکریوں کو بھی بیت المال سے تمہاری طرح رقم قرض دی تھی؟ انہوں نے کہا: نہیں، حضرت عمر نے فرمایا: ابو موسیٰ نے تمہارے ساتھ یہ رعایت صرف امیر المؤمنین کے فرزند ہونے کی حیثیت سے برتی ہے۔ اب تم اصل مال اور نفع دونوں بیت المال

میں جمع کرا دو۔ حضرت عبداللہ تو خاموش رہے لیکن حضرت عبید اللہ نے عرض کیا: یہ مناسب نہیں، کیونکہ اگر ہم کو نقصان ہوتا یا سارا مال خسارہ میں جاتا تو آپ ہم سے پوری رقم وصول کر لیتے، اس لئے آپ کو صرف اصل رقم لینے کا حق ہے، حضرت عمر نے پھر اصل مال اور نفع واپس کرنے کا حکم دیا اور حضرت عبید اللہ نے پھر اپنی دلیل دہرائی، اس پر اہل مجلس میں ایک شخص نے کہا: اے امیر المؤمنین! اس مال کو آپ مضاربت کیوں نہیں کر دیتے؟ حضرت عمر نے اس رائے کو پسند فرما کر قبول کر لیا اور اصل مال اور آدھا نفع بیت المال کے لئے رکھا اور باقی نصف نفع دونوں بھائیوں نے بطور مضاربت کے لے لیا۔

قرآن کریم، احادیث، آثار صحابہ اور تعامل مسلمین سے مضاربت کا شرعی ثبوت ظاہر ہو چکا ہے۔ اب ہم آپ کے سامنے مضاربت کی فقہی تعریف، اس کے احکام اور اقسام بیان کرتے ہیں۔

مضاربت کی فقہی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

هی عبارة عن عقد على الشركة فی الربح بمال من احد الجانبين والعمل من الجانب الاخر بان يقول رب المال خذ هذا المال مضاربة على ان ما رزق الله

مضاربت میں دو فریق آپس میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ وہ شرکت سے کاروبار کریں گے، ایک فریق کا سرمایہ ہوگا اور دوسرے کی محنت بایں طور کہ صاحب مال کہے کہ یہ

او اطعم الله تعالیٰ عنه من ربح فهو بیننا علی کذا من نصف او ربع او ثلث او غیر ذالك من الاجزاء المعلومة و یقول المضارب اخذت او رضیت او قبلت۔ (عالمگیری ج ۴ ص ۲۸۵ ملخصا)

مال لو اور اس پر اللہ تعالیٰ جو منافع دے وہ ہمارے درمیان آدھے، چوتھائی یا تہائی کی نسبت سے تقسیم کر دیا جائے گا اور مضارب کہے کہ میں نے لے لیا یا میں اس پر راضی ہوا یا میں نے قبول کیا۔

اس تعریف کا خلاصہ یہ ہے کہ مضاربت میں ایک فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا فریق اس سرمایہ سے کاروبار کرتا ہے اور باہم یہ معاہدہ طے کیا جاتا ہے کہ نفع کو فریقین میں کسی متعین نسبت کے ساتھ تقسیم کیا جائے گا۔

مضاربت میں عقلاً تین صورتیں متصور ہو سکتی ہیں۔ ایک شخص کا سرمایہ ہو اور متعدد کام کریں یا متعدد افراد کا سرمایہ ہو اور متعدد افراد کام کریں یا متعدد افراد مل کر سرمایہ فراہم کر لیں اور ایک فرد یا ادارہ کاروبار کرے، بینک میں یہی صورت متصور ہو سکتی ہے۔

مضاربت کے احکام

مضاربت میں کاروبار کے لئے ایک متعین عرصہ کی مدت کے لئے معاہدہ کرنا چاہیے، یہ مدت ایک سال بھی ہو سکتی ہے اور دس سال بھی۔ جب ایک مدت ختم ہو جائے تو پہلا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور اس وقت فریقین طے شدہ شرائط کے مطابق نفع تقسیم کر لیں گے اور رب المال کی اصل رقم اس کو لوٹا دی جائے گی۔ الا یہ کہ وہ آئندہ کے لئے پھر ایک معین مدت کے لئے کاروبار کا معاہدہ کر لے۔

امام برہان الدین فرغانی متوفی ۵۹۳ھ ان احکام کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان وقت المضاربة وقتا بعینه یبطل العقد بمضیه لانه توکیل فیتوقت بما وقته والتوقیت مفید۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۶۱)

جب مضاربت میں ایک مدت کا تعین کر لیا جائے تو مدت پوری ہونے کے بعد معاہدہ ختم ہو جائے گا، کیونکہ یہ وکالت ہے اور وقت کے ساتھ مقید ہو سکتی ہے اور مدت کا متعین کر لینا مفید ہے۔

نفع اور نقصان

اگر مضاربت کے کاروبار میں نقصان ہو تو یہ نقصان صرف صاحب مال کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور مضارب کے لئے یہ نقصان کافی ہے کہ اس نے کاروبار کرنے میں اپنا وقت، محنت، ذہانت اور قابلیت صرف کی اور اس کو اس کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ تاہم کرنا یوں چاہیے کہ جب کاروبار میں نقصان ہو تو اس کو اصل رقم کی بجائے نفع سے مجرا کرنا چاہیے۔ اگر نقصان نفع سے بڑھ جائے تو وہ بہر حال اصل مال سے وضع ہوگا۔

اس سلسلہ میں امام برہان الدین فرغانی فرماتے ہیں:

وما هلك من مال المضاربة فهو من الربح دون راس المال لان الربح تابع و صرف الهالك الى ما هو التبع اولى كما يصرف الهلاك الى العفو فى الزكوة فان زاد الهالك على الربح فلا ضمان على المضارب لانه امين۔ (ہدایہ ج ۳ ص ۲۶۶)	مال مضاربت میں جو نقصان واقع ہو اس کو نفع سے وضع کرنا چاہیے کیونکہ نفع تابع ہے اور نقصان کو تابع کی طرف راجع کرنا اولیٰ ہے۔ جس طرح اگر زکوۃ دینے والے کے مال میں نقصان ہو تو اس نقصان کو مافوق النصاب سے وضع کیا جاتا ہے نہ کہ اصل نصاب سے۔ اگر نقصان نفع سے بڑھ جائے وہ اصل مال سے وضع ہوگا اور مضارب اس نقصان کا ذمہ دار نہیں ہوگا کیونکہ مضارب امین ہوتا ہے اور امین پر نقصان کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

اور علامہ علاؤالدین الحصکفی ۱۰۸۸ھ فرماتے ہیں:

ولا تصح كفالة المضارب لرب المال اى بالثمن لما مر ولان الثمن امانة عندهما فالضمان تغيير للحكم الشرعى (درمختار علی هامش ردالمحتار ج ۴ ص ۴۷۵)	مضارب کا صاحب مال کو اصل مال کی ضمانت دینا صحیح نہیں ہے کیونکہ مال مضارب اور وکیل کے پاس امانت ہوتا ہے اور امانت میں کسی کو ضامن کرنا شرعی

حکم کو بدلنا ہے۔

مضاربت کی قسمیں

مضاربت کی فقہاء نے تین اقسام بیان فرمائی ہیں۔ لیکن بینکنگ کے نظام میں جن اقسام کی ضرورت پیش آسکتی ہے وہ صرف دو قسمیں ہیں۔ چنانچہ ہم صرف انہیں کا یہاں ذکر کر رہے ہیں۔

امام برہان الدین فرغانی فرماتے ہیں:

والاصل ان ما يفعله المضارب ثلثة انواع نوع يملكه بمطلق المضاربة و هو مايكون من باب المضاربة و توابعها و هو ما ذكرنا و من جملته التوكيل بالبيع و الشراء للحاجة اليه والارتهان والرهن لانه ايفاء واستيفاء والاجارة والاستيجار والابداع والابضاع والمسافرة على ما ذكرناه من قبل و نوع لا يملكه بمطلق العقد و يملكه اذا قيل له اعمل برايك وهو ما يحتمل ان يلحق به فيلحق عند وجه وجود الدلالة و ذالك مثل رفع المال مضاربة او شركة الى غيره و خلط مال المضاربة بماله او بمال غيره لان رب المال رضى بشركة لا بشركة غيره و هو امر عارض لا يتوقف عليه التجارة فلا يدخل تحت مطلق العقد ولكن جهته

قاعدہ یہ ہے کہ مضارب کے کاروبار کی تین قسمیں ہیں: ایک قسم یہ کہ صاحب مال اور مضارب کے درمیان مطلقاً عقد ہو، اس صورت میں مضارب کو خرید و فروخت کرنے کا مال رہن رکھنے کا، رکھوانے اور کرایہ پر کسی چیز کے دینے یا لینے یا کسی چیز کو بنانے (Production) کا اور سرمایہ اکٹھا کرنے کا اور اس سلسلہ میں سفر وغیرہ کرنے کا مکمل اختیار ہوتا ہے، دوسری قسم یہ ہے کہ جس میں صاحب مال اس کو مکمل اختیار تفویض کر دے اور کہے کہ اپنی صواب دید سے کاروبار کرو اور اس قسم میں پہلی قسم کے تصرفات بھی مضارب کو حاصل ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس کو یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ اس مال کو کسی اور شخص کو مضاربت پر دے، اب یہ مضاربت در مضاربت ہوگی یا مضارب اصل سرمایہ کو

فی التشہیر فمن ھذا الوجہ یوافقہ فیدخل فیہ عند وجود الدلالۃ و قولہ اعمل برایک دلالۃ علی ذالک۔

(ہدایہ ج ۳ ص ۲۶۷۔۲۶۸)

کسی اور ادارہ کے ساتھ شرکت کے کاروبار میں لگا دے اور اپنے مال کو دوسری پارٹی کے مال کے ساتھ ملا دے، کیونکہ صاحب مال اس شراکت پر راضی ہو چکا ہے اور یہ ایک عارضی امر ہوتا ہے جس پر تجارت موقوف نہیں ہے، اسی وجہ سے مضارب کو یہ اختیار مطلقاً عقد مضاربت سے حاصل نہیں ہوتا، لیکن مضارب کا یہ اختیار چونکہ تجارت میں ثمر آور ہوتا ہے اس وجہ سے صاحب مال مضارب کے اس تصرف اور اختیار کو قبول کر لیتا ہے اور صاحب مال کا مضارب سے یہ کہنا کہ اپنی صواب دید سے کاروبار کرو ان تمام تصرفات اور اختیارات کے حصول کو شامل ہوتا ہے۔

شرکت اور مضاربت کا خلاصہ

شرکت (Company) میں کئی افراد مل کر کاروبار کرتے ہیں اور ان کے سرمایہ کی نوعیت مساوی اور مختلف دونوں طرح کی ہو سکتی ہے۔ سال کے اختتام پر اخراجات وضع کرنے کے بعد نفع (Profit) تمام شرکاء میں ان کے حصص (Shares) کے تناسب سے پہلے سے طے کردہ متعین نسبت کے ساتھ تقسیم کر دیا جاتا ہے اور اگر نقصان (Loss) ہو تو اول تو اس کو نفع سے وضع کیا جا سکے گا اور اگر نقصان اس سے بھی بڑھ جائے تو اس کو اصل رقم سے وضع کیا جا سکے گا اور نقصان میں تمام حصہ دار برابر کے شریک ہوں گے۔ اس کی نظیر ہمارے ملک کے بڑے بڑے کاروباری ادارے مثلاً نیشنل شپنگ کارپوریشن، داؤد، آدم جی اور کوہ نور وغیرہ ہیں۔

مضاربت میں ایک فریق سرمایہ بہم پہنچاتا ہے اور دوسرا فریق کاروبار کرتا ہے۔
مضاربت میں اگر نفع ہو تو وہ پہلے سے طے شدہ شرائط کے مطابق مضارب اور اصحاب مال کے درمیان تقسیم ہوگا اور اگر نقصان ہو تو اس کے ذمہ دار صرف سرمایہ لگانے والے ہوں گے۔ مضارب کے لئے یہ نقصان کافی ہے کہ اس کو وقت، محنت اور قابلیت خرچ کرنے کے باوجود کوئی صلہ نہیں ملا۔ مضاربت میں مدت کاروبار شروع کرنے سے پہلے متعین کر لینی چاہیے۔ یہ مدت مثلاً ایک سال سے لے کر دس سال تک بھی ہو سکتی ہے۔ نفع ہر سال کے اختتام پر تقسیم کیا جائے گا اور مدت مضاربت ختم ہونے کے بعد صاحب مال کا کھاتہ ختم ہو جائے گا اور اگر وہ چاہے تو اپنی رقم واپس لے سکتا ہے۔ مضاربت کی قسم ثانی کاروبار کے لئے سہل اور آسان ہے، اس میں سرمایہ لگانے والے مضارب سے مدت کے معاہدہ کے ساتھ اس کو اجازت دیں گے، وہ جس طرح چاہے کاروبار کرے، وہ اس سرمایہ کو کسی اور کو مضاربت پر بھی دے سکتا ہے اور کسی کمپنی کے ساتھ مل کر شرکت کا کاروبار بھی کر سکتا ہے۔

کیا فی الواقع بینک کی ضرورت ہے؟

بینک کے ذریعہ ملک کے تمام بکھرے ہوئے افراد کا سرمایہ ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے۔ جو لوگ اپنی رقم کی حفاظت کا انتظام نہیں کر سکتے، بینک کے ذریعہ ان کی رقم محفوظ ہو سکتی ہے اور جب وہ چاہیں مل جاتی ہے۔ اگر بینک کا وجود نہ ہو اور مشترک قومی سرمایہ ایک جگہ جمع نہ ہو اور لوگ اپنے اپنے طور پر چھوٹے چھوٹے کاروبار شرکت اور مضاربت کے طور پر کریں تو ملک میں کسی بڑی صنعت کا قیام نہیں ہو سکتا اور بین الاقوامی تجارت قریب قریب ناممکن ہو جائے گی۔

موجودہ زمانہ کی تمدنی اور کاروباری زندگی میں ایک شہر سے دوسرے شہر میں رقم کی منتقلی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ایک آدمی خود یہ رقم لے کر جاتا ہے تو قدم قدم پر جیب کتروں کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اگر منی آڈر (Money Order) کے ذریعہ رقم ارسال کرے تو اس پر بہت زیادہ خرچ آتا ہے۔ بینک اس سے بیس پچیس گنا کم کمیشن پر رقم ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے ایک معقول کمیشن پر ایک ملک سے

دوسرے ملک میں رقم کے انتقال میں بینک کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ بینک لوکر (Bank locker) کے ذریعہ قیمتی اشیاء کی حفاظت ہوتی ہے، تاجروں کے باہمی لین دین میں ہنڈی (Bill of Exchange) بھنانے میں بینک سہولت فراہم کرتا ہے۔ اس کے شرعی جواز کی بحث آگے آرہی ہے اور ایک معقول کمیشن پر سفری چیک اور گشتی نوٹ جاری کرتا ہے۔ کمپنیوں کے حصص کی فروخت کا انتظام کرتا ہے اور بہت سی وکیلانہ خدمات انجام دیتا ہے اور یہ سب جائز کام ہیں، علاوہ ازیں Foriegn Exchange یعنی غیر ممالک سے اشیاء کی درآمد بینک کے ذریعہ بہت آسانی سے ہو جاتی ہے، اس کی اصلاحی صورت کا بیان آگے آرہا ہے۔ غرض یہ کہ ایک عام آدمی سے لے کر ایک صنعتی اور تجارتی ادارے تک سب کو بینک سہولت بہم پہنچاتا ہے اور ان کی ضروریات کے لئے بینک کا وجود ناگزیر ہے۔

مضاربت کے اصول پر بینکنگ (Banking) کا نظام

جب ہم اصول مضاربت پر بینکنگ کا نظام چلائیں گے تو بینک میں دو قسم کے کھاتے ہوں گے، ایک چلت کھاتہ (Current Account) بینک میں یہ رقم لوگ اپنی بچت کو محفوظ رکھنے کے لئے بطور امانت رکھواتے ہیں، اس پر بینک چاہے تو ان سے اس حفاظت کا معاوضہ لے سکتا ہے۔ بینک کو بعض دفعہ حکومت کے تعمیری اقدامات کی تکمیل کے لئے رقم دینی پڑتی ہے جس رقم سے کاروبار نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے کوئی نفع متوقع ہوتا ہے۔ اس طرح بعض دفعہ کاروباری ساکھ کی بنیاد پر لوگوں کے بعض نجی ضروریات پر قرض دینا ہوتا ہے اور قرض کی رقم بھی ثمر آور نہیں ہوتی، اس قسم کے قرضوں کو بینک کرنٹ اکاؤنٹ کے جمع شدہ سرمایہ سے حسب گنجائش قرض دے سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ کرنٹ اکاؤنٹ پر وہ نہ کوئی سود دیتا ہے اور نہ ہی ان قرضوں پر کوئی سود وصول کرے گا۔ البتہ حساب کتاب محفوظ کرنے اور اس کے دیگر اخراجات پر وہ دونوں فریقوں سے ایک مناسب معاوضہ وصول کر سکتا ہے اور اس کی قرآن کریم اجازت دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اے ایمان والو! جب تم مقررہ مدت تک

إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ (البقرہ: ۲۸۲)	کسی قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ لین دین کو صحیح صحیح لکھے۔

اور اس کے بعد فرمایا:

وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ (البقرہ: ۲۸۲)	اور نہ لکھنے والے کو ضرر دیا جائے گا اور نہ گواہ کو۔

علامہ السید محمود آلوسی المتوفی ۱۲۷۰ھ ضرر کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

لا يعطى الكاتب حقه من الجعل او يحمل الشاهد مؤنة المجيء من بلد۔ (روح المعانی ج ۳ ص ۶۱)	کاتب کو لکھنے کی اجرت نہ دی جائے یا گواہ کو کسی دوسرے شہر سے بلانے کے باوجود اس کو کرایہ نہ دیا جائے۔

جب ضرر کا معنی کاتب کو اجرت نہ دینا ہوئے اور یہ از روئے قرآن منع ہے تو کاروباری معاملہ میں حساب کتاب رکھنے پر بینک کا معاوضہ لینا جائز ہوا۔

دوسرا کھاتہ ہوگا فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed Deposits) جس میں رقم جمع کرانے والا بینک سے ایک معین مدت مثلاً ایک سال کے لئے کاروبار کا معاہدہ کرے گا کہ ایک سال سے پہلے وہ رقم نہیں نکلوا سکے گا اور اس کی رقم حصص (Shares) کہلائے گی اور رب المال کو Share Holder کہا جائے گا اور حصص کی صورت میں جو بینک کے پاس رقم جمع ہوگی، بینک اس سے کاروبار کرے گا، جس کی مندرجہ ذیل صورت ہو سکتی ہے۔

(۱) اندرون ملک تجارت (Business) کرے۔

(۲) بیرون ملک درآمد برآمد (Import Export) کرے۔

(۳) صنعتی پیداوار (Industrial production) کے لئے کارخانے قائم کرے۔

(۴) عمارات (Building) بنا کر ان کو کرایہ پر دے۔

(۵) دوسری کمپنیوں کے حصص خریدے اور ان سے شراکت کا کاروبار کرے۔

(۶) تیل صاف کرنے کا کارخانہ (Refinery) لگائے۔

(۷) عمارات تیار کرا کے فروخت کرے (Housing Scheme)۔

اور اس قسم کے دوسرے آمدنی کے ذرائع کو اپنا کر بینک کاروبار کرے اور ایک سال بعد اخراجات وضع کر کے نفع تقسیم کرے۔ فرض کیجئے بینک اور حصہ داروں کے درمیان ایک سال کے لئے نصف نصف کا معاہدہ ہوتا ہے اور ایک سال کے بعد بینک کو ۴۰ فیصد نفع ہوتا ہے۔ (یاد رہے کہ آج کل بعض کاروباری ادارے دس روپیہ کی چیز پر ۶۰ روپے تک نفع لیتے ہیں۔ اس کی ایک تازہ مثال یہ ہے کہ سوئٹزر لینڈ سے لبریکس (Librex) گیس السر کی دوا گیارہ روپے کی چلتی ہے اور یہاں وہ ۶۷ روپے میں بمشکل دستیاب ہوتی ہے) تو جس شخص نے سو روپیہ جمع کرائے تھے اس کو سال کے بعد بیس روپے نفع ملے گا اور بیس روپیہ بینک رکھے گا۔ اب حصہ دار کی مرضی ہوگی کہ وہ آئندہ سال کے لئے اپنا شیئر برقرار رکھے یا اپنا شیئر واپس لے لے۔ یہ صاف اور سیدھا کاروبار کا طریقہ ہے اور اس طریقہ سے رقم جمع کرانے والوں کو چھ فیصد حساب کے حرام سود سے انشاء اللہ زیادہ نفع ہوگا اور وہ خالص حلال وطیب ہوگا۔

اعتماد کی ضمانت

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ موجودہ نظام بینکاری اعتماد پر قائم ہے، بینک اپنی امانتوں کا بیشتر حصہ کاروبار میں لگاتا ہے یا قرض دے دیتا ہے۔ عام معاشی حالت کیسی ہی ہو اور قرض لینے والے کا جو بھی حال ہو بینک ہر حال میں اپنا اصل زر مع سود کے وصول کر لیتا ہے۔ اس لئے بینک کے کھاتہ داروں کو پورا یقین ہوتا ہے کہ ان کا سرمایہ محفوظ رہے گا اور میعادی امانت داروں کو مقررہ شرح کے مطابق سود بھی ملے گا۔ یہ وہ اعتماد ہے جس کی بناء پر بینکوں میں جمع شدہ رقوم میں بالعموم اضافہ ہوتا رہتا ہے، اگر یہ اعتماد کسی وجہ سے متزلزل ہو جائے تو نظام بینکاری بری طرح متاثر ہوتا ہے، جس کے نتائج ملکی معیشت کے لئے بھی نقصان دہ ہو سکتے ہیں۔

سود کی جگہ شرکت اور مضاربت کے اصول پر اگر بینکاری کا نظام (Banking System) چلایا جائے تو یہ عین نظام مصطفیٰ کے مطابق ہوگا اور عوام کا استحصال اور سود کی

پیدا کردہ بہت سی خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ لیکن اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اتنے عرصہ میں سودی نظام کے رواج سے اچانک اس نظام میں تبدیلی سے لوگوں کے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا ہو سکتے ہیں کہ شرکت اور مضاربت پر عمل کرنے سے بینک نقصان اٹھا سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جو رقم بینکوں میں جمع کرائی ہیں وہ ڈوب جائیں۔

نئے نظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہوگا کہ کھاتہ داروں کا اعتماد بینکوں میں ہر صورت میں قائم رہے، کیا اس اعتماد کو برقرار رکھنے کے لئے ضمانت کا طریقہ اپنایا جا سکتا ہے۔ مثلاً حکومت یا انشورنس کمپنی اس بات کی ضمانت دے کہ اگر غیر سودی بینک کے کاروبار مضاربت سے کھاتہ دار کی اصل رقم ضائع ہو گئی یا اس کو نقصان ہوا تو حکومت یا انشورنس کمپنی اس کی رقم ڈوب جانے کی صورت میں وہ اس کا اصل رقم کا بدل مہیا کرے گی اور نقصان کی صورت میں اس کی تلافی کرے گی۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کھاتہ داروں کو اعتماد میں لینے کے لئے کسی قسم کے تحفظ کی نہ شرعاً کوئی ضرورت ہے اور نہ عقلاً۔ شرعاً تو اس لئے کہ جب انسان شرکت اور مضاربت کے طور پر کسی کاروبار میں روپیہ لگاتا ہے تو شرعاً وہ نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہوتا ہے اور عقلاً اس لئے کہ جب دو فریق کاروبار کر رہے ہیں اور تیسرے فریق کا اس کاروبار میں ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے اور نہ ہی ان کے باہمی حاصل شدہ نفع میں اس کا کوئی حصہ ہے تو آخر کس بناء پر اس تیسرے فریق کو ان کے نقصان کا ذمہ دار قرار دیا جا سکتا ہے اور جب تیسرا فریق ان کے نفع میں شریک نہیں ہے تو اس کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ ان کے نقصان کی تلافی کرتا پھرے۔

علاوہ ازیں فقہاء اسلام نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب دو فریق کاروبار کر رہے ہوں اور تیسرا فریق کسی ایک سے کہے: تم کاروبار کرو، اگر نقصان ہو گیا تو سرے سے اصل رقم ضائع ہو گی تو میں ضامن ہوں تو اس قسم کی ضمانت صحیح نہیں ہے۔

فقہاء احناف کے طبقہ ثالثہ میں سے امام فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی الفرغانی الحنفی المعروف بقاضی خان المتوفی ۵۹۲ھ جن کو احناف مجتہد فی المسائل قرار دیتے ہیں۔

(ردالمحتار ج ۱ ص ۷۰) وہ تحریر فرماتے ہیں:

رجل قال للاخر بایع فلانا علی ان ما اصابك من خسران فیه فهو علی او قال رجل للرجل ان هلك عبدك هذا فانا ضامن به فلا تصح هذا الكفالة۔ (فتاوی قاضی خاں علی الہندیہ ج ۳ ص ۶۲)

ایک شخص ایک فریق سے کہے کہ تم فلاں فریق سے کاروبار کرو، اگر نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں یا ایک شخص دوسرے سے کہے: اگر تمہارا یہ غلام ہلاک ہو گیا تو اس کا میں ضامن ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے۔

اور امام حافظ الدین محمد بن محمد بن شہاب المعروف بابن البزاز الکردری الحنفی المتوفی ۸۲۷ھ فرماتے ہیں:

و ذکر القاضی بایع فلانا علی ان ما اصابك من خسران فعلی او قال الرجل ان هلك عنك هذا فانا ضامن لم تصح۔ (فتاوی بزازیہ علی الہندیہ ج ۶ ص ۱۵)

قاضی خان نے ذکر کیا ہے کہ ایک شخص کسی شخص سے کہے کہ تم فلاں شخص سے کاروبار کرو، اگر نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں یا کسی شخص سے کہا: اگر تمہارا یہ مال ضائع ہو گیا تو میں ضامن ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے۔

اور علامہ حامد آفندی مفتی دمشق حنفی متوفی ۹۸۵ھ تحریر فرماتے ہیں:

سئل فیما اذا اشتری زید مقدارا معلوما من البصل من عمرو ثم خسر فیه و یرید الرجوع علی عمر والبائع زاعما انه ضمن له ذالك فهل یکون ضمان الخسران باطلا الجواب نعم لانه ما ضامن لما یخسره کما قال بعضهم نظرا الی قوله علی لانه الوجوب فلا یجوز کما قال لرجل بایع فی السوق فما

سوال: زید نے عمرو سے ایک معین مقدار پیاز خریدی اور اس میں نقصان ہوا تو کیا وہ نقصان کی تلافی عمرو سے کر سکتا ہے یہ سمجھتے ہوئے کہ عمرو اس نقصان کا ضامن ہے یا یہ ضمانت باطل ہے؟ جواب: ہاں یہ ضمانت باطل ہے اور یہ اسی طرح ناجائز ہے جیسا کہ کوئی شخص بازار میں کسی سے کہے کہ تم خریداری کرو، جو نقصان ہو گا اس کا میں

ضمنت فعلی زیلعی من الکفایة و فی شرح التنویر للعلائی لانه اما ضمان الخسران او توکیل بمجهول و ذالک باطل له وهذا ملخص ما فی الزیلعی وغیرہ مسئلہ بایع فی السوق صرح بھا فی الخانیة بقوله رجل قال لاخر بایع فلانا علی ان ما اصابك من خسران فهو علی لا تصح الکفالة۔ (تنقیح الفتاوی الحامدیہ ج۱ ص ۲۶۶)

ضامن ہوں۔ (بحوالہ زیلعی) اور علامہ علائی نے شرح تنویر میں فرمایا کہ یا تو یہ ضمانت خسران ہے یا توکیل بالمجهول ہے اور دونوں باطل ہیں اور زیلعی وغیرہ کتب فقہ میں خانیہ کے حوالہ سے ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا: تم فلاں سے کاروبار کرو، اگر نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے۔

اور علامہ خیر الدین الرملی الحنفی المتوفی ۱۰۸۱ھ تحریر فرماتے ہیں:

سئل فی دلال قال لاخر اشتر هذا بکذا وان خسر فعلی فاشتراہ فخسر هل تصحه ویلزمه الخسران ام لا (اجاب) لا تصح ولا یلزمه الخسران فقد صرح فی البزازیه بانه قال بایع فلانا علی ان ما اصابك من خسران فعلی لم یصح وقد ذکرہ فی البحر فی شرح قوله و ما غصبك فلان فعلی ناقلا عنه و مثله فی کثیر من الکتب۔

(فتاوی خیریہ علی الحامدیہ ج۲ ص ۲۸۲)

سوال: ایک دلال نے کسی شخص سے کہا: یہ چیز اتنے میں خرید لو، اگر نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں، اس نے خرید لی اور نقصان ہوا تو کیا دلال اس نقصان کا ضامن ہوگا؟

(جواب:) یہ ضمانت صحیح نہیں اور اس پر تاوان لازم نہیں ہوگا کیونکہ ''بزازیہ'' میں تصریح ہے کہ اگر کسی شخص نے دوسرے سے کہا کہ تم فلاں سے کاروبار کرو، اگر نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے اور بحر الرائق نے بھی یہ مسئلہ ذکر کیا ہے اور اس کی مثالیں بہت سی کتابوں میں ہیں۔

اور فتاوی عالمگیری مدون شدہ ۱۰۸۲ھ میں ہے:

رجل قال لاخر بایع فلانا علی ان ما اصابك من خسران فعلی او قال ان هلك عبدك هذا فانا ضامن به فلا تصح هذا الکفالة۔	ایک شخص نے کسی کاروباری فریق سے کہا کہ تم فلاں سے کاروبار کرو، اگر تم کو نقصان ہوا تو میں ذمہ دار ہوں یا کہا: اگر تمہارا یہ غلام ہلاک ہوا تو میں ذمہ دار ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے۔

(فتاوٰی عالمگیری ج ۳ ص ۲۷۱۔۲۷۲)

فائدہ: اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) نے اپنی سلطنت کے تمام اطراف واکناف سے پچاس جید اور فاضل حنفی علماء کو جمع کیا۔ جنہوں نے آٹھ سال کی مدت میں کثیر محنت شاقہ سے ایک سوتیس فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے ایک فتاوٰی کو مرتب کیا، اس فتاوٰی کی تالیف پر ۲ لاکھ عالمگیری سکے خرچ ہوئے اور یہ عہد عالمگیری کا آئین قرار پایا۔ فتاوٰی کی ترتیب اور تدوین کا کام چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر حصہ کی تدوین کا قائد ایک ایک قاضی مقرر کیا گیا اور اس کی معاونت کے لئے دس دس فاضل اور جید علماء مقرر کئے گئے۔ ایک ربع کے قائد محمد حسین جونپوری متوفی ۱۰۸۱ء تھے اور ایک ربع کے قائد محمد اکرام لاہوری متوفی ۱۰۹۲ء تھے، ایک ربع کے قائد سید جلال الدین محمد مچھلی شہری تھے اور ایک ربع کے قائد شیخ وجید گوپاموی متوفی ۱۰۹۷ء تھے۔ ان تمام علماء کی ٹیم کے صدر شیخ نظام الدین برہان پوری متوفی ۱۰۹۲ء تھے۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر خود بھی اس کام میں دلچسپی لیتے تھے۔ شیخ نظام الدین ان کو بعض حصص پڑھ کر سناتے اور وہ اس پر بسا اوقات اصلاح اور تنقید کیا کرتے تھے۔ یہ کتاب ۱۰۷۴ء میں شروع اور ۱۰۸۲ء میں مکمل ہوئی۔ اس فتاوٰی کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی، یہ فتاوٰی متعدد بار ہند، مصر، افغانستان اور بیروت سے چھپ چکا ہے اور کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ فارسی زبان میں اس کا ترجمہ چلپی عبداللہ رومی نے کیا۔ اردو زبان میں اس کا ترجمہ احتشام الدین مراد آبادی اور امیر علی نے کیا اور ۱۸۵۰ء میں بیلی نے اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا اور اس کا نام "A Digest of Mohammeden Haneefea Islamia leas in Indiae" رکھا۔ ہندوستان کی انگریزی عدالتوں میں مسلمانوں کے شرعی مقدمات کا

فیصلہ کرنے کے لئے مدتوں تک ''فتاوی عالمگیری'' پر عمل ہوتا رہا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۵ ص ۱۲۵ تا ۱۲۹)

اور علامہ علاؤ الدین الحصکفی الحنفی المتوفی ۱۰۸۸ھ بیع عینہ کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں:

لا شئی علی الامر لانه اما ضمان الخسران او توکیل بمجھول و ذالك باطل۔ (در مختار شرح تنویر الابصار علی حاشش الردالمختار ج ۴ ص ۳۸۷)

کاروبار کا حکم دینے والے پر کوئی ضمانت نہیں کیونکہ یہ یا تو نقصان کی ضمانت ہے یا مجہول کی وکالت ہے، دونوں باطل ہیں۔

اور علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ای نظرا الی قوله علی فانها للوجوب فلا یجوز کما اذا قال لرجل فما خسرت فھو علی (درر)۔ (ردالمختار ج ۴ ص ۳۸۷)

آمر کے قول ''مجھ پر ذمہ ہے'' کی طرف نظر کرتے ہوئے، کیونکہ یہ کلمہ وجوب کا فائدہ دیتا ہے، پس یہ جائز نہیں ہے، جس طرح کوئی شخص کسی کو کہے، بازار میں بیع کرو، اگر تم کو نقصان ہوا تو میں ذمہ دار ہوں، یہ بھی ناجائز ہے۔ (بحوالہ درر غرر)

اور شیخ زین الدین ابن نجیم المتوفی ۱۲۵۲ھ تحریر فرماتے ہیں:

لو قال بایع فلانا علی ما اصابك من خسران فعلی لم یصح۔ (بحر الرائق ج ۶ ص ۲۲۸)

اگر کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص سے کاروبار کرو، اگر تم کو نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے۔

اور خاتم المحققین سید محمد امین المعروف بابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ تحریر فرماتے ہیں:

لو قال بایع فلانا علی ان اصابك من خسران فعلی لم یصح قال الخیر الرملی

اگر کسی شخص نے ایک فریق سے کہا کہ فلاں سے کاروبار کرو، اگر تم کو نقصان ہوا تو میں

وھو صریح من من قال استاجر طاحونۃ فلان وما اصابك من خسران فعلی لم یصح وھی واقعۃ التقوی۔
(ردالمحتار ج ۴ ص ۳۶۷)

ذمہ دار ہوں تو صحیح نہیں۔ علامہ رملی نے فرمایا: اس جزیہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ کسی شخص نے کہا: فلاں شخص سے چکی کرائے پر لو، اگر تم کو نقصان ہوا تو میں ضامن ہوں تو یہ ضمانت صحیح نہیں ہے اور یہی قول مفتی بہ ہے۔

فقہائے کرام کی ان تمام تصریحات سے یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ جب دو فریق کاروبار کر رہے ہوں تو تیسرے فریق کے لئے خواہ وہ حکومت ہو یا انشورنس کمپنی ان کے کاروبار میں اصل مال کی ہلاکت یا نقصان کی ضمانت دینا از روئے شرع جائز نہیں، لہٰذا حکومت کا کھاتہ داروں کو نقصان یا اصل مال کی ضمانت دینا نہ عقلاً صحیح ہے نہ شرعاً صحیح ہے۔

نیز یہ اعتماد کی ضمانت حقائق، واقعات اور مشاہدات کے بھی بالکل برعکس ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ گورنمنٹ کے مقرر کردہ ادارے سٹاک ایکسچینج مارکیٹ (Stock Ecxange) اور مختلف صنعتی اور تجارتی کمپنیوں کے حصص (Market Industrial and Trade Companies Shares) فروخت کئے جاتے ہیں، جب کہ یہ صنعتی ادارے مثلاً نیشنل شپنگ کارپوریشن، داؤد، آدم جی، کوہ نور وغیرہا کمپنیاں بھی شراکت کے اصول پر کام کرتی ہیں اور ان میں سے بعض کمپنیوں کو اکثر و بیشتر نفع ہوتا ہے اور نقصان کے احتمال کے باوجود یہ حصص (Shares) بھاری تعداد میں فروخت ہوتے ہیں اور اس کی خریداری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، بلکہ دن بدن اضافہ ہو رہا ہے اور لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ بیس روپیہ کے شیئر کو پچیس پچیس روپیہ میں بھی خرید لیتے ہیں۔ ان حقائق و واقعات اور مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے اس تردد کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب بینک مضاربت کے اصول پر کاروبار کرے گا تو فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed Deposit) کی شکل میں اس کے حصہ دار (Share Holder) نہیں بنیں گے اور عام تجربہ کو سامنے رکھتے ہوئے ظن غالب یہی ہے کہ بینک کو بھی دیگر کمپنیوں کی طرح اس کاروبار میں بہت

زیادہ نفع ہوگا اور اگر بالفرض کبھی نقصان بھی ہوا تو اولاً تو اس نقصان کو نفع سے پورا کرنا چاہیے اور اگر کسی صورت میں یہ نقصان کھاتہ داروں پر پڑ ہی جائے تو ان کو یہ نقصان اسی جذبہ (Spirit) سے برداشت کر لینا چاہیے جس طرح مختلف کمپنیوں کے شیئرز میں وہ بعض دفعہ نقصان برداشت کر لیتے ہیں۔

بینک کے ذریعہ درآمدات کی اصلاح

بینک کے ذریعہ ایک اہم خدمت جو حاصل کی جاتی ہے وہ بیرونی ممالک سے اشیاء کی درآمد ہے۔ ایک تاجر نے اگر مثلاً ایک لاکھ روپیہ کا مال منگوانا ہے تو وہ بینک میں ۴۰۰۰۰ چالیس ہزار روپیہ جمع کر کے L.C کھول لیتا ہے، اب بینک کام شروع کر دیتا ہے اور دوسرے ملک سے مال خرید کر پوری قیمت کی ادائیگی اس ملک کے بینک کو کر دیتا ہے اور جس دن سے وہ رقم ادا کرتا ہے (یعنی ساٹھ ہزار روپیہ) تو اس دن سے مال چھڑانے تک اس رقم پر سود لاگو کر دیتا ہے، اس سود کو ختم کر دیا جائے اور اس کے بجائے بینک ایک معقول اور معتد بہ رقم اپنے تمام اخراجات اور حق خدمت کے طور پر بطور کمیشن وصول کرے۔ اس صورت میں سود کی لعنت سے بھی نجات ملے گی۔ نہ بینک کو کوئی نقصان ہوگا اور نہ تاجروں کو باہر سے مال منگوانے کی سہولت میں کوئی فرق آئے گا۔

ہنڈی بنوانے کی اصلاح

آج کل ہنڈی (Bill of Exchange) بنانے کا طریقہ کار اس طرح ہے۔

زید نے عمرو سے مال خریدا اور تین ماہ بعد رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے لئے زید نے عمرو کو ایک دستاویز ہنڈی کی شکل میں فراہم کر دی۔ عمرو نے بینک الف میں یہ ہنڈی پیش کی تاکہ اس کی بناء پر بینک سے رقم قرض لے اور بینک یہ رقم مدت گزرنے کے بعد زید سے یا زید کے وکیل بینک سے وصول کرے، بینک الف عمرو کو وہ رقم ادا کرتا ہے، لیکن پوری رقم نہیں بلکہ اصل میں سے کچھ حصہ اپنے حق کے طور پر وضع کر لیتا ہے، گویا عمرو کو وقت سے پہلے رقم وصول کرنے کے لئے کٹوتی منظور کرنی پڑتی ہے۔

ہنڈی کا طریقہ شرعی اصطلاح میں حوالہ کی تعریف میں آتا ہے، لیکن طریقہ مروجہ کو

شریعت کے مطابق کرنے کے لئے اس میں کچھ تغیر کرنا ہوگا۔ زید جب عمرو سے تین ماہ بعد ادائیگی کے وعدہ پر مال خریدتا ہے اور اس کو ایک دستاویز فراہم کرتا ہے، جس کو دکھا کر عمرو وقت سے پہلے بھی بینک سے رقم لے سکتا ہے اس صورت میں زید محیل، بینک محتال اور عمرو محتال علیہ قرار پایا۔ اس کے جواز کی اصل یہ حدیث "من احیل علی ملئی فلیتبع" (طبرانی) "جو شخص کسی مال دار پر اپنا قرض حوالہ کر دے اس کو مان لینا چاہیے" اب یہاں اس طرح اصلاح ہونی چاہیے کہ زید اس دستاویز پر کسی معین بینک کے نام پر یہ ہدایت کر دے کہ میں اپنا قرض تمہارے حوالے کرتا ہوں اور میری جگہ یہ قرض تم عمرو کو ادا کرو گے اور جب بینک نے اس دستاویز کو منظور کر لیا تو حوالہ مکمل ہو گیا۔

امام برہان الدین فرغانی متوفی ۵۹۳ھ فرماتے ہیں:

و تصح الحوالة برضا المحیل والمحتال و المحتال علیه۔	جب محیل، محتال اور محتال علیہ معاہدہ پر راضی ہو جائیں تو حوالہ صحیح ہو جائے گا۔

(ہدایہ ج ۳ ص ۱۲۹)

اب محتال علیہ مثلاً عمرو (قرض خواہ) کو اختیار ہے کہ وہ اپنی رقم میں سے جس قدر چاہے رقم ساقط کر دے اور محتال (بینک) سے وقت سے پہلے رقم وصول کرے، مثلاً اگر محتال علیہ نے تین ماہ بعد بینک سے ایک ہزار روپیہ وصول کرنا ہے۔ اب وہ چاہے تو تین ماہ بعد بینک سے پوری رقم وصول کر لے اور چاہے تو اس رقم میں سے پچاس روپیہ ساقط کر دے اور مقررہ میعاد سے پہلے رقم وصول کرے، کیونکہ وہ خود اپنا حق ساقط کر رہا ہے اور اس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

ضعوا و تعجلوا۔ (شرح السیر الکبیر للسرخسی ج ۳ ص ۲۲۵)

قرض خواہ قرض کی رقم کچھ کم کر دے اور مقروض سے جلد رقم وصول کر لے۔

اس حدیث شریف سے ہمارے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن کعب انه تقاضی ابن ابی حدرد دینا کان له علیه فی المسجد فارتفعت اصواتهما حتی سمعها رسول الله ﷺ و هو فی بیته فخرج الیهما حتی کشف سجف حجرته فنادی یا کعب قال لبیك یا رسول الله قال ضع من دینك هذا و اومأ الیه الشطر قال لقد فعلت یا رسول الله قال قم فاقضه۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۶۵)

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن ابی حدرد سے قرض لیا تھا، انہوں نے مسجد نبوی میں اپنے قرض کا تقاضا کیا حتی کہ حضور نے ان کی آوازوں کو اپنے حجرہ میں سن لیا۔ آپ نے حجرہ سے پردہ ہٹایا اور حضرت کعب کو آواز دی، انہوں نے عرض کیا: لبیک یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: اپنے قرض کو کچھ کم کرو اور اشارہ سے فرمایا کہ آدھا کم کر دو، انہوں نے آدھا کم کر دیا۔ پھر حضور ﷺ نے عبداللہ بن ابی حدرد سے فرمایا: اٹھو! اب ان کا قرض ادا کر دو۔

ان دو حدیثوں اور حوالہ کی فقہی صورت کی روشنی میں یہ امر واضح ہو گیا کہ ہنڈی بھنانے کے لئے قرض خواہ بینک سے قبل از وقت رقم وصول کرنے کے لئے اپنے قرض میں کٹوتی کر سکتا ہے۔

بیع الکالئی بالکالئی

بعض علماء کو یہ شبہ لاحق ہوتا ہے کہ ہنڈی بھنانے کا یہ طریقہ الکالئی بالکالئی کی زد میں آتا ہے۔ اس لئے ہم اس مقام میں بیع الکالئی بالکالئی کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ حدیث مذکور یہ ہے۔

حافظ ابوبکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی المتوفی ۲۱۱ھ اور حافظ ابوبکر احمد الحسین علی البیہقی المتوفی ۴۵۸ھ اپنی اپنی سند کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما قال نھی رسول اللہ ﷺ ان یباع کالئی

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے قرض کی بیع

بکالئی۔ (مصنف عبدالرزاق ج ۸ ص ۹۰، قرض کے عوض کرنے سے منع فرمادیا ہے۔
سنن الکبریٰ ج ۵ ص ۲۹۰)

ان محدثین کے علاوہ یہ حدیث مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف اسحٰق بن راہویہ، مصنف بزار، حاکم دارقطنی اور طبرانی نے بھی اپنی اپنی اسناد کے ساتھ بیان کی ہے اور ہر سند کے بعض راویوں پر جرح کی گئی ہے، تاہم امام ابن ہمام فرماتے ہیں:

والحديث لاتنزل عن الحسن بلاشك۔ یہ حدیث بہرحال حسن ہے۔

اور حدیث کا معنی بیان فرماتے ہیں:

قال ابوعبيدة هو النسيئة بالنسيئة۔ کالئی بالکالئی کا معنی قرض کی بیع قرض کے عوض ہے۔ (فتح القدیر ج ۵ ص ۲۸۸، طبع دوم)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ادھار کی بیع ادھار کے ساتھ کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ مثلاً زید نے عمرو سے ایک ہزار روپیہ قرض لیا۔ اب زید عمرو سے کہتا ہے کہ میں اس ایک ہزار کے عوض جو مجھ پر قرض ہے تم کو ایک تھان کپڑے کا ایک ماہ بعد ادا کر دوں گا تو یہ ادھار کی بیع ادھار کے عوض ہے اور بیع الکالئی بالکالئی ہے، لیکن ہنڈی (Bill of Exchange) بھنانا اس تعریف کی زد میں ہرگز نہیں آتا۔

نقد اور ادھار قیمتوں میں فرق

سود کے معاملہ میں ایک یہ سوال بھی زیر بحث لایا جاتا ہے کہ بیع میں نقد اور ادھار کی صورت میں علیحدہ علیحدہ قیمتیں مقرر کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس بیع کی مندرجہ ذیل صورتیں ہیں۔

(۱) زید کوئی چیز ادھار فروخت کرتا ہے اور سب کو معلوم ہے کہ وہ دوسرے نقد فروخت کرنے والوں کے مقابلہ میں گراں فروش ہے۔

(۲) زید علانیہ کہتا ہے کہ اس کے سامان کی نقد قیمت سو روپیہ اور ادھار ایک سو بیس روپیہ ہے۔

(۳) زید سامان قسطوں پر فروخت کرتا ہے اور ایسے سامان کو جس کی نقد قیمت عام طور پر سو

روپے ہے، دس روپیہ ماہانہ کی بارہ قسطوں میں فروخت کرتا ہے۔

ان صورتوں میں پہلی اور تیسری صورت جائز ہے اور دوسری صورت میں جس میں زید علانیہ کہتا ہے کہ اس چیز کی نقد قیمت سو روپیہ اور ادھار ایک سو بیس روپیہ ہے، خواہ وہ ادھار روپیہ بالاقساط وصول کیا جائے یا یک مشت، نقد اور ادھار قیمتوں میں فرق کرنے کی وجہ سے ناجائز ہے(1)۔

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ فِيْ بَيْعَةٍ۔
(امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ۱۹۷)

حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دو بیعوں کو ایک بیع میں کرنے سے منع فرمادیا ہے۔

امام ترمذی بیعتین فی بیعۃ کی ایک صورت بیان فرماتے ہیں:

وقد فسر بعض اهل العلم قالوا بيعتين فی بيعة ان يقول ابيعك هذا الثوب بنقد بعشرة و بنسيئة بعشرين
(امام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، جامع ترمذی ص ۱۹۷۔ ۱۹۸)

بعض اہل علم نے بیعتین فی بیعۃ کی تفسیر کی ہے کہ ایک شخص کہے کہ میں تمہیں یہ کپڑا نقد دس کا اور ادھار بیس کا بیچتا ہوں۔

شوکانی اس حدیث پر طویل بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فيها الدلالة على المنع من البيع اذا وقع على هذه الصورة و هی ان يقول نقدا بكذا و نسيئة بكذا الا اذا قال من اول الامر نسيئة بكذا فقط و كان اكثر من سعر يومه۔ (محمد بن علی شوکانی

اس حدیث میں اس بات پر دلالت ہے کہ جب بیع اس صورت پر واقع ہو کہ بائع کہے کہ یہ چیز نقد اتنے کی اور ادھار اتنے کی تو یہ بیع ناجائز ہے البتہ اگر وہ ابتداءً کہے کہ یہ چیز ادھار اتنے کی ہے، حالانکہ اس کی

1۔ نقد اور ادھار قیمتوں میں فرق کو مقالات کے پہلے ایڈیشن میں میں نے جائز لکھا تھا، لیکن بعد میں مجھ پر دلائل سے واضح ہوا کہ یہ ناجائز ہے۔ اس لئے میں نے یہ ترمیم کردی ہے۔ (غلام رسول سعیدی غفرلہ)

متوفی ۱۲۵۰ھ، نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۷۲)	قیمت اس دن کی قیمت سے بہت زیادہ لگائی ہو تو یہ جائز ہے۔

فتاوی عالمگیری میں بڑی صراحت کے ساتھ اس بیع کو ناجائز قرار دیا ہے۔

رجل باع على انه بالنقد كذا و بالنسيئة بكذا او على انه الى شهر بكذا والى شهرين بكذا لم يجز كذا فى الخلاصة۔	ایک شخص نے اس طور پر بیع کی کہ یہ چیز نقد اتنے کی ہے اور ادھار اتنے کی یا ایک ماہ کے ادھار پر اتنے کی ہے اور دو ماہ کے ادھار پر اتنے کی ہے تو یہ ناجائز ہے، اسی طرح خلاصہ میں ہے۔
(ملا نظام الدین، فتاوی عالمگیری ج ۳ ص ۱۳۶)	

مولانا امجد علی متوفی ۱۳۷۶ھ نے بھی عالمگیری کے حوالہ سے اس بیع کو ناجائز لکھا ہے۔ (فتاوی امجدیہ ج ۳ ص ۱۸۱، مکتبہ رضویہ، کراچی)

بعض عبارات اس کے خلاف کی موہم ہیں، یہاں ہم ان کا مطلب بیان کر دیتے ہیں۔

مثلاً امام ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ بیان فرماتے ہیں:

فان كون الثمن على تقدير النقد الفا و على تقدير النسيئة الفين ليس فى معنى الربا۔ (امام کمال الدین ابن ہمام متوفی ۸۶۱ھ، فتح القدیر ج ۶ ص ۸۱)	نقد کی صورت میں قیمت کا ہزار رہنا اور ادھار کی صورت میں دو ہزار سود کے معنی میں نہیں ہے۔

علامہ ابن ہمام نے اس عبارت میں یہ بتلایا ہے کہ یہ سود نہیں ہے، یہ نہیں کہا کہ بیع جائز ہے، اس کے عدم جواز کی وجہ بیعتین فی بیعتہ ہے، اسی طرح ملا علی قاری ہروی متوفی ۱۰۱۴ھ فرماتے ہیں:

فسروا البيعتين فى بيعة على وجهين احدهما ان يقول بعتك هذا الثوب بعشرة نقدا او بعشرين نسيئة الى شهر فهو فاسد عند اكثر اهل العلم لانه لا	بیعتین فی بیعتہ کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت یہ ہے کہ بائع یوں کہے کہ میں یہ کپڑا تم کو نقد دس روپیہ کا بیچتا ہوں یا ایک ماہ کے ادھار پر بیس روپیہ کا، تو اکثر اہل علم

يدرى ايهما جعل الثمن و ثانيهما ان يقول بعتك هذا العبد بعشرة دنانير على ان تبيعنى جاريتك بكذا فهذا باطل لانه بيع و شرط۔ (ملا علی قاری ہروی متوفی ۱۰۱۴ھ، مرقاۃ المفاتیح ج ۶ ص ۸۱)	کے نزدیک یہ بیع فاسد ہے کیونکہ اس صورت میں معین نہیں ہوا کہ اس نے کس قیمت کو ثمن قرار دیا ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کہے: میں تم کو یہ غلام دس روپیہ میں بیچتا ہوں کہ تم بھی اپنی کنیز مجھ کو اتنے میں بیچ دو اور یہ بیع بھی فاسد ہے کیونکہ یہ بیع اور شرط ہے۔

بیعتین فی بیعۃ کی یہاں دو صورتیں بیان کی ہیں، لیکن جس صورت کو عالمگیری نے ناجائز قرار دیا ہے اس سے یہاں تعرض نہیں کیا گیا۔

قوت خرید میں کمی بیشی اور حکومت کا فرض

ایک سوال یہ کہ افراط زر کی وجہ سے گرانی ہوتی ہے۔ یہ افراط بعض اوقات قومی مفاد کے حق میں پالیسی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بعض اوقات بیرونی اثرات کی وجہ سے اور بعض اوقات غلط پالیسی کی وجہ سے افراط زر میں لوگوں کی قوت خرید گھٹ جاتی ہے۔

مندرجہ بالا صورتوں میں کیا کسی صورت میں حکومت کے لئے یہ شرعی فرض ہے کہ وہ قوت خرید میں کمی واقع ہونے پر لوگوں کے نقصان کی تلافی کر دے؟ دوسرے الفاظ میں ان کے سکہ کی قدر کی ضامن ہو؟ یاد رہے کہ کبھی کبھی مندرجہ بالا عوامل کی بناء پر تفریط زر کی کیفیت بھی پیدا ہو سکتی ہے جس کا نتیجہ بالکل برعکس ہوتا ہے۔

قوت خرید میں کمی بیشی کے تعین کے لئے مختلف اشیاء کی قیمتوں کا نمائندہ اشاریہ استعمال کیا جا سکتا ہے، کیا اشاریے کو مستقبل کی ادائیگیوں کے معاہدے کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے؟ گویا اس طرح مستقبل کی ادائیگیوں کے لئے سکہ کی ثمنیت بعینہٖ نہیں رہے گی، بلکہ اضافی ہو جائے گی، جس کا انحصار سال بہ سال بدلتی ہوئی مجموعی قیمتوں کے اوسط پر ہوگا، اس کی مثال یہ ہے کہ زید نے آج سو روپیہ دیئے جس سے اس وقت چار من غلہ آتا تھا اور ایک سال بعد چار من غلہ کی قیمت ایک سو بیس روپیہ ہو تو اس کو بجائے سو روپیہ کے ایک سو بیس

روپیہ دیئے جائیں لیکن اگر یہ قیمت اسی روپیہ رہ جائے تو اس کو اسی روپیہ دیئے جائیں۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ملکی پالیسی اور بیرونی اثرات کی وجہ سے جو سکہ کی قیمت (Market Value) پر اثر پڑتا ہے، اس کی تلافی کی حکومت ذمہ دار نہیں، ورنہ اس کے رد عمل میں سینکڑوں الجھاوے لاحق ہوں گے اور ملک میں اقتصادی بحران پیدا ہو سکتا ہے۔

اشاریہ کے طریقہ کار کی جو مثال دی گئی ہے وہ شرعاً صحیح نہیں ہے۔ مثلاً زید نے تین سال کے لئے عمرو کو ایک سو روپیہ قرض دیا اور اس وقت اس سے چار من غلہ آتا ہے اور تین سال بعد افراط زر کی وجہ سے چار من غلہ کی قیمت ۱۲۰ روپیہ ہوا اور وہ عمرو سے سو کی بجائے ایک سو بیس روپیہ وصول کرے تو یہ صریحاً ربا النسیئہ ہے جو حرام قطعی ہے اور اگر تفریط زر (جو تقریباً محال عادی ہے) کی وجہ سے چار من غلہ اسی روپیہ کا رہ جائے تو قرض خواہ کو اس کی مرضی کے خلاف بیس روپیہ کم لینے پر شرعاً مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

ان حالات میں قرض دینے کی صورت میں زید کی رقم کا تحفظ کس طرح ہو؟ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ زید سو روپیہ کی چیز عمرو کو ایک سو بیس روپیہ میں تین سال کے ادھار پر فروخت کر دے، پھر بعد میں عمرو اسی چیز کو زید یا کسی اور شخص کے ہاتھ نقد سو روپیہ میں فروخت کر کے اپنا کام چلائے اور تین سال بعد زید کو ایک سو بیس روپیہ واپس کر دے۔ لیکن اس صورت میں اولاً تو یہ اشکال ہے کہ یہ بیع عینہ ہے اور سود خوری کا حیلہ ہے جس کی حدیث شریف میں شدید مذمت کی گئی ہے اور فقہاء نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے، دوسرا اشکال یہ ہے کہ اس صورت میں بھی یہ یقین کیسے کیا جا سکتا ہے کہ تین سال بعد وہ سو روپیہ ایک سو بیس کا ہوگا؟ وہ ایک سو پچاس کا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں ہے جس سے ہم افراط زر کی قدر کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ تیسرا اشکال یہ ہے کہ اس صورت میں افراط زر کی رعایت تو کسی قدر ملحوظ ہے لیکن تفریط زر کی کوئی رعایت نہیں کی گئی۔

ہمارے خیال میں اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی سے قرض مانگے تو قرض دینے والا ملکی کرنسی کے بجائے مستحکم کرنسی مثلاً ڈالر، پونڈ یا ریال کی صورت میں قرض دے اور بعد میں اتنی ہی کرنسی وصول کر لے۔

عہد رسالت اور دور صحابہ میں سونے چاندی کے سکہ ہوتے تھے۔ سونے کا سکہ دینار اور چاندی کا سکہ درہم کہلاتا تھا۔ بعد کے دور میں اشرفیوں اور ڈھلے ہوئے روپوں کا رواج ہوا، اشرفی سونے کی اور ڈھلا ہوا روپیہ چاندی کا ہوتا تھا اور جب قرض خواہ مقروض کو دینار درہم یا اشرفی اور روپیہ قرض دیتا تھا تو خواہ دس سال بعد بھی اس کو رقم واپس ملتی، اس کی رقم جوں کی توں رہتی اور اس رقم کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، اب جب سے نوٹوں کا رواج ہوا ہے تو افراط زر کی وجہ سے قرض خواہ کی دی ہوئی رقم کا تحفظ نہیں رہتا اور اگر ایک شخص آج کسی کو دس سال کے لئے ایک ہزار روپے قرض دیتا ہے تو افراط زر کی وجہ سے دس سال بعد وہ ہزار روپیہ صرف سو روپے کا رہ جاتا ہے، اس نقصان سے بچنے کے لئے لوگوں نے قرض پر دی ہوئی اپنی رقم پر سود لینا شروع کر دیا اور اس طرح سود کی وہ لعنت تمام کاروباری معاملات میں مکمل طور پر رچ گئی جس کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لئے اسلام نے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا کا فلک شگاف نعرہ لگایا تھا۔ سود کی اس لعنت سے چھٹکارا پانے کے لئے بہترین صورت یہی ہے کہ قرض خواہ کو قرض دیتے وقت ڈالر، پونڈ یا ریال کی شکل میں قرض دے چونکہ یہ مستحکم کرنسی ہیں۔ اور قرض دینے والا اگر دس سال بعد بھی اتنے ہی ڈالر، پونڈ یا ریال کی شکل میں اپنا قرض وصول کرے تو اسے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

قرض اور شرح مبادلہ کی تبدیلی

ایک سوال یہ ہے کہ ہمارے کاروباری اور صنعت کار افراد بعض قرض لیتے ہیں جن کا مصرف غیر ملکی مصنوعات (مشینیں وغیرہ) کی درآمد ہوتا ہے۔ یہ قرضے ان حضرات کو پاکستانی سکے کی شکل میں دیئے جاتے ہیں اور اسی شکل میں ان کی ادائیگی کی جاتی ہے۔ لیکن قرض کی اس مقدار کا معیار پاکستانی سکہ نہیں بلکہ غیر ملکی سکہ (ڈالر) ہوتا ہے، جس سے پاکستان منسلک ہے۔ اس معیار پر فریقین پہلے سے متفق ہوتے ہیں۔ لیکن اس طرح واجب الادا رقم غیر یقینی ہو جاتی ہے، کیونکہ سکہ کی اضافی قیمت غیر یقینی ہے۔ مثال کے طور پر زید نے پانچ سال قبل دس لاکھ روپے قرض لے کر سامان منگوایا تھا جس کی قیمت اس وقت دو لاکھ ڈالر تھی، کیونکہ ایک ڈالر پانچ روپے کے مساوی تھا۔ لیکن بعد میں پاکستانی سکے کی

قیمت گرادی گئی، نتیجتاً دولاکھ ڈالر کی قیمت بیس لاکھ روپیہ ہوگئی، اس طرح دس لاکھ روپیہ کا مقروض خود بخود بیس لاکھ روپے کا مقروض بن گیا۔ اسی طرح آگے چل کر اگر ایک ڈالر تین روپیہ کے مساوی ہو جائے، اس صورت میں دس لاکھ کا مقروض صرف چھ لاکھ کا دین دار رہ جاتا ہے۔ شرح میں تبدیلی اور اس کے لحاظ سے واجب الادا رقم کا فریقین کو پہلے سے علم نہیں ہوتا، البتہ دونوں اس نوعیت کے سودے پر متفق ہوتے ہیں جو بظاہر غرر ہے، لیکن جس کے بغیر پاکستان جیسے ملکوں کو گزارا کرنا انتہائی دشوار ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں جو قرض کی نوعیت بیان کی گئی ہے اس میں غرر ہے اور افراط زر کی صورت میں ربا النسیئہ بھی ہے اور یہ دونوں شرعاً ناجائز ہیں۔ اس مشکل کا صحیح حل یہی ہے کہ جب کہ ہمارے ملک میں بینکوں کے ذریعہ روپے ڈالر سے اور ڈالر روپوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں، تو مثلاً جو کاروباری یا صنعتی کمپنی بینک سے پانچ سال کے لئے دس لاکھ روپیہ قرض لینا چاہتی ہے تو بینک اس کو دس لاکھ روپیہ قرض نہ دے، بلکہ اس کے بجائے دولاکھ ڈالر قرض دے۔ اب پانچ سال بعد حکومت کے کرنسی کی قیمت گرادینے سے جس سے ڈالر کی قیمت بڑھ جائے یا حکومت کرنسی کی قیمت بڑھادے جس سے ڈالر کی قیمت کم ہو جائے، ہر صورت میں اس صنعتی کاروباری کمپنی نے پانچ سال بعد بینک کو دولاکھ ڈالر ادا کرنے ہیں، خواہ ان کی ملکی قیمت بیس لاکھ ہو یا چھ لاکھ، بینک نے جو کچھ صنعتی کمپنی کو دیا تھا، پانچ سال بعد بعینہٖ وہی وصول کر لیا، اس صورت میں نہ غرر لازم آئے گا نہ ربا النسیئہ۔

بینک کے قرضوں پر ٹینڈر کی سکیم

ایک سوال یہ کیا جاتا ہے کہ بینک لمبے عرصے کے لئے پیداواری قرضوں پر مقررہ شرح سے سود لینے کی بجائے اپنے قرضوں کا نیلام کیا کریں، اس کی مثال یہ ہوگی کہ بینک الف کے پاس دس کروڑ روپیہ لمبی مدت کے لئے قرض دینے کو دستیاب ہے، بینک مدت اور رقم کے لحاظ سے اس رقم کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے، جیسے:

پچاس لاکھ روپیہ تین سال کے لئے۔

پچاس لاکھ روپیہ سات سال کے لئے۔

ایک کروڑ روپیہ پانچ سال کے لئے۔

پچیس پچیس لاکھ کے آٹھ اجزاء دس سال کے لئے۔

دو کروڑ روپیہ چار سال کے لئے وغیرہ وغیرہ۔

بینک ٹھیکہ کا تخمینہ (Tender) طلب کرتا ہے کہ جو شخص مقررہ رقم پر مقررہ مدت گزرنے کے بعد اور سرمائے کا زیادہ سے زیادہ فیصد دینے کی پیش کش کرے گا تو اسے یہ رقم دے دی جائے گی، اس قسم کے معاملے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تجویز (Scheme) شرعی لحاظ سے صاف ربا النسیئہ کی تعریف میں آتی ہے جو حرام قطعی ہے، اس کا حل ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ بینک دس کروڑ روپیہ کی رقم قرض پر سود زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لئے ٹینڈر طلب کرنے کی بجائے کوئی صنعت (Industry) قائم کرے، مختلف صنعتی کمپنیوں (Industrial Company) کے حصص (Shares) خریدے اور دوسرے تمام جائز نفع آور ذرائع میں سرمایہ لگائے۔

غیر نفع آور سکیموں کے لئے قرض دینا

ایک سوال یہ ہے کہ بینکوں سے سود ختم کر کے نفع اور نقصان کی بناء پر چلانا اس حالت میں قابل عمل ہے جب اس سے رقم لینے والا اسے کاروبار میں لگاتا ہو یا نفع اور نقصان کی تقسیم کا عملی امکان موجود ہو، وہ قرضے جو صرفی ضرورت کے لئے دیئے جائیں یا غریب اور کم سرمایہ لوگوں کی کاروباری یا زرعی ضرورت کے لئے دیئے جائیں ان پر نفع نقصان کی شرط تو ممکن نہیں ہے یا نا مناسب ہے۔ اسی طرح بعض اوقات حکومت لمبے عرصے کے لئے غیر نفع آور سکیموں پر سرمایہ لگانے کے لئے بینکوں سے قرض لیتی ہے۔ یہ قرض عارضی بھی ہو سکتے ہیں اور طویل المیعاد بھی، ایسی صورت میں بینک کی رقم کا ایک حصہ نفع سے محروم ہو جائے گا جو بجائے خود خسارہ کا سودا ہے، نیز لمبی مدت کے قرضوں میں سود نہ لینے کی تقدیر پر افراط زر کی صورت میں بینک کی اصل رقم محفوظ نہ رہ سکے گی۔ اس مشکل کا شرعی حل کیا ہو سکتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک بات تو یہ کہی جا سکتی ہے کہ عارضی قرضے بینک ان قرضوں سے دیتا ہے جو کرنٹ اکاؤنٹ کے طور پر بچت کی رقمیں عارضی طور پر بینک میں رکھوائی جاتی ہیں۔ کیونکہ ان رقموں پر بینک رقم جمع کرانے والوں کو نہ سود ادا کرے گا اور نہ ہی ان عارضی قرضوں پر سود وصول کرے گا۔ البتہ حساب و کتاب پر جو بینک کا خرچ آئے گا اس کا حق محنت بطور معاوضہ کے وہ فریقین سے وصول کر سکتا ہے۔

طویل المیعاد قرضوں میں سود نہ لینے کی شکل میں روز افزوں افراط زر کی وجہ سے یقیناً بینک کی اصل رقم محفوظ نہ رہ سکے گی۔ اس کا صحیح حل یہی ہے کہ بینک قرض نوٹوں کی شکل میں دینے کی بجائے سونے یا ڈالر کی شکل میں دے، اس صورت میں جس قدر مدت کے لئے بھی قرض لیا گیا بینک کو اپنی اصل رقم واپس مل جائے گی اور اس کو کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا۔ البتہ یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ بینک نے اتنی مدت کے لئے اپنی رقم قرض دی اور اس کو کوئی فائدہ نہ ہوا، اگر وہ اس رقم سے کوئی کاروبار کرتا تو یقیناً اس کو نفع ہوتا۔ اس کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کے قرض حکومت کو بیت المال (State Bank) سے لینے چاہئیں اور اگر بالفرض کسی اور بینک سے بھی لئے گئے تو ظاہر ہے اس قسم کے قرض حکومت قوم اور ملت کے اجتماعی مفاد کے لئے حاصل کرے گی اور جس طرح اجتماعی مفاد کی خاطر ہر کاروباری ادارہ حکومت کو مختلف قسم کے ٹیکس ادا کر کے ایثار کرتا ہے، بلکہ یہ ایثار ہر شخص کو انفرادی حیثیت سے بھی برداشت کرنا پڑتا ہے، کیونکہ بعض ٹیکس اشیاء صرف کی قیمتوں میں شامل کر دیئے جاتے ہیں، اس طرح ہر شخص قوم اور ملت کے اجتماعی مفاد کی خاطر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ایثار کرتا ہے تو بینک کو اگر کچھ خرچ کئے بغیر ملک اور قوم کے اجتماعی مفاد کی خاطر کوئی ایثار کرنا پڑے تو اس کو اس خدمت میں ضرور شریک ہو کر اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔

طویل المیعاد قرضے اگر کاروباری ادارے سے حاصل کریں تو ان کو یہ رقم بطور قرض کے ہرگز نہیں دینا چاہیے، بلکہ شرکت اور مضاربت کے اصول پر باقاعدہ کاروبار میں شریک ہو کر رقم مہیا کرنی چاہیے۔

کاشت کار حضرات بعض اوقات اپنی زرعی ضرورتوں کے لئے عارضی طور پر قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں، اول تو ان کو بھی شرکت اور مضاربت کے اصول پر رقم مہیا کی جا سکتی ہے اور بینک ان کے زرعی کاروبار میں رب المال یا شریک کار کی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔

اس کی ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک کاشت کار یا چھوٹے پیمانہ پر کاروبار کرنے والا بینک سے ایک سال کے لئے دس ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تو بینک اس کو ہدایت کرے کہ وہ بارہ ہزار روپیہ بینک سے قرض لے اور اس میں سے دو ہزار بینک میں پانچ سال کے لئے اپنے نام سے جمع کرا دے، ایک سال بعد بینک کا دس ہزار روپیہ واپس کر دے اور پانچ سال بعد بینک سے اپنے دو ہزار روپے واپس لے لے۔ اس طرح باہمی معاونت کے طور پر اگر بینک اس کو اپنے یک مشت دس ہزار روپیہ سے ایک سال کے لئے کاروباری فائدہ اٹھانے کا موقع دیتا ہے تو وہ بھی اپنے دو ہزار روپیہ کی رقم سے بینک کو پانچ سال تک کاروباری نفع اٹھانے کا موقع دے رہا ہے۔ اس طرح بغیر سود کے لین دین کے دونوں فریق ایک دوسرے کے برابر کی سطح پر تعاون کر سکیں گے۔

قومی ضروریات کے لئے حکومت کے ملکی قرضے

جس وقت ہم ملک میں نظام مصطفیٰ رائج کریں گے سٹیٹ بینک (State Bank) کی حیثیت بیت المال کی ہوگی اور حکومت کے مقرر کردہ کارندے ہر صاحب نصاب شخص سے پوری جانچ پڑتال کے بعد زکوٰۃ وصول کریں گے، جس کو بیت المال میں جمع کرایا جائے گا، ملک کی تمام بارانی زرعی پیداوار کا دسواں اور غیر بارانی زرعی پیدوار کا بیسواں حصہ بیت المال میں جمع کرایا جائے گا۔ اس صورت میں اول تو بیت المال اس قدر مالا مال ہوگا کہ حکومت کو اپنی سکیم (Scheme) کو پورا کرنے کے لئے انشاء اللہ قرض لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اگر ضرورت پڑی بھی تو دوسرے بینک اور بڑے بڑے سرمایہ دار ایثار اور قربانی کی اسلامی اسپرٹ سے دل کھول کر حکومت کو ان شاء اللہ بلا سود قرض ادا کریں گے، جس کی کچھ وضاحت اس سے پہلے پیراگراف میں کی جا چکی ہے۔

قومی ضرورت کے لئے بیرونی قرضے

حکومت کو بعض مرتبہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے صنعتی منصوبہ (Industrial Project) یا زرعی منصوبہ (Agricultural Plan) اور دفاعی منصوبہ (Defence Scheme) کے لئے بڑے پیمانے پر قرض کی ضرورت ہوتی ہے، ان صورتوں میں بیرونی ملکوں سے قرض حاصل کیا جاتا ہے اور وہ بلاسود قرض نہیں دیتے۔ ہمارے خیال میں یہ بھی کوئی ایسا لاینحل مسئلہ نہیں ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ پاکستان کے غیر مسلم دوست ممالک نے پاکستان کو بلاسود قرض دیا ہے، اس لئے قومی ترقی کے منصوبوں کو مکمل کرنے کے لئے ان ممالک سے اور بالخصوص مسلم ممالک سے قرض بلاسود حاصل کیا جاسکتا ہے اور اگر بالفرض پاکستان کو غیر ممالک سے بلاسود قرض حاصل نہ ہو تو حکومت نے مشینری اور متعلقہ سامان، دفاعی ہتھیار وغیرہ جو چیزیں خریدنی ہیں بجائے ان کے کہ ان کو سودی قرض پر خریدے انہیں چیزوں کو ان ممالک سے زیادہ قیمت دے کر خرید لیا جائے اور انہیں بتادیا جائے کہ ہمارا مذہب سود کی اجازت نہیں دیتا، ہم تم کو سود تو نہیں دے سکتے البتہ ان کی قیمت زیادہ ادا کر سکتے ہیں۔ بجائے سود کے تم مہنگے داموں پر ہمیں یہ چیزیں فروخت کر دو، سود لینے سے جو تمہارا منشاء زیادہ پیسے وصول کرنا تھا وہ بھی پورا ہو جائے گا اور ہم سود کی لعنت سے بھی بچ جائیں گے۔

اگر ہم تہہ دل سے یہ تہیہ کرلیں کہ ہم سود ترک کرنا چاہتے ہیں تو انفرادی اور اجتماعی مرحلہ پر جو مشکل بھی پیش آئے گی، اللہ تعالیٰ کی نصرت خود بخود اس کا حل نکالتی رہے گی، کیونکہ یہی قانون قدرت ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۶۹) ”جو لوگ ہماری طرف آنے کی کوشش کرتے ہیں ہم انہیں اپنا راستہ خود دکھا دیتے ہیں“۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ہم نے خلوص اور للّٰہیت سے اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا چاہا نصرت خداوندی نے ہمیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ آیئے! ہم انفرادی اور قومی ہر سطح پر سود کی اس دلدل سے نکلنے کے لئے قدم اٹھائیں۔ پھر ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی نصرت اور رحمت کی موسلا دھار بارش ہم پر برسے گی اور دنیا حیرت سے انگشت بدنداں ہوگی۔

آیئے! قدم بڑھائیے تو سہی! اس وقت پاکستان دو کھرب روپے کا مقروض ہے اور قومی آمدنی کا پچیس فی صد سود کی ادائیگی پر خرچ ہوتا ہے، جب کہ اصل قرض جوں کا توں ہے۔ (جنگ کراچی۔ ۱۲ مارچ ۱۹۸۰ء) کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہو جاتا کہ سود کی لعنت کی وجہ سے کس تیزی سے ہم اقتصادی تباہی کی طرف جا رہے ہیں؟



اسلام اور تسخیر کائنات

انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی خلافت عطا فرمائی، اس کو اپنا نائب بنایا اور وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ سے اس کی فضیلت کو ظاہر فرمایا اور منصب خلافت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کا تابع ہو کر تمام روئے زمین پر حکومت کرے اور تمام کائنات کو اپنا مسخر کر لے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو روح اور مادے سے پیدا کیا، اس لئے تسخیر کائنات بھی ان دونوں کی طرف راجع ہے، یعنی مادی طور پر اشیاء کے عادی اور ظاہری اسباب کو تلاش کر کے کائنات کو مسخر کیا جائے۔ یا روح کی قوتوں کو اجاگر کر کے بغیر ظاہری اور عادی اسباب کے اس عالم آب و گل کے حقائق کو مسخر کیا جائے۔ مثلاً بینائی کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر کر دیا، خواہ وہ اسے مادی طریقے سے حاصل کرے یا روحانی طریقوں سے، موجودہ سائنس نے بینائی کے ظاہری اور مادی اسباب تلاش کر کے اندھوں کو بصارت بخش دی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بغیر ظاہری اور مادی اسباب کے اندھوں کو بینا کر دیا "وابری الاکمہ" (آل عمران) اسی طرح لوہے کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر کر دیا۔ خواہ مادی طریقوں سے اس کو اپنے کام میں لائے یا روحانی طریقوں سے۔ چنانچہ عام لوگ آگ کے ذریعے لوہے کو پگھلا کر اپنے کام میں لاتے ہیں اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں بغیر آگ کے لوہا نرم ہو جاتا تھا: وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ (الانبیاء: ۸۰) وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ ۝ (سباء) اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر پانی رکھا ہے اور اس پانی کو حاصل کرنے کے لئے انسان کی روح اور اس کے بدن کو طریقے تعلیم فرما دیئے۔ چنانچہ عام انسان مادی اوزاروں کے ذریعے زمین کھود کر اس سے پانی حاصل کر لیتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بغیر اسباب عادیہ کے پتھر پر عصا مار کر اس سے پانی حاصل کر لیا۔ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَیْنًا (البقرہ: ۶۰)

روحانی تسخیر کی مادی تسخیر پر فوقیت

روحانی طریقہ سے انسان نے اس کائنات کو اس قدر کثرت سے فتح کیا کہ مادی اسباب اس کی تسخیر کے سامنے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں اور آج تک عقل انسانی ان حقائق کے مادی اسباب کا سراغ پانے سے قاصر ہے جن پر روحانیت نے فتح پائی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لاٹھی میں اژدھے کی حیات کو نافذ کرنا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا پرندوں کی زبان سمجھنا اور ان سے گفتگو کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قدیم و جدید مردوں میں حیات کو جاری کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گوشت کے ٹکڑوں اور لکڑی کے ستونوں، پتھروں اور درختوں میں حیات نافذ کر کے ان سے گفتگو فرمانا اور چاند سورج پر تصرف فرمانا۔ اسی طرح حضرت عمر کا دریائے نیل کو احکام جاری کرنا، شیخ عبدالقادر جیلانی کا زمانہ کو تابع کر لینا، یہ امور روحانی تسخیر کے وہ کرشمہ ہیں جنہوں نے مادی اسباب کی پہنچ کو حیرت زدہ کر دیا۔

چاند کی مادی تسخیر ممکن ہے

گزشتہ سطور میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ عظیم الشان کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے بس اور اختیار میں کر دی ہے: وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (حاشیہ: ۱۳) خواہ وہ اس کو مادی قوتوں سے مسخر کرے یا روحانی قوتوں سے اور زمین سے چاند کے ماوراء بلکہ آسمانوں کے پار جانا بھی روحانی قوتوں سے ثابت ہو چکا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ادریس علیہ السلام ہنوز آسمانوں میں زندہ ہیں جو چاند سے ہزاروں سال مسافت کے بعد پر موجود ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر معراج پر آسمانوں سے گزر کر لامکاں کی بھی سیر کر کے واپس آ گئے۔ اس کے مقابلہ میں چاند جو ایک حقیر مسافت پر واقع ہے اس پر مادی اسباب سے جا کر واپس آ جانا کسی طرح حیرت و استبعاد کا موجب نہیں ہے، بلکہ قرآن کریم میں اس پر تائید موجود ہے، دیکھئے مولا عزوجل فرماتا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (حٰم السجدہ: ۵۳) "ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو انہیں آفاق اور ان کے نفسوں میں دکھائیں گے"۔

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

ان المراد بآیات الآفاق الآیات الفلکیة والکواکبیة و آیات اللیل والنہار و آیات الاضواء والاظلال والظلمات و آیات عالم العناصر الاربعة فان قیل ہذا الوجہ ضعیف لان قولہ تعالٰی سنریہم یقتضی انہ تعالٰی ما اطلعہم علی تلک الآیات الی الآن و سیطلعہم علیہا بعد ذالک والآیات الموجودة فی العالم الاعلی والاسفل قد کان اطلعہم علیہا قبل ذالک قلنا ان القوم وان کانوا قد رأوا ہذہ الاشیاء الا ان العجائب التی اودعہا اللہ تعالٰی فی ہذہ الاشیاء مما لانہایة لہا فہو تعالٰی یطلعہم علی تلک العجائب زمانا فزمانا۔ (تفسیر کبیر ج ۷ ص ۲٦۷ ملخصا)

اس آیت کریمہ میں آیات آفاق سے مراد آیات افلاک، کواکب، لیل ونہار، روشنی، سایہ، اندھیرے اور عناصر اربعہ وغیرہ ہیں۔ اگر یہ شبہ ہو کہ سَنُرِیْہِمْ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالٰی نے ان حقائق کو ہمیں ابھی تک نہیں دکھایا اور آئندہ دکھائے گا۔ حالانکہ اللہ تعالٰی ہم کو ان تمام حقائق پر پہلے ہی مطلع کر چکا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ اللہ تعالٰی ہم کو یہ حقائق پہلے بھی دکھا چکا ہے لیکن ان حقائق کے اسرار غیر متناہی ہیں جو اللہ تعالٰی ہم کو وقتاً فوقتاً دکھاتا رہے گا۔

امام فخر الدین رازی نے اس آیت کریمہ کی جو تفسیر کی ہے اس کی روشنی میں یہ امر بالکل واضح ہو گیا کہ افلاک اور کواکب کے اسرار اور عجائب قیامت تک لوگوں پر زمانا فزمانا منعکس ہوتے رہیں گے اور اسی لحاظ سے چاند کی حالیہ تسخیر قرآن کریم کی اس آیت کی زبردست تصدیق کرتی ہے، کیونکہ چاند کے بارے میں جواب تجربات و مشاہدات سے انکشافات ہوئے ہیں اور اس کے اسرار پر اطلاع ہوئی ہے، وہ پہلے حاصل نہ تھی اور آئندہ جیسے جیسے چاند کی طرف سفر کی وجہ سے عجائب وغرائب کی اطلاع ہوگی، وہ اس آیت کی مزید تصدیق کا سبب قرار پائے گی۔

مندرجہ بالا حقائق کے پیش نظر مادی اسباب سے چاند تک پہنچ کر واپس آ جانا کوئی

اچنبھے کی بات نہیں ہے جس کو امکان اور استحالہ کے درمیان گردش دی جائے۔ لیکن چونکہ یہ واقعہ آج کل بحث ونظر کا موضوع بن گیا ہے اور بعض لوگوں نے اس وقوعہ کو قرآن وحدیث کی نصوص کے خلاف سمجھ کر اس واقعہ کا انکار کر دیا ہے اور بعض لوگوں نے تسخیر قمر کو ماننے والوں پر تجدید ایمانی وتجدید نکاح کا فتویٰ بھی لگا دیا۔ اس لئے ہم نے ضرورت سمجھی کہ اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی جائے۔

منکرین تسخیر کائنات کے شبہات

منکرین کے شبہات کا خلاصہ یہ ہے کہ چاند پہلے آسمان پر ہے اور آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ لہٰذا پانچ سو سال سے پہلے چاند پہ پہنچنا ممکن نہیں۔ خصوصاً کفار کے حق میں، کیونکہ ان کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں، جو کبھی نہیں کھولے جائیں گے اور اس دلیل کی اصل بناء چاند کا آسمان میں مرکوز ہونا ہے، جس پر منکرین بعض مفسرین کے اقوال اور قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کرتے ہیں۔ جنہیں ہم ان شاء اللہ العزیز اپنے موقع پر پیش کر کے ان پر تفصیلی کلام پیش کریں گے۔

چاند خلا میں ہے

چاند آسمان میں مرکوز نہیں ہے اور قرآن وحدیث میں ایسی کوئی نص قطعی نہیں جس کا مفاد یہ ہو کہ چاند پہلے آسمان پر مرکوز ہے۔ اس کے برخلاف احادیث سے یہ ثابت ہے کہ تمام سیارے زمین آسمان کے درمیان خلاء میں معلق ہیں، ملاحظہ فرمائیے، امام سیوطی فرماتے ہیں:

اخرج ابن جریر و ابن ابی حاتم عن ابن زید رضی اللہ عنہ فی قولہ کل فی فلك الفلك الذی بین السماء والارض من مجاری النجوم والشمس والقمر و فی قولہ یسبحون قال یجرون۔

(تفسیر درمنثور ج ۴ ص ۳۱۸)

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، انہوں نے کہا ''کل فی فلك'' کی تفسیر میں فرمایا کہ فلک آسمان اور زمین کے درمیان مدار میں ہے جس میں شمس وقمر اور دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں۔

و اخرج ابن ابی حاتم و ابو الشیخ عن حسان بن عطیة قال الشمس و القمر والنجوم مسخرة فی فلک بین السماء والارض۔ (تفسیر درمنثور ج ۳ ص ۳۱۸)

ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حسان بن عطیہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: شمس، قمر اور سیارگان آسمان اور زمین کے درمیان اپنے محور میں مسخر ہیں۔

قال عبداللہ ابن عمران الشمس والقمر وجہ ھما الی السموات وضوٗ الشمس والقمر فیھن جمیعا واقفیتھما الی الارض ویروی ھذا ابن عباس ایضاً۔ (خازن ج ۴ ص ۳۰۳، جمل ج ۴ ص ۴۱۲، مدارک علی ہامش الخازن ج ۴ ص ۳۰۳، تفسیر درمنثور ج ۶ ص ۲۶۸)

عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورج اور چاند کا چہرہ آسمانوں کی طرف ہے اور ان کی روشنی تمام آسمان میں پہنچ رہی ہے اور ان کی پشت زمین کی طرف ہے اور حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر، ابن عباس اور ابن زید کی یہ موقوف احادیث حکماً مرفوع ہیں اور یہ اس مقصد پر نص ناطق ہیں کہ چاند آسمان میں مرکوز نہیں بلکہ زمین و آسمان کے درمیان معلق ہے۔ احادیث کے بعد اب ہم ناظرین کی خدمت میں اس موضوع پر اقوال مفسرین پیش کرتے ہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

علامہ نسفی حنفی فرماتے ہیں:

والجمھور علی ان الفلک موج مکفوف تحت السماء تجری فیہ الشمس والقمر والنجوم۔ (مدارک علی ہامش الخازن ج ۳ ص ۲۵۹)

جمہور مسلمین کا مسلک یہ ہے کہ فلک آسمانوں کے نیچے ایک خلاء ہے جس میں سورج چاند اور دیگر ستارے گردش کر رہے ہیں۔

علامہ خازن اور امام رازی فرماتے ہیں:

الفلک موج مکفوف دون السماء تجری فیہ الشمس والقمر والنجوم۔ (لباب التاویل ج ۳ ص ۲۵۹، تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۰۳)

فلک آسمانوں کے نیچے خلاء کا نام ہے جس میں سورج، چاند اور دیگر ستارے گردش کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھی مفسرین کرام کی نصوص موجود ہیں۔ جن کو ہم نے طوالت کی وجہ سے ترک کر دیا۔ جبکہ دلائل قاہرہ سے ثابت ہو گیا چاند آسمان کے نیچے خلاء میں معلق ہے تو اس کے بعد اب ہم منکرین کے شبہات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ فنقول وباللہ التوفیق

اقوال مفسرین کی توجیہ

ہم گزشتہ سطور میں واضح کر چکے ہیں کہ جمہور مسلمین کا مسلک یہ ہے کہ چاند خلاء میں معلق ہے، البتہ بعض مفسرین نے چاند کے آسمان دنیا میں مرکوز ہونے کا قول کیا ہے، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ ان بعض مفسرین کے اقوال کا ماخذ کیا ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان اقوال کی بنیاد ارباب ہیئت کے مذہب پر ہے اور علم ہیئت کی کتابوں میں یہ تصریح موجود ہے کہ چاند پہلے آسمان میں اور سورج چوتھے آسمان میں مرکوز ہے اور بعض مفسرین نے تفسیر میں ان اقوال کو درج کر دیا اور یہ بیان کر دیا کہ اگر واقع میں تحقیق بھی یہی ہو تو یہ قرآن کریم کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کی کسی نص صریح نے کواکب کے مقام سے تعرض نہیں کیا۔ لہٰذا آسمانوں میں کواکب کا ترتیب وار مرکوز ہونا اصحاب ہیئت کے اقوال کے سوا کچھ نہیں، ملاحظہ فرمائیے۔

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

اعلم ان القرآن ههنا قد دل علی وجود سبع السموت وقال اصحاب الهیئة اقربها الینا کرة القمر وفوقها کرة عطارد ثم کرة الزهرة ثم کرة الشمس ثم کرة المریخ ثم کرة المشتری ثم کرة الزحل۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۴۵۔ ج ۲ ص ۵۶)

اے مخاطب! جان لے کہ قرآن سات آسمانوں پر دلالت کرتا ہے اور اصحاب ہیئت نے کہا: سب سے قریب وہ آسمان ہے جس میں چاند ہے، پھر وہ جس میں عطارد ہے، پھر وہ جس میں زہرہ ہے، پھر وہ جس میں شمس ہے، پھر وہ جس میں مریخ ہے، پھر وہ جس میں مشتری ہے، پھر وہ جس میں زحل ہے۔

بہر حال امام رازی کی اس تصریح سے یہ امر واضح ہو گیا کہ جن مفسرین نے چاند اور

دوسرے سیاروں کے مرکوز فی السماء کا قول کیا ہے وہ ان کا مذہب نہیں بلکہ علماء ہیئت کا مذہب ہے اور علماء ہیئت خود اس پر متفق نہیں۔ بعض نے کہا کہ اس پر اتفاق ہے کہ قمر سماء دنیا میں ہے اور سورج کے چوتھے آسمان میں ہونے میں اختلاف ہے اور بعض نے کہا کہ سورج پر اتفاق ہے کہ وہ چوتھے آسمان میں ہے۔

چاند کے خلاء میں ہونے پر ایک اور دلیل

امام رازی نے فرمایا کہ قرآن کریم سے سات آسمان ثابت ہیں اور اصحاب ہیئت نے نو آسمان ثابت کئے اور آٹھویں آسمان کے وجود پر یہ دلیل قائم کی کہ کواکب سبع سیارہ کے علاوہ ثوابت کے لئے بھی حرکت بطیہ ثابت ہے اور جس طرح سیارات سبعہ کی حرکت آسمان کی حرکت کے سبب سے ہے بایں طور پر ہر سیارہ اپنے آسمان میں مرکوز ہے اور آسمان کی حرکت سے وہ سیارہ حرکت کرتا ہے تو لامحالہ ان ثوابت کی حرکت کے لئے بھی ایک آسمان حامل کو ماننا پڑے گا جس میں مرکوز ہو کر یہ حرکت کر رہے ہیں۔ پس سات آسمانوں کے علاوہ آٹھویں آسمان کا وجود بھی ثابت ہو گیا، امام رازی اس دلیل کو رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

و هذه الدلالة ضعيفة من وجوه اولها لم لا يجوزان يقال الكواكب تتحرك بانفسها من غير ان تكون مركوزة فى جسم اخر وهذا الاحتمال لا تفسد۔ (تفسیر کبیر ج ا ص ۲۴۶)	فلاسفہ کی یہ دلیل بہت کمزور ہے کیونکہ یہ بھی جائز ہے کہ کواکب بنفسہا حرکت کریں، بغیر اس امر کے کہ وہ کسی اور جسم میں مرکوز ہوں اور یہ احتمال فاسد نہیں ہو سکتا۔

اور میں تائید ربانی سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ جب ثوابت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ خلاء میں بدون مرکوز فی السماء کے حرکت کریں تو کواکب سبعہ سیارہ کے لئے کیوں جائز نہیں کہ وہ بھی بغیر مرکوز فی السماء کے بنفسہا حرکت کریں؟ پس جس دلیل سے ثوابت کے لئے آسمان کے بغیر حرکت کرنا ثابت ہوگا، اسی دلیل سے کواکب سبعہ کا بھی بغیر مرکوز فی السماء کے خلاء میں حرکت کرنا ثابت ہو گیا اور اصحاب ہیئت کا سیاروں کے لئے مرکوز فی السماء کا قول بالکلیہ مردود ہو گیا۔ فللہ الحمد علی ذالک۔

آیات قرآنی کی توضیح

آیئے! اس کے بعد قرآن کریم کی ان آیات کی طرف رجوع کریں جن سے منکرین نے یہ سمجھا ہے کہ چاند آسمان میں مرکوز ہے۔ دیکھئے قرآن مجید میں ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿۶۱﴾ (الفرقان)	"بڑا برکت والا ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور ان میں چراغ (سورج) رکھا اور چمکتا چاند"۔
اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ﴿۱۵﴾ وَّ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ﴿۱۶﴾ (نوح)	"کیا تم نہیں دیکھتے اللہ نے کیونکر سات آسمان بنائے ایک پر ایک اور ان میں چاند کو روشن کیا اور سورج کو چراغ بنایا"۔

منکرین نے ان آیات کے تحت کہا: (قاعدہ) "معلوم ہوا کہ چاند آسمان میں ہے"

اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ یہ آیتیں ہرگز اس مفہوم پر نص نہیں ہیں کہ چاند آسمان میں ہو کیونکہ جائز ہے کہ یہاں پر سماء سے مراد مطلقاً بلندی ہو نہ کہ معہود اور متعارف سماء (یعنی آسمان) جس طرح اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً "اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا" اور ایک جگہ فرمایا: "و رزقکم فی السماء" اور اس کے تحت مفسرین کرام نے فرمایا کہ سماء سے مراد آسمان نہیں ہے، کیونکہ لغت عرب میں ہر بلند چیز کو سماء کہتے ہیں (کل ما علاك فهو سماء) پس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بلندی سے پانی اتارا۔

دیکھئے امام رازی فرماتے ہیں:

ان السماء انما سميت سماء لسموها فكل ما سماك فهو سماء فاذا نزل من السحاب فقل نزل من السماء۔ (تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۱۸)	سماء سمو سے مشتق ہے اور سمو کے معنی بلندی ہیں، آسمان کو سماء اس کے بلند ہونے کی وجہ سے کہتے ہیں۔ پس ہر چیز جو تجھ سے بلند ہے وہ سماء ہے۔ لہٰذا جب بارش بادل سے نازل ہوتی ہے تو یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ سماء

سے نازل ہوئی۔

دیکھئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ''اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا'' لیکن چونکہ مشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ پانی بادلوں سے آتا ہے تو مفسرین نے یہاں سماء کو آسمان کی بجائے مطلقاً بلندی کے معنی میں لے کر بادل پر محمول کیا۔ اس طرح ہم کہتے ہیں کہ جب احادیث، جمہور مفسرین کے اقوال اور مشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ چاند خلاء میں ہے، تو ہم بھی یہاں سماء کو مطلق بلندی کے معنی میں لے کر خلاء پر محمول کرتے ہیں اور اس تقدیر پر آیت کے معنی یہ ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے خلاء کے سات مراتب پیدا فرمائے اور چاند اور سورج کو ان مراتب میں سے اپنے اپنے مرتبہ میں رکھا'' وما ذالك على الله بعزيز۔ ثانیاً گزارش ہے کہ اگر سماء کو آسمان کے معنی پر بھی محمول کیا جائے تو بھی کچھ ضرر نہیں، کیونکہ جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا میں ''فیھن'' قمر کے لئے ظرف نہیں، بلکہ نور کے لئے ظرف ہے یعنی آیت کا مطلب یہ نہیں کہ چاند آسمانوں میں ہے (اور ظاہر ہے کہ ایک چاند تمام آسمانوں میں ہو بھی کیسے سکتا ہے) بلکہ مطلب یہ ہے کہ چاند کا نور تمام آسمانوں میں ہے۔ چنانچہ جائز ہے کہ چاند تو زمین اور آسمانوں کے درمیان خلاء میں معلق ہے اور اس کا نور تمام آسمانوں کو منور کر رہا ہے۔

دیکھئے علامہ جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:

ابن منذر نے عکرمہ سے روایت کی، انہوں نے جَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا کی تفسیر میں فرمایا کہ جس طرح سات شیشوں کے نیچے ستارہ ہو تو وہ ساتوں شیشوں کو روشن کرتا ہے اسی طرح نور قمر بھی سات آسمانوں کو ان کے شفاف ہونے کی وجہ سے روشن کرتا ہے۔	اخرج ابن المنذر عن عكرمة في قوله و جعل القمر فيهن نورا انه يضيء نور القمر فيهن كلهن كما لو كان سبع زجاجاة اسفل منها شهاب اضاءت كلهن فكذالك نور القمر في السموت كلهن لصفائهن۔ (درمنثور ج ۶ ص ۱۶۸)

اس مثال سے بھی اس امر کی تائید حاصل ہو گئی ہے کہ چاند آسمانوں کے نیچے خلاء میں واقع ہے۔

ومن عطاء فی قوله و جعل القمر فیھن نورا قال یضیء لا ھل السموت کما یضیء لاھل الارض (درمنثور ج ۶ ص ۲۶۸)	اور عطاء سے اس آیت کی تفسیر مروی ہے کہ چاند آسمانوں کو اسی طرح روشن کرتا ہے جس طرح زمین کو روشن کرتا ہے۔

اور واضح امر ہے کہ چاند آسمان میں مرکوز نہیں ہے۔ پس یہ مثال اسی وقت درست قرار پائے گی جب کہ یہ مانا جائے کہ چاند خلاء میں معلق ہے، اس کا رخ آسمانوں کی طرف اور پشت زمین کی طرف ہے اور وہ دونوں میں اپنی روشنی پہنچا رہا ہے، جس طرح حضرت عبداللہ ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد سے ثابت ہو چکا ہے۔ ثالثاً گزارش یہ ہے کہ "جعل القمر فیھن" میں اگر آسمان کو قمر کے لئے ظرف بنایا جائے پھر بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے، کیونکہ آسمان دنیا زمین و مافیہا کو محیط ہے اور باقی آسمان دنیا کو محیط ہیں، پس جب کہ چاند زمین اور آسمان کے درمیان معلق ہوا، پھر بھی وہ آسمان کے گھیرے اور احاطہ کے اندر ہی رہا، اور احاطہ آسمان سے باہر نہیں ہوا۔ لہٰذا بغیر کسی تکلف کے "جعل فیھا" اور "جعل فیھن" دونوں کا معنی درست ہو گیا۔ کیونکہ جب زمین اور آسمان کے درمیان چاند معلق ہوا تو وہ جس طرح پہلے آسمان کے احاطہ میں ہے، اسی طرح ساتوں آسمانوں کے احاطہ میں ہے۔ لہٰذا یہ بھی صحیح ہے کہ وہ سماء دنیا کے اندر ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ساتوں آسمانوں کے اندر ہے۔ پس آفتاب سے زیادہ روشن طریقہ پر ظاہر ہو گیا کہ قرآن کریم کی کوئی آیت چاند کے خلاء میں معلق ہونے کے منافی نہیں ہے۔ واللہ الحمد علی ذالک

آسمان پر رسائی

چاند پر انسان کی رسائی کے بارے میں منکرین کی دلیل کا مرکزی نقطہ یہی تھا کہ چاند آسمان دنیا میں مرکوز ہے اور بحمد اللہ تعالیٰ ہم نے روشن دلائل سے واضح کر دیا ہے کہ چاند خلاء میں معلق ہے، نہ یہ کہ آسمان میں مرکوز ہے۔ اس کے بعد یہ امر باقی رہ جاتا ہے کہ چلو چاند آسمان پر نہ سہی، لیکن آسمان پر انسان کی پہنچ ممکن ہے یا نہیں، بالخصوص مغربی سائنس دان جو اسلام پر یقین نہیں رکھتے، وہ آسمان پر جا سکتے ہیں یا نہیں، منکرین کا زعم یہ ہے کہ کفار

آسمان پر نہیں جا سکتے اور انہوں نے اس مدعیٰ پر قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کیا ہے، جن کو ہم عنقریب پیش کریں گے۔

مومن کے لئے آسمان پر جانا ممکن ہے، چنانچہ اصول کی کتابوں میں مصرح ہے کہ اگر کوئی شخص آسمان پر جانے کی قسم کھالے تو اس کی قسم منعقد ہو جائے گی کیونکہ آسمان پر جانا ممکنات سے ہے، باقی رہے کفار تو ان کے بارے میں قرآن نے تعرض نہیں فرمایا کہ وہ اپنی اس زندگی میں اسباب مادیہ سے آسمان میں جا سکتے ہیں یا نہیں اور جس کو قرآن کریم نے صراحت سے بیان نہیں فرمایا، ہم اسے اس کے اطلاق پر رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے نصوص کو مقید نہیں کرتے، رہے منکرین تو انہوں نے دو آیتوں سے کفار کے لئے آسمان پر پہنچنا محال قرار دیا، جن میں سے پہلی آیت یہ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ (الاعراف:۴۰)

بے شک جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں اور ان کے مقابل تکبر کیا ان کیلئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔

اس آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ کفار اس زندگی میں مادی اسباب کے ساتھ آسمان پر نہیں پہنچ سکتے، بلکہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مرنے کے بعد کفار کی ارواح آسمان پر نہیں جا سکیں گی۔ یا ان کی دعائیں اور نیک اعمال آسمانوں کے اوپر نہیں جا سکیں گے۔ یا ان پر آسمان سے رحمتیں نازل نہیں ہوں گی۔

(دیکھئے تفسیر کبیر ج ۴ ص ۲۰۸، بیضاوی ج ۱ ص ۲۹۲، جلالین علی حاشیہ خازن ج ۲ ص ۸۷، مدارک علی حاشیہ الخازن ج ۲ ص ۸۷)

دوسری آیت جس سے منکرین نے کفار کی آسمان پر رسائی کا انکار کیا ہے وہ یہ ہے:

وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ (الملک:۵)　"اور ہم نے ان ستاروں کو شیاطین کو مارنے کا ذریعہ بنایا"۔

اس آیت کریمہ کی رو سے جنات کا داخلہ آسمانوں میں بند ہے، یہاں انسانوں کا ذکر ہی نہیں۔ (دیکھئے جلالین علی حاشیہ الجمل ج ۴ ص ۳۷۶، جمل ج ۴ ص ۳۷۶، خازن ج ۴ ص ۲۹، مدارک علی حاشیہ الخازن ج ۴ ص ۲۹۰، تفسیر کبیر ج ۷ ص ۱۷۳)

کیا چاند پر رسائی کوئی قابل فخر کارنامہ ہے؟

سطور بالا میں جو تحقیق پیش کی گئی ہے اس کا مفاد فقط اتنا ہے کہ مادی اسباب سے چاند تک جانا محالات میں سے نہیں ہے اور یہ واقعہ قرآن کریم کے ہرگز منافی نہیں، بلکہ اس کے برعکس آیات قرآنیہ کا مصداق اور مؤید ہے اور اس مضمون کا مقصد چاند پر جانے والوں کی تحسین اور ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک داد و تحسین کے مستحق صرف وہ کام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہو، جن کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور مخلوق کی خدمت کی جائے وہ لائق صد تحسین ہیں۔ امریکہ کے صدر نکسن نے بھی یہی کہا تھا کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ مستقبل کے لوگ ہم کو اس نام سے یاد کریں کہ ہم نے سب سے پہلے انسان کو چاند پر اتارا، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ تاریخ ہم کو امن اور سلامتی کے خادم کی حیثیت سے یاد کرے۔ کیونکہ برسہا برس کی کوشش اور کروڑوں کھرب روپیہ کے اسراف کے بعد انسان چاند پر پہنچا، لیکن اس سے انسانیت کو کیا ملا۔ اگر یہی روپیہ دنیا کے تمام انسانوں پر تقسیم کیا جاتا تو ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر شخص کو پندرہ ہزار روپیہ مل جاتا، چلو دنیا کے ہر شخص کو نہ سہی صرف امریکہ کے مفلس اور غریبوں پر یہ روپیہ خرچ کیا جاتا تو انسانیت کی ایک عظیم خدمت ہوتی۔ اس لئے ہمارے نزدیک یہ واقعہ کسی طرح لائق تحسین نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی کسی طرح اسلام کے منافی بھی نہیں ہے۔



نظام مصطفیٰ کی اصطلاح

۹ مارچ ۱۹۷۷ء سے پانچ جولائی ۱۹۷۷ء تک کراچی سے لے کر خیبر تک پورے پاکستان میں ''نظام مصطفیٰ'' کے نام سے تحریک چلائی گئی۔ وفاق پاکستان کے وکیل مسٹر اے کے بروہی نے سپریم کورٹ میں بیانگ دہل یہ بیان کیا کہ اس تحریک کی مثال پورے برصغیر میں نہیں ملتی اور سپریم کورٹ کے فل بنچ نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا اور اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے بھی اپنی پہلی نشری تقریر میں ''نظام مصطفیٰ'' کے نام پر چلائی جانے والی اس تحریک کو دل کھول کر خراج تحسین پیش کیا۔ آج یہ نعرہ پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کی تمناؤں کا مرکز اور ان کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے اور پاکستان میں بسنے والے تمام مسلمان اور عیسائی سب کا نصب العین ایک اور صرف ایک حقیقت ہے اور وہ ہے نظام مصطفیٰ۔ اسی طرح پاکستان کی تمام سیاسی جماعتیں اس نعرہ کو بطور آئیڈل قبول کر چکی ہیں۔ حتیٰ کہ پیپلز پارٹی نے بھی سوشلزم کے نعرہ کو چھوڑ کر نظام مصطفیٰ کے دامن میں پناہ لی ہے۔ یہ وہی منزل ہے جس کو پانے کے لئے حالیہ تحریک میں سینکڑوں مسلمانوں نے اپنے سینوں پر گولیاں کھائیں اور ہزارہا کارکنوں نے اپنے آپ کو جیلوں کے حوالے کر دیا۔ یہاں تک کہ جیلوں کی دیواریں تنگ ہو گئیں، آنسو گیس کے شیل ختم ہو گئے، لاٹھی چارج کرنے والوں کے بازو شل ہو گئے اور فائرنگ کرنے والوں نے حوصلہ ہار دیا۔ لیکن نظام مصطفیٰ کے متوالوں کے جوش و خروش اور ایثار و قربانی کے جذبہ میں کوئی فرق نہ آیا۔

ہمیں اس وقت سخت حیرت ہوئی جب ہم نے ۱۷ نومبر کے نوائے وقت میں یہ خبر پڑھی کہ ''مسٹر بروہی نے لندن میں نیویارک روانہ ہونے سے قبل اسلام کونسل برائے یورپ کے تحت منعقدہ ایک جلسہ میں نظام مصطفیٰ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ اصطلاح غلط طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔ صحیح اصطلاح نظام الٰہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہم مسلمان ہیں

محمدی نہیں''۔ (روزنامہ نوائے وقت ۱۷ نومبر ۱۹۷۷ء)

مقام صد حیرت ہے کہ جو صاحب اس مقدمہ کی پیروی کے دوران بار بار نظام مصطفیٰ کا حوالہ دے کر اپنے بیان میں زور پیدا کرتے رہے۔ وہ فیصلہ کے بعد لندن پہنچتے ہی اپنے موقف سے کس طرح ہٹ گئے اور انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ان کے اس بیان سے کروڑوں مسلمانوں کی دل آزاری ہوگی۔ نظام الٰہی کسی معین و مشخص نظام کا نام نہیں ہے، بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء اور رسل علیہم السلام آئے وہ سب نظام الٰہی لے کر آئے۔ نظام الٰہی ان تمام ادیان میں قدر مشترک ہے اور جو چیز ان ادیان میں مابہ الامتیاز ہے اور جس کی وجہ سے ایک دین دوسرے دین سے ممتاز ہوتا ہے وہ اس دین کے وہ جزوی احکام ہوتے ہیں جنہیں ان کا پیغمبر نافذ کرتا ہے، اسی وجہ سے دین موسیٰ، دین عیسیٰ علیہما السلام اور دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک دوسرے سے ممتاز ہوتے ہیں۔ جب ہم صرف نظام الٰہی کا ذکر کریں گے تو یہ عنوان یہودیوں اور عیسائیوں کے نظام سے متمیز نہیں ہو گا۔ کیونکہ وہ بھی اپنے زعم میں نظام الٰہی کے پیروکار ہیں۔ دنیا کے دوسرے نظاموں سے ہمارا نظام اگر ممتاز اور متمیز ہو سکتا ہے تو صرف نظام مصطفیٰ کی تعبیر سے ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ (النساء: ۵۹) ''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو''۔ اس آیت کریمہ میں أَطِيعُوا کا مستقل طور پر دو بار ذکر کیا گیا ہے اور عطف سے کام نہیں لیا گیا اور اس میں یہی بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی اطاعت مستقل ہے، بلکہ اس منزل سے بھی آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ (النساء: ۸۰) ''جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر لی''، اس آیت میں یہ ظاہر فرما دیا کہ اطاعت مصطفیٰ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو مستلزم ہے، اس کے برعکس یہ نہیں کہ اطاعت خداوندی اطاعت مصطفیٰ کو مستلزم ہے۔ کیونکہ اطاعت الٰہی تو دوسرے ادیان میں بھی تھی مگر وہاں اطاعت مصطفیٰ نہیں تھی۔ اس کے برخلاف جہاں اطاعت مصطفیٰ ہوگی وہاں اطاعت خداوندی لازماً ہوگی، اسی نہج پر یہ کہا جائے کہ یہ نظام الٰہی کی اصطلاح ہماری شریعت اور

شرائع سابقہ دونوں کو شامل ہے۔ اس لئے نظام الہی کی اصطلاح کو استعمال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے برعکس جب نظام مصطفیٰ کی اصطلاح کو استعمال کیا جائے تو یہ ایک جامع مانع مفہوم ہوگا۔ اطاعت خداوندی اور اطاعت مصطفیٰ دونوں کو شامل اور حاوی اور شرائع سابق سے متمیز اور ممتاز ہوگا، عقل صریح اور قرآن کریم کی روشنی میں نظام مصطفیٰ کی اصطلاح کا جواز اور استحسان سمجھنے کے بعد آیئے اب احادیث اور آثار کے اعتبار سے اس اصطلاح کے دلائل ملاحظہ ہوں۔

حافظ ابن عبداللہ قرطبی متوفی ۴۶۳ھ اور محمد بن سعد کاتب واقدی حضرت طفیل بن عمرو بن ظریف دوسی رضی اللہ عنہ کے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبول اسلام کے لئے حاضر ہوئے تو عرض کیا: آپ کی قوم نے مجھے آپ کی باتیں سننے سے روکا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ مجھے آپ کا کلام سنا کر رہا اور میرے دل نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آپ حق فرماتے ہیں: "فاعرض علی دینك" "پس اپنا دین مجھ پر پیش کیجئے" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر اسلام پیش کیا اور میں نے اس کو قبول کر لیا، جب میں اپنی قوم میں پہنچا تو میرے والد مجھ سے ملے۔ میں نے کہا: ایک طرف ہٹو، اب میرا اور تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا کیا ہوا؟ میں نے جواب دیا: "اسلمت و اتبعت دین محمد" "میں نے اسلام قبول کر لیا اور اب میں دین محمدی کا پیروکار ہوں" یہ سن کر میرے والد بھی مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد میری بیوی ملی تو میں نے اس سے بھی یہی کہا کہ اب تمہارا اور میرا راستہ الگ الگ ہے۔ اس نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا: "اسلمت و اتبعت دین محمد" "میں نے اسلام قبول کر لیا اور اب میں دین محمد کا پیروکار ہوں" یہ سن کر وہ بھی مسلمان ہو گئی۔

(ملخصاً الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب علی ھامش الاصابہ ج ۲ ص ۲۳۳-۲۳۴، کتاب الطبقات الکبیر لمحمد بن سعد کاتب الواقدی ج ۴ ص ۱۷۵-۱۷۶)

اس واقعہ میں ایک وجہ استدلال یہ ہے کہ حضرت طفیل رضی اللہ عنہ نے حضور کے سامنے عرض کیا: مجھ پر اپنا دین پیش کیجئے، یہ نہیں کہا کہ اللہ کا دین پیش کیجئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تغلیط نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ دین کی نسبت آپ کی طرف کرنا صحیح ہے اور یہی نظام

مصطفیٰ کا مدلول ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت طفیل اپنی قوم میں جا کر بار بار کہتے ہیں کہ میں دین محمد کا پیروکار ہوں۔ اس سے ثابت ہوا کہ دین محمد ایک صحیح اصطلاح ہے جو حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں تھی اور نظام مصطفیٰ اسی دین محمد کی ایک تعبیر اور عنوان ہے۔ قرآن و حدیث اور عقلی دلائل سے یہ حقیقت اب آفتاب سے روشن تر ہو گئی کہ نظام مصطفیٰ ایک صحیح اصطلاح ہے، اس کو غلط وہی شخص کہہ سکتا ہے جو قرآن و حدیث کے مضامین پر نظر نہ رکھتا ہو۔

رہا یہ کہنا کہ ہم مسلمان ہیں، محمدی نہیں ہیں تو یہ ایک ایسی بات ہے جس کی جرأت ایک کلمہ گو سے متصور نہیں ہو سکتی۔ حضرت نوح علیہ السلام کی امت سے لے کر بنی اسرائیل تک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے سب مسلمان تھے۔ لیکن وہ "کنتم خیر امت" (خیر الامم) اور امت مصطفیٰ ہونے کا شرف اور فضیلت حاصل نہ کر سکے۔ سابقہ امتوں اور اس امت کے اہل ایمان میں مسلمان کا نام مشترک رہا ہے اور اس امت کو امم سابقہ سے الگ کوئی وصف ممتاز کرتا ہے تو وہ محمدی ہونا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

(۱) حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ کرتے ہوئے فرمایا:

وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (یونس) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں"۔

(۲) حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام نے دعا کرتے ہوئے فرمایا:

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً (البقرہ:۱۲۸) "اے ہمارے رب! ہم کو مسلمان رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو مسلمان بنا"۔

(۳) فرشتوں نے لوط علیہ السلام کی قوم کے بارے میں کہا:

فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ ۝ (الذاریات) "ہم نے حضرت لوط علیہ السلام کی بستی میں مسلمانوں کا صرف ایک گھر پایا"۔

(۴) فرعون کے دھمکانے پر بنی اسرائیل نے دعا مانگی:

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲۶﴾ (الاعراف)

"اے ہمارے رب! ہمیں صبر عطا کر اور اس حال میں ہمیں فوت کرنا کہ ہم مسلمان ہوں"۔

(۵) حضرت سلیمان علیہ السلام نے بلقیس کی طرف خط میں تحریر فرمایا:

اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۳۰﴾ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ (النمل)

"یہ خط سلیمان (علیہ السلام) کی طرف سے ہے اور یہ اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے شروع ہے اور یہ کہ تم لوگ مجھ پر بڑائی حاصل نہ کرو اور مسلمان ہو کر میرے پاس آ جاؤ"۔

ان تمام آیات سے یہ حقیقت آفتاب سے زیادہ روشن ہو گئی کہ مسلمان ہونا صرف ہمارا امتیاز نہیں بلکہ اس وصف میں ہم اور امم سابقہ کے تمام اہل ایمان شریک ہیں۔ ہم میں اور ان میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ مسلمان ہونا نہیں محمدی ہونا ہے۔

صرف نظام الٰہی پر یقین رکھنا اور نظام مصطفیٰ سے اعراض کرنا یا اس کو غلط کہنا دراصل کفار کی فطرت ہے، کیونکہ کفار اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کے تکوینی اور تخلیقی نظام کے تو قائل تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریعی نظام کے منکر تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

(۱) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶۱)

اگر آپ ان کفار سے سوال کریں کہ آسمانوں اور زمینوں کو کس نے پیدا کیا اور سورج اور چاند کو تمہارے فائدے کے لئے کس نے مامور کیا تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

(۲) وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶۳)

اور اگر آپ ان (کافروں) سے سوال کریں کہ آسمانوں سے پانی کون برساتا ہے اور اس پانی سے بے جان زمین کو سبزہ سے زندہ کون کرتا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ۔

(۳) وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (الزخرف: ۸۷)

اور اگر آپ ان (مشرکین) سے سوال کریں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

قرآن کریم کی ان آیات کریمہ سے یہ امر واشگاف ہو گیا کہ کفار اور مشرکین نظام الٰہی سے اختلاف نہیں کرتے تھے، بلکہ اس پر ایمان رکھتے تھے اور اس کا زور شور سے اقرار کرتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ وہ پھر کس بناء پر کافر تھے اور کس نظام کو نہیں مانتے تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محمد ﷺ کو نہیں مانتے تھے اور نظام مصطفیٰ کے قائل نہ تھے۔

ملاحظہ فرمایئے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَ رَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (المنافقون)

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ (محمد مصطفیٰ) رسول اللہ (ﷺ) کے دربار اقدس میں وہ تمہارے لئے استغفار کریں تو وہ سر ہلا کر انکار کر دیتے ہیں اور منہ پھیر لیتے ہیں اور آپ دیکھتے ہی ہیں کہ وہ اعراض اور تکبر کرنے والے ہیں"۔

غالباً اسی طرح کے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

۲۵ نومبر کو جمعیۃ العلماء پاکستان کے صدر اور قائد اہل سنت حضرت علامہ شاہ احمد نورانی دام ظلہ نے بھی اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا: نظام الٰہی کی اصطلاح جلال الدین اکبر کے دین الٰہی کے مشابہ ہے، لیکن نظام مصطفیٰ کی اصطلاح ہمیں دیگر مذاہب کے نظاموں سے ممیز کرتی ہے۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی تشریح خود حضور ﷺ نے کی ہے۔ انہوں نے کہا: جون ۱۹۷۰ء میں پانچ ہزار سے زیادہ علماء ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مقام پر جمع ہوئے تھے اور انہوں نے نظام مصطفیٰ کی اصطلاح کی تشریح کی تھی،

اب قومی اتحاد میں شامل اور اس کے باہر تمام پارٹیاں اس اصطلاح کے استعمال پر پوری طرح متفق ہیں۔ اب یہ نظام قوم کا متفقہ مطالبہ بن چکا ہے۔ اگر اب اس مرحلہ پر کوئی بحث چھیڑ دی گئی تو وہ ان افراد سے غداری ہوگی جنہوں نے نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لئے قربانیاں پیش کی ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ نظام مصطفیٰ زندگی کا مکمل ضابطہ ہے اور اس میں طلباء، کارکنوں اور کسانوں کے اقتصادی اور سماجی مسائل کا حل مضمر ہے۔

(روزنامہ نوائے وقت ۲۵ نومبر ۱۹۷۷ء)

اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے ۲۷ نومبر کے "نوائے وقت" میں "سر راہے" کے زیر عنوان کالم نویس لکھتے ہیں:

مسٹر اے کے بروہی ملک کے ایک سر برآوردہ وکیل ہی نہیں بلکہ ان کا شمار ملک کے ممتاز ترین دانشوروں میں بھی ہوتا ہے اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ بارہا خراج تحسین وصول کر چکی ہے، لیکن خدا جانے انہوں نے کس خیال سے یہ کہہ دیا کہ ہمیں نظام مصطفیٰ کی جگہ نظام الٰہی کی ترکیب استعمال کرنی چاہیے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ نظام مصطفیٰ اور نظام الٰہی میں مسٹر بروہی کے نزدیک حد فاصل کیا ہے اور کہاں ہے، آگے چل کر لکھتے ہیں: لیکن نظام مصطفیٰ کی جگہ نظام الٰہی کے استعمال سے صرف ناموں کا فرق نہیں ہوتا، بلکہ نام بدل جانے سے معنوی تصورات میں بھی فرق آتا ہے اور مصطفیٰ کا نام تو مسلمانوں کے لئے اتنا مقدس، جان پرور اور عاقبت آراء ہے کہ حضرت اقبال کو بھی کہنا پڑا:

در دل مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

اور آخر میں انہوں نے یہ موضوع صاحبزادہ غلام نصیر الدین کے ان اشعار پر ختم کر دیا ہے:

صرف توحید کا شیطان بھی ہے قائل یوں تو
شرط ایمان ہے محمد کی غلامی یہ نہ بھول

ان سے نسبت نہ ہو گر تو محاسن بھی گناہ
وہ شفاعت پہ ہوں مائل تو جرائم بھی قبول

(روزنامہ نوائے وقت، ۲۷ نومبر ۱۹۷۷ء)

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء سے لے کر صحافیوں تک تمام اہل علم و دانش حضرات نے بروہی صاحب کے اس بیان سے بیزاری کا اظہار کیا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی سے موسوم نظام کو غلط کہہ کر بروہی صاحب نے ایسا اقدام کیا ہے جس کی کسی کلمہ گو سے توقع نہیں کی جا سکتی اور ان کے اس بیان سے نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے ان کروڑوں غلامان مصطفیٰ کے جذبات مجروح ہوئے ہیں جو اس نام کی عظمت پر ہزار بار سر کٹانے کو اپنی سعادت گردانتے ہیں۔

واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین

☆☆☆☆☆

نماز جنازہ بر طریقۂ سنت

ائمہ احناف کے نزدیک نماز جنازہ میں صرف قیام اور چار تکبیروں کا پڑھنا فرض ہے اور یہ ایک اتفاقی چیز ہے۔ پہلی تکبیر کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء، دوسری تکبیر کے بعد حضور ﷺ پر درود، تیسری تکبیر کے بعد میت کے حق میں دعا اور چوتھی تکبیر کے بعد سلام پھیر دیا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا پڑھنا فرض نہیں ہے، ثناء، درود اور دعا یہ سب مستحب ہیں، نیز نماز جنازہ میں ثناء، درود یا دعا کسی خاص الفاظ سے پڑھنے کا حدیث میں حکم نہیں ہے۔ احادیث شریفہ میں وارد جن کلمات سے ثناء، درود اور دعا پڑھ لی جائے ادا ہو جائے گی۔

چنانچہ امام ابن ابی شیبہ اپنی "مصنف" میں روایت کرتے ہیں:

عن جابر قال ما باح لنا رسول الله ﷺ ولا ابوبکر و لا عمر فی الصلوة علی المیت بشیء۔

(مصنف ابن ابی شیبہ ج ۴ ص ۱۱۰)

حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے نماز جنازہ میں پڑھنے کے لئے کسی چیز کو معین نہیں فرمایا، نہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ عن ثلاثین من اصحاب رسول الله ﷺ انھم لم یقوموا علی شیء فی امر الصلوة علی الجنازة۔

حضور ﷺ کے تیس صحابہ سے روایت ہے کہ نماز جنازہ میں پڑھنے کے لئے کوئی چیز معین نہیں ہے۔

عن عمران بن جریر قال سالت محمدا عن الصلوة علی المیت فقال مایعلم له شیء موقت فادع باحسن ما تعلم۔

عمران بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے حضرت محمد سے نماز جنازہ کے بارے میں پوچھا، وہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی چیز معین نہیں، جو اچھے کلمات ہوں ان سے دعا مانگو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ غیر مقلدین کا نماز جنازہ میں خاص ثناء، درود اور دعا کی

تعیین کرنا قطعاً باطل اور احادیث صریحہ کے خلاف ہے۔

آج کل جن عبارات کے ساتھ ثناء، درود اور دعا کا عام رواج ہو گیا ہے ان کے ساتھ تخصیص اور تعیین احناف کی کسی مستند کتاب میں موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ مخالفین بھی اس سلسلہ میں "یسرنا القرآن" کے سوا اور کوئی حوالہ پیش نہیں کر سکے۔ تاہم جن عبارات کے ساتھ آج کل نماز جنازہ میں ثناء، درود اور دعا پڑھی جاتی ہے، کتب احادیث میں ان عبارتوں کا ثبوت موجود ہے۔

ثناء

عام طور پر جس ثناء کو نماز میں پڑھا جاتا ہے اس کی عبارت یہ ہے: "سبحانك اللهم و بحمدك و تبارك اسمك و تعالی جدك و جل ثناؤك ولا اله غيرك" یہ ثناء احادیث کی مستند کتابوں میں موجود ہے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ اور حافظ ابو شجاع نے اپنی تصانیف میں اسی ثناء کو حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے۔

(بحوالہ فتح القدیر ج ۱ ص ۲۰۳)

درود

عام طور پر جس درود کو نماز جنازہ میں پڑھا جاتا ہے اس کی عبارت یہ ہے: "اللهم صل على محمد و على آل محمد كما صليت و سلمت و باركت و رحمت و ترحمت على ابراهيم و على آل ابراهيم انك حميد مجيد"۔

اس درود میں "سلمت" اور "رحمت و ترحمت" کے الفاظ بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے مخالفین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ درود شریف حدیث سے ثابت نہیں ہے، حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے اور یہ الفاظ بھی احادیث سے ثابت ہیں، "سلمت" کے ثبوت میں ملاحظہ فرمائیں۔

"اللهم و سلم على محمد كما سلمت على ابراهيم و على ال ابراهيم انك حميد مجيد"۔ (رواہ ابن مسدی عن علی ابن ابی طالب بحوالہ سعادت الدارین ص ۲۳۱)

"رحمت" کے ثبوت میں ملاحظہ فرمائیں۔

"وارحم محمدا وال محمد كما رحمت على ابراهيم وعلى ال ابراهيم انك حميد مجيد"۔ (رواہ ابن جریر عن ابن عباس رضی اللہ عنہما بحوالہ سعادت الدارین ص ۲۳۰)

"ترحمت" کے ثبوت میں ملاحظہ فرمائیں:

"وارحم محمدا وال محمد كما صليت وباركت وترحمت على ابراهيم وعلى ال ابراهيم انك حميد مجيد"۔

(رواہ الحاکم عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، بحوالہ سعادت الدارین ص ۲۳۰)

سنن ابن ماجہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے: "احسنوا الصلوة على نبيكم" "اپنے نبی پر بہترین طریقہ سے درود بھیجو" اور کیا یہ بہترین طریقہ نہیں ہے کہ اختصار کے ساتھ حدیث شریف میں وارد تمام کلمات "سلمت، رحمت، ترحمت" اور "برکت" کو درود میں پڑھ لیا جائے۔

دعا

جو دعا عام طور پر نماز جنازہ میں پڑھی جاتی ہے اس کے الفاظ ہیں: "اللهم اغفر لحينا وميتنا وشاهدنا وغائبنا وصغيرنا وكبيرنا وذكرنا وانثانا اللهم من احييته منا فاحيه على الاسلام ومن توفيته منا فتوفه على الايمان"۔

اور یہ دعا مسند امام احمد، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد اور ابن ماجہ میں موجود ہے۔
(بہ حوالہ مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۶)



نماز جنازہ بر طریقۂ غیر مقلدین

غیر مقلدین حضرات نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ اور ضم سورت کو ضروری خیال کرتے ہیں حالانکہ کسی صحیح حدیث سے تکبیر اولیٰ کے بعد حضور ﷺ کا سورۂ فاتحہ پڑھنا اور ضم سورت کرنا، یا اس کا حکم ثابت نہیں ہے۔ اس کے برخلاف حدیث صحیح سے یہ امر ثابت ہے کہ نماز جنازہ میں کسی چیز کی قرأت کو مقرر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح بکثرت آثار صحابہ سے بھی نماز جنازہ میں قرآن پڑھنے سے منع ثابت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ مشہور محدث حافظ علی بن ابی بکر ہیثمی متوفی ۸۰۷ھ فرماتے ہیں:

عن عبداللہ بن مسعود قال لم یوقت لنا فی الصلوۃ علی المیت قراۃ ولا قول کبر ما کبر الامام و اکثر من طیب الکلام۔ (رواہ احمد ورجالہ رجال الصحیح مجمع الزوائد ج ۳ ص ۳۲)

حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ہمارے لئے نماز جنازہ میں نہ قرآن پڑھنے کو مقرر کیا گیا ہے نہ کسی اور چیز کو، امام کی تکبیر پر تکبیر کہو اور اچھی دعا و ثناء کرو۔

نیز غیر مقلدین کے مستند ظاہری عالم ابن حزم متوفی ۴۵۶ھ ذکر کرتے ہیں:

عن فضالۃ بن عبید انہ سئل ایقرء فی جنازۃ بشیء من القران قال لا۔ (محلی ج ۵ ص ۱۳۱)

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: کیا نماز جنازہ میں قران پڑھا جائے گا؟ فرمایا: نہیں۔

نیز امام ابن ابی شیبہ اور ابن حزم اپنی تصانیف میں روایت کرتے ہیں:

عن نافع ان ابن عمر کان لا یقرء فی الصلوۃ علی المیت۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ج ۴ ص ۱۱۳، محلی ج ۵ ص ۱۳۱)

حضرت عبداللہ بن عمر نماز جنازہ میں قرآن نہیں پڑھتے تھے۔

اور علامہ بدرالدین عینی فرماتے ہیں:

و من کان لا یقرء فی الصلوۃ علی الجنازۃ و ینکر عمر بن الخطاب و علی بن ابی طالب و ابن عمر و ابی ھریرۃ۔
(عمدۃ القاری ج ۸ ص ۱۳۹)

جو اصحاب کرام نماز جنازہ میں قرآن پڑھنے سے منع کرتے تھے ان میں سے بعض یہ ہیں: حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت ابن عمر اور حضرت ابوہریرہ۔

سورت فاتحہ اور ضم سورت پر غیر مقلدین کے دلائل اور ان کے جوابات

(۱) صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابن عباس نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھی اور فرمایا کہ لوگ جان لیں کہ یہ سنت ہے۔

الجواب: اولاً تو یہ حدیث غیر مقلدین کے لئے مفید نہیں کیونکہ اس میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کو سنت کہا ہے اور وہ اس کی فرضیت کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ ثانیاً سنت کا لفظ اس بات میں صریح نہیں کہ وہ حضور کی سنت ہے۔ ثالثاً جب حدیث صحیح اور صحابہ کرام سے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے سے منع ثابت ہو چکا ہے تو اس کا پڑھنا سنت نہیں ہو سکتا اور حضرت ابن عباس کے قول کی تصحیح کے لئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے نماز میں بطور ثناء اور دعا سورۂ فاتحہ پڑھی۔ نہ بطور قرأت قرآن کے اور اس کے جواز کے احناف بھی قائل ہیں۔

(۲) ابن ماجہ سے ایک روایت پیش کی جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا۔

الجواب: اس حدیث کی سند میں ایک راوی ہے: حماد بن جعفر العبدی، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ لین الحدیث ہے یعنی ضعیف ہے۔ (تقریب التہذیب ص ۴۵) ایک راوی ہے: شہر بن حوشب، اس کے بارے میں ابن حجر فرماتے ہیں کہ یہ کثیر الارسال و الاوہام ہے یعنی اس کی روایات اکثر مرسل ہوتی تھیں اور اس کو بہت وہم لاحق ہوتے تھے۔ (تقریب التہذیب ص ۸۶) ایک راوی ہے: ابو عاصم، اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس کی روایات ضعیف ہوتی تھیں۔ (تقریب ص ۲۵۸)

خلاصہ یہ ہے کہ اس حدیث کی تمام کڑیاں ضعیف راویوں پر مشتمل ہیں۔

(۳) "مجمع الزوائد" ج ۳ ص ۳۳ کے حوالہ سے "طبرانی" کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے نماز جنازہ میں باآواز بلند سورۂ فاتحہ پڑھی، حالانکہ "مجمع الزوائد" میں اسی حدیث کے ساتھ یہ لکھا ہوا ہے کہ اس حدیث کی سند میں یحییٰ بن یزید بن عبدالملک نوفلی کے نام کا ایک راوی ہے وہ ضعیف ہے۔

(۴) "مجمع الزوائد" ج ۳ ص ۳۲ سے اسماء بنت یزید کی روایت پیش کرتے ہیں، جس میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نماز جنازہ پڑھو تو سورۂ فاتحہ پڑھو، جبکہ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد صاحب "مجمع الزاوئد" فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند میں معلیٰ بن حمران نام کا ایک مجہول راوی ہے اور اس کے علاوہ دوسرے راوی بھی محل کلام ہیں۔

(۵) "سنن نسائی" سے ایک حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے سورۂ فاتحہ پڑھی اور ضم سورت کیا۔ سورۂ فاتحہ کا جواب گزر چکا ہے اور ضم سورت کا جواب یہ ہے کہ یہ ابراہیم بن سعد کی روایت ہے اور بیہقی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ضم سورت کا ذکر غیر محفوظ ہے۔ (سنن کبریٰ ج ۴ ص ۳۸)

اظہار حق کی خاطر یہ چند سطور سپرد قلم کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور ان اوراق کو اہل سنت احناف کے لئے استقامت اور غیر مقلدین کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ و ما ذالك على الله بعزيز ولا حول ولا قوة الا بالله العلى العظيم والحمد لله رب العالمين۔



علاج کی شرعی حیثیت

انسان کی صحت اخلاط اربعہ کے توازن اور حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست کے اعتدال سے قائم ہے، ان اخلاط اور کیفیات میں سے کسی خلط اور کیفیت میں اگر خلل آ جائے تو انسان کا مزاج فاسد اور اس کی صحت بگڑ جاتی ہے۔ صحت کی بحالی کے لئے ہر کیفیت کو اس کے اصل حال کی طرف لوٹایا جاتا ہے اور اسی عمل کو عرف میں علاج معالجہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور روز افزوں ترقی نے طب و حکمت کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ علاج کرانا شرعاً جائز بھی ہے یا نہیں اور جائز ہونے کی صورت میں ہومیو پیتھک اور ایلو پیتھک دوائیں اسلامی احکام کے مطابق ہیں یا نہیں؟

علاج کا ثبوت قرآن سے

حالت احرام میں سر کے بالوں کا کٹوانا منع ہے۔ لیکن اگر کسی شخص کے سر میں جوئیں پڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ وہ بالوں کو منڈوا کر فدیہ دے۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ (البقرہ:۱۹۶)

"اور اپنے سر کے بالوں کو اس وقت تک نہ منڈواؤ جب تک کہ ہدی اپنی جگہ پر نہ پہنچ لے اور جو بیمار ہو یا جس کے سر میں جوئیں ہوں تو وہ (بال منڈوا) کر فدیہ ادا کر دے"۔

جب سر میں جوئیں ہوں اور اس کی وجہ سے تکلیف ہو تو اس کا علاج یہی ہے کہ بال منڈوا دیے جائیں۔ پس قرآن کریم کی اس آیت سے علاج کی اصل ظاہر ہو گئی۔

علاج کا ثبوت احادیث سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف بیماریوں کے لئے دوائیں تجویز فرمائیں، اپنا اور صحابہ کا

علاج فرمایا ہے۔ بخاری شریف میں سہل بن سعد سے روایت ہے کہ یوم احد کو جب حضور کا چہرہ زخمی ہو گیا تو حضرت فاطمہ نے زخم کو دھویا اور جب خون نہ رکا تو انہوں نے چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخم میں بھر دی۔ ابوداؤد میں ابن عباس سے روایت ہے کہ حضور نے ناک میں دوا ڈالی۔ ابو نعیم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا، وہ فرماتی ہیں کہ ہم اکثر رسول اللہ ﷺ کا بیماریوں میں علاج کیا کرتے تھے۔ ابوداؤد میں ابو درداء سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بیماری اور دوائیں دونوں اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہیں۔ اے اللہ کے بندو! دوا استعمال کرو اور حرام دوا سے بچو، لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کے بعد اب علاج کرانے کے جواز میں کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔

علاج اور توکل

بعض لوگ علاج کرانے کو اللہ پر توکل کے خلاف سمجھتے ہیں، اس سلسلے میں گزارش ہے کہ کسی شئے کو حاصل کرنے کے لئے اس کے اسباب کو حاصل کرنے کے بعد اس کے نتیجہ کو اللہ پر چھوڑ دینا یہ توکل ہے، نہ یہ کہ اسباب کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ جس طرح بھوک پیاس مٹانے کے لئے، کھانا پینا، روزی کمانا، مشکلات میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا توکل کے خلاف نہیں ہے اسی طرح بیماریوں کا علاج کرانا بھی توکل کے منافی نہیں ہے۔

اس موضوع پر "ترمذی" کی ایک حدیث پیش کی جاتی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:
"مَنِ اكْتَوٰى أَوِ اسْتَرْقٰى فَقَدْ بَرِئَ مِنَ التَّوَكُّلِ" "جس شخص نے اپنے جسم پر داغ لگوایا یا دم کرایا وہ توکل سے بری ہو گیا"۔ اکتواء عرب کا ایک معروف طریقہ علاج تھا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ جسم کے جس حصہ میں درد ہو اسے گرم لوہے سے داغ دیا جائے۔ اس حدیث میں حضور نے اکتواء کو خلاف توکل قرار دیا ہے، جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ علاج کرنا بھی توکل کے خلاف ہے۔

چونکہ حضور ﷺ نے بکثرت اکتواء سے علاج کیا ہے اس لئے اس حدیث میں توجیہ اور تاویل کرنا ضروری ہے۔ ترمذی میں حضرت انس سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے سعد بن زرارہ کا اکتواء سے علاج کیا۔ مسلم میں جابر سے روایت ہے کہ حضور ﷺ

نے ابی بن کعب کے پاس ایک طبیب بھیجا جس نے ان کا اکتواء سے علاج کیا۔ ان حدیثوں کے ملاحظہ کے بعد اس حدیث کی توجیہ ضروری ہوگئی جس میں اکتواء کو منافی توکل قرار دیا ہے۔ علامہ ابن قتیبہ نے فرمایا کہ اکتواء سے اس شخص کو منع کیا ہے جو حالت صحت میں مرض کے خوف سے بلاضرورت اکتواء کرے، کیونکہ اس کا یہ عمل توکل اور ایمان بالتقدیر کے خلاف ہے اور خطابی فرماتے ہیں کہ جو شخص اکتواء کو قطعی علاج قرار دیتا ہو اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ اگر اکتواء نہ کرایا تو مر جائے گا تو اسے اکتواء سے منع فرمایا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں محض اکتواء پر اعتماد ہوگا، اللہ تعالیٰ سے شفاء کی امید نہ ہوگی اور یہ یقیناً توکل کے خلاف ہے اور جو شخص اکتواء کو محض علاج کا سبب قرار دے اور شفاء کی امید اللہ سے وابستہ رکھے، اس کے لئے اکتواء جائز ہے اور یہ حکم ہر علاج کا ہے، صرف اکتواء کے ساتھ خاص نہیں ہے۔

وبائی امراض کا متعدی ہونا

یہ بحث شروع سے چلی آرہی ہے کہ وبائی امراض متعدی ہوتے ہیں یا نہیں؟ دونوں طرف سے احادیث پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن روایت کے تتبع اور دقت نظر سے جو بات سامنے آئی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض امراض میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ ان کے جرثومے ایک جسم سے دوسرے جسم میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ابونعیم اور بخاری نے روایت کیا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اتَّقُوا الْمَجْذُومَ كَمَا يُتَّقَى الْأَسَدَ۔	ابوہریرہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوڑھی سے ایسے بچو جیسے شیر سے بچا جاتا ہے۔

علامہ بدرالدین عینی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

اعلم ان الله تعالى جعل ذالك سببا فحذر من الضرر الذى يغلب وجوده عن وجوده بفعل الله عزوجل۔ (عمدۃ	جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے جذامی کے ساتھ میل جول کو جذام کا سبب غالب بنا دیا ہے۔ اس لئے حضور نے اس ضرر سے ڈرایا

القاری ج ۲۱ ص ۲۴۷) جو اختلاط کے وقت اللہ کے فضل سے ظہور میں آئے گا۔

نیز علامہ عینی فرماتے ہیں:

ان هذه الامراض لاتعدی بطبعها ولکن الله تعالی جعل مخالطة المریض بها للصحیح سببا لاعدائه مرضه۔

یہ بیماریاں خود بخود متعدی نہیں ہوتیں لیکن اللہ تعالیٰ نے بیمار کے تندرست کے ساتھ اختلاط کو تعدیٔ مرض کا سبب بنا دیا ہے۔

(عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۴۷)

نیز فقہاء نے بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بچہ کو غصب کر کے ایسی جگہ لے جائے جہاں وبائی مرض پھیلا ہوا ہو اور اس بیماری سے بچہ مر جائے تو اسے تاوان دینا ہوگا کیونکہ وباء سے متکیف ہوائیں بھی انسانی جسم میں غذاء کی طرح اثر کرتی ہیں۔

(شامی ج ۵ ص ۵۴۷، بزازیہ علی حامش الہندیہ ج ۶ ص ۳۸۶)

لاعدویٰ کا جواب

جو لوگ متعدی بیماریوں کے قائل نہیں ہیں وہ ذیل کی حدیث سے نفی تعدی پر استدلال کرتے ہیں۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ حِيْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَا عَدْوٰى وَلَا صَفَرَ وَلَا هَامَةَ فَقَالَ اَعْرَابِيٌّ يَا رَسُوْلَ اللهِ فَمَا بَالُ الْاِبِلِ تَكُوْنُ فِي الرَّمْلِ كَاَنَّهَا الظِّبَاءُ فَيَجِيْءُ الْبَعِيْرُ الْاَجْرَبُ فَيَدْخُلُ فِيْهَا فَيُجْرِبُهَا كُلَّهَا قَالَ فَمَنْ اَعْدَى الْاَوَّلَ۔ (صحیح مسلم)

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: مرض کی تعدی، الو کی نحوست اور ماہ صفر کے انتقال کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ایک اعرابی نے پوچھا: پھر کیا وجہ ہے کہ ایک خارش زدہ اونٹ تندرست اونٹوں میں ملتا ہے تو انہیں بھی خارش ہو جاتی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ پھر پہلے اونٹ میں خارش کس نے پیدا کی؟

یہ حدیث ابو ہریرہ سے مروی ہے، لیکن جب ان پر یہ حدیث پیش کی گئی تو انہوں

نے اس کی روایت کرنے سے انکار کیا اور اس کے خلاف یہ حدیث روایت کی: "لا یورد الممرض علی الصحیح" "بیمار کرنے والے شخص کو تندرست کے پاس مت لاؤ"۔ (نووی شرح مسلم علی حاشیہ مسلم ج ۲ ص ۲۳۰) نیز اس بحث سے قطع نظر کر کے اس حدیث کا صحیح محمل وہ ہے جسے علامہ بدر الدین عینی حنفی، ابن صلاح اور بیہقی وغیرہ نے بیان کیا ہے، چنانچہ علامہ عینی لکھتے ہیں:

و کانوا یظنون ان المرض بنفسہ یعدی فاعلمھم النبی ﷺ ان الامر لیس کذالک و انما اللہ عزوجل ھو الذی یمرض و ینزل الداء و لھذا قال فمن اعدی الاول من ابن صار فیہ الجرب۔

(عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۴۷)

عرب یہ گمان کرتے تھے کہ بیماریاں خود بخود متعدی ہوتی ہیں، پس حضور ﷺ نے انہیں بتلایا کہ ایسا نہیں ہے، اللہ ہی بیماری پیدا کرتا ہے، ورنہ پہلے اونٹ میں بیماری کہاں سے آ گئی؟

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے بیماری کے خود بخود متعدی ہونے کا رد فرمایا ہے اور اس عقیدہ کی نفی کی ہے اور صحت مندوں سے بیمار کو دور رکھنے کی حدیث میں تعدی کے لئے مرض کے سبب غالب ہونے کا اثبات فرمایا ہے۔

کوڑھی کو کھانے میں شریک کر لینا

اس سلسلہ میں "ترمذی" کی اس حدیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ حضور نے ایک کوڑھی کو اپنے ساتھ پیالے میں شریک فرما کر کہا کہ اللہ پر توکل کر کے کھاؤ۔ پس معلوم ہوا کہ امراض متعدی نہیں ہوتے اور اس کے جواب میں اولاً گزارش یہ ہے کہ یہ حدیث "ترمذی" کی ہے اور اس کے بارے میں خود امام ترمذی لکھتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضور کا نہیں، حضرت عمر کا واقعہ ہے۔ ثانیاً علامہ عینی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابو ہریرہ کی اس روایت کے پائے کی نہیں ہے جس میں کوڑھی سے دور رہنے کا حکم دیا ہے اور اس کے ثبوت کی تقدیر پر جواب یہ ہے کہ امراض خود بخود متعدی نہیں ہوتے، البتہ اللہ تعالیٰ نے مریض کی تندرست کے ساتھ مخالطت کو بیماری کے متعدی ہونے کا سبب غالب بنا دیا ہے، لیکن یہ

سبب بھی باقی اسباب کی طرح کبھی اپنے مسبب سے مختلف ہو جاتا ہے۔
(عمدۃ القاری ج ۲۱ ص ۲۴۷)

انگریزی دوائیں

ایلو پیتھک کی جو دوائیں از قسم مائع ہوتی ہیں ان میں الکحل ملی ہوئی ہوتی ہے اور ہومیو پیتھک کی کوئی دوا الکحل کی آمیزش سے پاک نہیں ہوتی۔ الکحل کی جتنی مقدار دواؤں میں شامل ہوتی ہے وہ نشہ آور نہیں ہوتی، لیکن خالص الکحل ایک خاص مقدار میں نشہ پیدا کر دیتی ہے، اس لئے عام طور پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ انگریزی دواؤں کو علاج میں استعمال کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اس سوال کے حل سے پہلے ہمیں یہ جائزہ لینا ہوگا کہ شراب کی کیا تعریف ہے، اس کی کتنی اقسام ہیں، ان کے کیا احکام ہیں اور دواؤں میں جو الکحل ملی ہوتی ہے وہ کس زمرہ میں آتی ہے۔

فقہاء حنفیہ نے حرام شرابوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔(۱) خمر (۲) باذق (۳) سکر اور (۴) نقیع الزبیب۔ خمر کی حرمت منصوص اور قطعی ہے اور باقی تین کی حرمت اجماع صحابہ سے ثابت اور ظنی ہے۔

خمر: انگور کے اس کچے شیرہ کو کہتے ہیں جو گاڑھا ہونے کے بعد جوش میں آ کر جھاگ چھوڑ دے۔

باذق: انگور کے اس پکے ہوئے شیرہ کو کہتے ہیں جو پک کر دو تہائی سے کم ختم ہو جائے خواہ نصف ختم ہو یا ایک تہائی اور وہ جوش کھانے کے بعد جھاگ چھوڑنے لگے۔

سکر: چھوہاروں میں ڈالے ہوئے اس کچے پانی کو کہتے ہیں جو گاڑھا ہو کر جوش میں آئے اور جھاگ چھوڑ دے۔

نقیع الزبیب: منقیٰ میں ڈالے ہوئے اس کچے پانی کو کہتے ہیں جو گاڑھا ہو کر جوش میں آئے اور جھاگ چھوڑ دے۔

یہ چاروں شرابیں حرام ہیں خواہ ان کی مقدار قلیل ہو یا کثیر، نشہ آور ہو یا نہ ہو، یہ حرام اور نجس ہیں، سوائے اضطرار اور مجبوری کے ان کو دواؤں میں بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

ان چاروں شرابوں کے علاوہ جس قدر نشہ آور مشروبات ہیں، امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک وہ صرف اسی مقدار میں حرام اور نجس ہیں جس مقدار میں وہ نشہ آور ہوں اور اس سے کم مقدار میں وہ نہ حرام ہیں اور نہ نجس۔ ان کو علاج اور تقویت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن عیش و طرب کے لئے انہیں قلیل مقدار میں بھی پینا حرام ہے اور امام محمد کے نزدیک نشہ آور مشروبات اپنی ہر مقدار میں حرام ہے، خواہ وہ مقدار قلیل ہو یا کثیر، نشہ آور ہو یا نہ ہو اور ہمارے مشائخ نے فساد زمانہ کے لحاظ سے امام محمد کے قول کو اختیار کر کے اس پر فتویٰ دیا ہے۔

الکحل آلو، گنے، چقندر، مکئی اور ایسی دوسری اجناس کے نشاستہ سے تیار کی جاتی ہے جس سے شکر حاصل ہو سکے، اس نشاستہ میں پانی شامل کر کے اسے جوش دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ رقیق کرتے ہیں۔ پھر اس میں مختلف کیمیکلز شامل کرتے ہیں۔ جس کے بعد یہ مرکب ایک مرتبہ میں الکحل بن جاتا ہے اور ایک خاص مقدار میں نشہ پیدا کرتا ہے۔

شراب کی جن چار قسموں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، الکحل ان سب سے خارج ہے، جس مقدار میں یہ نشہ آور ہو بالاتفاق حرام اور نجس ہے، لیکن اس سے کم مقدار میں امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کے مذہب کی رو سے یہ حرام اور نجس نہیں ہے اور امام محمد کے مذہب کے مطابق اس صورت میں بھی حرام اور نجس ہے۔

جب کسی مسئلہ میں ہمارے ائمہ کے متعدد اقوال ہوں تو مطلقاً امام اعظم کے قول پر فتویٰ دیا جاتا ہے اور جب امام اعظم کے ساتھ صاحبین میں سے بھی کوئی ہم نوا ہو تو یہ حکم اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے، لیکن اس اصول کے برخلاف یہاں ہمارے مشائخ نے امام محمد کے قول پر اس لئے فتویٰ دیا ہے کہ کہیں لوگ مقدار قلیل کا بہانہ بنا کر عیش و طرب کے لئے شراب پینا نہ شروع کر دیں۔ اس لئے انہوں نے فتنہ کا دروازہ بالکلیہ بند کرنے کے لئے امام محمد کے قول کو اختیار کر لیا۔

آج چونکہ ہر شخص انگریزی دواؤں کے علاج میں مبتلا ہے اور ابتلاء عام کی بناء پر احکام میں تخفیف کر دی جاتی ہے۔ اس لئے میں علمائے کرام سے گزارش کروں گا کہ مشائخ

نے امام محمد کے مذہب پر مقدار قلیل کی حرمت ونجاست کا فتویٰ اس خطرہ کے پیش نظر دیا تھا کہ اسے پی کر لوگ کہیں شراب کے راستہ پر نہ چل پڑیں، لیکن دواؤں میں الکحل کی جتنی مقدار شامل ہوتی ہے اس پر دوسری ادویات اس قدر غالب ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ مخلوط اور قلیل مقدار نہ شراب کی لذت سے آشنا کرتی ہے نہ اس کا راستہ دکھاتی ہے۔ لہٰذا جس علت کی بناء پر مشائخ نے مقدار قلیل میں امام محمد کے قول کا اعتبار کیا ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی، پس چاہیے کہ علماء کرام دواؤں کے معاملہ میں اصل کے مطابق امام ابوحنیفہ اور ابو یوسف کے مذہب پر فتویٰ دیں اور خالص الکحل استعمال کرنے کے مسئلہ میں امام محمد کے قول پر فتویٰ دیں یعنی خالص الکحل حرام اور نجس ہے، خواہ مقدار قلیل میں ہو یا کثیر میں، نشہ آور ہو یا نہ ہو، تقویت کے لئے پی جائے یا عیش وطرب کے لئے۔

نرسوں کا رواج

عہد رسالت میں عورتیں میدان جنگ میں زخمیوں کو دوا دیتی تھیں، پانی پلاتی تھیں۔ بعض لوگ اس پر نرسوں کو قیاس کر لیتے ہیں، لیکن یہ قیاس صحیح نہیں ہے کیونکہ وہ اضطرار کی صورت تھی اور اب ہسپتالوں میں کوئی مجبوری اور اضطرار نہیں ہے۔ حجاب تو الگ رہا نرسوں کے جسم پر جو لباس ہوتا ہے اس سے ان کا پورا ستر بھی قائم نہیں رہتا، اس لئے اسلامی اقدار کو اپنانے اور علاج کو شرعی لباس پہنانے کے لئے ضروری ہے کہ نرسنگ کے لئے مردانہ ہسپتالوں میں عورتوں کی بجائے مردوں سے کام لیا جائے۔



زاغ معروف کا شرعی حکم

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء کرام اس مسئلہ میں کہ آج کل بعض علماء کی طرف سے ایک فتویٰ شائع ہوا ہے کہ یہ عام کوا جو ہمارے شہروں میں پایا جاتا ہے اس کو کھانا حلال اور جائز ہے؟ ان کی طرف سے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ کوا مرغی کی طرح ہے۔ دانہ دنکا اور گندگی دونوں چیزیں کھاتا ہے۔ نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امام اعظم نے اس کوے کو بلا کراہت حلال قرار دیا ہے، براہ کرم دلائل سے حق واضح کریں۔ بینوا توجروا۔ سائل: محمد منشار ضوی

عام طور پر ہمارے شہروں میں جو کوا پایا جاتا ہے وہ چڑیا اور فاختہ وغیرہ کے بچوں کو پنجوں میں شکار کر کے کھاتا ہے، دانہ دنکا اور مردار بھی کھا جاتا ہے اور بچوں کے ہاتھ سے روٹی بھی جھپٹ کر لے جاتا ہے، اس کا کھانا قرآن کریم، حدیث شریف، ائمہ مذاہب کے اقوال اور قیاس صحیح سے ناجائز اور حرام ہے۔

زاغ معروف کے علاوہ کوے کی دو مشہور قسمیں اور ہیں، غراب زرع اور عقعق۔ غراب زرع معروف کوے سے چھوٹا ہوتا ہے، چونچ اور ٹانگیں سرخ ہوتی ہیں، نہ پنجوں سے شکار کرتا ہے اور نہ مردار کھاتا ہے، یہ بالاتفاق حلال ہے۔ عقعق جسامت میں کبوتر کے برابر ہوتا ہے، گندگی میں دانہ دنکا دونوں کھالیتا ہے، پنجوں سے شکار یہ بھی نہیں کرتا، اس کی حلت مختلف فیہ ہے۔

مؤخر الذکر دونوں قسمیں عام طور پر ہمارے شہروں میں نہیں پائی جاتیں۔ زاغ معروف کی حرمت پر چند دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) کوا ایک خبیث جانور ہے اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ویحرم علیهم الخبائث'' یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خبیث چیزوں کو حرام کر دیا ہے اور کوے کی خباثت پر دلیل یہ ہے:

عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ خَمْسٌ مِنَ الدَّوَابِ كُلُّهُنَّ فَاسِقٌ يُقْتَلْنَ فِي الْحَرَمِ الْغُرَابُ، وَالْحِدَاَةُ وَالْعَقْرَبُ وَالْفَارَةُ وَالْكَلْبُ الْعَقُوْرُ۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۴۶، صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۸۱)

حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ پانچ جانور کل کے کل فاسق ہیں جن کو حرم میں بھی قتل کر دیا جائے گا: کوا، چیل، بچھو، چوہا اور کاٹنے والا کتا۔

اور علامہ محمد بن محمود بابرتی متوفی ۷۸۶ھ فرماتے ہیں:

"و سمیت فواسق استعارۃ لخبثھن" (عنایہ شرح ہدایہ علی حاشیہ فتح القدیر ج ۲ ص ۲۵۵) یعنی ان جانوروں کو فاسق ان کی خباثت کی بناء پر فرمایا ہے۔ اسی طرح ملا علی قاری متوفی ۱۰۱۴ھ فرماتے ہیں: "اراد بفسقھن خبثھن" (مرقاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۳۸۸)۔ اور علامہ کمال الدین محمد بن موسیٰ الدمیری متوفی ۸۰۸ھ فرماتے ہیں:

انہ حیوان خبیث الفعل خبیث المطعم ولذا امر ﷺ بقتلہ فی الحل و الحرم۔ (حیوۃ الحیوان الکبریٰ ج ۲ ص ۹۴)

کوا ایک ایسا جانور ہے جس کے افعال بھی خبیث ہیں اور اس کا ذائقہ بھی خبیث ہے، اسی لئے حضور نے حرم اور غیر حرم میں اس کے قتل کا حکم فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث شریف اور تصریحات علماء کے مطابق کوا ایک خبیث جانور ہے اور ازروئے قرآن خبیث جانوروں کا کھانا حرام ہے "و یحرم علیھم الخبائث" پس کوا کھانا حرام ہے۔

(۲) سنن ابن ماجہ میں حدیث ہے:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ مَنْ يَّاكُلُ الْغُرَابَ وَقَدْ سَمَّاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاسِقًا وَاللّٰهِ مَا هُوَ مِنَ الطَّيِّبَاتِ۔ (سنن ابن ماجہ ص ۲۳۴)

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ کوے کو کون کھا سکتا ہے جب کہ حضور ﷺ اسکو فاسق فرما چکے ہیں۔ قسم بخدا! وہ حلال جانوروں میں سے نہیں ہے۔

(۳) عن عائشۃ ان رسول اللہ ﷺ قال خمس من الدواب کلھن فاسق

یقتلن فی الحرم الغراب الحدیث۔ (بخاری ج ۱ ص ۲۴۶) یعنی حضور نے فرمایا: کوا فاسق ہے اور حیوانات میں فسق اور فاسق کا اطلاق اس جانور پر آتا ہے جس کا کھانا حرام ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ نیز فرمایا: وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ۔

اسی سبب سے علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"واما المعنی فی وصف الدواب المذکورة بالفسق فقیل لخروجها من حکم غیرها من الحیوان فی تحریم قتله وقیل فی حل اکله"۔ (فتح الباری شرح بخاری ج ۴ ص ۴۰۸) یعنی کوے وغیرہ کو فاسق اس لئے فرمایا کہ یہ حلال جانوروں کے حکم سے خارج ہے، اس کو حرم میں قتل کرنا حلال اور اس کا کھانا حرام ہے۔

(۴) جو جانور پنجوں میں چیر پھاڑ کر شکار کر کے کھاتے ہیں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام فرما دیا۔ حدیث شریف میں ہے:

عَنِ الْعِرْبَاضِ بْنِ سَارِيَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم نَهٰى يَوْمَ خَيْبَرَ عَنْ كُلِّ ذِيْ نَابٍ مِّنَ السِّبَاعِ وَعَنْ كُلِّ ذِيْ مِخْلَبٍ مِّنَ الطَّيْرِ۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۵)

عرباض بن ساریہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم خیبر کو کچلیوں سے پھاڑنے والے درندے اور پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے حرام کر دیئے۔

اور کوا بھی چڑیا وغیرہ کے بچوں کو پنجوں سے چیرتا پھاڑتا ہے، اس لئے اس حدیث کے بموجب حرام قرار پایا۔

(۵) جمہور ائمہ مذاہب کے نزدیک بھی پنجوں سے چیر کر شکار کرنے والے پرندے حرام ہیں، چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

فی هذا الاحادیث دلالة لمذهب الشافعی وابی حنیفة واحمد وداؤد والجمهور انه یحرم اکل کل ذی ناب من السباع و ذی مخلب من الطیر۔ (نووی علی صحیح

مسلم ج ۲ ص ۱۴۷) یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور جمہور کے نزدیک پنجوں سے شکار کرنے والے پرندے حرام ہیں اور کوا بھی اس کلیہ میں داخل ہے۔ لہٰذا وہ بھی حرام قرار پایا۔

(۲) عقل اور قیاس صحیح سے بھی کوے کی حرمت ثابت ہے کیونکہ حرمت کا سبب یا خبث ہے اور یا ایذاء اور یہ دونوں وصف کوے میں موجود ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

والموثر فی الحرمۃ الایذاء و ھو طورا یکون بالناب و تارۃ یکون بالمخلب او الخبث و ھو قد یکون خلقۃ کما فی الحشرات والھوام و قد یکون بعارض کمافی الجلالۃ۔ (ردالمحتار ج ۵ ص ۱۶۵)

حرمت کا سبب یا تو ایذاء ہے اور وہ دانتوں سے پھاڑنے یا پنجے سے چیرنے سے ہوتی ہے اور یا خبث ہے اور وہ کبھی فطری ہوتی ہے، جیسے حشرات الارض میں اور کبھی طاری جیسے گندگی کھانے والے جانوروں میں۔

اور کوے میں ایذا کا وصف بھی ہے کیونکہ وہ چیرتا پھاڑتا ہے اور بچوں سے روٹی جھپٹ کر لے جاتا ہے اور خبث بھی ہے کیونکہ وہ گندگی اور مردار بھی کھالیتا ہے، اس لئے عقلاً اور قیاساً بھی حرام قرار پایا۔

ازالہ شبہات

بعض علماء عصر یہ کہتے ہیں کہ مرغی بھی گندگی اور پاک چیزیں دونوں کھالیتی ہے، پس جب مرغی حلال ہے تو کوا بھی حلال ہونا چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حرمت کے دلائل سے صرف نظر کر کے صرف مرغی پر قیاس کرنا مقصود ہے تو پھر کتا، چیل اور گدھ بھی حلال ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ جانور بھی گندگی اور مردار کے علاوہ پاک چیزیں مثلاً روٹی وغیرہ بھی کھالیتے ہیں اور اگر دوسرے دلائل کی وجہ سے یہ جانور حرام ہیں تو کیا وجہ ہے کہ ان دلائل کی وجہ سے کوا حرام نہ ہو؟ نیز اگر غور کیا جائے تو کوے اور مرغی میں فرق واضح ہے۔ کوے کو حضور نے فاسق فرمایا، اس کے برخلاف مرغی کو آپ نے خود تناول فرمایا۔ کوا چیر پھاڑ کر شکار کرتا ہے اور مرغی ایسا نہیں کرتی۔ کوے کو آپ نے حرم و غیر حرم میں قتل کرنے کا حکم دیا ہے،

مرغی کے لئے یہ حکم نہیں فرمایا۔ اصل بات یہ ہے کہ کوا مرغی کی طرح نہیں چیل اور گدھ کی طرح ہے، جس طرح وہ حرام ہیں یہ بھی حرام ہے۔

حلت زاغ کے سلسلہ میں یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ کوے کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ جو صرف مردار کھائے، وہ بالاتفاق حرام ہے۔ دوسری وہ جو صرف دانہ دنکا کھائے، یہ بالاتفاق حلال ہے، تیسری قسم وہ ہے جو گندگی اور مردار بھی کھائے اور دانہ دنکا بھی، اس میں اختلاف ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک یہ مکروہ ہے اور امام اعظم کے نزدیک بلاکراہت جائز ہے۔ یہ دلیل سخت مغالطہ آفرینی پر مبنی ہے۔ امام اعظم اور امام ابو یوسف کا اختلاف معروف کوے کے بارے میں نہیں، عقعق کے بارے میں ہے اور عقعق معروف کوے کے علاوہ ایک اور پرندہ ہے۔ ملاحظہ فرمایئے!

علامہ محمد بن حسین بن علی حنفی فرماتے ہیں:

والغراب ثلاثة انواع نوع یاکل الجیف فحسب فانه لا یوکل و نوع یاکل الحب فحسب فانه یوکل و نوع یخلط بینهما و هو ایضا یوکل عند الامام و هو العقعق لانه یاکل کالدجاجة و عند ابی یوسف انه یکره اکله لانه غالب اکله الجیف والاول اصح۔

(تکملۃ البحر الرائق ج ۸ ص ۱۷۲)

کوے کی تین قسمیں ہیں، اول جو صرف گندگی کھاتا ہے یہ حرام ہے۔ ثانی جو صرف دانہ کھاتا ہے یہ حلال ہے اور ثالث جو مردار اور دانہ دونوں کھانے والا ہے، جس کا نام عقعق ہے۔ امام صاحب کے نزدیک یہ بھی حلال ہے اور امام ابو یوسف کے نزدیک مکروہ ہے۔

اسی طرح ہدایہ میں ہے:

و قال ابو حنیفة لاباس باکل العقعق لانه یخلط فاشبه الدجاجة و عن ابی یوسف انه یکره لان غالب اکله الجیف۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ عقعق کے کھانے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ گندگی کو دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر کھاتا ہے، پس مرغی کے مشابہ ہے اور امام ابو یوسف

فرماتے ہیں کہ عقعق کی غالب خوراک
چونکہ مردار ہے اس لئے وہ مکروہ ہے۔

ان دوحوالوں سے یہ ظاہر ہو گیا کہ امام اعظم اور امام ابو یوسف کا یہ اختلاف معروف اور زیر بحث کوے میں نہیں، عقعق میں ہے۔ آیئے! اب دیکھیں کہ فقہاء کرام عقعق کی کیا تعریف کرتے ہیں:

علامہ طحطاوی فرماتے ہیں:

العقعق وزن جعفر طائر نحو الحمامة طويل الذنب فيه بياض و سواد و هو نوع من الغربان يشاءم به و يعقعق بصوت يشبه العين والقاف۔
(حاشیۃ الطحطاوی علی الدر المختار ج ۴ ص ۱۵۶)

عقعق کبوتر کی جسامت کا ایک پرندہ ہے، جس کی دم لمبی ہوتی ہے اور اس میں سیاہی اور سفیدی دونوں ہوتی ہیں، کوے کی ایک قسم ہے جس کو بدفالی کی علامت قرار دیتے ہیں اور اس کی آواز عین اور قاف (عق) کے مشابہ ہوتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی نے بھی ردالمحتار ج ۵ ص ۲۶۸ پر عقعق کی یہی تعریف بیان فرمائی ہے اور علامہ دمیری لکھتے ہیں:

صوته العقعقة و هو طائر على قدر الحمامة و هو على شكل الغراب و جناحاه اكبر من جناحي الحمامة و هو ذولونين ابيض و اسود طويل الذنب الى ان قال ليشتق له هذا الاسم من صوته
(حیوۃ الحیوان ج ۲ ص ۵۹)

عقعق کبوتر کی جسامت کا ایک پرندہ کوے کی شکل پر ہوتا ہے۔ اس میں سیاہ اور سفید دو رنگ ہوتے ہیں، اس کی دم لمبی اور پر کبوتر سے بڑے ہوتے ہیں۔ عق عق کی آواز نکالتا ہے، اسی وجہ سے عربوں نے اس کا نام عقعق رکھ دیا ہے۔

گندگی کھانے کے بارے میں اس کی عادت بیان کرتے ہوئے امام قاضی خان لکھتے ہیں:

و عن ابی یوسف رحمه الله تعالی انه قال

امام ابو یوسف کہتے ہیں: میں نے امام اعظم

سالت ابا حنیفۃ رحمہ اللہ تعالیٰ عن العقعق فقال لاباس بہ فقلت انہ یاکل النجاسات فقال انہ یخلط النجاسۃ بشیء اخر ثم یاکل۔ (فتاوی قاضی خان علی ھامش الہندیہ ج ۳ ص ۳۵۷)

سے عق عق کے بارے میں پوچھا، فرمایا: کوئی حرج نہیں، میں نے عرض کیا: وہ نجاست کھاتا ہے، فرمایا: وہ نجاست کو دوسری چیزوں کے ساتھ مخلوط کر کے کھاتا ہے۔

حاشیہ طحطاوی اور فتاوی عالم گیری میں بھی یہ عبارت پیش کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عق عق کی جسامت زاغ معروف سے چھوٹی اور کم ہوتی ہے، اس میں دو رنگ ہیں جب کہ زاغ معروف میں صرف ایک سیاہ رنگ ہوتا ہے، اس کی دم لمبی اور پر بڑے ہوتے ہیں، اس کی آواز عق عق ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف کوا غائیں غائیں کی آواز نکالتا ہے۔ عرب بدفالی کی علامت قرار دیتے ہیں، جب کہ عام کوے کا یہ حکم نہیں ہے۔ نیز یہ گندگی کو دوسری چیزوں کے ساتھ ملا کر کھاتا ہے جب کہ عام کوا یہ احتیاط نہیں کرتا۔ پس روز روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ عق عق اور پرندہ ہے اور کوا اور پرندہ ہے اور امام ابو یوسف اور امام اعظم کا اختلاف عقعق میں ہے، کوے میں نہیں اور یہ معروف کوا بہرحال حرام ہے۔



فلسفۂ حدود وتعزیرات

اصطلاح شرع میں حد اس معین سزا کو کہتے ہیں جس کو نافذ کرنا حقوق الہیہ میں سے ہے، اگر چہ تعزیر کا نفاذ بھی حقوق الہیہ میں سے ہے لیکن اس میں عقوبت کی مقدار معین نہیں ہوتی۔ جماہیر علماء اسلام کا جن حدود پر اجماع ثابت ہے وہ حد زنا، حد سرقہ، حد شراب اور حد قذف ہیں۔ حد زنا کی تعریف یہ ہے کہ اگر غیر شادی شدہ شخص سے یہ فعل شرعی طور پر ثابت ہو جائے تو اسے سو کوڑوں کی سزا دی جاتی ہے: اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ (النور: ۲) اور اگر شادی شدہ شخص سے یہ جرم ثابت ہو تو اسے سنگسار کر دیا جاتا ہے اور یہ بکثرت احادیث سے ثابت ہے۔ حد سرقہ میں چور کا پہلی مرتبہ چوری پر دایاں ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور عود کرنے پر بایاں پیر کاٹ دیا جاتا ہے اور بس وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَۃُ فَاقۡطَعُوۡۤا اَیۡدِیَہُمَا (المائدہ: ۳۸) اور حد شراب کی تفصیل یہ ہے کہ خمر کے فقط پینے سے خواہ نشہ ہو یا نہ ہو اور دیگر اشربہ محرمہ کو مقدار سکر تک پی لینے سے اسی کوڑوں کی حد واجب ہوتی ہے اور یہ اجماع صحابہ سے ثابت ہے اور حد قذف کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان پر صریح زنا کی تہمت لگائی جائے اور وہ حد کا طالب ہو تو تہمت لگانے والے پر اسی کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ وَ الَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡہُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً (النور: ۴) اگر کسی کافر پر یہی تہمت لگائی جائے یا مسلمان پر کفر، فسق یا خبث کا اتہام کیا جائے تو اسے تین سے انتالیس تک کوڑے لگائے جا سکتے ہیں۔ اسے تعزیر کہتے ہیں اور یہ قاضی کی صواب دید پر موقوف ہے۔

اجراء حدود پر ایک اشکال یہ ہے کہ ایک طرف تو اسلام نے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ پوشی کی ہدایت کی ہے۔ (من ستر مسلما سترہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ۔ بخاری) دوسری طرف اجراء حدود کا سختی سے حکم دیا، چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے: ''ولا تاخذ کم بھما رافۃ'' اور حد کا جاری کرنا اس کے ثبوت پر موقوف ہے اور اس کا ایک مقدمہ شہادت

ہے اور جس کے خلاف ہوگی اس کی یقیناً پردہ دری ہوگی۔ پس یہ دو احکام ایک ستر مسلم، دوسرا اجراء حدود جو معناً ہتک مسلم ہے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، اس کے جواب میں گزارش ہے کہ ستر اور شہادت دونوں کے محمل الگ الگ ہیں۔ اگر کوئی شخص اغواء شیطان اور شامت نفس سے ایک آدھ بار اس ورطۂ ہلاکت میں گر جائے تو اس سے درگزر کرنا چاہیے اور اگر کچھ لوگوں کے علم میں یہ جرم آ جائے تو ان کے لئے یہی مستحب ہے کہ وہ اس شخص پر ستر کریں۔ چنانچہ جب ہزال نے ماعز اسلمی کو مشورہ دیا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جا کر اپنے جرم کا اعتراف کرے تو آپ نے ہزال کو ملامت کرتے ہوئے فرمایا: "لَوْ سَتَرْتَهُ بِثَوْبِكَ لَكَانَ خَيْرًا لَكَ" (ابوداؤد) "اگر تو اس کی پردہ پوشی کرتا تو یہ بہتر تھا" اور اگر کوئی شخص اس فعل قبیح کو اپنا مشغلہ بنا لے اور ان افعال قبیحہ کی اشاعت اور ان پر فخر کرے تو اس کے خلاف شہادت دینا واجب ہے، تا کہ احکام الٰہیہ کی تخفیف اور حدود شرعیہ کی بے حرمتی نہ ہو۔

ایک اور اعتراض اس مقام پر کیا جاتا ہے کہ یہ سزائیں غیر انسانی اور وحشیانہ ہیں۔ اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ اس اعتراض کا سبب اور پس منظر یہ ہے کہ زنا اور شراب کا رواج آج معاشرہ کے بعض طبقوں میں اتنا عام ہو چکا ہے کہ اب وہ ان کی زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں۔ پس شراب اور زنا جن لوگوں کی طبیعت کا خاصا اور مزاج بن چکا ہے وہ اس کے قبح کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں اور چونکہ ان لوگوں پر ان جرائم کا قبح روشن نہیں ہے اس لئے انہیں ان کی سزا ظالمانہ معلوم ہوتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اختصاراً ان جرائم کی قباحت بیان کی جائے، تا کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ایسے شدید قبیح امر کو روکنے کے لئے اتنی ہی سزاؤں کی ضرورت تھی۔ قبح زنا پر اولاً دلیل یہ ہے کہ اس سے نسب محفوظ نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جب زنا عام ہوگا اور ایک عورت متعدد اشخاص سے وابستہ ہوگی تو "فقیر کی جھولی میں کون سا دانہ کس کا" یہ کون جان سکتا ہے اور پھر اس فعل قبیح سے پیدا ہونے والی اولاد کا مستقبل ہر لحاظ سے تاریک ہو جائے گا۔ ثانیاً جب عورت کسی ایک شخص سے خاص نہ ہوئی تو ہر شخص اس کا مدعی ہو سکتا ہے۔ اس سے بعض صورتوں میں فتنے پیدا ہوں گے اور قتل و غارت تک نوبت پہنچے گی۔ ثالثاً جب ایک عورت ہر مرد کی آماجگاہ بن سکے گی تو اس کی زندگی اور ایک جانور کے

طرز حیات میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ رابعاً جو عورت بھی تکمیل ہوس کا ذریعہ بنے گی، وہ آخر کسی کی بہن اور بیٹی ہوگی، اب اگر وہ اس فعل پر راضی رہیں تو بے غیرتی، نہ راضی ہوں تو کشت و خون، غرضیکہ یہ ایک فتنہ بے شمار فتنوں کا دروازہ ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اس فتنہ کو پوری شدت سے روکا جائے، اس لئے اللہ عزوجل اور اس کے رسول علیہ السلام نے اس جرم کے لئے کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی۔ اسی طرح شراب کی بے شمار خرابیاں ہیں، سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے عقل بے کار ہو جاتی ہے اور پھر انسان جانوروں کی سطح سے بھی گر جاتا ہے۔ فخر رازی اور علامہ آلوسی نے بیان کیا کہ ابن ابی الدنیا ایک شرابی کے پاس سے گزرے جو پیشاب کرنے کی حالت میں اسی پیشاب سے وضو کر رہا تھا اور کہتا تھا: ''الحمد للہ الذی جعل الاسلام نوراً و الماء طھورا''۔ ثانیاً اس سے عداوت اور بغض پیدا ہوتا ہے اور یہ عبادت میں حارج ہے، ثالثاً اس سے بکثرت امراض جسمانیہ پیدا ہوتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ام الخبائث فرمایا اور یہ کہ ''چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی''۔

ان قبائح کے پیش نظر ضروری تھا کہ اسے بھی پوری سختی سے روکا جاتا۔ اسی لئے شریعت نے اس پر اسی کوڑوں کی سزا مقرر فرمائی ہے، اس اعتراض کے جواب میں ثانیاً گزارش ہے: چلئے مان لیا یہ غیر انسانی سزائیں ہیں، لیکن جن افعال پر یہ سزائیں دی جاتی ہیں کیا وہ انسانوں کے کام ہیں؟ بغیر کسی ضابطہ اور قید کے جس سے چاہے ہوس پوری کر لینا، بلا استحقاق جس کا چاہے مال لے لینا، تہمت لگا کر کسی شریف کی عزت تباہ کر دینا اور شراب پینے کے بعد جو افعال صادر ہوتے ہیں، کیا یہ سب غیر انسانی افعال نہیں ہیں؟ پھر اگر غیر انسانی جرائم پر ویسی ہی سزا دی جائے تو یہ موجب طعن ہے یا عین حکمت کا مقتضی؟ ثالثاً ارباب عقل کے درمیان یہ امر مسلم ہے کہ اگر جسم کے کسی حصہ میں کوئی ایسی بیماری لاحق ہو جائے جس سے باقی جسم کو ضرر پہنچنے کا خدشہ ہو تو اس حصہ کو کاٹ کر الگ کر دیا جاتا ہے تاکہ باقی جسم اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکے۔ پس جب کوئی شخص چوری، شراب خوری یا بدکاری کرے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بار بار ان امور کا ارتکاب کرے گا اور اس سے مسلمانوں کے معاشرہ میں دو قسم کا نقصان لاحق ہوگا، ایک تو اس کی چوری اور بدکاری سے

ان کی عزت اور مال کا ضیاع ہوگا۔ دوسرے اس بیماری کے جراثیم معاشرہ کے دوسرے صحت مند افراد کو بیمار کر دیں گے اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''المومنون کرجل واحد'' ''تمام مسلمان جسم واحد کے بمنزلہ میں ہیں'' اور ایک شخص ایک عضو کے مرتبہ میں ہے، پس جب مسلم معاشرہ کے ایک فرد نے بدکاری کی تو یوں سمجھئے کہ جسم کا ایک عضو فاسد ہو گیا، جس کے فساد سے باقی اعضاء کے فساد یا انہیں ضرر پہنچنے کا خطرہ ہے، ایسے میں اس فاسد عضو کو کاٹ کر باقی اعضاء کو اس کے فساد سے بچا لینا کیا عین حکمت کے مطابق نہیں ہے؟ رابعاً انسان کی عظمت اور اس کا شرف صرف اسی شکل میں ہے جب وہ اللہ کا اطاعت گزار ہو اور جب اس نے اللہ تعالیٰ کے قوانین سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرکشی کی تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ہاتھ جس کی قیمت اسلام نے بشکل دیت پچاس اونٹ مقرر کی ہے، جب چوری کر کے نافرمانی کرے تو دس درہم کے عوض اسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ پس ظاہر ہوا کہ اللہ کا سرکش اور باغی کسی اعزاز کا مستحق ہی نہیں ہے کہ اجراء حدود اس کے منافی ہو۔ خامساً یہ کہنا بھی غلط ہے کہ سنگسار کرنے یا کوڑے لگانے سے انسانیت کی تذلیل ہوتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کوڑے وہ سرکشی اور بغاوت کھا رہی ہے جس نے حدود الٰہیہ کو لائق احترام نہیں سمجھا اس میں انسانیت کی نہیں بلکہ سرکشی اور بغاوت کی تذلیل ہے۔ سادساً ان سزاؤں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے دوسروں کو زبردست عبرت حاصل ہوتی ہے۔ جب ایک مجمع عظیم کے سامنے کسی کو رجم کیا جائے یا اسے کوڑے لگائے جائیں تو دیکھنے والوں پر یقیناً ایک نفسیاتی اثر پڑے گا، جب ایک کٹے ہوئے ہاتھ پیر والا سزا یافتہ شخص بار بار نظروں کے سامنے آئے گا تو ذہن میں اس جرم سے نفرت کا تصور اور گہرا ہو جائے گا۔ سابعاً اس بحث میں پڑنا کہ کس جرم کی کیا سزا ہونی چاہیے، ظاہر ہے کہ یہ ہمارا منصب نہیں، بلکہ جس ذات کا جرم کیا ہے، سزا کا بھی اسی کو اختیار ہے۔ جیسی اور جس طرح سزا دے وہ مالک علی الاطلاق ہے اور ہم اس کے مملوک مطلق ہیں۔ پس یا تو ہم اپنے آپ کو اس کی ملکیت میں شمار نہ کریں اور سرے سے انکار کر دیں اور یا جب اس کو حاکم مان لیا ہے تو اس کے کسی فیصلہ پر اعتراض نہ کریں۔ چنانچہ ان حدود کے مخاطب وہی لوگ ہیں جنہوں نے اس

کو حاکم مان لیا اور جو اس کے منکر ہیں وہ ان احکام کے مخاطب نہیں ہیں۔ ثامناً حدیث شریف میں ہے: حشر کے روز ایک حاکم کو پیش کیا جائے گا جس نے حد جاری کرتے وقت ایک کوڑا کم لگایا تھا، اس سے پوچھا جائے گا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا؟ تیرے بندے پر رحم کرنے کے لئے، ارشاد ہوگا: تو ہم سے زیادہ رحیم ہے؟ پھر حکم ہوگا: اسے جہنم میں ڈال دو۔ (تفسیر کبیر ج ۶ ص ۲۳۵) تاسعاً آج کی مہذب اور شائستہ دنیا سیاسی مجرموں اور نظریاتی مخالفوں پر قابو پانے کے بعد ان سے کیا سلوک کرتی ہے؟ جسم کے نازک حصوں کو عریاں کر کے انہیں سگریٹ سے داغنا، بجلی کے تل سے پیٹ میں پانی بھرنا، مجرم کو اس کی بہنوں کے ساتھ جمع کر کے انہیں برہنہ کر دینا، بجلی کے پیہم جھٹکے پہنچانا، بالآخر اسے یوں ہی نفسیاتی اور جسمانی اذیتیں دے دے کر مار ڈالنا، کیا یہ سب کچھ انسانی شرف اور فرشتوں کا تقدس ہے؟ انسان اپنے مجرم کو، جو نہ اس کا مخلوق ہے نہ مملوک ہے، جس طرح چاہے سزا دے اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا اور رب کائنات اپنے مجرم کو، جو اس کا مملوک و مخلوق ہے، اس سے کم درجہ کی سزا دے تو اعتراض کے لئے ان لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت ایں چہ بوالعجبی است

حدود و تعزیرات میں ایک یہ بحث بھی ہے کہ حد جاری ہونے کے بعد وہ شخص پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اس جرم پر اب آخرت میں اسے عذاب نہ ہوگا یا یہ کہ یہ اس کے عذاب کی صرف ایک قسط تھی اور دوسری قسط اسے آخرت میں بھگتنی ہوگی۔ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ حد جاری ہونے سے پہلے اگر اس نے توبہ کر لی ہے اور اپنے فعل پر نادم ہو کر آئندہ عدم عود کا عزم کر چکا ہے تو بمطابق فرمان رسالت "وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذَالِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ" (بخاری) اس سے آخرت میں مواخذہ نہیں ہوگا اور اگر وہ اتفاقاً پکڑا گیا اور اس میں سرکشی باقی ہے تو بمطابق فرمان الٰہی: ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (المائدہ) اس کے لئے یہ دنیاوی سزا کافی نہیں اور اسے آخرت میں اس سے زیادہ عذاب بھگتنا ہوگا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اسلام میں غرباء کا مقام

اسلام کے مخالفین جہاں اسلام پر اور بہت سے اعتراضات کرتے ہیں، ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ اسلامی ممالک کے مقابلے میں غیر اسلامی ملک زیادہ قوی اور مال دار ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں میں عبادت گزاروں کے بہ نسبت غیر عبادت گزار زیادہ مال دار اور خوشحال ہیں۔ اگر اللہ کو ماننا اور اس کی عبادت کرنا کوئی نفس الامری حقیقت ہوتی تو اللہ تعالیٰ اپنے ماننے اور عبادت کرنے والوں کو یوں کسمپرسی کے عالم میں نہ چھوڑتا۔ نیز قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (طٰہٰ: ۱۲۴) ''جو میری عبادت سے اعراض کرتا ہے اس پر معیشت تنگ ہو جاتی ہے''۔ حالانکہ آج معیشت انہیں پر کشادہ ہے جو اس کی عبادت سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اس کے جواب میں اولاً گزارش ہے کہ مادی وسائل کی کثرت اور مال و دولت کی فراوانی کبھی اور کسی دور میں بھی حق و باطل کا معیار نہیں رہی، ہر قسم کے عقائد و افکار رکھنے والوں میں یہ امور مشترک رہے ہیں، پس ایک ایسا عام اور مشترک امر حق و صداقت کا مابہ الامتیاز کیسے قرار پا سکتا ہے؟ ثانیاً اللہ تعالیٰ نے کفار اور مؤمنین کی نیکیوں کی جزاء کو تقسیم کر دیا، کفار کو ان کی نیکیوں کی جزاء دنیا میں دے دی اور مؤمنوں کی جزاء کو آخرت کے لئے محفوظ رکھا۔ رہا یہ سوال کہ اس کا الٹ کیوں نہ کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کافر غیب کا منکر ہے اور ظاہر کو مانتا ہے، اس لئے اس کے اعمال حسنہ کی جزاء اسی عالم شہادت میں مناسب تھی اور مومن چونکہ ایمان بالغیب کا اقراری ہے، اس لئے اس کے اعمال کی جزاء آخرت میں مناسب تھی، جو امور غیبیہ میں سے ہے، ثالثاً اللہ تعالیٰ رحمان ہے، اگر کافر کی دنیا اور آخرت دونوں عذاب ہوتیں تو کافر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کہتا: اے خداوند کریم! تو میرے حق میں رحمان کس طرح ہوگا جب کہ میں دنیا اور آخرت دونوں جگہ تیرے قہر کا شکار رہا ہوں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے رحمان ہونے کا تقاضا ہے کہ دنیا میں کفار پر وسعت کی جائے۔ رہا یہ امر کہ کفار پر

وسعت کرنے سے مؤمنوں پر دنیا کیوں تنگ ہوئی؟ اس کا جواب آئندہ سطور میں واضح ہو جائے گا۔ رابعاً اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ (الرعد:۲۶) ''اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہے رزق میں وسعت اور تنگی پیدا کرتا ہے''۔ حکمت اور عدل کا تقاضا تھا کہ مومن اور کافر دونوں اللہ کی مخلوق ہیں، لہٰذا دونوں پر وسعت اور تنگی کا ظہور ہونا چاہیے۔ پس مومن پر دنیا تنگ اور آخرت وسیع کر دی اور کافر پر دنیا وسیع اور آخرت تنگ کر دی۔ کما قال رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ''اَلدُّنْيَا سِجْنُ لِلْمُؤْمِنِ وَجَنَّةٌ لِلْكَافِرِ'' ''دنیا مومن کی قید اور کافر کی جنت ہے''۔ یا یوں کہیے کہ کافر کا مطمح نظر دنیا تھی اس کی دنیا وسیع کر دی اور مومن کا مطمح نظر آخرت تھی اس کی آخرت وسیع کر دی۔ خامساً حضور ﷺ نے فرمایا: ''الدنیا جیفۃ'' ''دنیا مردار ہے'' اور کفار کو قرآن نے مردہ قرار دیا حیث قال اللہ تعالیٰ ''فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى'' وقال اللہ تعالیٰ ''مَاۤ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ'' اور مردہ مردے کے مناسب ہوتا ہے، اس لئے دنیا کفار ہی کے مناسب تھی۔ اس کے مقابلے میں مومن زندہ ہے اور آخرت زندگی ہے۔ بقولہ تعالیٰ ''فی عیشۃ راضیۃ'' اور زندگی زندہ کے مناسب ہے، اس لئے مومن کو آخرت دے دی۔ سادساً کافر کا کفر فانی ہے، کیونکہ آخرت میں یہ کفر زائل ہو جائے گا اور وہ امور غیبیہ کا مشاہدہ کر کے ان پر ایمان لے آئے گا اور مومن کا ایمان باقی ہے کیونکہ اس کا ایمان دنیا میں بھی اللہ پر ہے اور آخرت میں بھی اللہ پر ہوگا۔ پس مومن کے حال کے مناسب بقا تھی اور آخرت باقی ہے، اسے آخرت دے دی اور کافر کے حال کے مناسب فنا تھی اور دنیا فانی ہے، اس لئے اسے دنیا دے دی۔ سابعاً کفار کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کی کثرت استدراجاً عطا فرمائی ہے۔ حیث قال اللہ تعالیٰ۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰۤى اِذَا فَرِحُوْا بِمَاۤ اُوْتُوْۤا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ (الانعام)

''پس جب انہوں نے اللہ کا پیغام بھلا دیا تو ہم نے ان پر نعمتوں کے تمام دروازے کھول دیئے حتیٰ کہ جب وہ ان نعمتوں پر اترانے لگے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا یعنی موت طاری کر دی اور

وہ حیرت زدہ ہو گئے"۔

اور مسلمانوں کو تنگی کا شکار ابتلاء کیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۝ (العنکبوت)

"کیا لوگوں نے گمان کر لیا ہے کہ انہیں محض ان کے دعویٰ ایمان پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی"۔

نیز حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَشَدُّ النَّاسِ بَلَآءً الْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ۔

سب سے زیادہ تکالیف انبیاء پر آتی ہیں پھر بحسب مراتب جو ان کے قریب ہو۔

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

خلاصہ یہ ہے کہ کفار پر نعمتیں ان کے حق میں استدراج ہیں اور مسلمانوں پر رحمتیں ان کے حق میں ابتلاء ہیں۔ ثامناً "ترمذی شریف" میں سہل بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر دنیا کی قدر اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر جتنی بھی ہوتی تو کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ بھی عطا نہ فرماتا، اس حدیث شریف سے معلوم ہوا مسلمان کے پاس دنیا کی وسعتوں کا نہ ہونا اس کی وجہ سے نہیں ہے کہ ان میں دنیا کی لیاقت نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ دنیا خود ان کے لائق نہیں ہے۔ تاسعاً "بخاری شریف" میں ہے: "حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ" "جہنم پر شہوات کا پردہ ہے اور جنت پر تکلیفوں کا"۔ اس لئے حصول جنت کی خاطر بہر نوع تکلیف اٹھانی ہو گی۔ عاشراً جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں سرشار ہوا سے اللہ کی راہ میں تمام تکلیفیں عین راحت معلوم ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہید جنت کی تمام نعمتیں دیکھنے کے بعد بھی یہ تمنا کرے گا کہ کاش! خدا کی راہ میں پھر سر کٹانے کی سعادت نصیب ہو اور جو دنیا کی محبت میں مستغرق ہوا سے عین راحت میں بھی زوال نعمت کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ پس اہل اللہ پر اگرچہ تکالیف اور مصائب طاری رہتے ہیں لیکن وہ سب ان کے حق میں کیف و سرور کا حکم رکھتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اس مقام پر کسی شخص کو یہ شبہ لاحق ہو کہ جب دنیا مردار، فانی، مچھر کے پر سے حقیر ہے اور مجسمہ شہوات ہے تو پھر مسلمان دنیا سے بے تعلق ہو کر گوشہ نشین ہو جائے اور جدوجہد، کشور کشائی اور ملک و سلطنت سے کنارہ کر کے فقر و مسکنت کی زندگی بسر کرے۔ جواباً گزارش ہے کہ مسلمان کا طریقہ بلاشک وشبہ فقر ہے، مگر فقیر مسکین نہیں، فقیر غیور ہے، وہ فقر نہیں جسے "کاد الفقر ان یکون کفرا" سے تعبیر فرمایا، بلکہ وہ فقر ہے جو باعث فخر ہے، وہ فقر جس میں ابوذر کا استغناء ہو، بلال کی غیرت ہو، عمر فاروق کا فقر جس کی ہیبت سے قیصر و کسریٰ کے ایوان لرزتے ہیں اور جس کی راتیں لوگوں کی ضرورتیں معلوم کرنے کے لئے مدینہ کی گلیوں میں خاک چھانتے گزر جاتی تھیں۔ جو بوریے پر بیٹھ کر دنیا کی تقدیر بناتا تھا اور جسے برسر منبر بھی ایک بوڑھا ٹوک دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ کشور کشائی اور زر و دولت کا حصول مسلمان اور کافر دونوں کرتے ہیں۔ لیکن کافر ملک کی تسخیر اور مال کی تحصیل اپنی حکومت اور ذاتی تعیش کے لئے کرتا ہے۔ کافر کائنات کو مسخر کرنے کے لئے مادی قوتوں کو اجاگر کرتا ہے اور اس کا منشاء کمال یہ ہے کہ وہ چاند سورج کے گرد گردش کرنے لگے اور مومن روحانی قوتوں کو بڑھاتا ہے اور اس کے کمال کا مبتداء یہ ہے کہ چاند سورج اس کے اشارے پر گردش کرتے ہیں۔

کافر کی یہ پہچان ہے کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان ہے گم اس میں ہیں آفاق

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا مردار اور مچھر کے پر کی طرح بے وقعت اس وقت ہے جب اسے برائے دنیا حاصل کیا جائے اور جب دنیا کی تحصیل اللہ کے لئے ہو تو یہ "ذالك فضل الله يؤتيه من يشاء" کا مصداق ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کاشانہ اقدس میں ایک بکری ذبح کی گئی اور اس کا گوشت تقسیم کیا گیا۔ حضور تشریف لائے اور فرمایا کہ کچھ بچا ہے؟ عرض کیا گیا: ایک ران باقی ہے، فرمایا: نہیں، سب باقی ہے سوائے اس ایک ران کے یعنی جو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا گیا وہ باقی ہے اور جو تمہارے نفس کے لئے رہ گیا، وہ فانی ہے۔ پس دنیا حاصل کر کے اسے اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کر دیا جائے تو وہ باقی اور

زندہ جاوید ہے اور اگر صرف ذاتی تعیش کے لئے اسے حاصل کیا جائے تو مردار اور مچھر کے پر کی طرح بے وقعت ہے۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ روحانیت کی بات تو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کے ساتھ خاص ہے، عام مادی نقطہ نگاہ سے اسلام نے سرمایہ داروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ایک ایسا اقتصادی نظام پیش کیا جس میں حصول زر کی کوئی تحدید نہیں۔ اراضی اور پیداوار کے دوسرے ذرائع کی مقدار متعین نہیں۔ محنت کش اور مزدور طبقہ کی اجرت کا کوئی تعین نہیں۔ قیمت مقرر کرنے کی اجازت نہیں جس کے نتیجہ میں گرانی کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ سرمایہ دار کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کی قیمت دن بدن بڑھا کر ہولناک حد تک پہنچا دے۔ مالکان کو اختیار ہے کہ وہ محنت کشوں کی جس قدر چاہے کم تنخواہ مقرر کریں۔ نتیجتاً چار پانچ روپیہ یومیہ پانے والا مزدور دس سال میں اپنی ذمہ داریاں اور اخراجات کئی گنا بڑھا کر گرانی اور افکار کے بوجھ تلے دب کر ٹی بی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مل کا مالک اس عرصہ میں ایک مل سے دس ملیں بنا تا ہے، آخر اس طبقاتی منافرت کی ذمہ داری کس نظام پر ہے؟ اس کے جواب میں گزارش ہے کہ موجودہ بے اطمینانی اور طبقاتی کش مکش کا ذمہ دار اسلام نہیں، بلکہ اس کا ذمہ دار ارباب اقتدار طبقہ ہے۔ جنہوں نے ایک طرف سے تو اسلام کو اپنانے اور اس کے احکام کے نفاذ سے گریز کیا اور دوسری طرف سرمایہ داروں کو ناجائز مراعات دیں جس کی وجہ سے چند افراد قوم کی دولت کے ایک عظیم حصہ پر قابض ہو گئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دفتری نظام میں نوکر شاہی کو فروغ دیا گیا۔ افسروں اور عام کلرکوں کی تنخواہوں میں ایسا فرق رکھا کہ یہاں بھی دو طبقہ پیدا ہو گئے۔ رشوت ستانی کو اس حد تک عام ہو جانے دیا کہ کوئی شخص بغیر رشوت دیئے کوئی کاروبار کر ہی نہیں سکتا۔ خویش و اقارب کے لئے بے مقصد اور غیر ضروری آسامیاں پیدا کر کے حکومت پر غیر ضروری بوجھ ڈالا گیا، زکوٰۃ، عشر، جزیہ اور خراج کے حصول کی طرف توجہ نہیں دی گئی، منظور نظر لوگوں کو ناجائز عطیات دیئے گئے، قومی سرمایہ سے امراء کو روپیہ فراہم کیا گیا، یہ اور اس قسم کی بہت سی غیر اسلامی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے قومی خزانہ اس قدر کمزور ہو گیا کہ وہ غرباء کے مسائل حل

کرنے میں بے بس ہو گیا اور امراء کو ارباب اقتدار سے اس قدر مراعات ملیں کہ وہ ملک کی عظیم دولت پر قابض ہو گئے۔ اب بھی کچھ بگڑا نہیں ہے۔ پوری ایمان داری سے کھوج لگا کرنا جائز طریقہ سے حاصل کی ہوئی دولت کو واپس لیا جائے، پاکستان کی کل زرعی پیداوار کا عشر قومی خزانہ میں داخل ہو۔ امراء کے تمام اموال سے زکوٰۃ لی جائے، جزیہ اور خراج وصول ہو، افسروں اور ماتحتوں کی تنخواہوں میں تفاوت کم کیا جائے، ناجائز عطیات واپس لئے جائیں تو یقیناً قومی خزانہ اتنا قوی ہو گا کہ اس سے بے روزگاروں کے لئے اسباب فراہم ہو سکیں گے، یتیموں اور ضرورت مندوں کے لئے ان کی ضروریات کے مطابق وظائف مقرر کئے جائیں اور اس طرح حضرت عمر فاروق اور عمر بن عبدالعزیز کے مثالی طرز حکومت کا احیاء کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ بے اطمینانی ختم نہ ہو جائے۔

آیئے! اب اس امر پر غور کریں کہ اسلام نے امراء کو عزت دی ہے یا غرباء کو، اسلام نے امراء پر زکوٰۃ اور عشر کو فرض کیا اور حکم دیا کہ غرباء کو اپنی پیداوار کا دسواں اور اپنے اموال کا چالیسواں حصہ دو۔ غرباء کو یہ نہیں فرمایا کہ تم امراء سے جا کر یہ رقم لو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عشر و زکوٰۃ کی ادائیگی میں امراء غرباء کے محتاج ہیں۔ غرباء کو امراء کی احتیاج نہیں، ان محنت کشوں اور مزدوروں کو سرمایہ داروں کے دروازوں پر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ امراء غرباء کے دروازوں پر جائیں اور ان سے عشر زکوٰۃ لینے کی گدا کریں۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اگر غرباء کو امراء عشر و زکوٰۃ نہ دیں تو ان کی دنیا بگڑنے کا اندیشہ ہے اور اگر غرباء امراء سے عشر و زکوٰۃ نہ لیں تو ان کی آخرت بگڑنے کا خطرہ ہے۔ پس امیر اگر زکوٰۃ دے کر غریب کی دنیا سنوارتا ہے تو غریب زکوٰۃ لے کر امیر کی عقبیٰ سنوارتا ہے۔ وہ دنیا کے محسن یہ عقبیٰ کے محسن۔ عشر و زکوٰۃ دینے کے باوجود امراء عرصہ محشر میں پانچ سو سال تک کھڑے منتظر ہوں گے، جب غرباء، محنت کشوں اور مزدوروں کا قافلہ گزر جائے گا تو پانچ سو سال بعد امراء کو جنت میں جانے کی اجازت ملے گی۔ اجر و ثواب کی بات آئی ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ امراء

صدقہ کریں تو اللہ تعالیٰ نے اس سے سات سو گنا تک اجر دینے کا وعدہ فرمایا، لیکن جب غربت کے ماروں، آلام ومصائب پر صبر کرنے والوں کی باری آئی تو اعداد وشمار ختم کر دیئے اور فرمایا: اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾ (الزمر: ۱۰) "صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب اجر وثواب عطا فرمائے گا"۔

غرباء اکثر بھوک کے پیاسے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سب پر ایک ماہ کی بھوک پیاس فرض کر دی، یہ حصول معاش کے لئے وطن سے دور مارے مارے پھرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے امراء پر حج فرض کر دیا۔ امراء روزے رکھیں تا کہ ان پر غرباء کی بھوک ظاہر ہو، یہ حج کے لئے سفر کریں تا کہ ان میں مسافر اور غربت کا رنگ پایا جا سکے۔ زیب وزینت اور لذت سے دور رہیں تا کہ ان پر غربت کی بے کسی طاری ہو۔ مہد سے لے کر لحد تک رسول اکرم ﷺ کی ساری زندگی ملاحظہ کیجئے۔ آپ نے خزائن ارض وسماء کی چابیاں رکھنے کے باوجود فقر وفاقہ سے زندگی گزاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیدا کرتے ہی آپ کو بنو سعد کی ایک غریب دایہ کی آغوش میں دے دیا، تا کہ ابتداء سے یہ تصور قائم ہو کہ آپ غرباء کے ہیں۔ آپ نے بکریاں چرائی ہیں، خندقیں کھودی ہیں، دودھ دوہا ہے، پھٹے کپڑے سیئے ہیں، بوجھ اٹھایا ہے اور وہ سارے کام کئے ہیں جو غرباء کرتے ہیں، قرضہ لیا، سامان گروی رکھا ہے، پیوند لگا لباس پہنا ہے، دو وقت کا کھانا نہیں کھایا، دو دو ماہ کاشانۂ اقدس میں آگ نہیں جلی، بھوک کی شدت سے شکم مبارک پر دو دو پتھر باندھے ہیں، صنادید قریش کی باتیں سنی ہیں، طنز واستہزاء کا نشانہ بنے ہیں اور یہ وہ سب حالات ہیں جن کا عام طور پر غرباء کو سامنا ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ امت کا کوئی غریب ان حالات کا سامنا کرے تو اس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہو اور وہ یہ سوچے کہ ان تکالیف میں میں تنہا تو نہیں۔ رسول اللہ نے بھی یہ دن گزارے ہیں اور مجھ سے بڑھ کر کٹھن ایام گزارے ہیں۔ جب بھوک کی شدت سے کوئی غریب بلبلا اٹھے، جب غم واندوہ کے کرب سے کوئی محنت کش بے چین ہو جائے تو رسول اللہ کی تکالیف اس کا سہارا بن جائیں۔ جب دنیا کسی مزدور کو ٹھکرا دے، اس پر آوازے اور پھبتیاں کس کر اس کی عزت کو پامال کر دے تو رسول اللہ کا صبر واستقلال اس کے زخموں کے

لئے تسلی کا مرہم بن جائے۔ امراء کوٹھیوں کے مالک ہو سکتے ہیں، کارخانے چلا سکتے ہیں، بینک میں زرکثیر جمع کرا سکتے ہیں، لیکن رسول اللہ کی زندگی کے پیکر نہیں بن سکتے اور غرباء اور کچھ لیں یا نہ لیں رسول اللہ کی زندگی لے سکتے ہیں۔ امراء کے لئے مال و دولت کے انبار سہی، غرباء کے لئے یہ اعزاز کچھ کم تو نہیں کہ رسول اللہ کی گزاری ہوئی زندگی ان کی زندگی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ فقراء رسول اللہ پر فخر کرتے، مگر کیا یہ ان کی عظمتوں کی معراج نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فقراء پر فخر فرمایا ہے اور جب یہی غریب مزدور اور محنت کش لوگ جن کے لئے رسول اللہ نے ساری زندگی فقر و فاقہ میں گزاری، سڑکوں پر ماؤ اور لینن کی سیرت کا پرچار کرتے پھریں تو ذرا چشم تصور سے سوچیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر کیا گزرتی ہوگی؟

حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرصۂ محشر میں ایک شخص سے فرمائے گا: میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی، وہ شخص عرض کرے گا: اے رب اللہ! تو رب العالمین ہے، میں تیری کیسے عیادت کرتا؟ اللہ عزوجل ارشاد فرمائے گا: میرا فلاں بندہ بیمار تھا، اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہاں پاتا، پھر فرمائے گا: میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا، وہ شخص پھر عرض کرے گا: اے خداوند! تو رب العالمین ہے، میں تجھے کیسے کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بھوکا تھا، تو اگر اسے کھلاتا تو مجھے وہاں پاتا، پھر فرمائے گا: میں پیاسا تھا تو نے مجھے پانی نہ پلایا، وہ عرض کرے گا: میں تجھے پانی کیسے پلاتا؟ فرمائے گا: میرا فلاں بندہ پیاسا تھا، تو اسے پانی پلاتا تو مجھے وہاں پاتا۔

اس حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے غریب بندوں پر الطاف و عنایت کی انتہا کر دی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ غریب کی ذات کو اپنی ذات قرار دیتا ہے۔ امراء اپنی ثروت و حشمت اور مال و دولت پر فخر کرتے ہیں اور اے غرباء! تمہارے افتخار کے لئے یہ کچھ کم تو نہیں کہ تم بیمار ہو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں بیمار ہوں۔ تم بھوکے ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں بھوکا ہوں، تم پیاسے ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں پیاسا ہوں۔ تمہاری ذات کو اپنی ذات قرار دیا۔ تمہارے حال کو اپنا حال قرار دیا۔ امراء امارت پر ناز کرتے ہیں اور اے غرباء! تم خدا کی ذات پر ناز کرو، مال ان کا ہے خدا تمہارا ہے۔

انڈا حلال ہے

کیا فرماتے ہیں علماء دین وفقیہان شرح متین اس مسئلہ میں کہ:

بیضۂ مرغ جس کا استعمال عام ہے اس کے کھانے کا شرعی حکم کیا ہے؟ صحابہ کرام کے گھروں میں مرغیوں کی پرورش کا تذکرہ موجود ہے مگر یہ نظر سے نہیں گزرا کہ ان حضرات نے انڈا کھایا ہے، اگر نقل موجود ہو تو تشویش ختم ہو جاتی ہے۔ براہ کرم اگر نظر سامی سے گزری ہے مع حوالہ ارقام فرمائیں۔ وجہ تشویش یہ ہے کہ بیضہ مادہ ولادت جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی چوزہ ضروری عمل کے بعد انڈے سے برآمد ہوتا ہے، اس جگہ میں آپ کی اجازت سے بعض لوگوں کا یعنی امجد یہ والوں کا جواب من وعن نقل کرتا ہوں۔ امت مسلمہ کا کھانا حلت کی دلیل ہے، نقل کی ضرورت نہیں۔ وھذا الیس بشیءاس لئے کہ امت مسلمہ قدوۃ نہیں ہے اور جو اس امت میں قدوۃ ہیں، انہیں کے عمل کی تلاش ہے تو نقل کی ضرورت تو ہے وہ آپ کے تعاون سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے۔

(محمد رفعت اللہ صدیقی، 19.L.S.O، لانڈھی نمبر ۱۹، کراچی)

الجواب ہوالموفق للصواب:

ہر حلال پرندے کا انڈا کھانا جائز ہے اور اس پر احادیث شریف میں دلائل موجود ہیں۔ احادیث کے علاوہ فقہائے کرام کی تصریحات بھی بکثرت موجود ہیں۔

امام بخاری اپنی ''صحیح'' میں روایت فرماتے ہیں:

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ ثُمَّ رَاحَ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بُدْنَةً وَ مَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً وَ مَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ فَكَاَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشًا اَقْرَنَ	حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس شخص نے جمعہ کے دن کو غسل فرمایا۔ پھر مسجد میں جمعہ پڑھنے گیا، اس نے گویا اونٹنی کا صدقہ کیا اور جو شخص دوسری ساعت میں گیا اس نے گویا گائے

وَ مَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً وَ مَنْ رَاحَ فِي السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً۔ (صحیح بخاری ج ا ص ۱۲۱)	کا صدقہ کیا اور جو تیسری ساعت میں گیا اس نے گویا سینگوں والے مینڈھے کا صدقہ کیا اور جو چوتھی ساعت میں گیا اس نے گویا مرغی کا صدقہ کیا اور جو پانچویں ساعت میں گیا اس نے گویا انڈے کا صدقہ کیا۔

اس حدیث شریف میں انڈے کا صدقہ کرنے اور اس سے تقرب حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اگر انڈا احرام اور نجس ہوتا تو اس کے صدقہ کرنے کا حضور کبھی ذکر نہ فرماتے۔ حضور اکرم ﷺ نے انڈے کا ذکر ان تمام جانوروں کے ساتھ فرمایا ہے جو حلال ہیں اور دور رسالت میں ان کے کھانے کا عام رواج تھا۔

اور یہ اس بات پر ظاہر قرینہ ہے کہ مرغی کے انڈے کے کھانے کا بھی اس دور میں عام رواج تھا، علاوہ ازیں علامہ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ زہری کی روایت میں ''کانما قرب'' کی جگہ ''کالذی یھدی'' کے الفاظ ہیں اور ہدی کے معنی قربانی کے بھی ہیں۔
(فتح الباری ج ۳ ص ۱۸)

اور مرغی اور انڈے کی قربانی اگرچہ متعارف اور مشروع نہیں ہے، تاہم اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ انڈا بھی مرغی کی طرح حلال اور کھانے کی چیز ہے، نیز امام احمد بن حنبل اپنی مسند میں اپنی سند کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ:

عن علی ان النبی علیه السلام اتی ببیض النعام فقال انا قوم حرم اطعموه اهل الحل۔ (بہ حوالہ نیل الاوطار ج ۵ ص ۲۳)	حضرت علی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کی خدمت میں شتر مرغ کے انڈے لائے گئے، آپ نے فرمایا: میں محرم ہوں، جو لوگ غیر محرم ہیں ان کو یہ کھلا دو۔

شتر مرغ کا انڈا تمام پرندوں کے انڈوں میں سب سے بڑا انڈا ہے اور جب اس کے کھانے کے بارے میں حضور ﷺ کا حکم موجود ہے تو باقی حلال پرندوں کے انڈے بطریق اولیٰ جائز قرار پائے، علاوہ ازیں امام بیہقی ''شعب الایمان'' میں حدیث مرفوع

بیان کرتے ہیں:

ان نبیا من الانبیاء شکی الی اللہ سبحانہ الضعف فامرہ باکل البیض و فی شہوتہ نظر و یختار من البیض الحدیث علی العتیق و بیض الدجاجۃ علی سائر بیض الطیر۔

(بہ حوالہ زاد المعاد ج ۳ ص ۱۵۸)

انبیاء سابقین سے ایک نبی نے اللہ تعالیٰ سے اپنی کمزوری کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو انڈے کھانے کا حکم فرمایا (یہ روایت محل نظر ہے) اور تازہ انڈوں کو باسی انڈوں پر اور مرغی کے انڈوں کو دیگر پرندوں کے انڈوں پر ترجیح دینی چاہیے۔

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

البیضۃ اذ خرجت من دجاجۃ اکلت۔

(عالمگیری ج ۵ ص ۳۳۹)

اگر مرغی مر جائے اور اس میں سے انڈا نکال لیا جائے اسے کھایا جاسکتا ہے۔

اور امام ابن بزاز کردری فرماتے ہیں:

ماتت الدجاجۃ وفی بطنھا بیضۃ توکل

(بہ حوالہ فتاویٰ بزازیہ علی ہامش الہندیہ ج ۶ ص ۳۶۵)

مرغی مر جائے اور اس کے پیٹ میں انڈا ہو تو نکال کر کھا لیا جائے۔

اور جب مردہ مرغی کے پیٹ سے انڈا نکال کر کھالینا جائز ہے تو زندہ سے حاصل شدہ انڈے بطریق اولیٰ جائز قرار پائیں گے۔ بہرحال ان تمام تصریحات سے آفتاب سے زیادہ واضح ہوگیا کہ مرغی اور دیگر حلال پرندوں کے انڈے کھانا جائز ہے



برصغیر کی سیاست اور علماء اہل سنت

ہفت روزہ ''صحافت'' ۲۳ جنوری تا ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ء میں نعیم اختر کے نام سے ایک دل آزار مضمون بعنوان ''کیا جمعیت علماء پاکستان بھی پاکستان دشمن جماعت ہے'' شائع ہوا۔ اس مضمون کی پیشانی پر یہ سطور تحریر تھیں: زیر نظر مضمون میں نعیم اختر صاحب نے جمعیت علماء پاکستان کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ان سے ہمارا متفق ہونا ضروری نہیں، البتہ یہ بات خود ہمارے لئے انتہائی حیرت کا باعث ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب جو بظاہر ایک منجھے ہوئے سیاستدان اور بااصول انسان ہیں اس حد تک فرقہ پرست ہو سکتے ہیں۔ ہم ان کی طرف سے یا ان کے کسی ذمہ دار فرد کی طرف سے وضاحت بخوشی شائع کریں گے۔ (صحافت شمارہ مذکورہ ص ۲۷)

ہم کو بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ صحافت کے ادارہ نے جو اس مضمون کے جواب کو شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی، بلکہ جواب چھاپنے کی پیش کش کی تھی وہ اس کو پورا نہ کر سکا۔ مولانا حفیظ نیازی مدیر ''رضائے مصطفیٰ'' علامہ اسد نظامی اور دیگر ذمہ دار علماء اہل سنت دستی جوابات لے کر جناب ضیاء شاہد صاحب کے پاس گئے، لیکن انہوں نے اس دل آزار اور خلاف واقع حقائق پر مشتمل مضمون کے جواب شائع کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ایک طرف محاذ آرائی شروع کر کے نہ صرف اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کیا بلکہ قلم کی آبرو کو رسوا اور عصمت صحافت کو داغ دار کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

جن دنوں ''صحافت'' میں یہ اشتعال انگیز مضمون شائع ہوا، ان دنوں میں کراچی کے لئے عازم سفر تھا، واپس آیا تھا تو ماہنامہ ''فیضان'' میں مولانا شبیر احمد صاحب ہاشمی زید مجدہ کا قلم حقائق رقم اس مضمون کا قصاص لے چکا تھا۔ میں نے مضمون پڑھا اور اس سے بے اختیار مولانا کے لئے دعائیں نکلیں، مولیٰ تعالیٰ ان کے دینی ذوق اور مذہبی حمیت کو قائم و

دائم رکھے۔

میرے خیال میں یہ مضمون ''صحافت'' کے جواب کے لئے کافی تھا، لیکن جب قاری عطاء اللہ صاحب مدیر ''فیضان'' میرے پاس تشریف لائے اور مخدوم و محترم حکیم محمد موسیٰ صاحب کی وساطت سے اصرار کیا کہ میں بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کروں، بہر حال ان حضرات کے حکم سے سرتابی کی مجال میں اپنے اندر نہیں پاتا۔ اس لئے میں بھی اس موضوع پر اپنے انداز سے کچھ گزارشات پیش کر رہا ہوں۔ فاقول و باللہ التوفیق

نعیم اختر صاحب لکھتے ہیں:

اہل سنت جماعت عقیدے کے دو بڑے حصے ہیں: یعنی دیوبندی اور بریلوی۔ دیوبندی اصحاب شاہ ولی اللہ، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی وغیرہ کے پیروکار ہیں۔ جب کہ بریلوی حضرات مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی، مولانا حشمت علی قادری، مولانا عبدالحامد بدایونی، سید دیدار علی شاہ، مولوی محمد طیب ہمدانی وغیرہ کو اپنا پیشوا مانتے ہیں۔

جمعیت علماء پاکستان قیام پاکستان کے وقت موجود نہ تھی اور نہ اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس کے موجودہ قائدین مثلاً مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالستار نیازی، شاہ فرید الحق، ظہور الحسن بھوپالی وغیرہ کا تحریک پاکستان سے کسی قسم کا کوئی تعلق تھا۔ اس مکتب فکر کے صرف ایک نامور عالم دین حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی نے البتہ مسلم لیگ کی حمایت کی تھی، لیکن یہ ان کا ذاتی فعل تھا اور جس طرح دیوبندی علماء کرام میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی پاکستان کے لئے غیر مشروط حمایت بلکہ کوشش کو پورے دیوبند مکتب فکر پر لاگو نہیں کیا جاسکتا جو اپنی سیاست کے لئے جمعیت علمائے ہند کو پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتا تھا، اسی طرح مولانا عبدالحامد بدایونی کی پاکستان کے لئے تائید و حمایت تمام بریلوی علماء کو تحریک پاکستان کے حامی لیڈر نہیں بنا سکتے۔ (صحافت شمارہ مذکورہ ص ۲۷)

اہل سنت و جماعت کے مقتداء کون ہیں؟

نعیم اختر صاحب اس پیراگراف میں کئی باتیں تاریخی طور پر غلط کہہ گئے ہیں، پہلی

بات تو یہ ہے کہ انہوں نے اہلسنت کے اکابر علماء کی جو فہرست پیش کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اہل سنت کے اکابر علماء میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مولانا فضل حق خیر آبادی، اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، صدر الشریعت مولانا امجد علی، مولانا حامد رضا خاں، مولانا مصطفیٰ رضا خان، مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا عبدالسلام باندوی، محدث سورتی، پیر جماعت علی شاہ محدث علی پوری، سید محمد محدث کچھوچھوی، پیر مانکی شریف، پیر زکوڑی شریف، خواجہ قمر الدین سیالوی، پیر عبدالرحیم بھر چونڈی شریف، مفتی عنایت احمد کاکوری اور مولانا کفایت علی کافی شامل ہیں۔

رہے مولانا حشمت علی تو وہ علمی اور عملی خدمات کے اعتبار سے صف اول کے علماء میں سے نہیں تھے، سیاسی نظریات میں ان کی سوچ منفرد اور علیحدہ مزاج تھا، سیاسی خیالات میں جمہور علماء اہل سنت نے ان کی کبھی تائید نہیں کی، اس لئے ان کے اقوال کو جمہور اہل سنت پر حجت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اور مولانا طیب صاحب ہمدانی مصنف ''تجانب اہل سنت'' علمی اعتبار سے کسی گنتی شمار میں نہیں ہیں، وہ مولانا حشمت علی کے داماد تھے اور ان کا مبلغ علم فقط اتنا تھا کہ وہ شرقپور کی ایک چھوٹی سی مسجد کے امام تھے اور بس! ''تجانب اہل سنت'' میں جو کچھ انہوں نے لکھا وہ ان کے ذاتی خیالات تھے، اہل سنت کے پانچ ہزار علماء اور مشائخ نے بنارس کانفرنس میں قرارداد قیام پاکستان منظور کر کے مولانا حشمت علی کے سیاسی افکار اور ''تجانب اہل سنت'' کے مندرجات کو عملاً رد کر دیا تھا۔ لہٰذا سیاسی نظریات میں ایک غیر معروف مسجد کے غیر معروف امام (مولانا طیب) اور غیر مستند شخص کے سیاسی خیالات کو سواد اعظم اہل سنت پر لاگو نہیں کیا جا سکتا، نہ یہ شخص ہمارے لئے حجت ہے اور نہ اس کے سیاسی افکار۔

البتہ سلوف دیوبند میں سید احمد سے لے کر مفتی محمود تک تمام علماء سوائے مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا شبیر احمد عثمانی (اور ان کے بعض متبعین) کے سب کے سب انگریز کے حامی اور وفادار اور بعض کانگریس کے ایجنٹ تھے۔ علماء دیوبند ہوں یا مجلس احرار یا جماعت

اسلامی کے رہنما، عقائد و افکار میں یہ سب مشترک ہیں (سوائے بعض جزوی فروعات کے) اور ان سب حضرات نے (سوائے مولانا ظفر احمد اور مولانا شبیر احمد عثمانی جن کا ذکر پہلے ہم کر چکے ہیں) تحریک پاکستان کی مخالفت میں سرتوڑ کوشش کی تھی۔

جس طرح ہم نے تقاضائے انصاف کے پیش نظر مولانا حشمت علی اور مولانا طیب کے سیاسی افکار کو رد کر دیا ہے کیا موجودہ دیوبندی حضرات میں بھی یہ جرأت ہے کہ وہ سید احمد سے لے کر مفتی محمود تک تمام سلوف دیوبند کے خیالات اور افکار سے برأت کا اظہار کر کے ان سب کو رد کر دیں اور ان حضرات نے جس طرح انگریز کی وفاداری اور کانگریس کی کاسہ لیسی کی ہے اس کے سبب ان کو ملت اسلامیہ کا غدار قرار دے دیں۔ (یاد رہے مولانا حشمت علی اور مولانا طیب نے انگریز اور کانگریس کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا، صرف مسلم لیگ میں بعض بدعقیدہ لوگوں کے شمول پر تنقید کی ہے)۔

نعیم اختر صاحب نے لکھا ہے: ''جس طرح دیوبندی علماء کرام میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی پاکستان کے لئے غیر مشروط حمایت بلکہ کوشش کو پورے دیوبندی مکتب فکر پر لاگو نہیں کیا جا سکتا جو اپنی سیاست کے لئے جمعیت علماء ہند کو پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتا تھا، اسی طرح مولانا عبدالحامد بدایونی کی پاکستان کے لئے تائید و حمایت تمام بریلوی علماء کو تحریک پاکستان کے لیڈر نہیں بنا سکتے''۔ (صحافت شمارہ مذکور ص ۲۷)

نعیم اختر صاحب کی یہ تحریر سراسر خلاف واقع ہے۔ اس کے برعکس اصل واقعہ یہ ہے کہ مولانا حشمت علی اور مولانا طیب صاحب کے سوا تمام اہل سنت علماء نے اپنے ذاتی پیسے خرچ کر کے قیام پاکستان کے لئے زبردست مساعی اور مسلسل جدوجہد جاری رکھی اور علماء دیوبند میں سوائے مولانا ظفر احمد اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے، جنہوں نے مسلم لیگ کے فنڈ سے تحریک قیام پاکستان کی تائید اور حمایت کی، تمام علماء دیوبند، مجلس احرار اور جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کی بھرپور مخالفت کی۔

نعیم اختر صاحب نے مذکورہ پیراگراف میں لکھا ہے:

جمعیت العلماء پاکستان قیام پاکستان کے وقت موجود نہ تھی اور نہ اس امر کا کوئی ثبوت

ملتا ہے کہ اس کے موجودہ قائدین مثلاً مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالستار خاں نیازی، شاہ فرید الحق، ظہور الحسن بھوپالی وغیرہ کا تحریک پاکستان سے کوئی تعلق تھا۔

(صحافت شمارہ مذکورہ ص ۲۷)

اس عبارت میں نعیم اختر صاحب نے سخت غلط بیانی اور مغالطہ آفرینی سے کام لیا ہے۔ جمعیت العلماء پاکستان کے وجود کی بحث آگے آرہی ہے۔ اسی طرح مولانا عبدالستار خاں صاحب نیازی مدظلہ جو اپنی ساری زندگی نظام مصطفیٰ کے نفاذ کے لئے وقف کر چکے ہیں اور جنہوں نے اس جرم کی پاداش میں اپنی عمر عزیز کا زیادہ تر حصہ جیل میں گزارا ہے، قیام پاکستان کے لئے ان کی مساعی، مسلم لیگ کی حمایت، انگریز اور کانگریس دونوں سے ان کی مخالفت اور قائد اعظم محمد علی جناح سے ان کے روابط تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں، جن کو ہم آگے چل کر ان شاء اللہ ناقابل تردید تاریخی دستاویزات کے ساتھ پیش کریں گے۔

رہے علامہ شاہ احمد نورانی تو ان کے والد گرامی شاہ مولانا عبدالعلیم صدیقی کی قیام پاکستان کے لئے مساعی تاریخ میں محفوظ ہیں اور علامہ نورانی چونکہ ان کے سامنے خورد اور جواں عمر تھے اس لئے ان کی مساعی کو اصاغر اور کارکنوں کی صف میں شامل ہونے کی وجہ سے تاریخ نے محفوظ نہیں رکھا۔ یہی حال شاہ فرید الحق کا ہے، باقی رہے ظہور الحسن بھوپالی تو وہ تحریک قیام پاکستان کے وقت غالباً پیدا بھی نہیں ہوئے ہوں گے اور یا بہت کم سن ہوں گے، یہ تو ایسا ہی الزام ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ نعیم اختر صاحب اور ضیاء شاہد کا تحریک قیام پاکستان میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، اس لئے وہ قیام پاکستان کے مؤید نہیں ہیں۔ اس وضاحت سے قارئین کرام پر واضح ہو گیا ہوگا کہ نعیم اختر صاحب نے اپنے دعاوی کی بنیاد جن دلائل پر رکھی ہے وہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتے جا رہے ہیں اور ریت کے ٹیلوں پر چنی ہوئی دیوار بھی نعیم اختر صاحب کے دلائل سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔

جمعیت العلماء پاکستان کا وجود

یہ کہنا کہ جمعیت علماء پاکستان قیام پاکستان کے وقت موجود نہیں تھی، انتہائی لغو اور مہمل بات ہے، ظاہر ہے کہ قیام پاکستان سے پہلے کسی جماعت کا نام جمعیت علماء پاکستان

کس طرح ہو سکتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے سواد اعظم اہل سنت کے علماء نے جو جماعت قائم کی وہ آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے موسوم تھی۔ یہ جماعت ۱۹۴۵ء سے پہلے قائم ہو چکی تھی، ۱۹۴۶ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا گیا اور جلد ہی ایک آل انڈیا اجلاس کا اعلان کر دیا گیا۔ چنانچہ ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء کو بنارس میں چار روزہ اجلاس منعقد ہوا جس میں پاک و ہند کے پانچ ہزار علماء و مشائخ نے اپنے ذاتی خرچ سے شرکت کی اور اجلاس میں ڈیڑھ لاکھ حاضرین کا اجتماع ہوا۔ (حیات صدر الافاضل ص ۱۸۹) اس کانفرنس میں حضرت سید محمد محدث کچھوچھوی نے جو خطبۂ صدارت دیا اس کے یہ اقتباسات قابل توجہ ہیں۔

اب بحث کی لعنت چھوڑو، اب غفلت کے جرم سے باز آ جاؤ، اٹھ پڑو، کھڑے ہو جاؤ، چلے چلو، ایک منٹ بھی نہ رکو، پاکستان بنالو تو جا کر دم لو، یہ کام اے سنیو! سن لو کہ صرف تمہارا ہے۔ اگر ایک دم سارے سنی مسلم لیگ سے نکل جائیں تو کوئی مجھے بتا دے کہ مسلم لیگ کس کو کہا جائے گا؟ اس کا دفتر کہاں رہے گا؟ اور اس کا جھنڈا سارے ملک میں کون اٹھائے گا؟

(الخطبہ الاشرفیہ جمہوریت الاسلامیہ ص ۲۸۔۲۹، ملخصاً)

آل انڈیا سنی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ بنارس (اپریل ۱۹۴۶ء) میں اتفاق رائے سے جو قرارداد منظور کی گئی اس کی بعض اہم دفعات یہ ہیں:

(۱) یہ اجلاس مطالبۂ پاکستان کی پرزور حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علماء و مشائخ اہل سنت، اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ہر امکانی قربانی کے واسطے تیار ہیں۔

(۲) یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ اسلامی حکومت کے لئے لائحہ عمل مرتب کرنے کے لئے حسب ذیل علماء کی کمیٹی بنائی جاتی ہے:

مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی (تلمیذ اعلیٰ حضرت بریلوی)، مولانا نعیم الدین مراد آبادی (تلمیذ اعلیٰ حضرت)، مولانا مصطفیٰ رضا خاں (ابن اعلیٰ حضرت)، مولانا امجد علی (خلیفہ اعلیٰ حضرت)، مولانا عبد العلیم میرٹھی (خلیفہ رضا بریلوی)، مولانا ابو الحسنات (ابن

خلیفہ اعلیٰ حضرت)، مولانا ابوالبرکات سید احمد (ایضا)، مولانا عبدالحامد بدایونی، دیوان سید آل رسول (سجادہ نشین درگاہ اجمیر شریف)، خواجہ قمر الدین سیالوی، شاہ عبدالرحمٰن بھرچونڈی شریف، سید امین الحسنات مانکی شریف اور مصطفیٰ علی خان۔

(حیات صدر الافاضل ص ۱۹۰ ملخصا)

پاکستان بننے کے بعد چونکہ آل انڈیا سنی کانفرنس کا مقصد پورا ہو چکا تھا، اس لئے مارچ ۱۹۴۸ء میں مدرسہ انوار العلوم ملتان میں علماء اہل سنت کا ایک اجتماع ہوا اور آل انڈیا سنی کانفرنس کا نام بدل کر جمعیت العلماء پاکستان رکھا گیا۔ مولانا ابوالحسنات محمد احمد کو صدر اور علامہ سید احمد سعید کاظمی شاہ صاحب کو ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا اور ہندوستان میں اس تحریک کو کلیتاً ختم کر دیا گیا، چونکہ آل انڈیا سنی کانفرنس کا مقصد حقیقی صرف تعمیر پاکستان تھا۔

(حیات صدر الافاضل مع توضیح ص ۱۲۶)

غالباً اب نعیم اختر صاحب کو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ انہوں نے تاریخ منقلب کر دی تھی، اصل واقعہ یہ ہے کہ دیوبند کا مکتبہ فکر من حیث الجماعت کانگریس کا حامی اور قیام پاکستان کا مخالف تھا (اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے) اور مولانا ظفر احمد انصاری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے جو مسلم لیگ کے فنڈ سے مسلم لیگ کی حمایت کی وہ ان کا انفرادی فعل تھا جس کو دیوبند کی حمایت حاصل نہ تھی اور اہل سنت و جماعت من حیث الجماعت مسلم لیگ کے حامی اور قیام پاکستان کے داعی، محرک اور بانی تھے اور مولانا حشمت علی اور مولوی محمد طیب ہمدانی نے جو اس مسئلہ میں مخالفت کی وہ ان کی انفرادی سوچ تھی، جس کو سواد اعظم اہل سنت کی تائید حاصل نہ ہو سکی۔

اعلیٰ حضرت اور دو قومی نظریہ

نعیم اختر صاحب نے اس پیراگراف میں علماء بریلوی اور علماء دیوبند کے اکابر پیشواؤں کی بحث بھی چھیڑی ہے، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں بھی حقائق پیش کر دوں تا کہ کسی شخص کے ذہن میں الجھن نہ رہے۔ برصغیر کی تاریخ پر نظر رکھنے والا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ غیر منقسم ہندوستان میں اقبال اور قائد اعظم سے

بھی پہلے جس شخص نے دو قومی نظریہ پیش کیا، وہ اعلیٰ حضرت احمد رضا خان بریلوی کی ذات گرامی تھی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مسلمانوں کی طرف سے تحریک خلافت کا آغاز ہوا تو حالات نے نیا رخ اختیار کیا، اس تحریک میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ظفر علی، مولانا حسرت موہانی وغیرہم مشاہیر ملت شامل تھے، اسی زمانے میں انڈین نیشنل کانگریس نے مسٹر گاندھی کے ایماء پر ترک موالات کی تحریک شروع کی۔ کانگریس کا قیام اگرچہ ۱۸۸۵ء میں عمل میں آ گیا تھا مگر اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ حاکم و محکوم کے تعلقات کو استوار کرے اور بس! بعد میں کامل آزادی کا مطالبہ کیا گیا، الغرض ۱۹۲۰ء میں کانگریس کے قوم پرست ہندو اور مسلمان اور تحریک خلافت کے داعی اپنے مشترکہ دشمن انگریز کے خلاف متحد ہو گئے، ہر شخص ترک موالات پر تلا ہوا نظر آتا تھا۔ مخالفت کی کسی کو جرأت نہ تھی۔ جوش جنوں میں انگریزوں سے ترک موالات بلکہ ترک معاملت کر کے کفار و مشرکین سے دوستی و محبت کے لیے ہاتھ بڑھایا گیا۔

علماء دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اس مسئلہ میں یوں کہا:

کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ، نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول کے لئے مؤید بنا دیا ہے اور میں ان دونوں قوموں (ہندو، مسلمان) کے اتفاق و اتحاد کو بہت مفید اور منتج سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لئے میرے دل میں بہت قدر ہے۔

(علماء حق حصہ اول ص ۲۱۶، مطبوعہ مراد آباد)

ہندو مسلم اتحاد کے مؤید اور ہمارے محترم بزرگ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی جب فاضل بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو فاضل بریلوی نے صاف صاف فرما دیا: مولانا میری اور آپ کی سیاست میں فرق ہے، آپ ہندو مسلم اتحاد کے حامی ہیں، میں مخالف ہوں۔ اس جواب سے علی برادران کچھ

ناراض سے ہو گئے تو فاضل بریلوی نے تالیف قلب کے لئے مکرر فرمایا: مولانا میں ملکی آزادی کا مخالف نہیں، ہندو مسلم اتحاد کا مخالف ہوں۔

(اعلیٰ حضرت کی مذہبی وسیاسی خدمات، مطبوعہ عرفات شمارہ اپریل، ۱۹۷۰ء)

۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی تحریک ایک طوفان کی طرح اٹھی اور پورے ملک پر چھا گئی، قائداعظم اس تحریک سے الگ تھلگ رہے اور اقبال قوم کو نیا شوالہ اور ترانہ ہندی سناتے رہے۔

سید رئیس احمد جعفری ندوی اس تحریک کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں: یہ زمانہ تھا ترک موالات کا، عدم تعاون کا، ایثار وقربانی کا، مر مٹنے اور تباہ و برباد ہونے کا، سب کچھ لٹا دینے اور دار ورسن کے استقبال کرنے کا یہ زمانہ تھا۔ طوفان کا، حوادث کا، انقلاب کا ایسا طوفان جس نے ملک کے طول وعرض میں طلاطم بپا کر دیا، جس نے گمناموں کو اوج ثریا پر پہنچا دیا، جس نے لیڈروں کو عامی بنا دیا، جس نے عامیوں کو زعیم وقائد بنا دیا۔

(قائداعظم اور ان کا عہد ص ۹۶)

آخر یہ کیا بات تھی، جناح کے کیمپ میں خاموشی کیوں تھی؟ سناٹا کیوں چھایا ہوا تھا؟ چہل پہل اور گہما گہمی اور ہنگامہ آرائی کیوں ناپید تھی؟ کیا ان کے قوائے عمل شل ہو گئے تھے؟ کیا ان کی زبان گنگ ہو گئی تھی؟ کیا ان کا دماغ ناکارہ ہو گیا تھا؟ نہیں یہ بات نہیں تھی۔ جناح کی نظریں حال کے آئینے میں مستقبل کا جلوہ دیکھ رہی تھیں۔

(قائداعظم اور ان کا عہد ص ۹۷)

قارئین کرام! غور فرمایا، یہ ایسا طوفانی دور تھا جس میں قائداعظم جیسے مقبول لیڈر کو بھی ترک موالات کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ پورا ملک ہندو مسلم اتحاد کی طوفانی لہروں میں بہہ رہا تھا۔ ایسے پرفتن دور میں جس مرد مجاہد نے سب سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف آواز اٹھائی اور دو قومی نظریہ پیش کیا، وہ صرف اور صرف اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ العزیز کی ذات گرامی تھی۔

ترک موالات کے سلسلہ میں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ۱۹۲۰ء میں لاہور اور لائل پور سے یکے بعد دیگرے دو استفتاء ارسال کئے گئے جن کا آپ نے مفصل مبسوط

جواب مرحمت فرمایا تھا، بعد میں یہ فاضلانہ جواب ایک رسالہ کی صورت میں "المحجة المؤتمنہ فی آیۃ الممتحنہ" ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کے تاریخی نام سے مولوی حسنین رضا خان نے مطبع حسنی بریلی سے چھپوا کر شائع کیا تھا، یہ پورا رسالہ رئیس احمد جعفری نے اپنی تالیف "اوراق گم گشتہ" میں شامل کر دیا ہے، جو بڑے سائز کے اسی صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

ترک موالات کا پس منظر و پیش نظر

مسلم کالج، بعد میں یونیورسٹی، مولانا محمود الحسن اور ان کے ہمنوا علماء کی نظر میں بری طرح سے کھٹکتا تھا کہ کسی طرح اس بت کو ڈھا دیا جائے۔ آخر تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں مسٹر گاندھی کے ایماء پر مولانا محمود الحسن اور ابوالکلام نے پروگرام بنایا تو مولانا محمود الحسن نے اسلامیہ کالج علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور کو نیست و نابود کرنے کے لئے اپنے دیرینہ بغض کا یوں اظہار فرمایا: علی گڑھ کی ابتداء کی حالت میں علماء متدین نے علی العموم اس قسم کی تعلیم کے جواز سے جو از سر تا پا گورنمنٹ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے روکا، بدقسمتی سے وہ رک نہ سکی۔ اب جب کہ اس کے ثمرات و نتائج آنکھوں سے دیکھ لئے تو قوم کو اس سے بچانا بالبداہت ایک ضروری امر ہے۔ (ترک موالات ص ۱۱-۹)

مولانا محمود الحسن نے مسلم کالج علی گڑھ کے طلباء کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا: "میں امید کرتا ہوں کہ میری معروضات سے آپ کے سوالات کا جواب مل جائے گا اور علی گڑھ کی عمارتوں، کتب خانوں وغیرہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آپ کو دستک دے گا کہ قسطنطنیہ، شام، فلسطین اور عراق کی قیمت سے ان چیزوں کو کیا نسبت ہے"

مولانا محمود الحسن کے فتاوٰی، ابوالکلام اور مولانا محمد علی کی تقریریں اور خطبات آخر میں رنگ لائے۔ ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی جوہر کی زیر سرکردگی میں "مجاہدین" کی ایک عظیم فوج نے علی گڑھ کالج پر ہلہ بول دیا۔

علی گڑھ کالج کے فاتحین نے اب اسلامیہ کالج لاہور کی طرف باگیں موڑیں، اس گروہ کا قائد وہ شخص تھا جس کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس مسلمان قوم کو تباہ کرنے کے لئے وقف تھا۔

فاضل بریلوی نے اس کے متعلق کیا خوب لکھا ہے:

آزاد مگر نہ تو بے شک مشرک
مسلم سے وہی بچے یک مشرک
ز اسلامت اگر بہرہ بدی مے کر دی
بر ناخن مسلم خدا لک مشرک

ابوالکلام آزاد نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ایک ہندو پر دس مسلمان قربان کئے جا سکتے ہیں، آزاد کے اس قول کو سامنے رکھ کر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: آزاد تو بلا شک وشبہ مشرک ہے کہ دس مسلمانوں کو ایک مشرک پر قربان کرتا ہے، اگر تجھ کو اسلام سے کچھ بھی حصہ ملا ہوتا تو مسلمان کے ایک ناخن پر لاکھوں مشرکوں کو قربان کر دیتا۔

ابو الکلام آزاد ۲۰ اکتوبر کو لاہور پہنچے اور انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل میں ممبران کو ہمنوا اور ہم خیال بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کے حامیوں نے ابوالکلام آزاد زندہ باد کے نعرے لگائے اور قریب تھا کہ انجمن کے ارکان مولانا کے حق میں رائے دیتے کہ شیخ عبدالقادر مرحوم اپنی جگہ سے اٹھے اور مولانا کی جذباتی لیکن ناعاقبت اندیشانہ تقریر کا اپنی متین اور مدلل تقریر سے رد فرمایا۔ اس کے بعد انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری نے فیصلہ کیا کہ ایسے علماء سے رجوع کیا جائے جو مسٹر گاندھی کے حلقۂ اثر سے باہر ہوں اور اعلاء کلمۃ الحق جن کا وظیفہ ہو۔ چنانچہ یہ کام مولوی حاکم علی صاحب پروفیسر سائنس اسلامیہ کالج لاہور کے سپرد کیا گیا، انہوں نے مندرجہ ذیل فتویٰ ترتیب دیا:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں کافروں اور یہود ونصاریٰ کے ساتھ تولی سے منع فرمایا ہے، مگر ابو الکلام تولی کے معنی معاملت اور ترک موالات (نان کوآپریشن Non Co-Operation) قرار دے رہے ہیں اور یہ صریح زیادتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کے ساتھ کی جا رہی ہے، مذکور نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی جنرل کونسل کی کمیٹی میں تشریف لا کر یہ اطلاق کر دیا ہے کہ جب تک اسلامیہ کالج لاہور کی سرکاری امداد بند نہ کی جائے اور یونیورسٹی سے اس کا قطع الحاق نہ کیا جائے تب تک انگریزوں سے ترک موالات

نہیں ہو سکتی اور اسلامیہ کالج لاہور کے لڑکوں کو فتویٰ دے دیا ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو کالج چھوڑ دو، لہٰذا اس طرح سے کالج میں بے چینی پھیلا دی۔ علامہ مذکور کا یہ فتویٰ غلط ہے۔ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق قائم رکھنے سے اور امداد لینے سے معاملت قائم رہتی ہے نہ کہ موالات، لہٰذا میں فتویٰ دیتا ہوں کہ یونیورسٹی کے ساتھ الحاق اور امداد لینا جائز ہے۔ (المحجۃ المؤتمنہ ص ۲)

پروفیسر حاکم علی صاحب نے اس فتویٰ کو مع ایک خط کے جو درج ذیل ہے، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں تصحیح و تصدیق کے لئے روانہ کیا۔

آقائے نامدار مؤید ملت جناب شاہ احمد رضا خاں صاحب مدظلہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ پشت ہذا پر ایک فتویٰ مطالعہ گرامی کے لئے ارسال کر کے التجا کرتا ہوں کہ دوسری نقل کی پشت پر اس کی تصحیح فرما کر احقر نیاز مند کے نام بواپسی ڈاک اگر ممکن ہو سکے تو آج ہی یا کم از کم دوسرے روز بھیج دیویں۔ انجمن حمایت اسلام کی کونسل کا اجلاس ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ہونا قرار پایا ہے، اس میں یہ پیش کرتا ہوں۔ دیوبندیوں اور نیچریوں نے مسلمانوں کو تباہ کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ ہندوؤں اور گاندھی کے ساتھ موالات قائم کر لی ہے اور مسلمانوں کے کام میں روڑے اٹکانے کی ٹھان لی ہے، عالم حنفیہ کو ان کے ہاتھوں سے بچائیں۔

نیاز مند دعا گو حاکم علی موتی بازار، ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۰ء

(المحجۃ المؤتمنہ ص ۲۰)

اعلیٰ حضرت نے اس فتویٰ کی تصدیق فرمائی اور لکھا کہ ایسی امداد جو مشروطہ نہ ہو جائز ہے، چنانچہ اعلیٰ حضرت کے اس فتویٰ کو حمایت اسلام کی جنرل کونسل میں پیش کیا گیا اور یہ عظیم درس گاہ اغیار کی دستبرد سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔

اعلیٰ حضرت کا یہ تاریخی اور انقلاب آفریں فتویٰ جو "المحجة المؤتمنه" کے نام سے مشہور ہے، ایک ایسی دستاویز ہے جس نے اس ہولناک اور پر آشوب دور میں ہر موقع پر اور ہر مشکل میں مسلمانانِ ہند کے لئے مشعل راہ کا کام دیا۔

قرآن کریم کی آیت مبارکہ لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ

لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الممتحنہ) ''اللہ تعالیٰ تمہیں ان کافروں سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین میں نہ لڑیں اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہ نکالیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک اور عدل و انصاف کا برتاؤ کرنے والے بہت محبوب ہیں'' سے مخالفین ترک موالات پر استدلال کرتے تھے اور ثابت کرتے تھے کہ غیر محارب ہنود کے ساتھ وداد اور محبت جائز بلکہ فرض ہے، اعلیٰ حضرت نے اپنے رسالہ میں معتمد تفاسیر مثلاً تفسیر کبیر، روح البیان، تفسیر ابوالسعود وغیرہا اور مستند کتب فقہ مثلاً ہدایہ وغیرہ اور جلیل القدر فقہاء اسلام کے اقوال کی روشنی میں ان کے اس استدلال کے تارو پود بکھیر دیئے اور ثابت کر دیا کہ کوئی کافر مسلمان کا ولی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ ''اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے مسلمانوں پر ہرگز کوئی راہ نہ کھولے گا''۔ ترک موالات کے حامیوں نے قرآن کریم کی جس آیت کریمہ سے استدلال کرنے میں مغالطہ کھایا یا مغالطہ آفرینی کی اس کا ازالہ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

ان صاحبوں سے یہ بھی پوچھ دیکھئے کہ سب جانے دو، آیہ کریمہ ''ینھکم'' ہر مشرک غیر محارب کو عام ہو کہ محکم ہی سہی اور مشرکین ہند میں کوئی محارب بالفعل نہ سہی۔ آیہ کریمہ نے کچھ نیک برتاؤ مالی مواسات ہی کی رخصت دی یا یہ فرمایا کہ ان کی جے پکارو۔ انہیں مساجد مسلمین میں باادب و تعظیم پہنچا کر، مسند مصطفیٰ پر لے جا کر، مسلمانوں سے اونچا بٹھا کر واعظ و ہادی مسلمین بناؤ، گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ، قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ ایک ڈولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ، ان کے سرغنہ کو کہو کہ خدا نے ان (گاندھی) کو تمہارے پاس مذکر بنا کر بھیجا ہے یعنی نبوت جماؤ۔ (المحجۃ المؤتمنہ ص ۴۴۔۴۵)

مزید فرماتے ہیں:

اگر بالفرض امکان ان (رہبران گم کردہ راہ) کی یہ شتر گربگی مان بھی لی جائے تو عام مشرکین ہند کو ''لم یقاتلوکم فی الدین'' کا مصداق ماننا ایمان کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا ہے، کیا وہ ہم سے دین پر نہ لڑے، کیا قربانی گاؤ پر ان کے سخت ظالمانہ فساد پرانے پڑ گئے؟ کیا

کنار پور آرہ اور کہاں کہاں کے ناپاک و ہولناک مظالم جو ابھی تازہ ہیں دلوں سے محو ہو گئے؟ بے گناہ مسلمان نہایت سختی سے ذبح کئے گئے، مٹی کا تیل ڈال کر جلائے گئے، ناپاکوں نے پاک مسجدیں ڈھائیں، قرآن پاک کے اوراق پھاڑے اور جلائے اور ایسی ہی وہ باتیں جن کا نام لینے سے کلیجہ منہ کو آئے۔ (المحجۃ المؤتمنہ ص ۷۲)

الغرض اعلیٰ حضرت نے ترک موالات کے حامیوں کے تمام اعتراضات کے چن چن کر جواب دیئے اور گاندھی کے تمام اقوال و افعال کا ایک ایک کر کے اس رسالہ میں رد بلیغ فرمایا اور اس حقیقت کو آفتاب سے زیادہ روشن کر دیا۔ کوئی بھی غیر مسلم خواہ وہ ہندو ہو یا عیسائی، مجوسی ہو یا یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے مقابلہ میں "الکفر ملۃ واحدۃ" کا مصداق ہے۔

اعلیٰ حضرت کے اس بصیرت افروز اور علمی مقالے میں مکمل استفادہ تو اس رسالہ کو پڑھ کر ہی ہو سکتا ہے، ہم اس عظیم رسالہ سے چند اور نکات پیش کر رہے ہیں۔

(۱) موالات اور مجرد معاملت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دنیوی معاملت جس سے دین پر ضرر نہ ہو، سوا مرتدین کے کسی سے ممنوع نہیں، ذمی تو معاملت میں مثل مسلم ہے۔

(۲) کتابیہ سے نکاح کرنا بھی فی نفسہٖ حلال ہے، وہ صلح کی طرف جھکیں تو مصالحت کرنا بھی ضروری ہے۔

(۳) یوں ہی ایک حد تک معاہدہ موادعت کرنا بھی اور جو جائز عہد کر لیا ہے اس کی وفا فرض ہے، غدر حرام ہے۔

نوٹ: ترک موالات کی تحریک میں انگریزی مال خریدنا جائز نہ تھا۔ البتہ اس کی چیزوں سے نفع اٹھانا جائز تھا۔ مثلاً ڈاک، تار، ریل وغیرہ سے تمتع کو کسی نے ناجائز نہیں کہا، اس عجیب طرز عمل پر فاضل بریلوی اظہار حیرت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

(۴) عجب کہ معاملت میں مال دینا حلال ہو الینا حرام، اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ریل، تار، ڈاک ہمارے ہی ملک میں ہیں، ہمارے ہی روپے سے بنے ہیں۔ سبحان اللہ! امداد تعلیم کا روپیہ کیا انگلستان سے آتا ہے، وہ بھی تو یہیں کا ہے۔ تو حاصل وہی

ٹھہرا کہ مقاطعت میں اپنے مال سے نفع پہنچانا مشروع اور خود نفع لینا ممنوع، اس الٹی عقل کا کیا علاج؟

اعلیٰ حضرت نے ۱۹۲۰ء میں اپنے معرکتہ الآراء مقالہ میں ہندو مسلم اتحاد کے خلاف فتویٰ دیا اور دو قومی نظریہ پیش کر دیا۔ اب ہم آپ کے سامنے تاریخی شہادتوں سے یہ حقیقت واشگاف کرتے ہیں کہ اقبال اور قائد اعظم نے جداگانہ قومیت کا نعرہ اعلیٰ حضرت کا فتویٰ شائع ہونے کے کتنے عرصہ بعد لگایا ہے۔

سید رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

ہندو کانگریس کی ذہنیت اور جبلیت دیکھ کر علامہ اقبال مغفور کی فراست ایمان نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا کفر اور اسلام کا حق و باطل، مکر و صداقت کا گزر ایک ساتھ نہیں ہو سکتا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (الٰہ آباد) کی صدارت کرتے ہوئے انہوں نے یہی خواب دیکھا تھا اور بے جھجک اور برملا اسے بیان بھی کر دیا تھا، اگرچہ اس وقت ان کی بات نہیں سنی گئی۔ (قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور ان کا عہد ۲۹۲)

آگے چل کر سید رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

کانگری دور حکومت کے تلخ تجارب کے بعد مسٹر جناح کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور وہ سوچنے لگے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا سیاسی مستقبل کیا ہو گا، وفاق یا پاکستان؟ اس زمانہ میں علامہ اقبال مرحوم نے اس موضوع پر متعدد اہم اور قابل غور خطوط مسٹر جناح کو لکھے، چند کا اقتباس ضروری ذیل میں درج کیا جاتا ہے، مرحوم مسٹر جناح کو لکھتے ہیں:

''سوال صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کے مسئلہ کا حل کیسے ممکن ہے؟ لیگ کے مستقبل کا دارومدار ان مساعی پر ہے جو اس مسئلہ کو حل کرنے میں وہ اختیار کرے گی، اگر لیگ اس قسم کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتی تو مسلم لیڈر پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید تصورات کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل نکل آتا ہے، اسلامی قانون کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سے سمجھ کر عملی جامہ پہنایا جائے تو کم از کم ہر فرد کے

معاشی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے، لیکن اس ملک میں شریعت اسلامی کا نفاذ ایک آزاد مسلم مملکت یا چند مملکتوں کے بغیر ناممکن ہے، کیا آپ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کے مطالبہ کا وقت آ گیا ہے؟'' (مکتوب مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء)

اس مکتوب کو نقل کرنے کے بعد سید رئیس احمد جعفری ندوی لکھتے ہیں:

مسٹر جناح اب تک پاکستان کی راہ اختیار کرنے میں تامل کر رہے تھے کہ جواہر لعل نہرو صدر کانگریس نے کلکتہ میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا: ملک میں دو ہی جماعتیں ہیں، حکومت اور کانگریس، مسٹر جناح نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا: ایک تیسری جماعت بھی ہے اور وہ ہیں مسلمان۔

جواہر لعل نہرو کے اس بیان کے بعد علامہ اقبال نے مسٹر جناح کو ایک مکتوب لکھا:

''صدر کانگریس نے مسلمانوں کے سیاسی وجود سے صریحاً انکار کر دیا۔ ان حالات میں قیام امن کی واحد راہ یہی ہے کہ نسلی، مذہبی اور لسانی مماثلت کے لحاظ سے ہندوستان کی دوبارہ تقسیم عمل میں آئے۔

مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے مراجعت سے قبل لارڈ لوتھین نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری اسکیم ہی ہندوستان کے درد کا واحد درمان ہے''۔

(مکتوب، مورخہ ۱۱ جون ۱۹۳۸ء قائداعظم اور ان کا عہد ص ۲۹۴۔۲۹۵)

تنقیحات

(۱) اعلیٰ حضرت نے ''المحجۃ المؤتمنہ'' تحریر فرما کر دو قومی نظریہ ۱۹۲۰ء میں پیش کیا۔

(۲) اقبال نے دو قومی نظریہ کا تصور ۱۹۳۰ء میں پیش کیا۔

(۳) قائداعظم نے دو قومی نظریہ کو ۱۹۳۸ء میں قبول کیا۔

یاد رہے کہ اعلیٰ حضرت نے ''المحجۃ المؤتمنہ'' ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء میں تحریر فرمائی اور ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء یعنی اس رسالہ کی تصنیف کے چند ماہ بعد اعلیٰ حضرت کا وصال ہو گیا۔

اگر اعلیٰ حضرت کو قضاء کچھ اور مہلت دیتی تو دنیا دیکھتی کہ تحریک آزادی اور قیام پاکستان کے سلسلہ میں اعلیٰ حضرت کس پایہ کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیتے۔

بہر حال اعلیٰ حضرت نے دوقومی نظریہ پیش کر کے جس مہم کا آغاز کیا تھا، اس مہم کو اعلیٰ حضرت کے قابل صد ستائش تلامذہ نے مسلسل جاری رکھا اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک کہ پاکستان قائم نہیں ہو گیا۔

تقسیم ہند کا تصور

یہ اعلیٰ حضرت کے فیضان اور ان کی تربیت ہی کا اثر تھا کہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے فسادات بمبئی کے موقع پر ماہ شوال ۱۳۶۵ھ/۱۹۳۱ء میں فرمایا کہ ہندوستان کو ہندو مسلم علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اعلیٰ حضرت کے دوقومی نظریہ پیش کرنے کے بعد جس شخص نے غیر مبہم اور واشگاف الفاظ میں تقسیم ہند کرنے کی سب سے پہلے صدا بلند کی وہ ذات مقدس صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی قدس سرہ ہیں اقبال اور قائد اعظم تو بہت دور کی بات ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''بمبئی کے ہندو کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی دکانیں مسلمان محلوں سے ہٹا کر ہندو محلوں میں لے جائیں۔ ہندوؤں کے یہ افعال، یہ تجویزیں، یہ طرز عمل اتحاد کے ذرا بھی منافی نہیں لیکن مسلمان ایسا کریں تو اتحاد کے دشمن قرار دیئے جائیں، یہ کھلی ناانصافی ہے، جب ہندو اپنی حفاظت اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے محلوں سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنی حدود علیحدہ کر لیں تو مسلمانوں کو یقیناً ان کے محلوں میں جانے اور ان کے ساتھ کاروبار رکھنے سے احتیاط رکھنا چاہیے، دونوں اپنی اپنی حدود جداگانہ قرار دیں اور اس نکتہ کو ملحوظ رکھ کر سیاسی مباحث کو طے کر لینا چاہیے، یعنی ہندوستان میں ملک کی تقسیم سے ہندو مسلم علاقے جدا جدا بنائیں، تاہم باہمی تصادم کا اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے، ہر علاقہ میں اسی علاقہ والوں کی حکومت ہو، مسلم علاقوں میں مسلمانوں کی اور ہندو علاقوں میں ہندوؤں کی۔ اب نہ مخلوط و جداگانہ انتخاب کی بحثیں درپیش ہوں گی، نہ کونسلوں میں نشستوں کی منازعت کا کوئی موقع رہے گا۔ ہر فریق اپنی حدود میں آرام کی زندگی گزار سکے گا، جب ہندو ذہنیت نے بمبئی

میں یہ گوارہ کرلیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ جدید حکومت کا مسئلہ اس اصول پر نہ طے کیا جائے؟"
(السواد الاعظم مراد آباد ج ۸ ص ۱۳۔ ۱۴، شمارہ ۶ ماہ شوال ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء)

خلاصہ بحث:

(۱) اعلیٰ حضرت نے ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کی مخالفت کر کے دو قومی نظریہ کی اساس رکھی۔

(۲) صدر الافاضل مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی نے ۱۹۳۱ء میں تقسیم ہند کی تجویز پیش کی۔

(۳) اقبال نے ۱۹۳۷ء میں قیام پاکستان کا خاکہ بنایا۔

(۴) قائداعظم نے ۱۹۳۸ء میں قیام پاکستان کی تجویز کو قبول کیا۔

غور کیجئے کہ یہ تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ جو لوگ قیام پاکستان کے محرک اول تھے ان کا کوئی نام نہیں لیتا اور بعد کے لوگوں کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔

نیرنگئ سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

اعلیٰ حضرت کی انگریزوں سے نفرت

جناب شوکت صدیقی مدیر ہفت روزہ "الفتح" لکھتے ہیں:

تاریخ ہمیں بتاتی ہیں کہ بریلوی تحریک کی ابتداء مسلمانوں میں وہابیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کے ردعمل میں ہوئی تھی۔ اس تحریک کے بانی مولانا احمد رضا خان بریلوی تھے۔ مگر سید احمد شہید اور مولانا احمد رضا خاں کے وطن مالوف میں یہ فرق ہے کہ سید صاحب رائے بریلی کے اور خاں صاحب بانس بریلی سے تعلق رکھتے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں جون ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں ان کا وصال ہوا۔ وہ نسباً پٹھان، مسلکاً حنفی، مشرباً قادری اور مولداً بریلوی تھے، ان کے بارے میں وہابیوں کا یہ الزام کہ وہ انگریزوں کے پروردہ یا انگریز پرست تھے، نہایت گمراہ کن اور شرانگیز ہے۔

وہ انگریزوں اور ان کی حکومت کے اس قدر کٹر دشمن تھے کہ لفافے پر ہمیشہ الٹا ٹکٹ

لگاتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ میں نے جارج پنجم کا سر نیچا کر دیا۔ انہوں نے زندگی بھر انگریزوں کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا۔ مشہور ہے کہ مولانا احمد رضا خان نے عدالت میں کبھی حاضری نہ دی۔ ایک بار انہیں ایک مقدمہ کے سلسلہ میں عدالت میں طلب بھی کیا گیا مگر انہوں نے توہین عدالت کے باوجود حاضری نہ دی اور یہ کہہ کر نہ دی کہ میں انگریز کی حکومت ہی کو جب تسلیم نہیں کرتا تو اس کے عدل و انصاف اور عدالت کو کیسے تسلیم کروں۔ کہتے ہیں کہ انہیں گرفتار کر کے حاضر عدالت ہونے کے احکامات جاری کئے گئے، بات اتنی بڑھی کہ معاملہ پولیس سے گزر کر فوج تک پہنچا، مگر ان کے جاں نثار ہزاروں کی تعداد میں سر سے کفن باندھ کر ان کے گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے، آخر عدالت کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔

(ہفت روزہ الفتح ۱۴، ۲۱ مئی ۱۹۷۶ء ص ۱۷)

اور مدیر ''الحبیب'' لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ انگریز کمشنر نے ۳۵ مربع زمین کی آپ کو پیش کش کی مگر اس مرد قلندر نے فرمایا: انگریز اپنی تمام حکومت بھی مجھے دے دے تو بھی میرا ایمان نہیں خرید سکتا

(ماہنامہ الحبیب اکتوبر ۱۹۷۰ء)

مولانا فضل حق خیر آبادی کا سیاسی کردار

انگریزوں نے ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزی زبان سکھانے کے لئے سکول کھولنے شروع کیے اور دینی مدارس بند کرانے کی مہم شروع کی، مسلمانوں کو ختنہ سے روکنے اور پردہ نشین خواتین سے ان کا پردہ ختم کرانے کی مہم شروع کی، مسلمانوں کو سور کی چربی والے اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دیئے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔ غرض انگریز کے مظالم اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر کون سا مسلمان ایسا ہوگا جو انگریز سے متنفر اور بے زار نہ ہو۔

علامہ فضل حق خیر آبادی فرماتے ہیں:

نص قرآنی سے ثابت ہے کہ ان کی (نصاریٰ کی) محبت کفر ہے، کسی حق پرست انسان کو اس میں شک نہیں ہوسکتا۔ نصاریٰ سے محبت کس طرح جائز ہوسکتی ہے جب کہ یہ

لوگ اس ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن ہیں جن کے طفیل ارض وسماء پیدا کئے گئے۔
(قصائد فتنۃ الہند ص ۳۴۸)

ستمبر ۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد مولانا نے دہلی کو بادیدۂ نم الوداع کہا اور اس کے بعد وہ جنوری ۱۸۵۹ء تک مسلسل دوسرے مجاہدین کے ساتھ اودھ میں سرگرم جہاد رہے، چنانچہ اودھ کے معاصر حکام کی شہادت ملاحظہ ہو۔

اودھ کے چیف کمشنر کا سیکرٹری ہمیر پور کے کلکٹر کے نام ۸ دسمبر ۱۸۵۸ء کو اپنے سرکاری مراسلہ میں لکھتا ہے:

باغی بسوا میں جو لکھنو سے شمال مغرب میں پچاس میل کے فاصلہ پر ہے شکست کھا کر گنگا فرار ہو گئے، ان کی تعداد ۹۰۰ سوار جن میں ۴۰۰ پوری طرح مسلح ہیں اور باقی سپاہیوں کے پاس اسلحہ کافی نہیں ہے۔ ۳۰۰ پیدل وغیرہ تھے، ان میں سے سو عورتیں، چھ ہاتھی، ایک توپ جس کا نام گروہ ہے، اس جماعت کے لیڈر فیروز شاہ شہزادہ دہلی، لکڑ شاہ، کلام شاہ اور پیر جی محسن علی خاں ساکن منتوشس آباد، فرخ آباد (جو خود کو یورپین ظاہر کرتا ہے) اور مولوی فضل حق سابق رشتہ دار کمشنر دہلی جس کے بہت سے اعزہ اعلیٰ مناصب حکومت پر ہیں اور جس کا بھائی پٹیالہ میں راجہ ہری سنگھ کا ملازم ہے۔
(فریڈم اسٹرگل ان اتر پردیش حصہ دوم ص ۵۶۳ وحصہ پنجم ص ۸۱۰ لکھنؤ انگریزی)

یہی سیکرٹری ۱۱ دسمبر ۱۸۵۸ء کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سیکرٹری کے نام اپنے ایک سرکاری مراسلہ میں لکھتا ہے:

مندرجہ ذیل لوگوں کے چلے جانے کے بعد حکومت کو قیام امن میں کافی سہولت ہو رہی ہے۔ فیروز شاہ، لکڑ شاہ، مولوی فضل حق جو ہماری حکومت کا دشمن جان ہے، حالانکہ حکومت نے اسے اور اس کے اعزہ کو اعلیٰ مناصب عطا کئے تھے۔ (فریڈم سٹرگل ص ۵۶۵)

فتویٰ جہاد

علامہ فضل حق خیر آبادی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہد تھے۔ یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جس کو رد نہیں کیا جا سکتا، ایک عرصہ تک ان کے فتویٰ جہاد کو بغیر کسی اختلاف کے

تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ تقریباً جس نے بھی علامہ کا ذکر کیا ہے، اس فتویٰ کا ضرور ذکر کیا ہے، مثلاً عبدالشاہد خان شیروانی نے "باغی ہندوستان" ص ۱۵۶، مولوی حسین احمد مدنی نے "نقش حیات" ج ۲ ص ۴۳۶، مفتی انتظام اللہ شہابی نے "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" ص ۷۳، غلام رسول مہر نے "۱۸۵۷ء کے مجاہد" ص ۲۰۶، پروفیسر محمد ایوب قادری نے "مولانا فیض احمد بدایونی" ص ۲۱۔ ۲۴، ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون "مولانا فضل حق خیر آبادی سراپا فضل سراپا حق سراپا خیر" ہفت روزہ زندگی (اذان حق) شمارہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۲ء میں، مولانا عبدالسلام ندوی نے "حکماء اسلام" ج ۲ ص ۳۳۲ میں اور مولانا ریاست علی نے "ماہنامہ معارف اعظم گڑھ" میں اکتوبر ۱۹۴۷ء ص ۳۱۲ میں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ماضی قریب میں بعض لوگوں نے علامہ کے فتویٰ جہاد کا انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ علامہ کا دہلی آنا ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء سے پہلے ثابت نہیں، جب کہ فتویٰ جہاد جولائی ۱۸۵۷ء میں بہ حوالہ اخبار الظفر دہلی جو فتویٰ شائع ہوا تھا اس میں علامہ کے دستخط نہیں ہیں۔

(ماہنامہ دہلی شمارہ اگست ۱۹۰۷ء، از عرش رامپوری)

علامہ عبدالحکیم صاحب شرف زید مجدہٗ اس اعتراض کے جواب میں لکھتے ہیں:

اس دور کے تاریخی روزناموں سے ۱۶ اگست ۱۸۵۷ء کو علامہ کی بہادر شاہ ظفر کے دربار میں موجودگی کا ثبوت ملتا ہے، اس سے یہ یقین کیسے پیدا ہو گیا کہ علامہ اس سے پہلے دہلی میں نہیں تھے؟ پھر اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے مخالفین کو یہ بھی ثابت کرنا پڑے گا کہ دہلی سے صرف ایک ہی فتویٰ جاری ہوا تھا جس کی نقل "صادق الاخبار" میں چھپی تھی۔

(مقدمہ باغی ہندوستان ص ۲۳)

حکیم محمود احمد برکاتی مولانا کے فتویٰ جہاد اور انگریز کے خلاف مسلسل جہاد کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

معاصرین کے بعد اب قریب تر عہد کے مورخین کے حوالے سے بھی ملاحظہ ہوں۔

مولانا کی وفات کے صرف نو سال بعد مشہور انگریزی مصنف ہنٹر اپنی کتاب "ہمارے

ہندوستانی مسلمان'' میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے اس وقت کے صدر مدرس علامہ عبدالحق خیرآبادی کے والد علامہ فضل حق خیرآبادی کے متعلق لکھتا ہے:

موجودہ ہیڈ مولوی اس عالم دین کے صاحبزادہ ہیں جن کو ۱۸۵۸ء کے غدر نے نمایاں کر دیا تھا اور جنہوں نے اپنے جرموں کا خمیازہ اس طرح بھگتا تھا کہ بحر ہند کے ایک جزیرہ میں تمام عمر کے لئے جلاوطن کر دیے جائیں۔ اس غدار عالم دین کا کتب خانہ جس کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اب کلکتہ کے کالج میں موجود ہے۔

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص ۲۹۴، مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین طبع دوم ۱۹۵۵ء لاہور)

مولوی ذکا اللہ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو سن ستاون میں ۲۵ سال کے تھے اور دہلی کی جنگ آزادی کے عینی شاہدوں میں سے تھے اور انہوں نے اس کے بیس پچیس سال بعد ہی اپنی تاریخ مرتب کی، ان کا بیان یہ ہے کہ:

ان (مولانا) کو اس بغاوت کے سبب سے جلاوطنی کی سزا ملی تھی۔

(تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ص ۶۸۷)

خود مولانا فضل حق نے اپنے عربی رسالہ ''غدریہ'' میں، جو واقعات غدر پر ایک مستند مستند دستاویز بھی ہے، اگرچہ اپنی سرگرمیوں کو از راہ انکسار اور مدح خود سے احتراز کے پیش نظر یا ممکن ہے اس وقت کے مہیب و پرخطر ماحول کے باعث بہت کم لکھا ہے، مگر پھر بھی اتنا ضرور لکھ گئے ہیں کہ دہلی پہنچ کر تحریک آزادی کے سلسلہ میں میری جو رائے تھی اور میری عقل کا جو فیصلہ تھا میں نے لوگوں کے سامنے رکھا، مگر انہوں نے میری رائے اور میری ہدایت کو نہ مانا۔

اسی طرح غدر ہی سے متعلق اپنے قصیدہ ''ہمزیہ'' میں انڈیمان سے لکھتے ہیں:

''میں (تھک کے) بیٹھ جانے والوں کو مسلسل ہمت دلاتا رہا''۔

علامہ عبدالحکیم صاحب شرف زید شرفہٗ علامہ کی سزا کے بارے میں لکھتے ہیں:

مسٹر جارج کیمبل جوڈیشنل کمشنر اودھ اور میجر بارو قائم مقام کمشنر خیرآباد نے ۴ مارچ ۱۸۵۹ء کو فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھا ہے:

بغاوت شروع ہونے کے وقت وہ الور میں ملازم تھا۔ یہاں سے دیدہ دانستہ دہلی آیا اور اس کے بعد وہ باغی اور بغاوت کے قدم بقدم چلتا رہا، ایسے شخص کو سخت ترین سزا ملنی چاہیے اور اسے خاص طور پر ہندوستان سے خارج کردینا چاہیے۔ (ماہنامہ تحریک دہلی ص ۱۷)

اپیلوں اور کوششوں کے باوجود جلاوطنی کا فیصلہ بحال رہا اور علامہ کو کلکتہ سے نجارئرکوئین جہاز میں سوار کر کے انڈیمان بھیج دیا گیا۔ یہ جہاز ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پورٹ ملبر پہنچا۔
(ماہنامہ تحریک دہلی ص ۲۰، مقدمہ باغی ہندوستان ص ۲۲)

عبدالشاہد شروانی لکھتے ہیں:

علامہ اور ان کے ساتھیوں کو کیا کیا تکالیف اٹھانا پڑیں اور انڈیمان میں کیسے ذلت آمیز برتاؤ سے سابقہ رہا، رسالہ وقصائد میں اس کا مفصل ذکر موجود ہے۔ ادھر علامہ کے صاحبزادے مولوی شمس الحق اور خواجہ غلام غوث بے خبر میر منشی لیفٹیننٹ مغربی وشمالی صوبہ اودھ سرگرم سعی تھے۔ پروانہ رہائی حاصل کر کے مولوی شمس الحق انڈیمان روانہ ہو گئے، جہاز سے اتر کر شہر میں گئے تو ایک جنازہ نظر پڑا، اس کے ساتھ بڑا اژدحام تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء کو علامہ فضل حق خیر آبادی کا انتقال ہو گیا ہے۔
(باغی ہندوستان ص ۱۵۵)

یہ تھے علامہ فضل حق خیر آبادی جن کی کچھ زندگی انگریز کے خلاف مسلسل جہاد میں اور باقی اس جرم کی سزا پانے میں گزری، یہی شخص تحریک جنگ آزادی کا ہیرو تھا جس کو اس قوم نے فراموش کر دیا اور آج تاریخ، تذکروں اور درسی کتابوں میں اصل تاریخ کو مسخ کر کے اس جنگ کا ہیرو سید احمد اور اسماعیل دہلوی کو بنایا جا رہا ہے اور جو درحقیقت مجاہد تھا اس کو گمنامی کے تاریک غاروں میں دھکیل دیا گیا۔

چونکہ نعیم اختر صاحب نے زیر بحث پیراگراف میں اکابر علماء دیوبند اور اکابر علماء اہل سنت کے سیاسی کردار کی بحث چھیڑی تھی، اس لئے ہم نے اجمالاً اکابر علماء اہل سنت کا سیاسی کردار اوراق سابقہ میں پیش کر دیا ہے اور اب سطور ذیل میں اکابر علماء دیوبند کا سیاسی کردار پیش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد پاکستان بنانے میں علماء اہل سنت اور اس کی مخالفت میں

علماء دیوبند کا کردار تاریخی شواہد سے پیش کریں گے اور جن بعض علماء دیوبند نے پاکستان بنانے میں کردار ادا کیا ہے ان کے کام کا بھی ہم انصاف پسندی سے جائزہ لیں گے۔

نعیم اختر صاحب نے اکابر علماء دیوبند میں اصحاب شاہ ولی اللہ کا ذکر کیا ہے۔ غالباً ان کی مراد اس سے مولانا اسماعیل دہلوی اور سید احمد ہیں۔ نیز مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی ذکر کیا ہے اور اس صف میں وہ مولانا رشید احمد گنگوہی کا ذکر کرنا شاید بھول گئے۔ بہرحال ہم ان تمام حضرات کے سیاسی کردار کا ذکر مستند حوالوں اور ناقابل تردید اسانید سے پیش کریں گے، فاقول وباللہ التوفیق۔

سید احمد کا سیاسی کردار

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

کوئی شہر کوئی قصبہ ایسا نہ تھا جہاں سید احمد صاحب کے واعظ وعظ دیتے اور چند آدمی جمع نہ کرتے پھرتے ہوں۔ اسی اثناء میں آپ حج بیت اللہ کے لئے گئے اور وہاں سے واپس ہو کر پھر اپنے عظیم الشان فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہوئے جو ہجرت اور جہاد کے مدنظر تھے۔ ہجرت اگرچہ انگریزوں کی آمد کی وجہ سے تھی، لیکن سیاسی مصلحت کی بناء پر سید صاحب نے یہ اعلان کیا کہ سرکار انگریز سے ہمارا مقابلہ نہیں اور نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے، ہم صرف سکھوں سے اپنے بھائیوں کا انتقام لیں گے، یہی وجہ تھی کہ حکام انگلشیہ بالکل باخبر نہ ہوئے اور نہ ان کی تیاری میں مانع آئے۔

(حیات طیبہ مطبوعہ مکتبہ السلام ص ۲۹۰)

مولانا محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ سید احمد نے اپنے جہاد کی حقیقت واضح کرتے ہوئے کہا: سرکار انگریز گو منکر اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے ہیں اور ترویج مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔

پھر ہم سرکار انگریز پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصول مذہب کے خلاف بلا وجہ

طرفین کا خون گرادیں۔ (حیات سید احمد شہید ص ۱۷۱)

یہی مولانا جعفر صاحب لکھتے ہیں:

سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا، وہ اس وقت آزاد عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر سرکار انگریز اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ ملتی مگر سرکار انگریز اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔ (حیات سید احمد شہید ص ۲۹۳)

اس مسئلہ پر سید احمد کی تحریک پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس مقام پر میں یہ بات بیان کرتا ہوں کہ سید احمد صاحب نے پشاور پر سکھوں کا پھر قبضہ ہونے کے بعد اپنے ان رفیقوں سے جو جہاد میں جان دینے پر آمادہ تھے یہ کہا کہ تم جہاد کے لئے مجھ سے بیعت شرعی کرو۔ چنانچہ کئی سو آدمی نے اس وقت بیعت کی اور یہ بات تحقیق ہے کہ جو شخص شیر سنگھ کے مقابلہ میں لڑائی سے بچ رہے تھے۔ ان میں صرف چند آدمی اپنے پیشوا سید احمد صاحب کی شہادت کے بعد مولوی عنایت علی اور ولایت علی ساکن پٹنہ ان کے سردار ہوئے۔ لیکن انہوں نے جہاد کے فرائض سرانجام دینے میں کچھ کوشش نہیں کی اور جب پنجاب پر گورنمنٹ انگریز کا تسلط ہوا تو مولوی عنایت علی اور ولایت علی مع اپنے اکثر رفیقوں کے ۱۸۴۷ء میں اپنے گھروں کو واپس بھیج دیئے گئے۔ پس اس سے ہم کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ خاص پٹنہ یا بنگال کے اور ضلعوں سے عموماً ہندوستان سے روپے اور آدمی اس وہابیت کے پہلے تین زمانوں میں ضرور سرحد کو بھیجے گئے تھے، لیکن میری رائے میں یہ بات بہت کھلی ہوئی ہے کہ ان میں سے کوئی آدمی انگریز گورنمنٹ پر حملہ کرنے کے واسطہ ہرگز نہیں گیا تھا اور نہ ان سے یہ کام لیا گیا اور نہ تین زمانوں میں سے کسی کو اس کا کچھ خیال ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نیت بغاوت کی جانب مائل ہے۔

(مقالات سرسید حصہ نہم ص ۱۴۵۔۱۴۶)

اس موضوع پر سرسید مزید لکھتے ہیں:

مجھ کو ایک ایسے معاملے کے اظہار میں ڈرنا نہ چاہیے جس کو میں اپنے ذہن میں بالکل

سچ سمجھتا ہوں، جب مولوی عنایت علی اور ولایت علی ۱۸۴۷ء میں ہندوستان کو لوٹ آئے تو اس وقت سید احمد صاحب کے چند پیروکار سرحد پر باقی رہ گئے تھے اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ ان دو شخصوں نے پٹنہ اور اس کے قرب و جوار کے آدمیوں کو اس کی ترغیب دینے میں ہرگز کوتاہی نہیں کی کہ وہ جہاد میں شریک ہوں اور یہ اس کام کے واسطے روپیہ جمع کریں۔ چنانچہ وہ برابر بڑی سرگرمی سے کوشش کرتے رہے اور جس بات کا اب تک ان کو دل سے خیال تھا اس کا اظہار انہوں نے ۱۸۵۱ء میں اس طرح کیا کہ وہ پھر ہندوستان سے سرحد کی جانب چلے گئے۔ مگر ڈاکٹر ہنٹر صاحب نے یہ خیال کیا کہ یہ لوگ دوبارہ سرحد کو انگریزوں پر حملہ کرنے کی نیت سے گئے تھے اور انہوں نے بجائے سکھوں کے انگریزوں پر جہاد کیا تھا، حالانکہ جب ان لوگوں کو انگریزوں سے کسی طرح کی شکایت نہ تھی تو پھر ان کا یہ ارادہ کسی طرح پر صحیح نہیں ہوسکتا۔ (مقالات سرسید حصہ نہم ص ۱۴۷)

اور یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ وہابی اپنے مذہب میں بڑے پکے نہایت سچے ہوتے ہیں، وہ اپنے اصول سے کسی حال میں منحرف نہیں ہوتے اور جن شخصوں کی نسبت میں یہ لکھ رہا ہوں وہ اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور ان کے مذہب میں اپنے بال بچوں کے محافظوں پر حملہ کرنا نہایت ممنوع ہے، اس لحاظ سے اگر وہ انگریزوں سے لڑتے اور لڑائی میں مارے جاتے تو وہ بہشت کی خوشبوؤں اور شہادت کے درجہ سے محروم ہوجاتے، بلکہ اپنے مذہب میں گناہ گار خیال کئے جاتے۔ ہم کو یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ وہابیوں کی باقی ماندہ جماعت سرحد پر نہایت قلیل رہ گئی تھی اور پہاڑی قومیں ان کے مذہب کے باعث ان سے سخت عداوت رکھتی تھیں۔ (مقالات سرسید حصہ نہم ص ۱۴۸)

۱۸۵۷ء کے غدر میں مسلمانوں نے جو انگریز کے خلاف حصول آزادی کے لئے جہاد کیا اور جس جہاد پر فتوی دینے کے جرم میں علامہ فضل حق خیر آبادی برسوں کالا پانی میں شدید ترین مظالم سہتے رہے اور وہیں وفات پائی، اس دور کی تاریخ بیان کرتے ہوئے سرسید، سید احمد کے پیروکاروں کا جو کردار بیان کرتے ہیں وہ ہر دیدہ بینا کے لئے قابل عبرت ہے۔

سرسید لکھتے ہیں:

البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد کئی لڑائیاں ہوئیں لیکن ان لڑائیوں سے کیا نتیجہ نکلا، میری دانست میں تو ان سے صاف صاف یہ نتیجہ نکلا کہ جو کچھ اس کے بعد ظہور میں آیا اس میں بلوہ کرنے والے سرکاری فوج کے باغی سپاہی تھے۔ سید احمد شاہ صاحب کے گروہ کا ایک شخص بھی اس میں شریک نہ تھا۔ (مقالات سرسید حصہ نہم ۱۴۳)

اسی سلسلہ میں مرزا حیرت کا ذکر کردہ ایک واقعہ بھی قابل غور ہے۔

مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

سید صاحب کے پاس مجاہدین جمع ہونے لگے، سید صاحب نے مولانا شہید کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمال کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کرنے کی تیاری کرتے ہیں، سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عمل داری میں امن میں خلل نہ پڑے تو ہمیں آپ سے کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری میں مانع ہیں، یہ تمام بین ثبوت صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ جہاد صرف سکھوں سے مخصوص تھا۔ سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز مخاصمت نہ تھی، مولانا شہید کی سوانح عمری میں تمام جنگوں کا حال مفصل طور پر بیان ہو چکا، ان کا اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہے۔ (حیات طیبہ مکتبہ اسلام ص ۵۲۳)

اسی موضوع پر مرزا حیرت نے سید احمد کا ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس کی کسی غیور مسلمان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔

مرزا صاحب لکھتے ہیں:

۱۸۳۱ء تک سید احمد صاحب امیر خان کی ملازمت میں رہے، مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرا دی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دیئے گئے اور جن پر امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے دینے طے پائے تھے، لارڈ ہیسٹنگ سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خان، لارڈ ہیسٹنگ اور سید

احمد صاحب، سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا، آپ نے اسے یقین دلایا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لئے برا نہیں ہے تو تمہاری اولاد کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آ گئی تھی اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گزارہ کے لئے کچھ ملک مجھے دے دیئے جائیں تو میں با آرام بیٹھوں۔ امیر خاں نے ریاستوں اور ان کے ساتھ انگریزوں کا بھی ناک میں دم کر دیا تھا، آخر ایک بڑے مشورے کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری سے ہر ریاست میں کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کر لیا، جیسے جے پور سے ٹونک دلوا دیا اور بھوپال سے سرونج۔ اسی طرح متفرق پر گنے مختلف ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد انگریزوں سے دلوا کر بپھرے ہوئے شیر کو اس حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا۔

(حیات طیبہ مطبوعہ مکتبۃ الاسلام ص ۵۱۳۔ ۵۱۴)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ! یہ ہیں ضلوا واضلوا کے مصداق اتم جنہیں سید احمد شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، خود کو تو کبھی آزادی ملک کی خاطر انگریز کے خلاف تلوار اٹھانے کی ہمت نہ پڑی بلکہ اس کے برخلاف ساری زندگی نازنیں سرکار کے پاؤں کی مہندی بنے رہے اور جن لوگوں کی رگوں میں گرم لہو دوڑ رہا تھا جو شیر نر کی طرح انگریز پر جھپٹنے کے لئے بے قرار تھے ان کے غیور بدن سے بھی شیر کی کھال اتار کر گوسفند کا جامہ پہنا دیا، یہ تو تھے اکابر دیو بند کے صف اول کے مقتداء جناب سید احمد صاحب، آیئے! اب ان کے دوسرے رہنما مولانا اسماعیل دہلوی کے سیاسی کردار کا جائزہ لیں۔

اسماعیل دہلوی کا سیاسی کردار

نعیم اختر صاحب نے زیر بحث پیراگراف میں اکابر علماء دیو بند میں اصحاب شاہ ولی اللہ کا سرفہرست ذکر کیا ہے جن میں سے ایک تو سید احمد صاحب ہیں جن کا ابھی ذکر آچکا ہے، دوسرے ہیں مولانا اسماعیل دہلوی، آیئے! اب آپ کو ان سے بھی ملائے دیتے ہیں۔

جس وقت برصغیر کے مسلمان انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کے لئے بے قرار تھے، علماء کا ایک گروہ جس کو مولانا فضل حق خیر آبادی اور دوسرے علماء حق کی تائید حاصل

تھی، انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دے چکا تھا، چنانچہ کلکتہ کے جلسۂ عام میں جب ایک شخص نے شاہ اسماعیل سے دریافت کیا کہ انگریزوں کے خلاف آپ جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے تو اس وقت انہوں نے جو جواب دیا اس کو مرزا حیرت دہلوی کی زبانی سنئے:

''ان پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو ہم ان کی رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست درازی نہیں کرتے، ہمیں ان کی حکومت میں ہر طرح کی آزادی ہے بلکہ اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں''۔ (حیات طیبہ طبع قدیم ص ۳۶۴)

ایک اور مقام پر مرزا حیرت دہلوی، مولانا اسماعیل دہلوی کا موقف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مولوی اسماعیل صاحب نے اعلان کر رکھا تھا کہ انگریزی سرکار پر نہ جہاد مذہبی طور پر واجب ہے نہ ہمیں اس سے کچھ مخاصمت ہے۔ (حیات طیبہ طبع قدیم ص ۲۰۱)

اس موضوع پر سرسید قلم اٹھاتے ہیں:

پس ان پانچوں زمانوں میں وہابیت کا پہلا زمانہ نہایت عمدہ تھا اور جو کام اس زمانہ کے وہابی کرتے تھے ان سے گورنمنٹ انگریزی واقف تھی اور کسی طرح ان لوگوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بدخواہی کا گمان نہیں ہوتا تھا، چنانچہ اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے تاکہ وہ اپنے ہم وطن مسلمانوں کو اس قوم کے ظلم و تعدی سے نجات دیں، اس زمانہ میں مجاہدین کے پیشوا سید احمد صاحب تھے، مگر وہ واعظ نہ تھے۔ واعظ مولوی محمد اسماعیل صاحب تھے جن کی نصیحتوں سے مسلمانوں کے دلوں میں ایک ایسا ولولہ اثر خیز پیدا ہوتا تھا جیسا کہ کسی بزرگ کی کرامت کا اثر ہوتا ہے، مگر اس واعظ نے اپنے زمانہ میں کبھی کوئی لفظ اپنی زبان سے ایسا نہ نکالا جس سے ان کے ہم مشربوں کی طبیعت ذرا بھی برافروختہ ہو، بلکہ ایک مرتبہ وہ کلکتہ میں سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثناء وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو کافر ہیں؟ اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل

صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لئے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔ (مقالات سرسید حصہ نہم ص ۱۴۱۔۱۴۲)

مولوی اسماعیل دہلوی نے جو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں، مثلاً ''تقویت الایمان''، ''منصب امامت'' اور ''ایضاح الحق'' وغیرہ ان کے مطالعہ سے ڈاکٹر ہنٹر کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ شاید ان کتابوں میں روئے سخن انگریز کے خلاف جہاد سے متعلق ہے۔ لہٰذا ڈاکٹر ہنٹر کی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی لکھتے ہیں:

''تقویت الایمان'' اور ''تنویر العینین'' میں ایک جملہ بھی جہاد کی طرف اشارہ نہیں کرتا، اب اس تعصب اور اندھے پن کا کیا علاج کہ ان مذہبی کتابوں کو بھی جہاد کی کتاب کہا جاتا ہے اور یہاں آپ سخت تحیر سے لکھتے ہیں: اب تک برٹش عمل داری میں یہ کتابیں عام طور پر بکتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی ہی سمجھ کے لوگوں کے ہاتھ میں مظلوم مسلمانوں کی جانیں ہوتیں تو یہ کبھی کا پیس ڈالتے۔ خدا نے ہماری روشن دماغ گورنمنٹ کو ایسے کاموں کی سمجھ دی ہے کہ جب تک وہ ایک معاملہ کی خوب تحقیقات نہیں کر لیتی اس میں ہاتھ نہیں ڈالتی، ورنہ ایسے آتشیں عنصر تو کبھی کے اسلامی پرانے شکستہ ڈھانچے کو توڑ مروڑ ڈالتے۔

اتنا بڑا محقق (ڈاکٹر ہنٹر) اس الوالعزمی سے اتنے بڑے اہم مسئلہ میں رائے دینے اٹھا، مگر اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ جن رسائل کو میں جہاد کا رسالہ کہتا ہوں اگر خود پڑھا ہوا نہیں ہوں تو لاؤ کسی مسلمان بچے سے پڑھوا لوں، گھنٹہ دو گھنٹہ میں مضامین رسائل کے بارے میں اطلاع ہو جاتی، وہاں تو غرض گورنمنٹ کو مسلمانوں کی طرف سے بھڑکانے اور صریح دھوکا دینے کی تھی۔ اس لئے ہر حق بات سے عمداً چشم پوشی کی۔ الحمدللہ کہ سرسید کی زبردست تحریر نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیا اور ڈاکٹر ہنٹر صاحب کی غلط فہمی تعصب یا دھوکہ دہی کی نیت گورنمنٹ اور تقریباً تمام تعلیم یافتہ طبقہ لندن میں ظاہر ہو گئی، اب مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں نئی طرز پر بحث کروں ڈاکٹر صاحب پشیمان ہو چکے، گورنمنٹ ڈاکٹر صاحب کی غلطیاں تسلیم کر چکی پھر اب زیادہ لکھنے کی ضرورت ہی کیا رہی ہے۔

(حیات طیبہ مطبوعہ مکتبہ اسلام ص ۲۶۸-۲۶۹)

ڈاکٹر ہنٹر صاحب کو مولانا اسماعیل دہلوی کی تصنیفات میں لفظ جہاد سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی کہ شاید اس جہاد سے مراد انگریزی حکومت کے خلاف جہاد ہے، مرزا صاحب دہلوی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے اور اس تاثر کے ازالہ کے لئے مولانا اسماعیل کے بعض مکاتیب سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس جہاد سے مراد انگریزوں کے خلاف جہاد نہیں بلکہ سکھوں کے خلاف جہاد مراد ہے۔ ہم ذیل میں ان کے ایک مکتوب سے بعض اقتباسات پیش کرر ہے ہیں۔

(۱) از مولانا محمد اسماعیل بنام میر شاہ علی صاحب۔

"و بالجملہ چوں امامت آنجناب ثابت گردید ہیچ امرے کہ باعث انعزال آنجناب از منصب امامت باشد یافتہ نشد پس اطاعت آں جناب برکافہ مسلمین واجب گردید ہر کہ امامت آنجناب ابتداء قبول نکند یا بعد القول انکار نماید پس ہمو نست باغی مستحل الدم کہ قتل او مثل کفار (مراد سکھاں) عین جہاد است"۔

(حیات طیبہ مطبوعہ مکتبہ اسلام ص ۲۷۲-۲۷۳)

(۲) **"ثالثاً آں کہ مماثلت شوکت باشوکت جمیع مخالفین از کفرہ شرق و غرب اصلاً مراد نسبت والا امامت ہیچ امامے از سابقین ولا حقین ثابت نہ گردد پس مماثلت با شوکت ہمیں مخالفین مراد باشد کہ بالفعل مقابلہ بایشاں (یعنی سکھاں) در پیش است و در ما نحن فیہ ایں قدر شوکت البتہ متحقق ست"۔**

(حیات طیبہ مطبوعہ مکتبہ اسلام ص ۲۷۴)

۱۸۵۷ء کے تاریخی حالات پر نظر رکھنے والا ضرور سوچے گا کہ آخر سید احمد اور مولانا اسماعیل دہلوی نے انگریزوں سے کیوں تعلقات استوار رکھے، ان سے کیوں مالی امداد لیتے رہے اور دہلی میں ایک مشترک دشمن انگریز کو چھوڑ کر دو ہزار میل دور جا کر سکھوں اور سرحدی غیور اور دین دار مسلمانوں سے کیوں جنگ کی؟

چنانچہ مرزا حیرت صاحب لکھتے ہیں:

جب مجاہدین سرحد مصروف جہاد تھے تو انگریزوں کو اس کا مکمل طور پر علم تھا اور انہوں نے اسی لئے اس تحریک میں مزاحمت نہ کی، انگریزی سلطنت سے چندہ جمع ہو کر مجاہدین کو برابر پہنچتا رہا اور انگریزوں نے اس میں دست اندازی نہ کی، بلکہ ایک بار جب سات ہزار روپے کی ہنڈی ایک ہندو ساہوکار کی وجہ سے نہ پہنچی تو عدالت انگریزی میں مولانا محمد اسحاق نے مقدمہ دائر کر دیا اور حکومت انگریزی نے جماعت مجاہدین کے مذکورہ فرد کے حق میں فیصلہ دے دیا اور ہنڈی سید صاحب کو وصول ہو گئی۔ (حیات طیبہ طبع قدیم ص ۲۷۳)

جب سید احمد کے جہاد سے سکھوں کا زور ٹوٹ گیا تو ۱۸۴۸ء میں سکھوں اور انگریزوں کا معاہدہ ہو گیا تو انگریز نے ان مجاہدین کو جہاد سے روک دیا، چنانچہ مولانا جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

جب گلاب سنگھ اور سرکار انگریزی کا آپس میں معاہدہ ہو گیا تو اس وقت سرکار انگریزی نے ایک خط بنام مولوی ولایت علی صاحب لکھا کہ اب گلاب سنگھ سرکار انگریز کی حمایت میں ہے، اس وقت اس سے لڑنا عین گورنمنٹ سے لڑنا ہے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ اس کے ساتھ لڑنا بند کر دو۔ (حیات سید احمد شہید ص ۳۴۰)

جیسے ہی انگریز آقاؤں کا حکم موصول ہوا تو مولانا اسماعیل دہلوی اور سید احمد کے پیروکاروں نے اپنے ناخداؤں کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے یک لخت "جہاد" موقوف کر دیا۔ ہم سے نہیں مولانا تھانیسری کی زبان سے سنئے، لکھتے ہیں:

"اس کے بعد مجاہدین نے لڑائی بند کر دی، ہتھیار سرکار کے پاس جمع کرا دیئے اور قیمت وصول کر لی، انگریزوں نے مجاہدین کا شاندار استقبال کیا اور ان کی دعوتیں بھی کیں"۔ (حیات سید احمد ص ۳۴۱)

ان تاریخی دستاویزات کے بعد بھی کیا اس امر میں کوئی اشتباہ اور اخفاء رہ جاتا ہے کہ سکھوں کی شورشوں اور مظالم کی فرضی داستان تو صرف ایک بہانہ اور آڑ تھی، دراصل سید احمد اور مولانا اسماعیل دہلوی انگریز کے پروردہ اور ایجنٹ تھے اور اس کے اشارہ ابرو پر دہلی

الا فاضل نے "سواداعظم" میں ایک مقالہ لکھ کر سب سے پہلے تقسیم ہند کا تصور پیش کیا، یہ اس وقت کی بات ہے جب بمبئی میں اس سال شوال کے مہینہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ آپ نے تحریر فرمایا: بمبئی کے ہندو کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی دکانیں مسلمان محلوں سے ہٹا کر ہندو محلوں میں لے جائیں۔ ہندوؤں کے یہ افعال، یہ تجویزیں، یہ طرز عمل اتحاد کے ذرا بھی منافی نہیں لیکن مسلمان ایسا کریں تو اتحاد کے دشمن قرار دیئے جائیں۔ یہ کھلی ناانصافی ہے، جب ہندو اپنی حفاظت اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے محلوں سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنی حدود علیحدہ کر لیں تو مسلمانوں کو یقیناً ان کے محلوں میں جانے اور ان کے ساتھ کاروبار رکھنے سے احتیاط رکھنا چاہیے، دونوں کو اپنے اپنے حدود جداگانہ قرار دیں اور اس نکتہ کو ملحوظ رکھ کر سیاسی مباحث کو طے کر لینا چاہیے یعنی ہندوستان میں ملک کی تقسیم سے ہندو مسلم علاقے جدا جدا بنا سکیں تاکہ باہمی تصادم کا اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے اور ہر علاقے میں اسی علاقہ والوں کی حکومت ہو۔ مسلم علاقوں میں مسلمانوں کی اور ہندو علاقوں میں ہندوؤں کی، اب نہ مخلوط و جداگانہ انتخاب کی بحثیں درپیش ہوں گی، نہ کونسلوں میں نشستوں کی منازعت کا کوئی موقع رہے گا، ہر فریق اپنی حدود میں آرام کی زندگی گزار سکے گا۔ جب ہندو ذہنیت نے بمبئی میں یہ گوارہ کر لیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ جدید حکومت کا مسئلہ اس اصول پر نہ طے کیا جائے۔ صدر الافاضل نے تقسیم ہند کا یہ تصور اپنے فاضلانہ مقالہ میں ۱۹۳۱ء میں پیش کیا تھا اور ۱۹۳۸ء میں کانگریس میٹنگ (Meeting) منعقدہ لکھنؤ میں ہندو لیڈروں کے پوشیدہ عزائم اور ان کی اندرون خانہ اسلام دشمنی کو بھانپ کر قائداعظم کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے یہ کہہ کر اجلاس سے واک آؤٹ (Walk Out) کیا کہ ہم باعزت اور مساویانہ شرکت کر سکتے ہیں، ذلیل اور ماتحت ہو کر شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد دو قومی نظریہ نے بہت شہرت پائی اور ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی، کانگریس اور نیشنلسٹ علماء نے قیام پاکستان کی مخالفت میں سردھڑ کی بازی لگا دی۔ اس کے مقابلہ میں علماء اہل سنت نے اپنی تمام فکری اور عملی صلاحیتیں قیام پاکستان کی مساعی کے لئے وقف کر دیں۔ صدر الافاضل نے ۱۹۴۶ء میں بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد

کی جس میں تمام برصغیر کے علماء اہل سنت اور مشائخ عظام نے شرکت کی اور اس تاریخی اجتماع میں قیام پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی۔ بنارس کی تاریخی کانفرنس میں حضرت صدر الافاضل نے اعلان کیا: اگر بالفرض آل انڈیا مسلم لیگ مطالبۂ پاکستان سے دست کش بھی ہو جائے تو آل انڈیا سنی کانفرنس مطالبۂ پاکستان سے دست بردار نہیں ہوگی۔ صدر الافاضل کی تمام زندگی ملی اور سیاسی خدمات کے ایک ہنگامہ خیز دور سے عبارت تھی۔ انہوں نے بظاہر مراد آباد میں جامعہ نعیمیہ کے نام سے ایک مدرسہ بنایا اور چند کتابوں کے علاوہ قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی، لیکن درحقیقت انہوں نے ایسے افراد تیار کئے جو اپنی شخصیت کے اعتبار سے ایک مستقل ادارہ تھے۔ ان کے تلامذہ میں سے حضرت مفتی احمد یار خاں اور پیر کرم شاہ الازہری نے قرآن کریم کی تفسیریں لکھیں۔ مولانا نور اللہ نعیمی بصیر پوری نے حالات حاضرہ کے مطابق فقہ حنفی میں تجدیدی کام کیا۔ تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی، ابو البرکات سید احمد، مولانا محمد یونس نعیمی اور مولانا حبیب اللہ جیسے یگانہ روزگار محدث اور مفتی پیدا کئے۔ ابوالحسنات سید محمد احمد اور علامہ مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ اور علامہ شاہ احمد نورانی جیسی قدر آور سیاسی شخصیات بنائیں۔ علاوہ ازیں آپ کے تلامذہ نے پاکستان میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا۔ جن میں جامعہ نعیمیہ لاہور اور دار العلوم نعیمیہ کراچی خاص طور پر قابل ذکر ہیں (مورخہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ بروز جمعہ تحریک پاکستان کا یہ نامور مجاہد، برصغیر کے مسلمانوں کا پیشوا، اپنے دور کا عظیم ترین فاضل، رسول اللہ ﷺ کا محب صادق، اہل سنت کا محبوب اور ان کی عقیدتوں کا مرکز اور دنیائے اسلام میں علم و فضل کا یہ نیر تاباں غروب ہو گیا، لیکن حق یہ ہے کہ مومن کامل کبھی نہیں مرتا۔ اس کے زریں کارنامے اس کو زندہ رکھتے ہیں۔ ظلمت کدہ ضلالت میں اس کی سیرت کی یاد سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ فراعنہ عصر کی یلغار سے پیچھے ہٹنے والے غازیوں کو اس کی ولولہ انگیز حیات سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ وہ جیتا ہے تو اللہ کے نام پر مرنے کے لئے اور مرتا ہے اللہ کے بندوں کے جینے کے لئے)۔



(۱) غزالیٔ دوراں مولانا سید احمد سعید کاظمی (1)

غزالیٔ زماں رازی دوراں سید احمد سعید کاظمی متعنا اللہ تعالیٰ بطول حیاتہم سرمایہ افتخار محدث، بے بدل فقیہ اور عظیم ترین محقق ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم حدیث کی خدمت میں گزارا ہے۔ مختلف علمی موضوعات پر تحقیقی تصنیفات سپرد قلم کی ہیں۔ سینہ میں ملت کا گہرا درد رکھتے ہیں اور ہر ضرورت کے موقع پر ملک اور قوم کے لئے گراں بہا قربانیاں دی ہیں۔ مسلک سے والہانہ لگن اور اہل سنت کے حقوق کی پامالی پر ہمیشہ مضطرب رہتے ہیں۔ سنیوں کی تنظیم کے لئے بارہا کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ملک کے طول و عرض میں متعدد دورے کئے اور مختلف انواع کی مساعی مشکور کی ہیں۔

حضرت کے تلامذہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے جو ملک اور بیرون ملک میں دین کے متعدد شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ چشتی، قادری اور سہروردی ان تمام سلسلوں میں اجازت بیعت حاصل ہے۔ تلامذہ کی طرح مریدین کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے اور پاکستان کے قریہ قریہ میں آپ کے ارادت مند پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ بے حد منکسر المزاج اور متواضع شخصیت کے مالک ہیں، جس شخص کو بھی آپ کے ساتھ کچھ روز گزارنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ آپ کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں سوز و گداز ہے۔ درس حدیث کے وقت اکثر آنکھیں اشک بار رہتی ہیں۔ ایک بار سراج العلوم خانپور کے سالانہ جلسہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے، عجب سماں تھا، پنڈال میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین بیٹھے ہوئے تھے اور سب کی آنکھوں سے سیل اشک جاری تھا۔ اسی حال میں آپ دوران تقریر اسٹیج پر سے گر پڑے۔ ہر شخص پر رقت کا عالم طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں لوگوں کی آنکھوں سے آنسو تھمتے نہ تھے، ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی آوازیں، بے اختیارانہ چیخیں، اشکوں

1۔ یہ مقالہ حضرت مولانا سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں لکھا گیا تھا۔

کا سیل رواں اور پرسوز نالے غرض تمام سامعین پر عجب قسم کی ازخود رفتگی طاری تھی۔ راقم الحروف کو ۱۹۵۶ء سے حضرت کے ساتھ تعلق خاطر ہے۔ اس عرصہ میں اس گناہ گار پر حضرت کی بے پناہ عنایتیں اور نوازشیں شامل حال رہیں۔ بارہا آپ کی مجلسوں میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور آپ کی سیرت کے بے شمار واقعات لوح ذہن پر ثبت ہوتے رہے۔
ایک ملاقات میں میں نے آپ کے سامنے آپ کے حالات زندگی کا تذکرہ چھیڑ دیا اور آپ کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات معلومات کی روشنی میں آ گئے۔ یہ تمام معلومات اور یادداشتیں میں نے اپنے پاس نوٹ کر رکھی تھیں۔ اس خیال سے کہ کسی وقت ان کو سوانحی انداز پر ترتیب دے لوں گا۔ حسن اتفاق سے محترم عابد نظامی صاحب نے فرمائش کی کہ میں اس ماہ "ضیائے حرم" کے لئے حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی مدظلہ کی شخصیت پر کچھ لکھ کر پیش کرو۔ مجھے سوانحی مضامین شخصیات پر لکھنے کا کچھ سلیقہ اور تجربہ تو نہیں ہے۔ بہرحال حضرت سے کچھ ملاقاتوں، یادداشتوں، آپ کی علمی کاوشوں اور سیرت کی جھلکیوں کا جو کچھ سرمایہ میرے پاس محفوظ ہے اسے تلخیص کے ساتھ قارئین "ضیائے حرم" کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔

ابتدائی حالات

بیہقی زماں، غزالی دوراں ابوالنجم سید احمد سعید کاظمی کا سلسلۂ نسب سیدنا امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ سے منسلک ہے۔ ۱۹۱۳ء میں مراد آباد کے مضافاتی شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد مختار کاظمی تھا۔ ایام طفولیت میں ہی والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے برادر معظم سید محمد خلیل کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ سید محمد خلیل کاظمی انتہائی جید فاضل، عظیم محدث اور صاحب نظر درویش تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈوبی ہوئی نعتیں کہا کرتے تھے۔ شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحر العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے اور سفر و حضر میں ہمیشہ حضرت علامہ کاظمی کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

حضرت نے ابتداء سے انتہاء تک تمام تعلیم اپنے برادر معظم سے ہی حاصل کی اور آپ

ہی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔ دستار بندی کے موقع پر حضرت شاہ علی حسین صاحب اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھی۔ اس تقریب میں حضرت مولانا معوان صاحب رامپوری، حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری و دیگر اکابر علماء اور اعاظم مشائخ اہل سنت موجود تھے جنہوں نے آپ کو خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

ایام تحصیل ہی میں آپ نے امتناع کذب کے موضوع پر ایک انتہائی علمی اور پر مغز رسالہ "تسبیح الرحمٰن عن الکذب والنقصان" کے نام سے زیب رقم فرمایا۔ مختلف بدمذہبوں سے مباحثوں اور مناظروں میں حصہ لیا اور ہر بار خدا کے فضل و کرم سے غالب اور کامیاب رہے۔

تدریسی زندگی

حضرت علامہ فراغت کے بعد بعض احباب سے ملاقات کے لئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں حضرت سید محمد دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے مستفیض ہوئے اور حضرت مولانا سید ابو البرکات اور مولانا سید ابو الحسنات سے ملاقات ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک دن جامعہ نعمانیہ تشریف لائے۔ وہاں ایک کلاس میں حافظ محمد جمال صاحب "مسلم الثبوت" پڑھا رہے تھے۔ آپ بھی سماع کی خاطر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت ماہیت مجردہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ آپ کی جودت طبع اور استحضار مسائل کے ملکہ سے حافظ محمد جمال صاحب بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے دبیر انجمن خلیفہ تاج الدین صاحب سے آپ کی قابلیت کا تذکرہ کیا، انہوں نے آپ کو جامعہ نعمانیہ میں تدریس کی پیش کش کی، جس کو آپ نے اپنے برادر معظم کی اجازت کی شرط پر منظور کر لیا۔ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کے دوران آپ کے ذمہ نور الانوار، قطبی، مختصر المعانی اور شرح جامی وغیرہ کی تدریس مقرر کی گئی۔ رفتہ رفتہ طلبہ کا میلان آپ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اٹھائیس اسباق کی تدریس آپ کے ساتھ متعلق ہو گئی۔ تدریس کا تجربہ آپ کو دوران تعلیم ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ زمانہ تعلیم کے آخری دو سالوں میں آپ باقاعدہ اسباق

پڑھایا کرتے تھے۔ وہ مہارت یہاں کام آئی اور نعمانیہ میں آپ کی تدریس کا سکہ بیٹھ گیا۔

۱۹۳۱ء میں آپ لاہور سے واپس امروہہ تشریف لے گئے اور چار سال تک امروہہ کے مدرسہ محمدیہ حنفیہ میں حضرت محمد خلیل صاحب کاظمی کی سرپرستی میں تدریس فرماتے رہے۔ اس دوران مطلع العلوم کے حضرت مولانا خلیل اللہ سے مجلس ہوتی اور متعدد علمی مباحثے ہوتے۔ مشہور مناظر مولوی مرتضیٰ حسین دربھنگی سے بھی کئی بار مناظرے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ ہمیشہ کامیاب و کامران رہے۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں حکیم جان عالم سے آپ کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، جو لاہور سے واپسی کے بعد بھی برقرار رہے اور ان سے خط و کتابت ہوتی رہی۔ انہیں کے اصرار پر آپ ایک سال کے لئے اوکاڑہ تشریف لے گئے، اس زمانہ میں اوکاڑہ میں گستاخانِ رسول کی بڑی شورش تھی۔ ہر طرف تنقیص رسالت کی مہم جاری تھی۔ آپ نے وہاں جا کر مسلک اہل سنت کی تبلیغ اور درس و تدریس کے سلسلہ کو جاری کیا۔ آپ کی مساعی سے بہت جلد فضا بہتر ہو گئی اور عظمت رسول کے نعروں سے اوکاڑہ کے در و دیوار گونجنے لگے۔

ملتان میں آمد

حضرت سید نفیر عالم ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ آپ کے برادر معظم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ آپ نے حضرت نفیر عالم کو اپنا شیخ صحبت بنالیا تھا۔

حضرت سید نفیر عالم ہر سال ملتان میں خواجہ غریب نواز سلطان الہند حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا عرس منعقد کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں آپ کو وہاں تقریر کی دعوت دی۔ حضرت نفیر عالم نے جب آپ کی تقریر سنی تو دل و جان سے فدا ہو گئے اور تب سے ان کا پیہم اصرار رہا کہ آپ ملتان آجائیں اور اہالیان ملتان کو مستفیض کریں۔ بالآخر ۱۹۳۵ء کے اوائل میں آپ ملتان تشریف لے گئے۔

ملتان آنے کے بعد آپ نے اپنے رہائشی مکان ہی میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ متلاشیانِ حق اور تشنگانِ علم دور دور سے آ کر آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے

رہے۔ نومبر ۱۹۳۵ء میں آپ نے مسجد حافظ فتح شیر بیرون لوہاری دروازہ میں قرآن مجید کا درس شروع کیا۔ بعض بدبختوں نے اس درس کو ناکام کرنا چاہا، چنانچہ علاقہ کے تمام مخالف علماء درس میں شرکت کرتے اور دوران درس مختلف قسم کے اعتراض کیا کرتے۔ مگر خدا کے فضل سے وہ ہمیشہ ناکام رہے اور آپ کے علم وفضل کی شہرت دور دور پھیلتی گئی۔ حضرت اٹھارہ سال تک مسلسل اس مسجد میں درس قرآن پاک دیتے رہے اور اٹھارہ سال کے طویل عرصہ کے بعد آپ نے یہاں درس قرآن پاک مکمل کیا۔ اسی اثناء میں آپ نے عشاء کے بعد حضرت چپ شاہ صاحب کی مسجد میں درس حدیث شروع کیا اور پہلے ''مشکوٰۃ'' کا اور اس کے بعد ''بخاری شریف'' کا درس مکمل کیا۔

آپ کے حلقۂ درس میں یوں تو سب ہی آپ کے ارادت مند تھے، لیکن حاجی محمد ابراہیم کمپنی والے آپ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ یہ گوجرانوالہ کے ایک غیر مقلد مولوی عبدالعزیز کے مرید تھے۔ جب حاجی محمد ابراہیم نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو مولوی عبدالعزیز گوجرانوالہ سے انہیں رخصت کرنے کے لئے ملتان آئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کا یہ مرید حضرت کا درس سنتا ہے تو وہ بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے: یہ لوگ تو (العیاذ باللہ) مشرک ہیں۔ دوسرے دن جب حاجی محمد ابراہیم کو گاڑی میں سوار کرانے کے لئے اس کے احباب گئے، ان میں حضرت بھی تھے اور مولوی عبدالعزیز بھی، پھر وہاں کسی نے باہم تعارف کرادیا۔

مولوی عبدالعزیز نے اس کے بعد اپنے تمام ہم خیال علماء کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں ایک بدعتی آ گیا ہے۔ اگر اس کے قدم یہاں جم گئے تو بڑی پریشانی ہوگی، انہوں نے جواب میں کہا کہ حضرت! ہم نے بارہا کوشش کی ہے لیکن ان کے علم اور زور بیان کے آگے پیش نہیں جاتی، آپ کو فن مناظرہ میں بڑی مہارت ہے اور علم وفضل میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں، اس لئے آپ ان سے مناظرہ کریں۔ چنانچہ مولوی عبدالعزیز اور اس کے حواریوں نے مناظرہ کی تیاری شروع کردی اور کئی دن صرف کر کے بے شمار کتابوں پر نشان لگائے تھے۔ حضرت کا معمول تھا کہ روز صبح درس کے بعد حضرت غوث بہاء الحق رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں

حاضری دے کر آتے تھے۔ ایک دن وہاں سے واپس آ رہے تھے تو پیغام ملا کہ مولوی عبدالعزیز نے گفتگو کے لئے حاجی ابراہیم کی کمپنی میں بلایا ہے۔ حضرت اسی وقت اور اسی حال میں کمپنی میں تشریف لے گئے۔ اس گفتگو میں مولوی عبدالعزیز بری طرح ناکام ہوئے اور ان کی رسوائی کی خبر تمام شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور شہر کے تمام لوگ ہر طرف سے آ کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ اس مباحثہ کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

قاتلانہ حملہ

مولوی عبدالعزیز کی شکست کے بعد حضرت کا عروج ظاہر ہوا اور ہر طرف سے آپ کو لوگ تبلیغ وارشاد کے لئے بلانے لگے اور مسلک اہل سنت کی اشاعت کا ماہ درخشاں سندھ اور پنجاب کے تمام اضلاع میں اپنی نور افگن شعاعیں پھیلانے لگا۔

اہل سنت کے اس غلبہ سے گھبرا کر مخالفین نے آپ کے قتل کی سازش تیار کی۔ چنانچہ مولوی حسین علی واں بھچر وی کا شاگرد حبیب اللہ جو چنی گوٹھ میں رہتا تھا، اس نے حضرت کو بہاولپور کے گاؤں طلعا جملن میں تقریر کی دعوت دی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ یہاں سے اسٹیشن بھی نو میل تھا اور تھانہ بھی نو میل تھا۔

ایسی دور دراز جگہ پر تین محرم کو جمعہ کے دن حضرت کو تقریر کے لئے بلایا گیا۔ جلسہ میں کلہاڑی بردار لوگ کافی تعداد میں شریک تھے، اچانک مولوی حبیب اللہ تقریر کے دوران چلایا: قتل کر دو۔ چنانچہ کلہاڑی برداروں نے آپ پر حملہ کر دیا، جلسہ میں سنی لوگ بھی تھے، انہوں نے آپ کی طرف سے کافی مزاحمت کی لیکن حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے سر پر کلہاڑی کے پیہم وار کئے اور شدید ضربات سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ ایک ہندو عورت آپ کو یہ کہہ کر اٹھا کر لے گئی کہ یہ سید کا بال ہے۔ تین دن تک آپ اس ہندو عورت کے گھر میں بے ہوش پڑے رہے، پھر ادھر ادھر لوگوں کو خبر ہوئی اور آپ کو ملتان لایا گیا جہاں آپ چھ ماہ تک زیر علاج رہے۔ آپ کی عیادت کے لئے ہندوستان کے کونے کونے سے علماء اور مشائخ تشریف لائے۔ ان بزرگوں میں حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب، حضرت محدث صاحب کچھوچھوی، حضرت صدر

الا فاضل مولانا نعیم الدین اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کے اسماء خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

انوار العلوم کا قیام

دوران علاج ہر وقت عیادت کرنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اس حملہ کا تو کوئی ایسا افسوس نہیں ہے، لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ زندگی میں کوئی عظیم کام سرانجام نہیں دیا۔ منشی اللہ بخش رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس وقت آپ کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی دس ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کئے اور کہا کہ یہ آپ کی نذر ہیں، ان کی بیگم نے اپنے سونے کے کڑے اتار کر دیئے کہ انہیں بیچ کر میری طرف سے نذر کریں۔ حضرت کی اہلیہ نے بھی اپنا تمام زیور اتار کر نذر کر دیا۔ آپ نے اس رقم سے ملتان کے وسط میں زمین خرید کر مدرسہ انوار العلوم قائم کر دیا۔

تحریک پاکستان

حضرت علامہ کاظمی شاہ صاحب نے برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مسلم لیگ کے سٹیج سے قیام پاکستان کے لئے جلسے کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں قرارداد پاکستان کی توثیق کے لئے بنارس کانفرنس میں شرکت کی۔ جس زمانہ میں کانگریسی اور احراری علماء سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے اس وقت حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی، حضرت علامہ کاظمی صاحب مدظلہ، پیر جماعت علی شاہ، مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمہم اللہ کی رفاقت میں الگ قومیت اور آزاد پاکستان کے لئے سعی مسلسل اور جہد پیہم کر رہے تھے۔

جمعیۃ العلماء پاکستان کی بنیاد

قیام پاکستان کے بعد حضرت نے نئے حالات کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ وہ لوگ جو کل تک پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور دیکھتے دیکھتے وہ حکومت کی نظر میں سرمہ چشم بن کر سا گئے۔ اس وقت

آپ نے اہل سنت کے اتحاد اور تنظیم کی ضرورت محسوس کی تا کہ اہل سنت کو سیاسی استحکام اور قوت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے آپ نے مولانا ابوالحسنات سے مراسلت کی اور ان پر تشکیل جمعیت کے لئے زور ڈالتے رہے۔ نیز آپ نے پاکستان کے تمام علماء کے نام خطوط لکھے تا آنکہ مارچ ۱۹۴۸ء میں تمام علماء ملتان میں جمع ہوئے، جن میں حضرت مولانا ناصر جلالی (کراچی)، علامہ عبدالغفور ہزاروی (وزیر آباد)، مولانا ابوالنور محمد بشیر (سیالکوٹ)، مولانا ابوالحسنات (لاہور) اور مولانا غلام جہانیاں (ڈیرہ غازی خاں) کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ملتان کے اجلاس میں اہل سنت کی تنظیم کا نام جمعیۃ العلماء پاکستان تجویز کیا گیا اور حضرت علامہ ابوالحسنات کو جمعیت کا صدر اور حضرت علامہ کاظمی شاہ صاحب کو جمعیت کا ناظم اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔

حضرت علامہ نے اپنی نظامت کے دوران جمعیت کو بے حد فروغ دیا اور جمعیت کے ذریعے ملک وملت کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ جہاد کشمیر، دستور سازی، تحریک تحفظ ختم نبوت، تبلیغ و اشاعت، سیلاب زدگان کی مدد غرض ہر خدمت اور ہر ضرورت کے موقع پر آپ نے جمعیت کے پرچم کو سر بلند رکھا۔

جامعہ اسلامیہ میں

محکمہ اوقاف نے علوم اسلامیہ کے تخصص اور تحقیق کے لئے بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس جامعہ کے شعبہ حدیث میں بلند پایہ محقق اور ماہر حدیث کی ضرورت تھی جو روایت و درایت دونوں فنون میں قوی دست گاہ رکھتا ہو، بالآخر محکمہ کی نگاہیں آپ کی ذات پر جم گئیں اور اس نے آپ سے شیخ الحدیث کا منصب قبول کرنے کی درخواست کی۔ اگرچہ انوار العلوم کو چھوڑنا آپ کے لئے بار خاطر تھا، تاہم جامعہ میں اہل سنت کی نمائندگی اور مسلک کے تحفظ کی خاطر آپ نے یہ عہدہ قبول کر لیا اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ فیصلہ بروقت اور صحیح تھا۔ آپ نے ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک جامعہ اسلامیہ میں شعبہ حدیث کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا۔ ان گیارہ سالوں میں سنی طلباء کو

آپ کی وجہ سے اپنے حقوق کے حصول میں انتہائی آسانی رہی اور کئی آسامیوں پر سنی علماء کا تقرر ہوا۔

چند معرکہ آرا مناظرے

دوران تعلیم امروہہ میں آریہ سماج کا مشہور مناظر پنڈت رام چند آیا اور اس نے تناسخ اور قدامت عالم پر مناظرہ شروع کیا۔ اس مناظرہ میں علماء اسلام نے شرکت کی اور مباحثہ میں حصہ لیا۔ حضرت نے بھی اپنے برادر معظم مولانا سید محمد خلیل رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت اور دعاؤں کے ساتھ اس مباحثہ میں شرکت کی۔

پنڈت رام چند نے قدم عالم اور تناسخ پر قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـٕیْنَ (البقرہ) نیز فرماتا ہے: مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَیْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِیْرَ (مائدہ:٦٠)

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ بعض یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے بندر کی جون میں اور بعض عیسائیوں کو خنزیر کی جون میں تبدیل کر دیا اور یہ بعینہٖ تناسخ ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ مرنے کے بعد شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں اڑتی پھرتی ہیں اور یہ بھی تناسخ ہے اور تناسخ قدم عالم کو مستلزم ہے۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ تناسخ اسے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ایک جاندار کی روح دوسرے جسم میں منتقل ہو جائے اور یہاں یہودی اور عیسائی مرے تو نہ تھے، بلکہ زندگی میں ہی ان کی انسانی شکل کو مسخ کر کے انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں متشکل کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ تناسخ نہیں تماسخ ہے اور ارواح شہداء کی جو آپ نے حدیث پیش کی ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برزخ اور معاد کا حال بیان کیا ہے اور آپ معاد کے قائل نہیں ہیں۔ پنڈت رام چند نے کہا: اب تو میں جا رہا ہوں، آئندہ سال آ کر پھر اسی جگہ بحث کروں گا۔

آپ نے فرمایا: دیکھو موت کا کوئی پتہ نہیں ہے، کیا پتہ سال سے پہلے تمہیں موت آ جائے۔ لہٰذا مجھے یہ بتا کر جاؤ کہ اگر مر گئے تو آئندہ سال کس جانور کی جون میں آ کر مجھ سے ملاقات کرو گے۔ اس جواب پر وہ خوش ہوا اور جاتے وقت آپ کو اپنی گھڑی انعام میں

دے گیا۔

مولوی عبدالعزیز سے گفتگو اور مباہلہ

گوجرانوالہ کے مشہور غیر مقلد عالم مولوی عبدالعزیز نے ایک روز صبح صبح آپ کو حاجی محمد ابراہیم کی کمپنی میں بلوایا اور علم غیب کے مسئلہ پر گفتگو شروع کر دی۔ آپ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کے اثبات پر مندرجہ ذیل آیات پیش کیں۔

(۱) عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن)

"اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی شخص کو مطلع نہیں کرتا سوا ان کے جن سے وہ راضی ہو جائے جو اس کے رسول ہیں"۔

(۲) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَیْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَجْتَبِیْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (آل عمران:۱۷۹)

"اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ تم کو اپنے غیب پر مطلع کرے، لیکن اللہ تعالیٰ (اطلاع علی الغیب کیلئے) جسے چاہتا ہے پسند کر لیتا ہے، جو اس کے رسول ہیں"۔

(۳) عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا ﴿۱۱۳﴾ (النساء:۱۱۳)

"اللہ تعالیٰ نے وہ تمام چیزیں آپ کو بتلا دیں جو آپ نہ جانتے تھے اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے"۔

ان تین آیتوں کے بعد آپ نے اثبات علم غیب کے لئے مندرجہ ذیل احادیث پڑھیں۔

(۱) عن عمر قال قام فینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتی دخل اهل الجنة منازلهم واهل النار منازلهم حفظ ذالك من حفظه و نسیه من نسیه۔ (بخاری)

حضرت عمر سے روایت ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء آفرینش عالم سے حوادث کی خبریں دینی شروع کیں، یہاں تک کہ جنتی جنت میں داخل ہو گئے اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو گئے، جس نے

اس کو یاد رکھا، یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔

(۲) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ فِي رِوَايَةٍ فَتَجَلّٰى لِيْ كُلُّ شَيْءٍ وَعَرَفْتُ۔

حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے جان لیا جو کچھ تمام آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور ایک روایت میں یوں ہے: میرے لئے ہر چیز منکشف ہوگئی اور میں نے اس کو جان لیا۔

ان آیات اور احادیث کو سن کر مولوی عبدالعزیز کہنے لگا: "فتاویٰ قاضی خاں" میں ہے: جو شخص حضور ﷺ کے لئے غیب کا مدعی ہو وہ کافر ہے۔ آپ نے فرمایا: عجب بات ہے، میں قرآن اور حدیث پیش کرتا ہوں اور تم اس کے معارضہ میں قاضی خاں کے اقوال پیش کرتے ہو اور قول بھی وہ جو "قالوا" کے ساتھ مقرون ہیں اور قاضی خاں کی اصطلاح میں مقرر ہے کہ "قالوا" کے ساتھ جو قول ہو وہ ضعیف ہوتا ہے۔ مولوی عبدالعزیز نے کہا کہ تم حنفی ہو؟ فرمایا: ہاں! کہا: حنفیوں کی کتاب "شرح فقہ اکبر" میں لکھا ہے:

ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الا ما اعلمهم الله تعالیٰ احیانا

انبیاء کو علم غیب نہیں ہوتا، مگر ان باتوں کا جو اللہ تعالیٰ انہیں احیانا بتلا دیتا ہے۔

آپ نے فرمایا: یہ عبارت میرے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اس عبارت میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر جاننے کی نفی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے علم کا قائل ہوں۔ ثانیاً اس عبارت میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو احیانا علم غیب عطا فرماتا ہے اور احیان، حین کی جمع ہے، اب میں بتلاتا ہوں کہ ایک حین میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کتنا علم عطا فرمایا ہے۔ "ترمذی شریف" میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا، جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی۔ "فعلمت ما فی السموات و ما فی الارض" "پس میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے"

غور کرو! جب ایک حین میں حضور ﷺ کے علم کا یہ عالم ہے تو احیان میں ان کے علم کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ مولوی عبدالعزیز نے کہا: دکھلاؤ یہ حدیث کہاں ہے؟ آپ نے

انہیں کی کتابوں میں سے "مشکوٰۃ شریف" میں سے یہ حدیث نکال کر پیش کی۔ کہنے لگا: "مشکوٰۃ" بے سند کتاب ہے، میں اس کو نہیں مانتا، "ترمذی" میں دکھلاؤ۔ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر "ترمذی شریف" کھولی تو سامنے سورۂ ص کی تفسیر میں وہی حدیث نکل آئی۔ جب مولوی عبدالعزیز کو یہ حدیث دکھائی تو وہ غصہ میں آگ بگولا ہو گیا اور طیش میں آ کر کتاب کو پھینک دیا۔ جیسے ہی مولوی عبدالعزیز نے "ترمذی شریف" اٹھا کر پھینکی حضرت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: تو گستاخ اور بے ادب ہے، اب میں تجھ سے مناظرہ نہیں کرتا، مباہلہ کروں گا۔ چنانچہ دونوں نے یہ الفاظ کہے: اگر میرا مقابل حق پر ہو اور میں باطل پر ہوں تو میں اس سال کے اندر خدا کے قہر وغضب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاؤں اور اگر میں حق پر ہوں تو میرا مقابل خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے۔ مباہلہ کرنے کے بعد آپ وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔

مولوی عبدالعزیز جب گوجرانولہ پہنچے اور صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دینے کے لئے بیٹھے اور بولنا چاہا تو الفاظ منہ سے نہ نکلے، زبان باہر نکل آئی، کافی دنوں تک علاج کی کوشش کی گئی، لیکن ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ کوئی مرض ہو تو اس کا علاج کیا جائے، یہ تو عذاب الٰہی ہے بالآخر سال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے گفتگو

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران مختلف مکاتیب فکر کے علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے۔ ایک مجلس میں مولانا ظفر احمد انصاری، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت قبلہ کاظمی شاہ صاحب جمع ہوئے۔ اثناءِ گفتگو میں حضرت صاحب نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے فرمایا: آپ نے اپنی کتاب "الکلام" میں مرزا غلام احمد قادیانی کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا حسب نسب اپنے زمانہ کے تمام احساب وانساب سے افضل ہو۔ حالانکہ یہ بات بے دلیل ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی نے کہا کہ میں نے تو حدیث شریف کا ترجمہ کیا ہے۔ "بخاری شریف" میں ہے: "کذالک تبعث الانبیاء فی احساب قومھم" "انبیاء

علیہم السلام اپنی قوم کے بہترین نسب سے مبعوث کئے جاتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا: حدیث کا ترجمہ تو یہ ہے کہ جس قوم کی طرف نبی مبعوث ہو اس کا نسب اس قوم میں افضل ہوتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے: نبی کا نسب اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہوتا ہے۔ کہنے لگے: اگر میں نے لکھ دیا تو کیا خرابی لازم آئی؟ حضرت نے فرمایا: خرابی یہ ہے کہ "ترمذی شریف" میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم میں اسماعیل کو فضیلت دی اور اولاد اسماعیل میں کنانہ کو فضیلت دی اور کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنو ہاشم اور بنو ہاشم میں مجھے فضیلت دی۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ حضرت ابراہیم کے دو فرزندوں اسحاق اور اسماعیل علیہم السلام میں حضرت اسماعیل کا نسب حضرت اسحاق سے افضل تھا اور جس زمانہ میں نسل اسحاق سے بنی اسرائیل کے نبی مبعوث ہوئے اس وقت حضرت اسماعیل کی اولاد بھی موجود تھی اور ان کا نسب بنی اسرائیل کے انبیاء سے افضل تھا۔ اب اگر نبی کے لئے ضروری ہو کہ اس کا نسب اپنے زمانہ کے تمام انساب سے افضل ہو تو لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء، انبیاء نہ رہیں کیونکہ ان کا نسب اپنے زمانہ کے نسب اسماعیل سے افضل نہ تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کی نبوت کے انکار سے بڑھ کر اور کون سی خرابی ہوگی۔ جب حضرت نے یہ ایراد قائم فرمایا تو مولانا ادریس صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور مجلس وہیں برخاست ہوگئی۔

قاضی نجد سے گفتگو

حضرت علامہ حرم رسول میں حاضر تھے۔ پرسوز گزارشات اور التجائیں کر رہے تھے۔ چہرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور پیٹھ مبارک کعبہ کی جانب تھی۔ نجدی پہرہ داروں نے منع کیا اور کہا کہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ کرو، بلکہ کعبہ کی طرف منہ کر کے حضور کی طرف پیٹھ کرلو۔ آپ نے ان کے انکار کی طرف ذرا التفات نہ کیا۔ دوسرے دن آپ کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی نے پوچھا: کیا آپ قبر رسول کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم کعبہ کی بات کرتے ہو، میں تو اس جگہ کو عرش سے بھی افضل جانتا ہوں۔ اس نے پوچھا: دلیل؟ آپ نے فرمایا: دیکھو از روئے قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے شکر گزار

بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: ۷) "اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہارے مراتب میں اور زیادتی کروں گا"۔ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے زیادتی دی، زمین سے چوتھے آسمان پر لے گیا۔ حضرت عیسیٰ وہاں بھی شکر گزار رہے۔ اب چاہیے یہ تھا کہ انہیں اور بلندی پر لے جاتا، یہاں تک کہ عرش پر لے جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں حضور کے پہلو میں لائے گا۔ معلوم ہوا کہ جو عظمت اور بلندی جوار مصطفیٰ میں ہے وہ عرش کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حضرت نے جب یہ دلیل قائم کی تو قاضی مجید دم بخود رہ گیا۔

فوائد حدیث

جامعہ اسلامیہ میں ایک مرتبہ حدیث شریف پڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تابعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، اس پر ایک طالب علم نے سوال کیا کہ تابعی تو وہ ہوتا ہے جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہو، بلکہ آپ کے صحابی کو دیکھا ہو تو تابعی حضور سے کیسے روایت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنی، بعد میں وہ العیاذ باللہ مرتد ہو گیا اور "من یکفر بالایمان فقد حبط عملہ" مرتد ہونے کے بعد اس کے تمام اعمال اکارت ہوئے۔ شرف صحابیت بھی جاتا رہا، حضور کے وصال کے بعد وہ پھر ایمان لے آیا اور اس نے صحابہ کو دیکھا، اب وہ تابعی ہوا، اس کے بعد اگر وہ حضور سے سنی ہوئی کسی روایت کو بیان کرے تو وہ حضور سے تابعی کی روایت ہوگی، صحابی کی نہیں۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ "بخاری شریف" میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں استغفار سے منع فرمایا ہے: اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰) نیز جب آپ کے استغفار کے باوجود اس کی مغفرت نہ ہوئی تو آپ کی شان محبوبیت اور استجابت دعا پر حرف آیا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: حضور نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعا مانگی، نماز جنازہ میں آپ نے فرمایا: "اللھم اغفر لحینا و میتنا" "اے اللہ! بخش دے ہمارے زندوں کو اور ہمارے مردوں کو" اور وہ ہمارا کب تھا اور جو کہتے ہیں: ہمارا ہے انہیں مبارک ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا اب بھی کوئی شخص کسی مرتد کا جنازہ اس تاویل سے پڑھ سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ

زبردست فاضل اور بے بدل عالم دین علامہ فضل حق خیر آبادی قدس سرہٗ کو فہرست علماء سے خارج کر دیتا ہو، جو برملا اپنی کتابوں میں انگریز کو جھوٹا، متعصب اور محرف لکھتا ہو اور انگریزوں کی تحریر پر اعتماد نہ کرنے کی تلقین کرتا ہو اس کو محض سید احمد کی وکالت میں انگریز پرست قرار دینا کس قدر افسوس ناک غلط بیانی ہے۔

مرزا حیرت سرسید کے مخالف تھے

ماہنامہ ''الحق'' کے تبصرہ نگار اور سید احمد کے وکیل نے مرزا حیرت کی ''حیات طیبہ'' کو غیر مستند ثابت کرنے کی ناکام سعی کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ مرزا صاحب سرسید کی تحریک تجدد کے اہم فرد تھے۔ مرزا حیرت کے سرسید کے بارے میں کیا تاثرات ہیں؟ سطور ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔ مرزا حیرت سید احمد کی حمد و ثناء کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ زمانہ جب آپ نے وطن چھوڑ کے لکھنؤ کا غضب ناک منظر دیکھا ہے اور اب دہلی کی طرف قدم اٹھایا ہے، انتہا درجہ کا پر شباب تھا۔ بایں ہمہ بزرگ سید کی پاک روح عنفوان جوانی کی بھول بھلیوں سے ابھی بہت دور تھی۔ جوانی کے زمانہ کی وہ تاریکی جس میں کچھ نہیں دکھائی دیتا اور انسان بالکل اندھا ہو جاتا ہے، بزرگ سید کو نور بن گئی تھی۔ غیر معمولی امنگیں اور غیر خوش آئند جوش جو عین عنفوان جوانی کا جزو اعظم اور اصل الاصول ہیں، بزرگ سید کی ذات مقدس سے بہت دور تھے۔ گو یہ کسی کو نہ معلوم تھا نہ اور کوئی امید کر سکتا تھا کہ عمر نو جوانی وعدے وعید ایک نہ ایک دن پورے کرے گی اور ان عجیب ولولوں کا خاتمہ خوش آئند دکھائی دینے لگے گا، یہ وہ ولولے تھے جو خاص خاص طبائع میں اٹھتے ہیں اور انہیں ملکہ انسانیت کہتے ہیں۔ انسانیت کے مدارج اعلیٰ پر پہنچنے کے لئے یہ ایک سیڑھی ہے۔ جسے غلط فہمی سے علی گڑھ والے سرسید ملکہ نبوت کہتے ہیں اور آخر اس غلطی نے انہیں یہاں تک گمراہ کر دیا کہ وہ نبی عربی کے مقابلہ میں یہ کہنے لگے: بشپ چندر سین پیغمبر ہندوستان ہے (معاذ اللہ)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب ایک بد دین پیغمبر ہند بن گیا تو میں اپنے آپ کو مسلمان نبی کہتا ہوں اور خاندان سیدات سے بھی بعض اوقات نسبت کر لیتا ہوں۔ میں کسی نہ کسی زمانہ میں زندگی میں یا بعد از اں پیغمبر ہند ضرور بن جاؤں گا۔ (حیات طیبہ مطبوعہ مسلم اکادمی ص ۴۰۰۔۴۰۱)

غور فرمایئے کہ جو شخص سرسید کو گمراہ اور مدعی نبوت قرار دے رہا ہے اس کو سرسید کا پیروکار بتایا جارہا ہے۔ آخر اس جھوٹ کی کوئی حد بھی ہے۔

قارئین کرام! ''حیات طیبہ'' کے سلسلہ میں یہ گفت گو طویل ہوتی جارہی ہے، لیکن ہم جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانے کے لئے ایک آخری بات پر اور بحث کرنا چاہتے ہیں۔

مرزا حیرت اسماعیل دہلوی کے زبردست معتقد تھے

سید احمد کے وکیل اور ماہنامہ ''الحق'' کے تبصرہ نگار نے لکھا ہے:

''مرزا حیرت دہلوی کے بارے میں واضح ہے کہ وہ شاہ صاحب کی تحریک کے بعض پہلوؤں سے ہمدردی رکھتے تھے'' غالباً کہنا یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان سے مکمل ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ حالانکہ فی الواقع نہ صرف ان کی تحریک سے مکمل ہمدردی رکھتے تھے بلکہ وہ ان کی ذات سے انتہائی درجہ کا غلو عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ سید احمد مرید اسماعیل دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

اگر ہمارے دماغ میں ذرا بھی عقل ہے اور ہمیں فطرت سے فہم سلیم کا حصہ ملا ہے تو آسانی سے ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ مولانا شہید میں فاروق اعظم جیسی روح اور حضرت خالد جیسے بے دھڑک شیر کی سی اسپرٹ اور سچے مسلمانوں کا سا نبی اور اس کے دین پر فدائیانہ عشق تھا۔ جس نے ہوش سنبھالتے ہی مسلمانوں کی خستہ خالی پر خون کے آنسو بہائے اور ان کی ترقی میں بڑا اور بوڑھا ہوا اور آخر انہی کے لئے جان دی۔

(حیات طیبہ مطبوعہ مسلم اکادمی ص ۱۹۷)

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اسماعیل دہلوی کو سچے مسلمانوں کا نبی نہ مانے (العیاذ باللہ) عقل سے خالی اور فطرت سلیم سے محروم ہے۔

اور ذرا جگر تھام کر یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

اسماعیل دہلوی کے وعظ کی شان بیان کرتے ہوئے مرزا حیرت لکھتے ہیں:

اب یہ بیان کرنا فضول ہوگا کہ مولانا شہید نے ایسا وعظ دیا اور ایسی زبردست تقریر کی کہ صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ مولانا شہید نے پوری آمادگی اور قابلیت سے وعظ

فرمایا۔ مجتہد تو سنانے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ یہ اسماعیل بول رہا ہے یا خود خداوند تعالیٰ گفتگو کر رہا ہے۔ (حیات طیبہ مطبوعہ مسلم اکادمی ص ۲۲۱)

اللہ اللہ! مرید کے رتبے کی یہ شان ہے تو پیر کے مرتبہ کا کیا عالم ہوگا۔

سید احمد کے وکیل اور ماہنامہ "الحق" کے تبصرہ نگار نے مرزا حیرت کی "حیات طیبہ" کو غیر مستند قرار دینے کے لئے جتنے ریمارکس دیئے تھے، ہم نے ان ریمارک میں سے ہر ریمارکس پر مدلل مفصل اور باحوالہ گفتگو کی ہے اور اس سے قارئین کرام پر واضح ہو گیا ہوگا کہ سید احمد کے وکیل نے کسی تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے یا محض رزمیہ شاعری فرمائی ہے۔

مرزا حیرت کیا تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ مرزا حیرت دہلوی کٹر اور متعصب اہل حدیث اور نجدیت اور وہابیت کے ناقوس اعظم تھے۔ اسماعیل دہلوی اور سید احمد کے زبردست معتقد تھے اور ان کی اندھی عقیدت میں اس حد تک آگے چلے گئے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عقیدت مند غالی شیعوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا اور چونکہ اس دور میں اسماعیل دہلوی اور سید احمد کا سیاسی کعبہ انگریز کی حکومت تھی، اس لئے ان کی اتباع میں انہوں نے بھی اپنا سر نیاز اسی قبلہ کے سامنے جھکا دیا۔

اسماعیل دہلوی اور سید احمد نے انگریزوں کے منشاء اور ابرو کو پہچانتے ہوئے پنجاب میں سکھوں اور سرحد میں غیور پٹھانوں کے خلاف محاذ آرائی کی۔ پنجاب میں سکھوں کی اور سرحد میں غیور پٹھانوں کی زبردست طاقت تھی اور یہ قوت انگریز کی فاتحانہ یلغار کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل تھی اور یہ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو اس ملک سے ہی غداروں کا ایک ٹولہ اپنی فاتحانہ فوج کے لئے بطور ہراول دستہ مل گیا۔ ہند کے چاک چاک گریبان کو مزید تار تار کرنے کے لئے ننگ آدم، ننگ دین، ننگ وطن غداروں کا ایک قافلہ خریدا گیا۔ انگریزوں نے ان لوگوں کے وعظ کرائے، سفر حج کی دعوتیں کیں، نذرانے پیش کئے اور ان غداروں نے اپنا ضمیر، دین اور ایمان انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کے لئے ان کے فرضی مظالم کی داستان تراشی اور سرحد کے غیور پٹھانوں کے خلاف ان کی فرضی بدعات کو وضع کیا۔ بعض پٹھان سرداروں سے محض اس

لئے جنگ شروع کی کہ انہوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور اس کو امام وقت تسلیم نہیں کیا۔ اس طرح سید احمد اور اسماعیل دہلوی نے پنجاب سے لے کر سرحد تک انگریزوں کی فوجوں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

آج سکھوں کے مظالم بیان کرنے والے دیدہ دانستہ یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ اس وقت سرزمین ہند میں اگر کسی کے روح فرسا مظالم تھے تو وہ صرف انگریزوں کے مظالم تھے۔

جس صدی میں سید احمد اور اسماعیل نے سکھوں کے خلاف محاذ آرائی کی اس دور میں انگریزوں کے مظالم

اس زمانہ کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے علامہ فضل حق خیر آبادی ایک مکتوب میں لکھتے ہیں؟ اس ملک کے باشندے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، ان میں کچھ کسان اور کاشت کار ہیں، کچھ روزگار پیشہ، کچھ تاجر اور اہل حرفہ، کچھ لوگ زمیندار ہیں اور کچھ کی معاش محض دریوزہ گری پر ہے۔

یہاں کے باشندے مسلمان بیشتر اور ہندو کمتر ایسے ہیں جو اپنا اصلی وطن ترک کر کے کسی زمانہ میں یہاں آ کر آباد ہوئے۔ جب تک ہندوستان کی حکومت بادشاہوں اور راجاؤں کے تصرف میں رہی، اس ملک کے باشندوں کو معیشت کی کوئی تنگی نہ تھی۔ کیونکہ ہر قسم کی سرکاری خدمات خواہ وہ سپاہ کی نوکری ہو یا دوسری خدمات، اس ملک کے باشندوں کے واسطے مختص تھیں اور یہاں کے باشندوں میں ہر شخص اپنے حوصلہ اور لیاقت کے موافق تجارت حرفہ، سپاہ یا مناصب میں اپنا روزگار پالیتا تھا۔

مگر جب سے انگریزوں کی عمل داری ہوئی ہے اس وقت سے بتدریج معاش کی تنگی اور روزگار کا فقدان اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ عوام کی حالت تباہ ہو گئی ہے۔ کیونکہ انگریز سرکار کے زمانے میں معاش کے سارے وسائل مفقود ہیں اور روزگار کے دروازے بند ہو گئے ہیں، سوائے معدودے چند لوگوں کے جنہیں عدالت دیوانی، کلکٹری، فوجداری پرمٹ، تھانہ یا تحصیل کے عملے میں معمولی سی تنخواہ کی نوکری مل جاتی ہے، وہ بھی اب دفتروں کے تبدیل ہونے اور سرکاری کام کا ڈھانچہ بدل جانے کے بعد ایسا نظر آ رہا ہے کہ ان لوگوں

سے چھن جائے گی۔

چنانچہ اس شہر کے باشندوں کا حال اور یہاں کے تاجروں کی کیفیت یہ ہے کہ سرکار انگریز نے تجارت کے سارے گر اپنے قبضے میں رکھے ہیں اور تمام اجناس، مثلاً کپڑا، سوت، برتن، گھوڑے اور دوسرے مویشی وغیرہ ملک انگلستان سے لاتے ہیں اور اسی ملک کے ہر ہر شہر اور گاؤں میں فروخت کر کے خود نفع کماتے ہیں اور یہاں کے باشندوں کو نفع اندوزی کا کوئی موقع نہیں دیتے۔ اس لئے ہمارے ملک کے تاجر اپنے پیشوں سے دست بردار ہو گئے ہیں۔

اور معافی داروں کا حال یہ ہے کہ ۱۸۰۳ء اور ۱۸۰۵ء کے قوانین کی رو سے اگرچہ انگریز سرکار نے عہد و پیمان کیے تھے کہ ساری لاخراجی زمینیں جو یکم جنوری ۱۸۰۱ء اور یکم جنوری ۱۸۰۳ء سے پہلے لاخراجی دار کے تصرف میں ہوں گی چاہے وہ ان کی سند رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور خواہ ان کے واہب کو عطا کا اختیار ہو یا نہ ہو، ایسی زمینوں کو ضبط نہ کیا جائے گا۔ مگر اب بغیر کسی تحقیقات کے ہر ضلع میں معافیاں ضبط کر لی گئی ہیں اور معافی داروں کے لئے کوئی وجہ معاش باقی نہیں چھوڑی۔

اور کسانوں کا یہ حال ہے کہ ان پر اتنے محاصل واجب کر دیے گئے ہیں کہ ان میں ادا کرنے کی سکت نہیں ہے، ان کے لئے بے استطاعتی اور بے مقدوری خود دفتر کلکٹر کے ریکارڈ سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ پس جب کسی کے لئے اس ملک میں روزگار باقی نہ رہا ہو تو اب اہل حرفہ کس کے لئے کام کریں جو ان کا پیٹ بھرے اور جب سارے ہی لوگ تنگیٔ معاش میں مبتلا ہوں تو بھیک منگے کو کون خیرات دے۔ یہ مختصر سی کیفیت ہندوستان کے رعایا معاشی تنگی کی ہے۔

اور علاقہ شاہجہان آباد کی رعایا کا اقتصادی حال بطور اجمال یہ ہے کہ ابتدائے عمل سرکار انگریزی میں ہوڈل، ویلول، وتین نجف گڑھ وسالکہ وفیروز آباد، وڈیک ولبونا پانا و سانگرس وبجنور وسونی پت وگوہانہ وجرسٹھ وکھرکھودہ وروہتک ومہم وہانسی وحصار، یہ سارے پرگنے جاگیر میں تھے اور جاگیرداروں کی سرکار میں ہزارہا آدمی فوج، انتظامیہ اور شاگرد

پیشہ کی خدمت پر مامور تھے۔ ان میں اکثر دیہات معافی کے تھے۔ اب یہ سب پرگنے اور دیہات واراضیات سرکار انگریز نے ضبط کر لی ہیں اور لاکھوں کسان یک لخت بے روزگار ہو گئے اور تمام عالم میں روزگار عنقاء کی طرح ناپید ہو گیا۔ سینکڑوں بیوائیں اور محتاج اپنی روزی کا دارومدار چرخہ کاتنے، رسیاں بٹنے یا چکی پیسنے پر موقوف کئے ہوئے تھے۔ اب رسیوں کی تجارت سرکار نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے اور ہاتھ کی چکیوں کی جگہ پن چکیاں لگ گئی ہیں تو یہ ذریعہ معاش بھی جاتا رہا۔ اسی طرح اہل حرفہ اور ساہوکار عوام کی بے بضاعتی کے باعث نفع اندوزی سے محروم ہو گئے اور جو کچھ سرمایہ ان کے پاس تھا کھا پی کر برابر کر دیا اور اپنے دیوالیے نکال دیئے۔

ان ساری دشواریوں کے باوجود سر چارلس مٹکاف بہادر کی پیشی سے حکم ہوا کہ ہم غریب "زر چوکیداری" ادا کریں، اگرچہ کبھی سلاطین کے زمانہ میں یہ رسم نہیں ہوئی، مگر "حکم حاکم مرگ مفاجات" سمجھ کر اسے بھی قبول کیا اور اب تک ادا کرتے رہے، اب ڈسٹرک مجسٹریٹ کا نیا حکم آیا ہے، جس میں انہوں نے ہر گلی کوچہ میں پھاٹک تعمیر کرنے کا حکم دیا ہے۔ جس کا فائدہ نہ پہلے کچھ تھا نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ ہم غریبوں نے فاقہ کشی کی مصیبت جھیل کر، سامان گروی رکھ کر یا بیچ کھوچ کر ہزار ہا روپیہ خرچ کیا اور اس حکم کی تعمیل بھی کر دی، اب ان نو تعمیر پھاٹکوں کے کھلنے اور بند ہونے کے اوقات یا چوکیدار کے تساہل سے ہم لوگوں کو آئے دن تکلیف کا سامنا ہے، مگر اسے بھی جھیل لیا۔ اس خبر کے علاوہ اب صاحب مجسٹریٹ بہادر نے ہر محلہ میں پانچ پنچوں کے مقرر کرنے کا حکم دیا ہے۔

(نثار احمد فاروقی ؛ مولانا فضل حق خیر آبادی کا ایک غیر مطبوعہ خط، سہ ماہی رسالہ نوائے ادب، بمبئی ص ۴۰۔۴۶، بحوالہ باغی ہندوستان ص ۱۳۔۱۶)

انگریزوں کے دینی مظالم

نیز علامہ فضل حق خیر آبادی متوفی ۱۸۶۱ء لکھتے ہیں:

(۱) انگریز نے بچوں کو اپنا دین اور اپنی زبان سکھانے کے لئے جگہ جگہ اسکول کھولے اور دینی مدارس کو ختم کرنے کے لئے پوری کوشش کی۔

(۲) ملک کی تمام پیداوار خرید کر غلے کی قیمت اور سپلائی پر اجارہ داری قائم کر لی، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ خلق خدا ہماری دست نگر ہو جائے اور بے چوں و چرا ہمارے احکام کی تعمیل کرے۔

(۳) مسلمانوں کو ختنہ کرانے سے روکنے اور پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

(۴) مسلمانوں کو سور کی چربی اور ہندوؤں کو گائے کی چربی والے کارتوس دیے گئے جو منہ سے کاٹنے پڑتے تھے۔ ان کی نظر میں اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کا یہی طریقہ تھا کہ مذہبی اختلافات ختم کر کے تمام رعایا کو ملت کفر و الحاد پر متفق کر دیا جائے۔

(الثورۃ الہندیہ، باغی ہندوستان ص ۲۶۰۔۲۵۶)

محمد عبدالشاہد خاں شیروانی دیوبندی انگریز کے مظالم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

علامہ (فضل حق خیر آبادی: سعیدی) دہلی سے ۲۴ دسمبر کو روانہ ہو گئے تھے۔ اس طرح ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور ۱۷۹۷ء کی جنگ میسور کی طرح ۱۸۷۵ء کی یہ جنگ آزادی بھی ہندوستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح پر ختم ہوئی:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے امیر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا

انگریز کے خونی مظالم

۱۹ ستمبر کے بعد ہندوستانیوں پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، اس کی نظیر تاریخ میں مشکل سے ملے گی، یوں تو دہلی نے بہت سے ہنگامہ دیکھے تھے۔ نادر شاہ درانی کا ایام عیدالضحیٰ میں قربانی کا جانوروں کی جگہ انسانوں کا ذبح عام اور شہر کی نالیوں میں پانی کی بجائے خون کی روانی دیکھی تھی۔ ''ہر کہ آمد عمارت نو ساخت'' کے مطابق شہر کا اجڑنا اور دوسری جگہ آباد ہونا، دارالسلطنت پر حملہ آوری اور ''ان الملوک اذا دخلوا قریۃ افسدوھا و جعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ'' کے بموجب شرفاء کی ذلت و خواری بھی نظر سے گزری تھی۔ مگر ایسے مظالم ''ولا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر'' نہ آنکھوں نے

دیکھے نہ کانوں نے سنے نہ انسان کے دل میں کبھی ان کا خطرہ بھی گزرا، الامان والحفیظ۔

سر کنم گریہ اگر تاب شنیدن داری

سینہ بشگافم اگر طاقت دیدن داری

ان مظالم کو دیکھتے ہوئے دل لرزتا ہے۔ سینہ قلم شق اور جگر قرطاس پارہ پارہ ہوا جاتا ہے۔ انتقام کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

۱۸۵۷ء میں انگریز جیسی دعویدار تمدن و تہذیب قوم نے یہ شرمناک اور انسانیت سوز حرکات جوش میں نہیں ہوش میں کیں۔ غلامی کی لعنت سے متاثر ہو کر نہیں، فاتح و قابض ہونے کے بعد کیں۔ جہالت و حماقت نہیں، بزعم خود دانش مندی و فرزانگی کے ماتحت کیں۔ غفلت اور دانستگی سے نہیں بلکہ قصداً اور دانستہ کیں۔ خصوصیت سے مسلمانوں کے ساتھ جو ذلت اور جگر خراش برتاؤ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔

زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤں میں ڈلوانا، سکھ رجمنٹ سے علی رؤس الاشہاد اغلام کرانا، فتح پور مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا، مساجد کی بے حرمتی خصوصاً شاہجہانی جامع مسجد دہلی کے منبروں میں گھوڑوں کا باندھنا، عبادت کی جگہ دفاتر قائم کرانا اور حوض میں وضو کے پانی جگہ گھوڑوں کی لید ڈالنا نا قابل معافی اور غیر ممکن التلافی جرم ہے۔

منصف مزاج انگریز بھی اس کی مذمت کئے بغیر نہ رہ سکے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے، ''انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ'' مرتبہ شیخ حسان الدین بی اے امرتسری سابق صدر مجلس احرار اسلام ہند۔ (باغی ہندوستان ص ۱۴۲۔۱۴۵)

عبدالشاہد شیروانی نے باغی ہندوستان میں تفصیل کے ساتھ ۱۲۰ امراء علماء اور نوابوں کی نام بنام فہرس پیش کی ہے جن کی انگریزوں نے تمام جائیداد ضبط کر کے ان کو پھانسی دے دی۔ ۱۲۴ امراء کی فہرس پیش کی ہے جو دہلی چھوڑ کر غریب الوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ (باغی ہندوستان ص ۱۴۷ تا ۱۵۰، ملخصاً)

اس کے بعد لکھتے ہیں:

ان کے علاوہ حیدر خان اور اشرف خان ممبران نے ایک سو سات نوجوانوں کو الور سے گرفتار کرا کے دہلی بھیجا، آدھے گوڑگاؤں میں قتل کر دیئے گئے، باقی کو دہلی میں پھانسی دی گئی۔ اسی طرح کے بیسویں حادثات ہوئے، کہاں تک بیان کئے جائیں۔

مفتی صدر الدین خاں آزردہ، صدر الصدور، مرزا اسد اللہ خاں غالب اور نواب مصطفیٰ حسین خان شیفتہ وغیرہم بھی دھر لیے گئے۔ ان اکابر کو بڑی دشواریوں کے بعد نجات مل سکی۔ پنشنوں اور جاگیروں پر زد پھر بھی باقی رہی۔

سید اسماعیل حسین منیر شکوہ آبادی، مولانا مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریا آبادی وغیرہم کو بجرم بغاوت کالے پانی کی سزا ہوئی۔

علامہ فضل حق کو بھی ''باغی'' قرار دیا گیا۔ اسیر فرنگ ہو کر بند ہوئے، ۱۲۷۵ھ کے بمطابق ۱۸۶۹ء لکھنؤ میں مقدمہ چلا۔ آخرش جزیرہ انڈیمان روانہ کر دیئے گئے اور وہیں وفات پائی۔ (باغی ہندوستان ص ۱۵۰۔ ۱۵۳، ملخصاً)

علامہ فضل حق خیر آبادی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا اور گرفتاری سے پہلے انگریزی استبداد کے خلاف سرفروشانہ جذبہ سے مسلسل معروف جہاد رہے اور عدالت میں صد ہا دباؤ کے باوجود اپنے فتویٰ جہاد سے رجوع نہیں کیا، عبور دریائے شور کالے پانی کی تاحیات قید و بند کی سزا مسکرا کر قبول کی اور وہیں شدید تکالیف اور مصائب کا شکار ہو کر مسکراتے ہوئے موت کو گلے سے لگایا اور اہل دنیا پر ظاہر کر دیا۔

زندگی اتنی غنیمت تو نہیں جس کے لئے
عہد کم ظرف کی ہر بات گوارا کر لیں

ایک طرف تو انگریز ہندوستان کے باشندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رہا تھا، ہزاروں انسانوں کو دن رات پھانسی دی جا رہی تھی، زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ میں تلوایا جا رہا تھا۔ جامع مسجد فتح پور سے لے کر قلعہ کے دروازہ تک تمام درختوں پر مسلمانوں کی لاشیں لٹکی ہوئی تھیں۔ مساجد کو گھوڑوں کے اصطبل میں تبدیل کیا جا رہا تھا اور بازاروں اور گلیوں کی نالیوں میں ہر جگہ گندے پانی کی جگہ مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔

دوسری طرف کلکتہ میں اسماعیل دہلوی وعظ کر رہے تھے کہ انگریزوں پر جہاد کسی طرح واجب نہیں بلکہ انگریزوں پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں اور سید احمد سمجھا رہے تھے: ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصول مذہب کے خلاف بلاوجہ فریقین کا خون گرا دیں اور اپنی ان خدمات کے سلسلہ میں انگریزوں کی دعوتیں کھا رہے تھے اور دھڑا دھڑ اشرفیوں کے نذرانے وصول کر رہے تھے۔

ملت اسلامیہ میں ابو عبداللہ، میر جعفر اور میر صادق جیسی قسم کے غدار گزرے ہیں، مگر جس نوعیت کے ساتھ سید احمد اور اسماعیل دہلوی نے ملت اسلامیہ سے غداری کی ہے، اس کی نظیر پوری تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔

جعفر تھانیسری

جعفر تھانیسری مسلک اور عقیدہ کے اعتبار سے سید احمد اور اسماعیل کا ہم نوا تھا اور ان سے محبت اور عقیدت میں غلو کی سرحدوں کو پھلانگ چکا تھا، دیوبندیوں کے شیخ الہند لکھتے ہیں کہ مولانا جعفر تھانیسری سید صاحب کے مستند سوانح نگار ہیں۔ (نقش حیات ص ۱۲) محمود الحسن اس دور کے آدمی ہیں جب انگریزوں کے خلاف عام نفرت اور غم وغصہ کی فضا پیدا ہو چکی تھی، اس لئے ان کے اس قول کو انگریز کی خوشامد یا ابن الوقتی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً جب کہ انگریزوں کے خلاف ترک موالات کی تحریک میں وہ پیش پیش رہے ہوں۔ اس لئے جس شخص کو دیوبند کا شیخ الہند سید احمد کی سوانح پر سند صحت دے چکا ہو اس کے مقابلہ میں بعد کے خوردہ اور خلوف تاریخی گروں کی بات حجت نہیں ہو سکتی۔

جعفر تھانیسری نے جن حالات کا مشاہدہ کیا ان کو اپنے قلم سے بے کم وکاست بیان کر دیا، وہ خود انگریزوں کے ستائے ہوئے تھے، ان لئے ان کو انگریزوں کی خوشامد میں سید احمد کے جہاد کی باگوں کا رخ سکھوں کی طرف موڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی، جب کہ اس کتاب میں انہوں نے انگریزوں کے خلاف بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس لئے اس دلیل کو نہیں مانا جا سکتا کہ انہوں نے انگریزوں کے ڈر سے سید احمد کے جہاد کا رخ سکھوں کی طرف موڑ دیا ہے۔

آیئے! اب دیکھیں کہ زمانہ کا رخ بدل جانے کے بعد سید احمد کے وکلاء نے سید احمد کو جنگ آزادی کا ہیرو بنانے کے لئے کس طرح پینترا بدلا ہے۔

یہ ہیں سید احمد کے ایک وکیل اور ماہنامہ "الحق" کے تبصرہ نگار، لکھتے ہیں:

''سوانح احمدی'' تحریک مجاہدین کا بنیادی ماخذ ہے جسے مولانا محمد جعفر تھانیسری صاحب نے اس وقت ترتیب دیا جب انگریز بہادر کے ذہن پر مجاہدین آزادی کو نیست و نابود کرنے کا بھوت سوار تھا۔ وہابی کا لفظ باغی کے مترادف تھا۔ ان حالات میں تھانیسری مرحوم نے تحریکی واقعات بیان کرتے ہوئے ممکن لچک پیدا کی۔ من وعن مکاتیب کے نقل کرنے اور مواد کو بلا کم وکاست پیش کرنے میں دو امکان تھے۔ اولاً سرے سے یہ سارا مواد ہی سی آئی ڈی کی نذر ہو جاتا۔ ثانیاً: اگر شائع ہو جاتا تو تحریک مجاہدین کے کارکنوں کے لئے مزید گرفت کا سبب بنتا۔ یہی اسباب ہیں کہ ''سوانح احمدی'' میں لچک موجود ہے۔ تھانیسری مرحوم سے غلطیوں کا صدور یقینی تھا۔ بعض مکاتیب جو تحریک کی اصل روح تھے شائع ہی نہ ہو سکے اور لٹریچر کا بڑا حصہ ان کے ہاتھ ہی نہ آیا۔ (ماہنامہ الحق ج ۱۱ ص ۱۲)

جعفر تھانیسری بے لچک آدمی تھے

جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب میں کوئی لچک پیدا نہیں کی، وہ لچک والے ہی نہ تھے۔ پروفیسر ایوب قادری ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

مولوی محمد جعفر تھانیسری سید احمد شہید کی تحریک کے خاص رکن تھے۔ انہوں نے تحریک مجاہدین کے سلسلے میں جانی و مالی قربانیاں پیش کیں۔ معرکہ امبیلا کے بعد ۱۸۶۴ء میں بغاوت اور سازش کے الزام میں ان پر مقدمہ چلا۔ جائیداد ضبط کی اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی، مگر انہوں نے فرنگی استبداد کے خلاف استقامت کا مظاہرہ کیا اور ابتلاء اور آزمائش میں پورے اترے۔ (مقدمہ حیات سید احمد شہید ص ۳۰)

مزید لکھتے ہیں:

جب حکومت کو یہ یقین ہو گیا کہ سرحد پر مجاہدین کے پاس رقم اور آدمی مولوی محمد جعفر کے ذریعے بھیجے جاتے ہیں تو ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کو ان کی خانہ تلاشی ہوئی، مولوی محمد جعفر فرار

ہو گئے، ان کی گرفتاری کے لئے دس ہزار روپے کا اشتہار جاری ہوا۔ آخر علی گڑھ سے گرفتار ہو کر انبالہ لائے گئے، مقدمہ چلایا گیا۔ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ ضبط ہوئی۔ پھانسی کی سزا تجویز ہوئی، مولوی محمد جعفر نے کسی قسم کی پریشانی اور رنج کا اظہار نہیں کیا بلکہ نہایت خوش اور مطمئن رہے۔ مقدمہ میں مولوی محمد جعفر نے نہایت استقامت اور پامردی کا ثبوت دیا۔ مولوی محمد جعفر کو لالچ بھی دیا گیا اور زدوکوب سے بھی واسطہ پڑا، مگر ایمان کی لذت سے سرشار ہر موقع پر ثابت قدم رہے، جج نے مولوی محمد جعفر سے مخاطب ہوتے ہوئے فیصلہ ان الفاظ میں سنایا:

تم بہت عقل مند، ذی علم، قانون دان اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو، جو تم نے اپنی ساری عقل مندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعے سے آدمی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا۔ تم نے سوائے انکار بحث کے کچھ حیلہ بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش کے اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی، اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی اور آخر میں یہ کلمہ بھی فرمایا: میں تم کو پھانسی پر لٹکا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔

مولوی محمد جعفر نے کیا مردانہ وار جواب دیا:

"جان دینا اور لینا خدا کا کام ہے آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ وہ رب العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تم کو ہلاک کر دے"۔

مولوی محمد جعفر صاحب کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئے اور چند روز کے بعد وہ جج اپنی موت آپ مر گیا۔ چیف کورٹ میں اپیل کی گئی، ۱۶ دسمبر ۱۸۶۴ء کو اپیل کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ پھانسی حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل ہو گئی۔ (مقدمہ حیات سید احمد شہید ص ۳۴-۳۵)

سوانح احمدی مؤلفہ جعفر تھانیسری کا تعارف کراتے ہوئے پروفیسر ایوب قادری لکھتے ہیں:

یہ کتاب سید احمد شہید اور ان کے اکابر خلفاء کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے، سید صاحب کے حالات میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور اس

موضوع پر دوسری کتابوں کے لئے بنیادی مواد ثابت ہوئی "سوانح احمدی" پانچ حصص (ابواب) پر مشتمل ہے، پہلے باب میں سید صاحب کی پیدائش، ایام طفولیت، تعلیم و تربیت، فیوض باطنی اور سفر حج کا ذکر ہے۔ یعنی ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۴۰ھ تک کے حالات آ گئے ہیں۔ دوسرے باب میں ان کی تعلیمات کا بیان ہے۔ یہ باب گویا "صراط مستقیم" کا لب لباب ہے۔ تیسرا باب ۱۲۴۱ھ سے ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے، اس میں ان کی سپاہیانہ زندگی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کا بیان ہے اور تمام معرکوں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے جو سکھوں وغیرہ سے پیش آئے۔ چوتھے باب میں نامور خلفاء کی فہرست ہے اور ان کے ضروری حالات درج ہیں۔ پانچویں باب میں سید صاحب کے وہ فارسی مکاتیب ہیں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً رؤسا و خوانین وغیرہ کو لکھے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۹۰ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا اور اس کے بعد صوفی کمپنی منڈی بہاؤالدین سے غالباً دو مرتبہ شائع ہوئی۔ (مقدمہ حیات سید احمد شہید ص ۴۴۔۴۵)

پروفیسر ایوب قادری کے ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل امور واضح ہو جاتے ہیں۔

(۱) جعفر تھانیسری انگریز کے مخالف تھے۔

(۲) جعفر تھانیسری نے موت کے حکم کو خوشی سے قبول کیا، لیکن اپنے مؤقف میں لچک نہ آنے دی۔

(۳) جعفر تھانیسری کی تصنیف "سوانح احمدی" سید احمد کی سوانح کے لئے اولین ماخذ ہے۔

(۴) جعفر تھانیسری نے لکھا ہے اور پروفیسر ایوب قادری نے تسلیم کیا ہے کہ سید احمد کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔

جعفر تھانیسری کو انگریز یا سی آئی ڈی کا ڈر نہ تھا

باقی رہا یہ کہنا کہ جعفر تھانیسری نے حکومت برطانیہ کے ڈر سے "سوانح احمدی" میں لچک پیدا کر دی، کہیں اس لئے کہ یہ کتاب ضبط نہ ہو جائے تو یہ شبہ اولاً تو اس لئے بے بنیاد ہے کہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ جو شخص پھانسی کے پھندے کو سامنے دیکھ کر اپنے موقف میں لچک پیدا نہیں کر سکا اس کے بارے میں یہ کہنا کہ اس نے اپنی کتاب میں انگریزوں

کے ڈر سے اصل مواد میں ترمیم کر دی ہو گی، حقائق سے شرمناک گریز کے علاوہ اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

جعفر تھانیسری نے اپنی گرفتاری سے لے کر کالا پانی میں ایام اسیری کے دوران کی سرگزشت ''تواریخ عجیبہ'' (المعروف بہ کالا پانی) کے عنوان سے لکھی ہے، اس میں انہوں نے اپنے صبر و استقلال اور بے لچک رویہ کی مبالغہ آمیز تصویر بھی کھینچی ہے اور انگریزوں کے مظالم کا بیان بھی کیا ہے اور ان کے خلاف غم وغصہ اور نفرت کا اظہار بھی کیا ہے اور انگریز کے دور میں ہی یہ کتاب شائع کی گئی ہے، اس لئے یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ انگریز کے ڈر سے جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر دی یا بقول غلام رسول مہر انگریزوں کی جگہ سکھوں کا نام لکھ دیا۔

جعفر تھانیسری زیادہ مستقل مزاج تھے

اپنے عزم اور استقلال کو بیان کرتے ہوئے جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

اس وقت مولوی یحییٰ علی صاحب کی صحبت نعمت ربانی تھی، مگر محمد شفیع اور عبدالکریم یہ دونوں آدمی کسی قدر کشیدہ خاطر رہا کرتے تھے، باقی ہم نو آدمی اس حوالات میں نہایت شاداں اور فرحاں تھے۔ اور یہ خاکسار تو جب اپنی ذلیل النفسی اور کم عقلی پر خیال کر کے انعامات الٰہی اور اس کی سرفرازی کو جو میرے بدحال پر مبذول تھی، مقابلہ کر کے دیکھتا تو سمجھتا تھا کہ میری مثال ایک ایسی ہے جیسے چمار کے سر پر بلا واسطہ سفارش اور بلا استحقاق و لیاقت ذاتی کے تاج شاہی رکھ دیا جاوے، میں اور میرا حسب ونسب اور لیاقت کہاں اور یہ سرفرازی خدا کی راہ میں ثابت قدم کے باعث تھی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے کہ ایسے امتحانوں میں پیغمبر اور صحابہ لوگ بھی گھبرا جاتے تھے۔ اس صبر و استقلال کے انعام کو خیال کر کے اول سے آخر تک میری زبان پر تو شکر ہی شکر جاری رہا۔

(کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید ص ۲۴۱)

غور فرمایئے! جو شخص اپنی کتاب میں انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام سے زیادہ صبر و استقامت کا دعویٰ دار ہو اس سے یہ کس طرح متصور ہو سکتا ہے کہ وہ اسی کتاب میں

انگریزوں کے خوف سے اصل واقعات بدل کر پیش کرے۔

جعفر تھانیسری کا انگریز کے خلاف غم و غصہ

آیئے! اب ہم آپ کو دکھاتے ہیں کہ جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب میں کس طرح انگریزوں کے خلاف نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

ہمارے لائق اور دیرینہ وکیل مسٹر پلوڈن نے بہت سی قانونی کتابوں اور نظائر سے ثابت کر کے یہ جواب لکھا تھا کہ ملک ستھانہ وغیرہ مقامات جہاں یہ جنگ جس کی اعانت کرنے کا ان لوگوں پر الزام ہے، یہ علاقہ عملداری سرکار سے باہر ہے اور لفظ جنگ کرنا یا ملکہ معظمہ یا بغاوت مصرحہ دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کسی جنگ وقوعہ بیرون حدود عمل داری سرکار پر صادق نہیں آتا۔ چنانچہ تمثیل ب زیر دفعہ ۱۲۱ صاف لکھا ہے کہ زید نے جو مما لک ہند میں ہے، باغیوں کو ہتھیار بھیج کر بغاوت میں اعانت دی جو گورنمنٹ ملکہ معظمہ واقعہ سیلون کے مقابلہ میں اندر حدود مما لک مقبوضہ ملکہ کے ہوئی تو زید ملکہ معظمہ سے جنگ کرنے میں اعانت کا مجرم ہوگا۔ اس واسطے ان لوگوں کو اس دفعہ کی رو سے سزا نہیں ہو سکتی۔

جب صاحب سیشن جج اور دوسرے انگریزوں نے یہ دلیل وکیل کی سنی تو ایک دم سرد ہو گئے اور سوائے ہاں اور بجا کے کوئی جواب نہ بن آیا، مگر اس مقدمہ میں تو انگریزوں کے پرلے سرے کا تعصب تھا۔ شروع کارروائی سے اس مقدمہ میں قانون طاق پر رکھ دیا گیا تھا۔ اس جواب کے بعد باہمی مشورے کے لئے چند روز تک مقدمہ ملتوی کر دیا گیا اور جان لارنس صاحب بہادر اور دوسرے بڑے بڑے افسروں سے جو خواہ مخواہ ہمارا قلع قمع ہی چاہتے تھے مشورہ کیا گیا، ان کو تو خود غرضوں نے (ان خود غرضوں سے مراد ڈاکٹر ہنٹر ہیں جنہوں نے اسماعیل دہلوی کی ''منصب امامت'' پڑھ کر غلط فہمی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہابی انگریزوں کے مخالف ہیں، حالانکہ واقعہ ایسا نہ تھا، چنانچہ سرسید نے اپنے ''مقالات'' میں اور مرزا حیرت نے ''حیات طیبہ'' میں ڈاکٹر ہنٹر کی غلط فہمی کا ازالہ تامہ کر دیا ہے، جس کا کچھ حصہ ہم گزشتہ ابحاث میں پیش کر چکے ہیں۔ سعیدی غفرلہ) یہ باور کرا رکھا تھا کہ اگر ان چند

غریبوں کو پھانسی دے کر وہابیوں کا ہند سے قلع قمع نہ کرو گے تو عمل داری سرکار ہند میں رہنا محال ہے۔ پھر قانون کی کون پابندی کرے گا۔

(کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۳۴۲۔ ۳۴۳)

جعفر تھانیسری کے اس اقتباس کو ملاحظہ فرمائیے۔ کیا اس میں انگریزوں کی عدالت کو بددیانت اور غیر منصف نہیں قرار دیا؟ جس شخص کو انگریز یا سی آئی ڈی کا ڈر ہو کیا وہ اس قسم کا مضمون اپنی کتاب میں لکھ سکتا ہے؟

جعفر تھانیسری اپنے مقدمہ میں انگریز حکمرانوں کے خلاف لکھتے ہیں:

اس مقام پر یہ بات بھی بیان کرنا ضروری ہے کہ پارسی صاحب بھی ایڈورڈ صاحب سے بڑھ کر متعصب تھا اور اس مقدمہ میں شروع سے اس نے ہم لوگوں پر ظلم کیا تھا کہ جس کی تفصیل یہ قلم بھی نہیں لکھ سکتا۔ مگر خداوند تعالیٰ منتقم حقیقی تو موجود ہے گو اس کے کام دیر اور سہولت سے ہوتے ہیں۔ (کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۳۴۶)

اس ضمن میں انگریزوں کے خلاف مزید لکھتے ہیں:

اسی اثناء میں بہ جرم قتل ایک خاص ولایت کے انگلش میں گورا کو پھانسی کا حکم ملا اور وہ سب سامان پھانسی جو میرے واسطے تیار ہوا تھا اس بے چارے بعد یورپین ہم قوم کو نصیب ہوا، چاہ کن راہ چاہ درپیش، جو رسہ بڑے اہتمام سے میرے گلے میں ڈالنے کے واسطے تیار ہوا تھا، اس قادر مطلق مقلب القلوب نے ایک ذات بھائی کے گلے میں ڈلوا دیا اور مجھ کو صاف بچا لیا۔ (کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۳۵۰۔ ۳۵۱)

مقام غور یہ ہے کہ اب تک جعفر تھانیسری کی تحریروں کے ہم نے جتنے اقتباس پیش کیے ہیں وہ سب توہین عدالت کی زد میں آتے ہیں۔ اگر جعفر تھانیسری کو انگریز کا خوف ہوتا اور وہ اصل واقعات بدل کر لکھنا چاہتے تو ان واقعات کو ضرور تبدیل کر دیتے۔ لیکن جب انہوں نے جوان کے قول کے مطابق انبیاء کرام اور صحابہ سے زیادہ دلیر تھے اور جنہوں نے ایسے خطرناک واقعات کو صفحہ قرطاس پر لانے سے گریز نہیں کیا تو کون ہوش مند شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ انہوں نے سید احمد کے مکتوبات میں انگریزوں کی جگہ سکھوں کا لفظ لکھا ہوگا؟ اگر

وہ انگریزوں سے خائف ہوتے اور لچک والا مزاج رکھتے تو انگریزوں کی عدالت اور انتظامیہ کو یوں کھری کھری نہ سناتے اور کم از کم یہ واقعات ضرور اپنی کتاب سے حذف کر دیتے۔ لیکن جب انہوں نے اتنا زبردست رسک (Risk) لے کر انتظامیہ اور عدالت کو خوب کوسا اور توہین عدالت یا کتاب کے ضبط ہونے کی مطلقاً پرواہ نہ کی تو پھر یہ کہنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے کہ انہوں نے انگریز کے ڈر سے سید احمد کے مکتوبات میں انگریزوں کی جگہ سکھوں کا لفظ لکھ دیا اور تحریک مجاہدین کو غلط انداز میں پیش کیا۔ یہ سب خانہ ساز اور ابن الوقت ذہن کی پیدا کردہ تاویلات ہیں جن سے خود کو دھوکا دیا جا سکتا ہے لیکن تاریخ کا چہرہ مسخ نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزوں کے مظالم بیان کرتے ہوئے جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

میرے فرار ہونے یا زیادہ غصہ کے باعث انگریزوں نے قبل از فیصلہ مقدمہ کے میری کل جائیداد پہلے ہی دن قرق کر لی تھی، دوسرے دن خود میرے عزیزوں کو کوئی اپنے برآمدہ میں بھی کھڑا نہ ہونے دیتا تھا۔ ایک رات میں وہ سب مال دوسروں کا ہو گیا۔ میرے وارثوں کو اس قدر موقع بھی نہ ملا کہ کوئی جائیداد قبل از ضبطی علیحدہ کر لیتے اور بعد حکم ضبطی کے جب میرے بھائی نے جو اس کا وارث تھا، اپنے حصہ کا دعویٰ کیا تو اس کو بھی فقط ایک کوٹھری دے کر کل جائیداد منقولہ وغیر منقولہ ضبط کر کے نیلام کر دی، میں نے بنظر دور اندیشی اپنے حصہ کی کل جائیداد کو اپنی بیوی کے نام لکھ دیا تھا، وہ بیع نامہ بھی پیش ہوا مگر مارے غصہ اور تعصب کے کسی نے بھی غور نہیں کیا اور میری بیوی کو مع دو نابالغ شیر خوار بچوں کے ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیا۔ (کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۳۵۲۔ ۳۵۳)

انگریز کی بددیانتی کو پھیلانا

انگریزوں کی عدالت اور انتظامیہ کے غیر منصفانہ رویہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بملاحظہ مثل مقدمہ اور دلائل ثبوت جرم نسبت محمد شفیع واضح ہوگا کہ اول محمد شفیع کو کس غیظ و غضب سے پھانسی کا حکم دے کر اس کی پچاس لاکھ کی جائیداد ضبط کی تھی اور پھر صرف ایک برس بعد گواہی کا حیلہ کر کے اس کو رہا کر دیا کہ جائیداد منضبطہ واپس نہ دینی پڑے۔ اگر وہ بے چارہ جیسے اس کی ایک برس بعد کی رہائی ظاہر ہے، بے قصور تھا تو پہلے اس شدومد

سے اس کی پچاس لاکھ کی جائیداد ضبط کر کے اس کو پھانسی کا حکم کیوں دیا تھا اور اگر دراصل وہ بھاری قصوروار تھا اور صاحب سیشن جج کے سب دلائل مندرجہ فیصلہ صحیح ہیں تو اس کو ایک برس بعد کس واسطے رہا کر دیا۔ (کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۳۵۵)

اس کے بعد ڈاکٹر گرے صاحب سپرنٹنڈنٹ جیل رونق افروز ہوئے، انہوں نے سب سے اول ہم لوگوں کو ملاحظہ کیا اور بڑے غصہ سے حکم دیا کہ ایک ایک آڑا ڈنڈا ابھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو۔ چنانچہ اس حکم کے بعد لوہار ڈنڈے آہنی لے کر حاضر ہو گیا اور ہمارے دونوں پاؤں کے دونوں کڑوں کے درمیان سے ایک آڑا ڈنڈا جو ایک فٹ پانچ گرہ سے زیادہ لمبا نہ تھا، ڈال دیا گیا۔ یہ حکم ازراہ تعصب فقط ہم لوگوں کے واسطے تھا اور تمام جیل بھر میں ہم نے اور کسی قیدی کے پاؤں میں یہ ڈنڈا نہیں دیکھا، چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا نہایت مشکل ہو گیا اور رات پاؤں پسار کر سونا بھی محال تھا۔

(کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۳۵۷)

انگریز کے مذہبی تعصب کا پرچار

انگریزوں کے نسلی امتیاز پر تبصرہ کرتے ہوئے تھانیسری صاحب لکھتے ہیں:

یہ تو سب کچھ تھا مگر ۱۸۷۹ء کا ایک نیا واقعہ عبرت انگیز دیکھ کر لوگوں کو رونا آتا تھا اور وہ یہ ہے کہ ۱۸۷۹ء میں ایک بدبخت راجہ جگن ناتھ پوری جس کے واسطے مدت تک اخباروں نے بھی سر پھوڑا تھا، قید ہو کر کالے پانی میں پہنچا، مگر بوجہ کالا چہرہ ہونے کے بے چارہ عام چوہڑے چماروں کے ساتھ کھاتا پیتا اور مشقت کرتا اور جب بوجہ نازک مزاجی اس سے مشقت نہ ہوتی تو بید اور جیل اور چکی پیسنے کی سزا پاتا۔ آخر ان صدموں سے تھوڑے روز بعد وہ راجہ وہیں پر جیل میں مر گیا اور انہی ایام میں مسٹر بسمیر نام کا ایک کلرک بھی گو بدن سے کالا مگر یورپین نام اور کوٹ پتلون سے مشرف ملک اودھ سے قید ہو کر وہاں پہنچا تھا اور اس کو گوروں جیسا عمدہ کھانا ملنے لگا، ایک علیحدہ مکان پلنگ وغیرہ کل سامان عیش و آرام کا مل گیا اور بجائے مشقت کے ڈپٹی کمشنری کی کچہری میں کلرک ہو گیا، کیونکہ یہ کم بخت راجہ اور یہ خوش نصیب کلرک دونوں ایک ہی وقت میں وہاں پہنچے تھے، یہ اختلاف سلوک اور طرف

داری کوٹ پتلون اور نا قدری شرفاء امراء ہند دیکھ کر ہر کسی کو رونا آتا ہے۔
(کالا پانی مع مکتوبات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۲۷۲)

نتیجہ بحث

غور فرمایئے کہ اس پیراگراف میں جعفر تھانیسری نے کس قدر بے خوفی اور بے باکی سے انگریزوں کے خلاف نفرت اور غم و غصہ کا تاثر پھیلانے کی کوشش کی ہے، اگر ان کو اپنی تحریروں کے سی آئی ڈی کی نذر ہو جانے کا خدشہ ہوتا تو اس قسم کا مواد کبھی سپرد قلم نہ کرتے، اس لئے سید احمد کے وکلاء خواہ وہ غلام رسول مہر ہوں، ابوالحسن علی ندوی ہوں یا ''الحق'' کے تبصرہ نگار کا یہ کہنا کہ جعفر تھانیسری نے انگریزوں سے خائف ہو کر یہ کتاب ضبط ہونے کے خدشہ سے اصل مواد میں ترمیم کر کے سید احمد کے مکاتیب میں انگریزوں کی جگہ سکھوں کا لفظ لکھ دیا ایک سفید جھوٹ اور خالص افتراء ہے اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ جس کی تائید میں کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی۔ محمود الحسن دیوبندی، جعفر تھانیسری کو سید احمد پر اتھارٹی قرار دیتے ہیں۔ پروفیسر ایوب قادری ان کی استقامت اور جرأت اور بے باکی کو تسلیم کرتے ہیں اور خود جعفر تھانیسری کی تحریروں کے متعدد اقتباسات اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ انگریزوں سے بالکل نہیں ڈرتے تھے، بلکہ خود انبیاء اور صحابہ سے زیادہ دل والے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کی بددیانتی، مجرمانہ استحصال، عدالت کی بے انصافی، انتظامیہ کے مظالم اور ان کے مذہبی اور نسلی امتیاز پر خوب کھل کر لکھا ہے اور اس کتاب کو انگریزوں کے دور حکومت میں شائع کیا ہے۔ اس لئے اس بات کو کسی طرح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اصل مواد میں تحریف کر کے انگریزوں کی جگہ سکھوں کا نام لکھ دیا۔

جعفر تھانیسری کیا تھے؟

جعفر تھانیسری بے لچک اور بے خوف انسان تھے، صاف گوئی ان کی سرشت تھی۔ سید احمد کی تحریک جہاد کے بارے میں جو کچھ ان کے علم اور مشاہدہ میں آیا وہ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا۔ علاوہ ازیں وہ سید احمد کے زبردست معتقد تھے حتیٰ کہ ان کی عقیدت غلو کی سرحدوں سے آگے پہنچی ہوئی تھی، وہ ان کے بارے میں کوئی ایسی بات کیسے لکھ سکتے

تھے جوان کے لئے بدنامی کا موجب ہوتی جب کہ سید احمد کی عزت اور حرمت سے زیادہ انہیں کوئی چیز عزیز نہ تھی۔

جعفر تھانیسری کی سید احمد سے عقیدت

آیئے! اب ہم آپ کے سامنے سید احمد سے جعفر تھانیسری کی عقیدت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ شب قدر حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آ کر سید احمد کو نیند سے بیدار کیا اور اس رات کو شب قدر اپنے تمام حقائق اور اسرار کے ساتھ سید احمد پر منکشف ہوئی۔ سید احمد نے یہ رات عبادت میں گزاری اور پھر اس رات کے بعد سے آناً فاناً آثار ترقیات وعلو درجات ومعاملات عجیب واردات غریب آپ پر ظاہر ہونے لگیں۔

(حیات سید احمد شہید ملخصاً ص ۶۳۔۶۴)

سید احمد کو حضرت علی کا غسل دلانا اور سیدہ فاطمہ کا لباس پہنانا

سید احمد سے جعفر تھانیسری کی عقیدت کا ایک نظارہ تو آپ نے دیکھ لیا، اب غلو عقیدت کا ایک اور جگر خراش منظر دیکھئے:

اس معاملہ عجیبہ کے بعد صاحب "مخزن" بہ حوالہ "صراط مستقیم" لکھتا ہے کہ ایک خواب میں رسول اللہ ﷺ نے تین چھوہارے اپنے دست مبارک سے سید صاحب کے منہ میں ایک دوسرے کے بعد رکھ کر بہت پیار اور محبت سے کھلائے اور جب آپ بیدار ہوئے تو ان چھواروں کی شیرینی آپ کے ظاہر و باطن سے ہویدا تھی۔ اس کے بعد ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کو سید صاحب نے خواب میں دیکھا۔ حضرت علی نے اپنے دست مبارک سے آپ کو نہلایا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک لباس اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنایا۔ ان واقعات کے بعد کمالات طریقہ نبوت کے نہایت آب و تاب کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہونے لگے اور وہ عنایت ازلی جو مکنون اور محجوب تھی، ظاہر ہوگئی اور تربیت یزدانی بلاواسطہ کسی کے متکفل حال آپ کے ہوگئی اور نہایت عجیب وغریب معاملات آپ پر ظاہر ہونے لگے، یہاں تک کہ ایک دن ایک دو پاء حقہ میں رب العزت نے اپنے دست

قدرت خاص سے سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر ایک چیز اور قدسیہ سے جو نہایت دلیع و بدیع تھی آپ کے سامنے رکھ کر فرمایا کہ تجھ کو یہ چیز اب عنایت ہوئی ہے اور اس کے سوا اور بہت سی چیزیں تجھ کو عنایت کریں گے۔ (حیات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۶۴)

مرزا غلام احمد قادیانی نے جب یہ بکواس کی کہ میں نے خواب دیکھا کہ میرا سر سیدہ فاطمہ زہراء (فداہا نفسی وابی وامی) کے زانو پر رکھا ہوا ہے تو غیور مسلمانوں کا خون کھول اٹھا، شمع اہل بیت کے پروانے مضطرب ہو گئے اور ہندوستان کے طول و عرض سے قادیانی کے خلاف غم و غصہ اور غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا اور اسماعیل دہلوی کا مرشد اور جعفر تھانیسری کا ممدوح اور تمام دیوبندیوں اور وہابیوں کا روحانی مقتداء علی الاعلان بیان کرتا ہے: مجھ کو داماد رسول علی مرتضیٰ نے غسل دیا اور محمد عربی کی لاڈلی اور محترمہ صاحبزادی بتول زہراء نے کپڑے پہنائے اور کسی مسلمان کی رگوں میں غیرت کا لہو جوش میں نہ آیا۔ اس کے برخلاف اس قسم کے ہذیان لکھنے والے کو تحریک جنگ آزادی کا ہیرو بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور اس کی مدح اور منقبت میں کتابوں پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ (فالی اللہ المشتکی!) کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ جس ذات مقدسہ کا احترام اللہ تعالیٰ کے رسول کو اس قدر عزیز ہو کہ وہ جب مجلس میں آئیں تو دو عالم کے سردار اور مختار محمد رسول اللہ ﷺ ان کے احترام کی خاطر سر مجلس کھڑے ہو جائیں۔ جس ذات مطہرہ کا اعزاز اللہ تعالیٰ کو اس درجہ منظور ہو کہ جب روز محشر سیدہ فاطمہ فداہا نفسی وابی وامی کی سواری سر محشر گزرے تو اہل محشر کو ندا کی جائے کہ سب اپنی اپنی گردنیں جھکا لیں، نگاہیں نیچی کر لیں، فاطمہ بنت محمد کی سواری آ رہی ہے۔ جن کے حیاء اور حجاب کا یہ عالم ہو کہ ان کا آنچل کسی غیر محرم نے نہ دیکھا ہو ان کے بارے میں یوں بکواس کی جائے کہ فاطمہ سید احمد کو غسل کے بعد کپڑے پہنا رہی ہیں اور اس شیطانی خواب پر فخر و مباہات کیا جائے اور اس واقعہ کو سید احمد کی شان بڑھانے کے لئے مکرر سہ کرر چھاپا جائے، کتابوں پر کتابیں لکھیں۔ میں سوچتا ہوں اس جھوٹ اور افتراء پر آسمان شق کیوں نہ ہو گیا؟ زمین پھٹ کیوں نہ پڑی ایوان کائنات میں زلزلہ کیوں نہ آ گیا؟ ناموس زہراء کی چادر پر چھینٹے اڑانے پر فرشتوں پر قیامت کیوں نہ آ گئی؟

سید احمد کا اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا

آیئے! جعفر تھانیسری کی سید احمد سے غلو عقیدت کا ایک اور نظارہ کیجئے، لکھتے ہیں:

انہیں ایام میں ایک شخص نے سید صاحب سے درخواست بیعت کی تھی، مگر ان ایام میں سید صاحب علی العموم ہر کسی کی بیعت نہ لیتے تھے، اس واسطے اس شخص کی درخواست کو بھی منظور نہ فرمایا۔ تب وہ شخص نہایت عجز و انکسار سے عرض کرنے لگا۔ اس وقت آپ نے فرمایا کہ دو ایک روز اور توقف کرو، اس کے بعد جو مناسب وقت ہوگا کیا جائے گا۔ اس کے بعد سید صاحب نے بڑے استغفار اور طلب اذن اخذ بیعت کے جناب باری میں اس طرح سے التجا کی کہ ایک بندہ تیرے بندوں میں سے مجھ سے بیعت کرنا چاہتا ہے اور تو نے میرا ہاتھ پکڑا ہے اور تیرے اوصاف کو مخلوق کے اوصاف سے کچھ نسبت نہیں ہے، پس اس معاملہ اخذ بیعت میں تیری کیا مرضی ہے؟ جناب باری سے حکم ہوا کہ جو کوئی تیرے ہاتھ پر بیعت کرے گا خواہ وہ لاکھوں ہوں ہر ایک کی کفایت کروں گا، بعد وقوع ان معاملات مذکورہ بالا کے سلوک لانبوت کا باحسن الوجوہ آپ کو حاصل ہوگا۔

(حیات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۶۴۔۶۵)

غور فرمایا، قارئین کرام! تھانیسری صاحب نے کس خوبصورتی اور چابک دستی سے اپنے ممدوح سید احمد کو کلیم اللہ اور راکب جادہ نبوت بنا دیا۔

سید احمد کی کلاہ سے نورانی شعاعوں کا نکلنا

غلو عقیدت کا ایک اور منظر بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

مولوی سید جعفر علی صاحب لکھتے ہیں کہ اس قدر تحصیل سلوک کے بعد آپ ایک مرتبہ وطن کو تشریف لے گئے، اس وقت لباس درویشانہ پہنے ہوئے تھے، آپ اپنے وطن پہنچ کر اول اپنی مسجد میں مقیم ہوئے لوگوں نے مشکل سے آپ کو شناخت کیا، اس وقت ایک کلاہ بھی آپ کے سر پر تھی، جو ایک روز صحن مسجد میں دھوپ دینے کو رکھی گئی تھی۔ اس وقت سید عبدالقادر بن حافظ سید امان اللہ نے دیکھا کہ ایک نور اس کلاہ سے نکل کر عرش تک جا رہا تھا۔

(حیات سید احمد شہید مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۶۷)

اللہ اکبر! محمد عربی ﷺ فداہ نفسی وابی وامی جن کے حق میں "قد جاء کم من اللہ نور" اور "سراجا منیرا" قرآن کریم میں وارد ہے اور متعدد احادیث میں جن کی ذات پر نور کا اطلاق موجود ہے، جو لوگ ان کی ذات پر نور کے اطلاق پہ دن رات مناظرے اور مجادلے کرتے ہیں وہی لوگ سید احمد کی کلاہ سے نور کی شعاعوں کا عرش تک جانا بیان کر رہے ہیں اور اس واقعہ کو دھڑا دھڑ کتابوں میں لکھ رہے ہیں اور ایڈیشنوں پر ایڈیشن نکل رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

حاصل بحث

بات طول پکڑتی جا رہی ہے، ہم بتلانا صرف اتنا چاہتے تھے کہ جعفر تھانیسری سید احمد شہید سے بے پناہ محبت اور بے اندازہ عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے سید احمد کو غسیل علی اور ملبوس بدست فاطمہ دکھایا ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ سید احمد اگر شب قدر کو سوئے ہوئے ہوں تو محمد مصطفیٰ اور ابو بکر انہیں جگانے آتے تھے۔ انہوں نے سید احمد کو بلا واسطہ کلیم اللہ دکھایا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ سید احمد کے تمام مریدوں کا اللہ تعالیٰ کفیل اور ضامن ہے۔ انہوں نے بتلایا ہے کہ سید احمد راہی منزل نبوت تھے، انہوں نے دکھلایا ہے کہ سید احمد کی کلاہ سے نور کی شعائیں نکل کر عرش تک جاتی تھیں، جو شخص سید احمد سے اس درجہ محبت اور عقیدت رکھتا ہو اس کے بارے میں ہرگز یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے سید احمد کی سیرت بیان کرنے میں کہیں غلط بیانی کی ہوگی یا سید احمد کے مکاتیب میں انگریزوں کی جگہ سکھوں کا لفظ لکھ دے گا۔ جو شخص موت سے نہ گھبراتا ہو اور تختہ دار کو سامنے دیکھ کر بھی مسکراتا ہو اور اپنے موقف میں لچک نہ آنے دیتا ہو وہ اپنے روحانی مرشد کے واقعات بیان کرنے میں کیسے لچک گوارہ کر سکتا ہے؟

واقعہ یہی ہے کہ سید احمد نے سکھوں اور مسلمانوں کے خلاف جہاد کیا اور اسی سلسلہ میں اسلحہ اور رقم حاصل کرنے کے لئے مختلف امراء کو خطوط لکھے اور اس بارے میں تمام واقعات اور مکاتیب کو جعفر تھانیسری نے من وعن ہم تک پہنچا دیا۔

"سوانح احمدی" میں سید احمد کے کل واقعات ہیں

جعفر تھانیسری نے سید احمد کی سوانح کے بارے میں جو مواد جمع کیا ہے اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

اس مظہر انوار نبی کے سوانح ایسے ہیں کہ اس کے مثل کوئی سوانح ناظرین نے نہ دیکھے ہوں گے، اگر اس بزرگ کو مجدد تیرہویں صدی یا مہدی وسط کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ بقول شاعر ؎

ہوتا ہے معصوم اگر بعد نبی کے کوئی
ہوتی اس عصر میں عصمت بھی اسی کے اندر

مگر احتمال ہے کہ نئی روشنی والوں کو ان واقعات سے سخت حیرت ہو۔ مگر جب کہ وہ اپنے پیران پیر مسیح کے سوانح سے مقابلہ کریں گے تو مابین ہر دو سوانح کے سر مو تفاوت نہ پائیں گے، بلکہ وقت موازنہ جان لیں گے کہ مسیح اور سید صاحب ایک ہی شاہراہ کے راہ رو اور ایک استاد کے شاگرد تھے، میں نے اس کتاب کو بڑے راست باز لوگوں کی متعدد تحریروں سے نقل کیا ہے، گو بعض مؤرخوں کی بے توجہی سے اکثر واقعات پس و پیش ہو گئے ہیں۔ اس سے مجھ کو بالترتیب لکھنے میں بہت دشواری ہوئی۔ کیونکہ جس قدر کتابیں میں نے اس سوانح کے جمع کرنے کے لئے فراہم کیں، ان میں مؤرخوں نے بوجہ حسن عقیدت صرف خرق عادات و کرامات کو بلا قید تاریخ بے ترتیب رنگین و دقیق، جس کا سمجھنا آسان نہیں، قلم بند کیا ہے۔ اس سبب سے مطالب کتاب پس و پیش اور بے ٹھکانے تھے، جن کے ترتیب دینے اور تحقیقات و صحت کرنے میں عاجز کو دور دور سفر کرنے اور بعض انگریزی کتب سے تاریخ واقعات لینے پڑے، اگرچہ با ایں ہمہ سعی میں جزماً یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ کل مطالب تاریخ وار اپنے اپنے موقع پر قائم ہوں گے مگر اس میں بھی شبہ نہیں کہ کتاب جامع کل تحریرات سابق اور عام فہم اور نہایت اہم ہو گئی ہے۔

(سوانح احمدی مطبوعہ بلالی سٹیم پریس، انبالہ ص ۳)

اس عبارت میں جعفر تھانیسری نے تصریح کر دی ہے کہ سید احمد کی سوانح کے بارے

میں کل واقعات ان کی اس کتاب میں جمع کئے جا چکے ہیں اور سید احمد کی زندگی کا کوئی اہم واقعہ نہیں ہے مگر اس کو وہ احاطہ تحریر میں لا چکے ہیں۔اس لئے اب اگر کوئی شخص سید احمد کی سوانح میں کوئی نیا واقعہ پیش کرتا ہے تو وہ جعلی من گھڑت اور موضوع ہوگا اور اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہوگی۔ خاص طور پر ابوالحسن علی ندوی اور غلام رسول مہر نے جو ایسے واقعات وضع کئے ہیں جو جعفر تھانیسری کی ''سوانح احمدی'' سے غیر مربوط متعارض یا زائد ہیں، تاریخی طور پر قطعاً قابل قبول نہیں ہیں، ان جعلی اور وضعی واقعات سے اپنے حلقہ بگوشوں کو تسلی تو دی جاسکتی ہے لیکن سواصدی سے جو مستند تاریخ تسلیم کی جاتی رہی تھی اس کا چہرہ مسخ نہیں کیا جاسکتا۔

''مکتوبات احمدیہ'' میں سید احمد کے کل مکاتیب ہیں

جس طرح جعفر تھانیسری نے سید احمد کی مکمل سوانح مرتب کی ہے، اسی طرح انہوں نے تمام مکاتیب کو بھی جمع کر دیا ہے۔

سید احمد کے جس قدر مکاتیب تھے وہ سب کے سب جعفر تھانیسری نے ''سوانح احمدی'' کے حصہ پنجم میں شامل کر دیئے ہیں، ان مکاتیب کے علاوہ جو بھی نیا مکتوب پیش کیا جائے گا وہ جعلی، من گھڑت اور موضوع ہوگا اور اس کی تاریخی حیثیت صفر سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی، اس کو محض اختراع اور ایجاد بندہ کہا جائے گا، چنانچہ مکاتیب کا ذکر کرنے سے پہلے جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

سید احمد کے مکتوبات بھی ویسے ہی پس و پیش اور بے ترتیب اور اکثر بلا تاریخ تحریر کئے ہیں جیسے آپ کے سوانح اس مٹھے مکتوبات میں جس میں سے میں نے یہاں یہ مجموعہ مکاتیب لکھا ہے۔ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے بہت سے خطبے اور روزمرہ رپورٹیں، کارروائی اور نیز بہت سے خطوط مرسلہ رؤساء و خوانین بنام سید صاحب اور نیز سید صاحب کے مکرر سہ کرر خطوط ہم مضمون ایک ہی رئیس کے نام اور قواعد مراقبہ و مشاہدہ اور کرسی نامے پیشوایان طریقت وغیرہ وغیرہ شامل ہیں، میں نے بغور اس مٹھے کا ملاحظہ کر کے من جملہ کل متفرق تحریر کے جو اس میں شامل ہے صرف ساٹھ مکتوبات جو لب لباب اس مجموعہ کے تھے،

یہاں شامل کر کے اصل مئودہ اسی مالک کو واپس کر دیا۔ اب اس مٹلے میں کوئی عبارت یا مضمون ایسا نہیں ہے جو اس کتاب میں نہ آ چکا ہو اور کیونکہ یہ مجموعہ مکاتیب احمدی ہے اس واسطے میں نے غیروں کے خطوط اور خطبے وکرسی نامہ وغیرہ اس میں شامل نہیں کئے۔

(سوانح احمدی مطبوعہ بلالی پریس، ساڈھورہ انبالہ ص ۱۶۹)

اس عبارت میں جعفر تھانیسری نے واضح طور پر تصریح کر دی ہے کہ سید احمد کے جس قدر مکاتیب تھے وہ ان کے پیش کردہ مجموعہ میں آ چکے ہیں، ۱۹۴۰ء تک ان مکاتیب کے علاوہ اور کسی مکتوب کا وجود نہ تھا۔ 1918ء میں جب انگریزوں کے خلاف عام تحریک شروع ہو گئی تو سید احمد کے مریدوں اور عقیدت کیشوں نے سوچا کہ یہ مکاتیب جو انگریزوں کی وفاداری سے ہیں، سید احمد کی شہرت کو داغ دار کریں گے، چنانچہ ابوالحسن علی ندوی اور غلام رسول مہر نے خانہ ساز واقعات اور مکاتیب کا انبار لگا دیا اور ان وضعی اور اختراعی واقعات اور مکاتیب کو بنیاد بنا کر جن کا ۱۹۴۰ء سے پہلے کوئی سراغ نہیں ملتا، یہ ثابت کرنے کی لا حاصل سعی کی ہے کہ اصل مکاتیب یہی ہیں اور جو مکاتیب جعفر تھانیسری کی ''سوانح احمدی'' سے اب تک پیش کئے جاتے رہے ہیں ان کی حیثیت مشکوک ہے، کیونکہ جعفر تھانیسری نے انگریزوں کے ڈر سے ان مکاتیب میں انگریزوں کی جگہ سکھوں کا نام لکھ دیا۔ یہ توجیہ کس قدر رکیک اور باطل ہے اس کی قلعی ہم اوراق سابقہ میں کھول چکے ہیں اور بتلا چکے ہیں کہ جعفر تھانیسری ڈرنے والے آدمی نہ تھے اور نہ ہی سید احمد کی عزت سے کھیلنے والے تھے۔

سید احمد کے وکلاء کی ابن الوقتی

میں ان بے ضمیر لوگوں کی ابن الوقتی پر حیران ہوں کہ جب انگریز کی حکومت کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا تو یہ لوگ ببانگ دہل کہتے تھے کہ سید احمد انگریزوں کا وفادار تھا اور جب حکومت برطانیہ کی کشتی بھنور میں پھنس گئی تو انہوں نے سید احمد کو انگریزوں کا مخالف بنانے کا ڈھول پیٹ دیا۔

سید احمد کے سکھوں کے خلاف جہاد کی ایک ناقابل تردید شہادت

بعض لوگ ان میں سے ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہوئے بھی نہیں شرماتے کہ سید احمد

نے سکھوں سے اصلاً جنگ کی ہی نہیں بلکہ وہ انگریزوں سے برسر پیکار رہے تھے، ایسے لوگوں کو آئینہ دکھانے کے لئے میں ایک حوالہ پیش کر رہا ہوں۔

یہ ابوالحسن علی ندوی کی ۱۴ اپریل ۱۹۷۴ء کی تحریر ہے، لکھتے ہیں:

سید صاحب نے دین خالص کی دعوت پر اپنی بنیاد رکھی، انہوں نے مسلمانوں میں ایمان ویقین، جذبہ اسلامی اور جہاد فی سبیل اللہ کی روح پھونک دی۔ ایک بڑی جماعت کو داعیانہ ومجاہدانہ بنیادوں پر منظم کیا اور ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو اپنی دعوت جہاد کا مرکز بنایا، ان کا منصوبہ دراصل یہ تھا کہ آگے چل کر وہ پورے ملک سے انگریزوں کو بے دخل کرنے کی کوشش کریں گے اور کتاب وسنت کی بنیاد پر یہاں حکومت شرعیہ قائم کریں گے۔ ان مجاہدین نے پنجاب میں سکھوں کو (جو پنجاب پر قابض تھے اور جنہوں نے وہاں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا) کئی معرکوں میں شکست فاش دی۔

(جب ایمان کی بہار آئی، مطبوعہ مجلس نشریات اسلام ص ۱۲)

انگریزوں کے خلاف سید احمد کے ارادۂ جہاد کی بحث

سید احمد کے انگریزوں کو بے دخل کرنے کا منصوبہ ابوالحسن علی ندوی کے علم میں کیسے آیا اور وہ سید احمد کے مقتول ہونے کے ڈیڑھ سو سال بعد ان کے دل کے حال پر کیسے مطلع ہو گئے؟ اس کو تو وہی بتا سکتے ہیں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دیوار کے پیچھے کا علم نہیں مانتے۔ ان پر ڈیڑھ سو سال بعد ایک گمنام قبر کے مردہ کے دل کا حال کیسے منکشف ہو گیا؟ اس معمہ کی وضاحت تو یہی لوگ کر سکیں گے۔ بہر حال اس عبارت میں ابوالحسن نے یہ تصریح کر دی ہے کہ سید احمد کا جہاد بہر حال سکھوں کے خلاف تھا، انگریزوں کے خلاف نہیں تھا۔ اس لئے سید احمد کے مکاتیب میں ان کا روئے سخن بھی لامحالہ سکھوں کی طرف ماننا ہوگا نہ کہ انگریزوں کی طرف۔

جعفر تھانیسری کی شہادت

اسی بحث میں یہ حوالہ بھی قابل غور ہے، جعفر تھانیسری، سید احمد کی مدح سرائی کرتے ہوئے اور ان کے مشن کے ناکام ہونے کی توجیہ میں لکھتے ہیں:

اپنی پاک باطنی اور صفائی قلب اور توکل و زہد اور اولوالعزمی کی وجہ سے اس بے نظیر بزرگ کو سیاسی پیچیدگیوں کی اور فن جنگ کے علم کی طرف بالکل توجہ نہ تھی۔ انہیں دو خامیوں نے اس کے بنے کام کو بگاڑ کر آخر اس کو بالاکوٹ میں وہ دن دکھایا کہ جس کی یاد سے آج تک ہزاروں خلقت کے دل دکھتے ہیں، اگر ان سب خوبیوں کے ساتھ جو اس کی ذات مقدس میں موجود تھیں فن ملک گیری اور فن جنگ بھی ہوتا تو وہ اس موجودہ نسل کے پیدا ہونے سے پہلے پنجاب کیا، بلکہ ساری دنیا کا بادشاہ ہوا ہوتا، اس "سوانح" اور "مکتوبات" کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا، وہ اس آزاد عمل داری کو اپنی ہی عمل داری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ بھی مدد نہ پہنچتی، مگر سرکار انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔

(حیات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی ص ۲۹۳)

اب غور کیجئے کہ جعفر تھانیسری جو سید احمد کی تحریک مجاہدین کے ایک اہم فرد تھے، جو ان کے قریب ترین معاصر تھے اور جو ایسے بے لچک شخص ہیں جس کی ثابت قدمی اور استقلال پروفیسر ایوب قادری، غلام رسول مہر اور ابوالحسن علی ندوی سب کو مسلم ہے، جو سید احمد کے زبردست معتقد ہیں، وہ تو لکھتے ہیں کہ سید صاحب کا سرکار انگریزی سے جہاد کا ہرگز ارادہ نہ تھا اور سید احمد کے مقتول ہونے کے سوا سو سال بعد ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ سکھوں سے فارغ ہونے کے بعد سید احمد کا انگریزوں سے جہاد کا ارادہ تھا، اب ان دونوں میں کس کی بات معتبر ہے۔ ناظرین خود فیصلہ کر لیں، ایک شخص سید احمد کا قریب ترین معاصر ہے جو سید احمد کے قتل کے ایک سال بعد پیدا ہوا۔ دوسرا شخص سوا سو سال بعد کا ہے، اب قریب ترین معاصر کے لئے سید احمد صاحب کے ارادہ کو جاننے کے زیادہ تر رکن تھے یا سوا سو سال بعد کے شخص کے لئے سید احمد کے ارادہ کو جاننے کے زیادہ تر رکن ہیں جس کے عہد میں سید احمد محض ایک گمنام قبر کے مردہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

سید احمد کی اپنی شہادت

اور سب کو چھوڑ یئے خود سید احمد سے پوچھ لیتے ہیں کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ رکھتے تھے یا نہیں۔

صاحب ''مخزن'' لکھتا ہے کہ ایام طفولیت سے آپ کی طبیعت اور جبلت میں شوق و ذوق اعلائے کلمۃ اللہ وانطفائے نائرہ کفر و بدعت کا بھرا ہوا تھا۔ اس واسطے ہر گھڑی اور ہر ساعت جہاد اور قتال کفار کا ارادہ کرتے رہتے تھے اور سرکار انگریزی تو کافر تھی مگر اس کی مسلمان رعایا کی آزادی اور سرکار انگریزی کی بے روریائی اور بوجہ موجودگی ان حالات کے ہماری شریعت کے شرائط سرکار انگریزی سے جہاد کو مانع تھیں۔ اس واسطے آپ کو منظور ہوا کہ اقوام سکھ پنجاب پر جو نہایت ظالم اور احکامات شریعت کی خارج اور مانع تھیں جہاد کیا جائے۔ (سوانح احمدی مطبوعہ انبالہ ص ۴۵)

جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے، کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہو؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جاوے گا۔ کیونکہ سینکڑوں کوس سفر کر کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امر محال ہے جن کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے۔ (سوانح احمد مطبوعہ انبالہ ص ۱۷)

جعفر تھانیسری لکھتے ہیں:

۶ ربیع الاول ۱۲۴۵ ہجری (بمطابق ۱۸۳۰ء۔ سعیدی) باتفاق رائے جملہ علماء و روساء ایک ایک اعلام نامہ بہ خط فارسی بہت طویل ہے، جس کو میں یہاں درج کرنا نہیں چاہتا، مگر اس کا ایک فقرہ مجھ کو نہایت پسند ہوا، بعینہٖ نقل کرتا ہوں، یہ فقرہ ص ۵۶۲ ''منظورۃ السعداء'' مؤلفہ مولوی جعفر علی نقوی میں درج ہے، سید صاحب لکھتے ہیں:

نه بلکسے از امراء مسلمین منازعت داریم ونه بلکسے از رؤساء مومنین مخالفت بلکفار لکام مقابله داریم نه بامدعیان اسلام۔ صرف بادراز مویاں (یہاں اقوام سکھ جو سر پر لمبے بال رکھتے ہیں مراد ہے) جویاں مقابله ایم نه با کلمه گویان و اسلام جویاں ونه بلسرکار انگریزی که او مسلمان رعایا خود را برائے اوائے فرائض مذهبی شان آزادی بخشیده است۔

نہ ہم مسلمانوں سے نزاع رکھتے ہیں نہ مسلمان رؤساء سے مخالفت رکھتے ہیں۔ ملعون کفاروں سے مقابلہ کرتے ہیں نہ مدعیان اسلام سے، صرف لمبے بال رکھنے والوں (سکھوں) سے مقابلہ کا ارادہ رکھتے ہیں نہ کہ کلمہ گویان اسلام سے اور نہ سرکار انگریزی سے، جس نے اپنی مسلمان رعایا کو ان کے مذہبی معاملات میں آزادی دی ہوئی ہے۔

(سوانح احمدی مطبوعہ انبالہ ص ۱۱۵)

اس خط کی نقول سید احمد نے ۱۸۳۰ء میں مختلف اطراف واکناف میں روانہ کی تھیں اور اس کے چند ماہ بعد ۱۸۳۱ء میں سید احمد مقتول ہو گئے اور ہم نے ''مخزن احمدی'' جو سید احمد کے بڑے بھانجے مولوی سید محمد علی کی تصنیف ہے، کے حوالہ سے بتلا دیا ہے کہ حج پر روانگی سے قبل بھی سید احمد کا انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا ارادہ نہ تھا اور ''منظور السعداء'' مؤلفہ جعفر علی نقوی کے حوالے سے بتلا دیا ہے کہ مقتول ہونے سے چند ماہ پہلے جو سید احمد نے عام مکتوب لکھوایا تھا اس میں بھی یہ لکھا تھا کہ سرکار انگریزی سے ان کا جہاد کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ گویا سید احمد کی تحریک جہاد کے نقطۂ آغاز سے لے کر نقطۂ اختتام تک کسی موقع پر سید احمد کے دل میں یہ ارادہ نہیں آیا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ جس پر ان کے اپنے اقوال اور تحریریں شاہد ہیں۔ اب ڈیڑھ سو سال بعد غلام رسول مہر اور ابوالحسن علی ندوی اس ڈیڑھ سو سال پرانے مردے کے دل میں زبردستی بعد از فراغ انگریزوں سے جہاد کا ارادہ خلاف واقعہ ٹھونس دیں تو ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ خدارا اپنی عقیدت کے غلو میں

تاریخ کا خون نہ کیجئے اور ڈیڑھ سو سالہ مسلم تاریخ کا چہرہ مسخ نہ کیجئے۔

جعفر تھانیسری نے عبارت "منظورۃ السعداء" سے نقل کی ہے، وہ بعینہٖ سید احمد کے مکاتیب میں موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیے! سید احمد اعلام نامہ میں لکھتے ہیں:

نہ بلکسے از امرائے مسلمین منازعت داریم ونہ بایکے از رؤسائے مومنین مخالفت بلکفار کیام مقابلہ داریم نہ بامدیعان اسلام صرف بادراز مویان (اس سے قوم سکھ مراد ہے جو سر پر لمبے لمبے بال رکھتے ہیں) مقاتلۃ نہ بلکلمہ گویاں و اسلام جویاں ونہ باسرکار انگریزی مخاصمت داریم ونہ ہیچ لاہ منازعت کراز رعایائے روز ہشتیم و بجاتیش از مظالم برایا چنانچہ ایں معنی معلوم ہر خاص و عام است و مسلم طوائف دتام۔

(سوانح احمدی مع پنجم مجموعہ مکاتیب احمد، مطبوعہ انبالہ ص ۱۷۵)

ہم مسلمان حکام سے عداوت رکھتے ہیں نہ مومن امراء سے، ملعون کفاروں سے مقابلہ کرتے ہیں نہ اسلام کے دعوے داروں سے، صرف لمبے بالوں والے سکھوں سے مقابلہ کرتے ہیں، جنگ نہ اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں سے ہے نہ سرکار انگریزی سے کوئی مخالفت ہے، نہ اس سے کسی قسم کا کوئی اختلاف ہے۔ کیونکہ ہم ان کی رعایا میں سے ہیں اور تمام مخلوقات کے مظالم سے محض ان کی وجہ سے محفوظ ہیں، چنانچہ یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہے اور تمام لوگوں کے درمیان مسلم ہے۔

اس آفتاب سے زیادہ روشن تصریح کے باوجود اس پر اصرار کیا جائے کہ سید احمد کا ارادہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کا تھا تو ہم اس غلوِ عقیدت پر اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ اس ڈیڑھ سو سالہ مردہ کے عزائم پر ظلم کے سوا اور کچھ نہیں ہے، محض دروغ بے فروغ اور خوفِ خدا سے بے پرواہ ہونے کی بدترین مثال ہے۔

سید احمد اور اسماعیل دہلوی کے بارے میں مودودی صاحب کی عقیدت

مودودی صاحب بھی چونکہ اپنے عقائد وافکار میں وہابیت کے پیروکار ہیں اور یہی چیز سید احمد، اسماعیل اور مودودی صاحب کے درمیان قدر مشترک ہے۔ اس لئے وہ بھی اسماعیل دہلوی اور سید احمد کی تحریک کو ان الفاظ کے ساتھ خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

سید صاحب اور شاہ اسماعیل صاحب دونوں روحاً اور معناً ایک وجود رکھتے ہیں، ان حضرات کے کارناموں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) انہوں نے عامۃ الخلائق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابہ کرام کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔

(۲) ان کے سپاہی دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اور رات کو جانماز پر سوتے تھے، خدا سے ڈرنے والے، آخرت کے حساب کو یاد رکھنے والے اور ہر حال میں راستہ پر قائم رہنے والے تھے، خواہ اس پر قائم رہنے میں ان کو فائدہ ہو یا نقصان ہو، انہوں نے کہیں شکست کھائی تو بزدل ثابت نہ ہوئے اور کہیں فتح پائی تو جبار اور متکبر نہ پائے گئے۔ اس شان کے ساتھ خالص اسلامی جہاد ہندوستان کی سرزمین میں نہ ان سے پہلے ہوا تھا اور نہ ان کے بعد ہوا۔

(گویا سید احمد، اسماعیل دہلوی کار جہاد میں، محمد بن قاسم، محمود غزنوی، سلطان نورالدین زنگی، سلطان شمس الدین التمش، علاؤالدین خلجی، قطب الدین ایبک اور شہاب الدین غوری ان سب سے بڑھ کر اور افضل تھے اور ان کا برین اسلام کے مجاہدین پر سید احمد اور اسماعیل دہلوی کے کارندے سبقت لے گئے۔ (نعوذ باللہ من تلک الخرافات)۔ وہابیت پسندی میں مودودی صاحب کے اس غلو عقیدت پر ہم سوائے اناللہ وانا الیہ راجعون کے اور کیا کہہ سکتے ہیں)

(۳) ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو تھوڑا سا موقع ملا، انہوں نے ٹھیک اس طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوت کہا گیا ہے۔ وہی

فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شوریٰ، وہی عدل، وہی انصاف، وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا، وہی مظلوم کی حمایت اگر ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی خدا سے ڈر کر حکومت کرنا اور اخلاق صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا، غرض ہر پہلو میں انہوں نے اس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا جو صدیق و فاروق نے کی تھی۔

(تجدید و احیاء دین ص ۱۱۵۔۱۱۷، اشاعت ۱۴ جون ۱۹۷۷ء)

(واضح رہے کہ مودودی صاحب نے اپنی اس عبارت میں جو عہد صدیقی و فاروقی کی قید لگائی ہے وہ احترازی ہے، کیونکہ انہوں نے خلافت و ملوکیت میں حضرت عثمان کی ان گنت غلطیاں گنوائی ہیں، ان پر بیت المال میں ناجائز تصرف اور اقرباء پروری کے بے شمار الزامات عائد ہیں۔ حضرت علی کے عہد خلافت میں ان پر الزام عائد کیا ہے کہ انہوں نے قاتلین عثمان سے نہ صرف یہ کہ قصاص نہیں لیا بلکہ ان کو مناصب جلیلہ پر فائز کیا اور کاتب وحی رسول اللہ کے برادر نسبتی اور دعائے رسول حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی ذات مقدس کے بارے میں تو اس قدر عیوب اور نقائص نکالے ہیں اور اس طرح کیچڑ اچھالا ہے کہ اس میدان میں وہ غالی رافضیوں کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ لہٰذا ان تصریحات کے پس منظر میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سید احمد اور اسماعیل دہلوی کا خود ساختہ دور حکومت خلافت عثمان و علی اور دور معاویہ ان تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور خلافت و حکومت سے افضل اور برتر تھا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ سعیدی)

سید احمد اور اسماعیل کی انگریز نوازی پر مودودی صاحب کی تنقید

سید احمد اور اسماعیل دہلوی سے اس غلو عقیدت کے باوجود مودودی صاحب اس بات پر تنقید کیے بغیر نہ رہ سکے کہ سید احمد نے سکھوں کے بجائے انگریزوں سے جہاد کیوں نہ کیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ان بزرگوں کے مقابلہ میں کئی ہزار میل دور سے آئے ہوئے

انگریزوں کو کس قسم کی فوقیت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ تو یہاں جعلی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور یہ خود اپنے گھر میں اسلامی حکومت قائم نہ کر سکے۔ الی ان قال

حیرت تو یہ ہے کہ شاہ ولی اللہ صاحب کے زمانہ میں انگریز بنگال پر چھا گئے تھے اور الہ آباد تک ان کا اقتدار پہنچ چکا تھا۔ مگر انہوں نے اس نئی ابھرنے والی طاقت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ میں دہلی کا بادشاہ انگریزوں کا پنشن خوار ہو چکا تھا اور قریب قریب سارے ہی ہندوستان پر انگریزوں کے پنجے جم چکے تھے، مگر ان کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا نہ ہوا کہ آخر کیا چیز اس قوم کو اس طرح بڑھا رہی ہے اور اس نئی طاقت کے پیچھے اسباب طاقت کیا ہے؟ سید صاحب اور شاہ اسماعیل شہید جو عملاً اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لئے اٹھے تھے، انہوں نے سارے انتظامات کئے، مگر اتنا نہ کیا کہ اہل نظر کا ایک وفد یورپ بھیجتے اور یہ تحقیق کراتے کہ یہ قوم جو طوفان کی طرح چھائی جا رہی ہے اور نئے آلات، نئے وسائل، نئے طریقوں اور نئے علوم وفنون سے کام لے رہی ہے، اس کی اتنی قوت اور اتنی ترقی کا کیا راز ہے؟ اس کے گھر میں کس نوعیت کے ادارے قائم ہیں؟ اس کے علوم کس قسم کے ہیں؟ اس کے تمدن کی اساس کن چیزوں پر ہے اور اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ جس وقت یہ حضرات جہاد کے لئے اٹھے ہیں اس وقت یہ بات کسی سے چھپی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں انگریزوں کی ہے اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالفت اگر ہو سکتی ہے تو انگریز ہی کی ہو سکتی ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دوررس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام وجاہلیت کی کش مکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لئے جس حریف سے نمٹنا تھا اس کے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کرتے اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کرتے۔ بہر حال جب ان سے یہ چوک ہو گئی تو اس عالم اسباب میں ایسی چوک کے نتائج سے وہ بچ نہ سکتے تھے۔ (تجدید واحیاء دین اشاعت ۱۴ جون ۱۹۷۷ء)

کاش! ابوالحسن علی ندوی اور غلام رسول مہر مودودی صاحب کی اس تحریر سے ہی سبق حاصل کر لیتے۔

سید احمد نے انگریزوں کی بجائے سکھوں کے خلاف رخ کیوں کیا؟

البتہ مودودی صاحب سے ہم اتنی گزارش ضرور کریں گے کہ ان کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ سید احمد اور اسماعیل دہلوی نے انگریز کی بجائے سکھوں کے خلاف کیوں محاذ آرائی کی جب کہ اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریز تھے۔ مودودی صاحب! اگر واقعی اس وجہ کو سمجھنا ہی چاہتے ہیں تو وہابیت پسندی کی وجہ سے غلو عقیدت کی عینک اتار کر ''مخزن احمدی'' اور ''سوانح احمدی'' کی وہ عبارات پڑھ لیں کہ انگریز بہادر کس طرح سید احمد اور اسماعیل دہلوی پر نذرانوں اور اشرفیوں کی بارش کرتے تھے، ان کی اور ان کے خلفاء کی کس طرح ضیافتیں کرتے تھے، اپنی بیگمات کو سید احمد کا مرید کراتے تھے اور ہزاروں انگریزوں کے مجمع میں سید احمد کے وعظ کراتے تھے اور کس طرح سید احمد اور اسماعیل دہلوی پر انگریزوں کی عنایت کی بارش ہوتی تھی۔ پھر یہ حقیقت مودودی صاحب کے لئے معمہ نہ رہے گی کہ سید احمد اور اسماعیل دہلوی جو ان کے خیال کے مطابق مظہر ابوبکر و عمر تھے، انہوں نے انگریزوں کے بجائے سکھوں سے محاذ آرائی کیوں کی جب کہ ان کے قول کے مطابق اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ انگریز تھے نہ کہ سکھ۔



شخصیات

فاضل بریلوی کا فقہی مقام

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت الشاہ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فقہی مقام پیش کرنا حقیقتاً اس شخص کا کام ہے جو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے فقہی کارناموں، آپ کے معاصرین اور متقدمین فقہاء کی کاوشوں پر گہری نظر رکھتا ہو۔ مجھ جیسے ہیچ مداں شخص کو جسے اپنی علمی بے بضاعتی کا مکمل اعتراف ہے، اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مقام پر لکھنے کا مکلف کرنا یقیناً زیادتی ہے۔ تاہم محسن اہل سنت اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ علیہ سے جو مجھے عقیدت و محبت ہے اس کے اقتضاء نے مجھے یہ جرأت رندانہ عطا کی کہ میں اپنی محبت و عقیدت کو صفحات قرطاس پر پیش کر سکوں۔ اس مرحلہ پر اگرچہ عقل و خرد روکتی رہی لیکن عشق عقل کی زنجیروں میں کبھی جکڑا نہیں گیا اور ہوش کا جیب و دامن کبھی شوق کے ہاتھوں سلامت نہیں رہا۔

اعلیٰ حضرت کے فقہی مقام پر کچھ تفویض قلم کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اختصاراً اعلیٰ حضرت کا ایک سوانحی خاکہ تحریر کیا جائے۔ پھر فقہ کی تعریف اور طبقات فقہاء بیان کئے جائیں تاکہ قارئین کرام فقہ اور طبقات فقہاء کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کی فقہی بصیرت کا اندازہ کر سکیں۔

مختصر سوانح

اعلیٰ حضرت، عظیم البرکت الشاہ مولانا احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۵۶ء بروز اتوار شہر بریلی کے محلہ جسولی میں ہوئی۔ پیدائشی نام محمد اور تاریخی نام المختار ہے۔ جد امجد حضرت مولانا رضا علی خاں نے آپ کا نام احمد رضا رکھا۔ خود اعلیٰ حضرت نے اپنی ولادت کا سن ہجری اس آیہ کریمہ سے مستنبط کیا ہے:

أُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (مجادلہ:۲۲) ''یہ ہیں وہ جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش فرما دیا اور اپنی پسندیدہ روح سے ان کی مدد فرمائی''۔

چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا۔ چھ سال کی عمر میں ربیع الاول کی تقریب میں منبر پر رونق افروز ہوئے اور ایک مجمع عظیم میں میلاد شریف پڑھا، اردو فارسی کی کتب پڑھنے کے بعد ''میزان منشعب'' وغیرہ کی تعلیم مرزا غلام قادر بیگ سے حاصل کی، پھر تمام دینیات کی تعلیم اپنے والد حضرت مولانا نقی علی خاں رضی اللہ عنہ سے مکمل کی۔ تیرہ سال دس ماہ کی عمر میں تفسیر، حدیث، کلام، فقہ وغیرہا تمام علوم دینیہ کی تکمیل کر لی اور ۱۴ شعبان المعظم ۱۲۸۶ھ میں دستار فضیلت کو اعزاز بخشا اور اسی دن مسئلہ رضاعت سے متعلق ایک فتویٰ لکھ کر اپنے والد ماجد کی خدمت میں پیش کیا۔ جواب بالکل صحیح تھا، والد صاحب نے جودت ذہنی دیکھ کر اسی وقت سے افتاء کا کام آپ کے سپرد کر دیا۔ تمام عمر درس و تدریس، افتاء و تصنیف میں بسر ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق تھا۔ ذکر و فکر کی ہر مجلس میں تصور رسالت سے ذہن شاداب رہتا تھا۔ آپ نے دین متین کے ہر گوشہ کو محبت رسول میں سمو دیا۔ عشق و محبت کی پاکیزہ لطافتوں کو جن لوگوں نے بدعت کا نام دیا، انہیں سنت و بدعت کا فرق سمجھایا، عظمت رسول میں تنقیص کرنے والوں کا عاشقانہ غیرت سے احتساب کیا۔ علم و عمل کے ہر پہلو میں عظمت رسول کو اجاگر کیا۔ عرب و عجم کے علماء نے آپ کی تکریم کی، ریاضی اور جفر کے بڑے بڑے ماہرین نے آپ کی علمی عظمت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے اور شرق و غرب میں آپ کا علمی اور روحانی فیض جاری ہو گیا۔

۲۵ صفر ۱۹۲۰ء بروز جمعۃ المبارک دو بج کر ۳۸ منٹ پر آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ادھر مؤذن نے ''حی علی الفلاح'' کی صدا بلند کی، ادھر آپ نے جان جان آفرین کے سپرد کر دی، جس وقت آپ کا وصال ہوا اسی وقت بیت المقدس کے ایک شامی بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ تشریف فرما ہیں اور آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے منتظر ہیں۔ انہوں نے عرض کیا: حضور! کس کا انتظار

ہے؟ فرمایا: احمد رضا کا۔ (ماخوذ از سوانح امام احمد رضا خاں)

فقہ کی تعریفات

اصولیین، فقہاء اور متصوفین تینوں طبقوں نے فقہ کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ہم قارئین کی ضیافت طبع کے لئے یہ تینوں تعریفیں پیش کرتے ہیں۔

اصولیین کی تعریف

فقہ احکام شرعیہ فرعیہ کے اس علم کو کہتے ہیں جو دلائل تفصیلیہ سے مکتسب ہو اور اس تعریف کے اعتبار سے فقہ مجتہدین کا خاصہ ہے۔

فقہاء کی تعریف

فقہ مسائل فرعیہ کے حفظ کو کہتے ہیں علاوہ ازیں کہ ان مسائل کا اکتساب دلائل تفصیلیہ سے کیا گیا ہو یا اقوال مجتہدین سے۔ اس تعریف کے اعتبار سے مقلدین کے علم کو بھی فقہ کہہ سکیں گے۔

متصوفین کی تعریف

فقہ دنیا سے اعراض کرنا، آخرت کی طرف رغبت کرنا، دین پر بصیرت رکھنا، عبادت پر مواظبت کرنا اور خلائق کو نصیحت کرنا ہے۔ اس تعریف کے اعتبار سے فقیہ کی تعریف عالم باعمل اور متقی کامل پر صادق آئے گی۔ (محصلہ از شامی)

فقہ اصولیین کے آئینہ میں

اصولیین کی تعریف کے اعتبار سے فقہ کی تعریف صرف مجتہدین پر صادق آتی ہے۔ ہم اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اجتہاد مطلق کا دعویٰ تو نہیں کرتے لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی شخصیت میں واضح طور پر اجتہاد کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ نے بے شمار ایسے قواعد مقرر فرمائے کہ اگر وہ سیدنا امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کئے جاتے۔ تو وہ یقیناً ان کی تحسین فرماتے۔ آپ نے متعدد ضوابط رقم فرمائے۔ جو کتب فقہ میں کہیں نہیں ملتے۔ لیکن ان کا وجود ناگزیر ہے، کیونکہ فقہ کی بے شمار

جزئیات اپنے انطباق کے لئے ان قواعد کی مرہون منت ہیں۔ ہم انشاء اللہ اس مضمون میں ان قواعد وضوابط کی نشاندہی کریں گے۔ چونکہ اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خاں صاحب نے ان تمام قواعد کا کتاب وسنت سے اکتساب کیا ہے اس لئے یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی شخصیت اجتہادی شان کی حامل تھی اور جس شخص نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی فقہی تحقیقات کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اس کے لئے یہ کوئی نظری مسئلہ نہیں۔ ہم آپ کے سامنے ایسی دو مثالیں پیش کرتے ہیں جن سے اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی فقیہانہ عظمت کا اندازہ ہو سکے گا اور آفتاب سے زیادہ روشن طریقہ پر ثابت ہو جائے گا کہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ مجتہد فی الشرع یا مجتہد مطلق تو نہیں ہیں، لیکن آپ کی تحریروں میں اجتہاد کا رنگ جھلکتا ہے اور آپ کی تقریروں سے استنباط کی مہک آتی ہے۔

رنگ اجتہاد

عام طور پر کتب اصول میں احکام شرعیہ کی سات قسمیں بیان کی جاتی ہیں: (۱) فرض (۲) واجب (۳) مستحب (۴) مباح (۵) حرام (۶) مکروہ تحریمی (۷) مکروہ تنزیہی۔ لیکن اعلیٰ حضرت عظیم البرکت نے احکام کی گیارہ قسمیں بیان فرائی ہیں جن کی تفصیل ہم ذیل میں پیش کررہے ہیں۔

(۱) فرض: جس فعل کا لزوم ثبوتاً اور دلالتاً قطعی ہو اور اس کا انکار کفر ہو اور اس کا ترک موجب استحقاق عذاب ہو، خواہ ترک دائماً ہو یا نادراً۔

(۲) واجب: جس فعل کا لزوم ثبوتاً یا دلالتاً ظنی ہو، اس کا انکار کفر نہ ہو۔ لیکن اس کا ترک موجب استحقاق عذاب ہو، خواہ ترک دائماً ہو یا نادراً۔

(۳) سنت مؤکدہ: جس فعل کا تاکد مواظبت رسول سے ثابت ہو، اس کا عادتاً ترک کرنا موجب استحقاق عذاب ہو اور نادراً ترک کرنا موجب استحقاق عتاب ہو۔

(۴) سنت غیر مؤکدہ: جس کام کا ترک کرنا موجب استحقاق عتاب ہو، خواہ ترک کرنا عادتاً ہو یا نادراً۔

(۵) مستحب: جس کام کے کرنے پر ثواب ہو اور ترک کرنے پر نہ ثواب ہو نہ عتاب، خواہ

ترک عادتاً ہو یا نادراً۔

(۶) مباح: جس کام کا کرنا نہ کرنا برابر ہو، نہ فعل پر عتاب نہ ترک پر، خواہ ترک عادتاً ہو یا نادراً۔

(۷) حرام: جس کام سے رکنے کا لزوم ثبوتاً و دلالتاً قطعی ہو، اس کا انکار کفر ہو اور اس کا فعل موجب استحقاق عذاب ہو، خواہ فعل دائماً ہو یا نادراً۔

(۸) مکروہ تحریمی: جس کام سے رکنے کا لزوم ثبوتاً یا دلالتاً ظنی ہو۔ اس کا انکار کفر نہیں لیکن اس کا فعل موجب استحقاق عذاب ہو، خواہ فعل دائماً ہو یا نادراً۔

(۹) اساءت: جس کام کا عادتاً کرنا موجب استحقاق عذاب ہو اور نادراً کرنا موجب عتاب ہو۔

(۱۰) مکروہ تنزیہی: جس کام کا کرنا مطلقاً موجب استحقاق عتاب ہو، خواہ عادۃً کیا جائے یا نادراً۔

(۱۱) خلاف اولیٰ: جس کام کا نہ کرنا موجب استحقاق ثواب ہو اور کرنا نہ موجب استحقاق عذاب ہو نہ عتاب، خواہ عادتاً کیا جائے یا نادراً۔

یہ وہ تقسیم ہے جس کے بارے میں خود اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ اس تقریر منیر کو حفظ کر لیجئے کہ ان سطور کے غیر میں نہ ملے گی اور ہزار ہا مسائل میں کام دے گی اور صدہا عقدوں کو حل کرے گی۔ کلمات اس کے موافق، مخالف سب طرح کے ملیں گے۔ مگر بحمد اللہ تعالیٰ حق اس سے متجاوز نہیں۔ فقیر طمع رکھتا ہے کہ اگر حضور سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کے حضور یہ تقریر عرض کی جاتی، ضرور ارشاد فرماتے کہ یہ عطر مذہب و طراز مذہب ہے۔ انتہیٰ کلامہ الشریف (ماخوذ از فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۱۷۳ تا ۱۷۵)

اسی طرح تیمم کے بارے میں اعلیٰ حضرت نے تین سو گیارہ امور بیان فرمائے، جن میں سے ایک سو اکیاسی سے تیمم جائز ہے اور ان ایک سو اکیاسی میں سے چوہتر وہ ہیں جنہیں فقہاء متقدمین نے بیان فرمایا اور ایک سو سات وہ ہیں جن کو اعلیٰ حضرت نے اپنے اجتہاد سے امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مذہب پر بیان فرمایا۔ اسی طرح ایک سو تیس اشیاء سے تیمم

کے عدم جواز کو بیان فرمایا، جن میں سے اٹھاون اشیاء فقہاء متقدمین نے بیان فرمائی ہیں اور بہتر اشیاء کا عدم جواز اعلیٰ حضرت نے اپنے استنباط سے امام اعظم رضی اللہ عنہ کے مذہب پر بیان فرمایا۔ (محصلہ از فتاویٰ رضویہ ج ا ص ۶۹۲ تا ۷۰۱)

ہم نے یہ دو مثالیں آپ کے سامنے پیش کی ہیں اور وہ بھی انتہائی اختصار اور اجمال کے ساتھ، ورنہ "فتاویٰ رضویہ" کے جہازی سائز کے بارہ ضخیم مجلدات اس قسم کی تحقیقات سے بھرے پڑے ہیں اور جن کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کے دماغ میں سیدنا امام اعظم رضی اللہ عنہ کی مجتہدانہ ذہانت ہے، آنکھوں میں خصاف کی ضیاء ہے، عقل ابوبکر رازی کی ہے اور حافظہ قاضی خاں کا معلوم ہوتا ہے۔

فقہاء کے پیمانے سے

فقہاء کی تعریف کے اعتبار سے فقہ کی تعریف اس شخص پر صادق آتی ہے جسے کم از کم تین فرعی مسائل حفظ ہوں۔ خواہ اس کے پیش نظر ان مسائل کے دلائل بھی ہوں یا ان کی بناء صرف اقوال مجتہدین پر ہو۔ اس اعتبار سے اعلیٰ حضرت کا فقہ میں بہت اونچا مقام ہے۔ تمام مسائل فرعیہ مع دلائل شرعیہ آپ کو ہمیشہ مستحضر رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا امجد علی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کی فتویٰ نویسی املاء کی صورت میں ہوتی تھی۔ تمام سوالات ایک ہی بار پڑھ کر سنا دیئے جاتے اور پھر آپ ان کا نمبروار جواب لکھواتے۔

(ملخص از دیباچہ فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ا)

مولوی محمد حسین میرٹھی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اعلیٰ حضرت کی عیادت کو گیا۔ آپ بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے، اس وقت گرداگرد چار لکھنے والے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاروں نے سوالات سنائے، پھر آپ نے چاروں کو بیک وقت جواب املاء کرانا شروع کیا۔ بایں طور کہ ایک جملہ پہلے کے لئے بولتے، پھر دوسرے لئے، تیسرے کے لئے اور پھر چوتھے کے لئے۔ چاروں اپنا اپنا جواب لکھتے رہتے۔ جب تک باقی تینوں کو املاء کراتے، پہلا لکھ چکتا، پھر اس سے ابتداء فرماتے۔ علیٰ ہذا القیاس چاروں کو بیک وقت جوابات لکھوائے۔

(محصلہ دیباچہ فتاویٰ رضویہ ج ۳ ص ا)

آپ کے فتاویٰ کا مجموعہ جو بارہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ بے شمار علمی تحقیقات کا گنجینہ ہے۔ اس میں بے شمار ایسے فتاویٰ موجود ہیں جن میں آپ نے مسئلہ کو نہ صرف دلائل سے مبرہن کیا بلکہ اقوال ائمہ سے بھی مزین کیا۔ مثلاً حرمت سجدہ تحیہ کے ثبوت میں آپ نے متعدد آیات، چالیس احادیث اور ڈیڑھ سو نصوص فقہیہ پیش فرمائی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کو دافع البلاء کہنے کے جواز پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور اس کو دو بابوں میں منقسم فرمایا، پہلے باب میں آیات اور ساٹھ حدیثیں ذکر فرمائیں اور دوسرے باب میں چوالیس آیتیں اور دو سو اٹھارہ حدیثیں ذکر فرمائیں۔ جواز استمداد پر تینتیس حدیثیں اور متعدد اقوال ذکر فرمائے۔ ''انوار الانتباہ'' میں ندائے یا رسول اللہ کے جواز پر احادیث کے علاوہ پینسٹھ اقوال علماء سے استشہاد فرمایا۔ غرضیکہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جملہ تصنیفات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ فقہ میں ایک عظیم مقام رکھتے تھے اور آپ نے مسائل کا استنباط اور استخراج دلائل شرعیہ اور اقوال ائمہ سے یکساں طور پر کیا ہے۔

فقہ صوفیاء کے آئینہ میں

متصوفین فقہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:

دنیا سے اعراض کرنا، آخرت کی طرف رغبت کرنا، دین پر بصیرت رکھنا، عبادت پر مداومت کرنا اور خلق خدا کو وعظ و نصیحت کرنا۔ آیئے! اب اس تعریف کے لحاظ سے اعلیٰ حضرت میں عکس فقہ دیکھئے۔

اعراض دنیا اور رغبت آخرت

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر علم و حکمت سے نوازا تھا اتنا ہی استغناء کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ جس وقت نام نہاد علماء اپنے علم و فضل کو جنس تجارت بنا کر حکام برطانیہ اور ہندو بنئوں سے نذرانے وصول کر رہے تھے اور اہل ثروت حضرات سے رابطہ قائم کر کے اپنی تصانیف کو کثیر تعداد میں چھپوا کر اپنے مبتدع عقائد کی ترویج و اشاعت کر رہے تھے، اس وقت اعلیٰ حضرت کی حمیت دینی کا یہ عالم تھا کہ حکام برطانیہ اور ہندو بنیئے تو بجائے خود رہے اپنے ہم مسلک اور معتقد نوابوں اور رئیسوں کی مسلسل

درخواستوں اور شدید تقاضوں کے باوجود کبھی ان سے ملاقات کے لئے جانا منظور نہیں کیا اور یہی فرمایا:

کروں مدح اہل دول رضا پڑے اس بلا میں میری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا میرا دین پارۂ ناں نہیں

آپ کے استغناء پر عظیم ترین شہادت یہ ہے کہ آپ کی بے شمار علمی تصانیف اور دینی تحقیقات آپ کی حیات مبارک میں طبع نہ ہو سکیں۔ حالانکہ بڑے بڑے رئیس آپ کے حلقہ ارادت میں داخل تھے۔ اگر آپ ارکان دولت کی طرف ذرا بھی توجہ اور التفات فرماتے تو کوئی وجہ ہی نہ تھی کہ آپ کی تمام تصانیف زیور طبع سے آراستہ نہ ہوتیں۔ اسی طرح آپ نے اپنے منصب کے شایان شان کوئی وسیع دارالعلوم بھی تعمیر نہیں کیا۔ حالانکہ دوسرے فرقہ والوں نے رئیسوں کے تعاون سے قلعہ نما مدارس بنا لئے، کیونکہ اس کام کے لئے نوابوں اور رئیسوں سے ملاقات، ان سے مروت ومحبت، ان کی خاطر ومدارت، عزت و تکریم ضروری ہے اور ان لوگوں میں فساق وفجار اور نیک وبد ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رضی اللہ عنہ کے مزاج وفطرت میں اللہ تعالیٰ نے زہد اور استغناء رکھا تھا۔ آپ سے یہ متصور ہی نہ تھا کہ کسی پاک باز دولت مند کی طرف بھی متوجہ ہوتے، چہ جائیکہ ہر کس وناکس کی طرف۔ صرف مال ودولت ہی نہیں دنیا کی ہر چیز سے آپ کو نفرت تھی اور دنیا کی جس شئے سے بھی آپ کو تعلق یا علاقہ رہا تو وہ دنیا کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ دین کے سبب سے تھا۔ چنانچہ آپ خود ایک موقع پر بطور تحدیث نعمت کے فرماتے ہیں کہ الحمد اللہ کہ میں نے مال من حیث ھو مال سے کبھی محبت نہ رکھی، صرف انفاق فی سبیل اللہ کے لئے اس سے محبت ہے۔ اسی طرح اولاد من حیث ھو اولاد سے بھی محبت نہیں، صرف اس سبب سے کہ صلۂ رحم عمل نیک ہے، اس کا سبب اولاد ہے اور یہ میری اختیاری بات نہیں، میری طبیعت کا تقاضا ہے۔ (الملفوظ حصہ چہارم ص ۷۶)

معلوم ہوا کہ زہد وتقویٰ کو آپ نے اس درجۂ کمال پر پہنچایا کہ وہ آپ کی طبیعت کا مقتضیٰ بن گیا اور جب انسان اپنی طبعی اور جبلی خواہشات کو فنا کر کے انہیں رضائے الٰہی کے

سانچے میں ڈھال لیتا ہے تو اسے فنا فی الذات کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ پس جب رضائے الٰہی اعلیٰ حضرت کی طبیعت کا اقتضاء بن گئی تو معلوم ہوا کہ آپ کو فنا فی الذات کا مرتبہ حاصل تھا۔ الحمد للہ علی ذالک

دین پر بصیرت

دین عقائد اور اعمال کا نام ہے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ ان دونوں پر مجددانہ بصیرت رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ کے زمانے میں جن عقائد و اعمال پر زائغین اور مبتدعین کے زیغ و بدعت کی دھند چھا گئی تھی، آپ نے علم ربانی اور نور یزدانی کی فیض آفرینیوں اور ضیاء پاشیوں سے اس دھند کو زائل کر کے حق کو صیقل کر دیا۔ جس طرح حضرت امام ربانی، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ اکبری کے قلع قمع کے لئے چن لیا تھا اسی طرح اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ نجدیت کے ابطال کے لئے منتخب فرما لیا۔ نجدی بدعات سے جو مسائل دھندلا چکے تھے، اعلیٰ حضرت نے ان کی آب و تاب کو زندہ فرمایا۔ استحالہ کذب باری تعالیٰ سبحانہ، ختم نبوت سید المرسلین، فضائل نبوت اور ناموس رسالت وغیرہ یہ وہ مسائل ہیں جنہیں مبتدعین اپنی اھواء باطلہ کا نشانہ بنا رہے تھے، اس طوفان بے تمیزی میں اعلیٰ حضرت غیرت دینی کی چٹان بن کر ابھرے اور بدعت کی طوفانی لہروں کا منہ پھیر دیا۔

عقائد اسلام کے جو ارکان مرجھا چکے تھے ان کے احیاء کے لئے آپ نے جو کتابیں تصنیف فرمائیں، ان میں چند یہ ہیں:

سبحان السبوح، تمہید ایمان، حسام الحرمین، الکوکبۃ الشہابیہ، خالص الاعتقاد، انباء المصطفیٰ، تجلی الیقین اور اعمال صالحہ کے احیاء کے لئے "فتاویٰ رضویہ" کی بارہ جلدیں آپ کی مجددانہ بصیرت پر شاہد عادل ہیں۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجددانہ شان کا اندازہ ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے کہ استحالہ کذب پر تمام متقدمین علماء نے پانچ دلیلیں ارقام فرمائی ہیں اور اکیلے اعلیٰ حضرت نے اصل مسئلہ پر پچیس دلیلیں قائم فرمائیں۔ چنانچہ "سبحان السبوح" ص ۱۵ پر تحریر فرماتے ہیں:

فقیر غفرلہ اللہ تعالیٰ بتوفیق مولیٰ سبحانہ وتعالیٰ ان مختصر سطور میں بلحاظ ایجاز کذب باری عزاسمہ کے محال صریح اور توہم امکان کے باطل قبیح ہونے پر صرف تیس دلیلیں ذکر کرتا ہے۔ جن میں خمسہ اولیٰ کلمات طیبات، ائمہ کرام، علماء عظام علیہم رحمۃ الملک المنعام میں ارشاد و انعام ہوئیں اور باقی پچیس باری اجل عزوجل کے فیوض ازل سے عبد ازل کے قلب پر القاء کی گئیں۔ والحمد للہ رب العالمین

یہ صرف ایک مثال ہے، ورنہ اعلیٰ حضرت کی تمام تحقیقی مجلدات اس شان افادیت سے مالا مال ہیں۔ جب آپ کسی مسئلہ پر رضوی جلال سے مدلل تقریر کرتے، یوں معلوم ہوتا کہ دلائل و براہین کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب ہے جو ہر نقش باطل کو مٹاتا چلا جائے گا۔ و ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔

عبادت پر مواظبت

اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ باوجود علمی، تبلیغی اور تصنیفی مصروفیات کے عبادت میں قدم راسخ رکھتے تھے۔ آپ نہ صرف فرائض و واجبات بلکہ مستحبات و نوافل، وظائف و اوراد، ذکر و اذکار، بیعت و ارشاد تمام شعبہ ہائے عبادت کو محیط تھے۔ بچپن سے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کو اس طرح اختیار فرمالیا تھا کہ تبلیغ و اشاعت کی طرح عبادت و ریاضت بھی آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی۔ چنانچہ "وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ" کے تحت اپنے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: بحمد اللہ مجھے بچپن سے دشمنان خدا سے نفرت رہی ہے، نہ صرف مجھے بلکہ میرے بچوں کے بچوں کو بھی ان سے عداوت ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوگیا۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ بحمد اللہ اگر قلب کے دو ٹکڑے کئے جائیں تو خدا کی قسم! ایک ٹکڑے پر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لکھا ہوگا اور دوسرے حصہ پر مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ تحریر ہوگا اور بحمد اللہ ہمیشہ ہر بد مذہب پر فتح حاصل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے روح القدس سے تائید فرمائی اور یہ سب حضرت جد امجد رضی اللہ عنہ کی برکات ہیں۔ قرآن کریم میں حضرت خضر علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ ایک مکان میں دو یتیم رہتے تھے۔ اس کی دیوار گرنے والی تھی جس کے نیچے ان کا خزانہ تھا۔ خضر علیہ السلام نے اس دیوار کو سیدھا کر دیا۔ اس

واقعہ کے بارے میں فرمایا: وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ''ان کا باپ صالح تھا''۔ جس کی برکت سے یہ رحمت کی گئی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ وہ باپ ان کی چودہویں پشت میں تھا۔ صالح باپ کی برکات کا اس طرح ثمرہ مرتب ہوتا ہے۔ یہاں تو ابھی تیسری ہی پشت ہے۔ دیکھیے کب تک اس سلسلہ میں برکات رہیں۔ اثناء گفتگو میں فرمایا: آٹھ دس برس ہوئے، رجب کے ماہ میں حضرت والد ماجد سے خواب میں مشرف بہ ملاقات ہوا۔ فرمایا: اے احمد رضا! اس بار رمضان میں تمہیں بیماری ہوگی، روزہ نہ چھوڑنا۔ بحمد اللہ جب سے روزے فرض ہوئے، کبھی نہ سفر میں نہ مرض میں کسی حالت میں روزہ نہ چھوڑا۔ اخیر رمضان میں بیمار ہوا اور بہت بیمار ہوا۔ لیکن بحمد اللہ روزے نہ چھوڑے۔

(محصلہ الملفوظ ج ۳ ص ۸۷ تا ۸۹)

وعظ و نصیحت

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ و ارشاد سے اللہ تعالیٰ نے بے شمار لوگوں کو ہدایت عطا فرمائی۔ کئی گم کردہ راہ آپ کے پند و نصائح سے صراط مستقیم اور جادۂ استقامت پر آ گئے۔ عقائد و اعمال ہر باب میں آپ نے خلق کی ہدایت فرمائی۔ ہم آپ کے سامنے صرف ایک مجلس کی تبلیغ کا اثر پیش کر رہے ہیں۔ صرف اسی سے آپ کی ساری عمر کے مواعظ ونصائح کی تاثیرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۸ رجب ۱۳۳۷ ہجری بروز جمعہ بوقت عصر آپ لوگوں کو بد مذہبوں کی صحبت سے احتراز کرنے پر وعظ فرما رہے تھے اور آپ کے ارشادات سن کر کتنے ہی آدمی اپنے افعال بدعت پر لعنت ملامت کر رہے تھے اور کبھی کسی گوشہ سے توبہ و استغفار کی بھی آواز آ جاتی تھی۔ اس وقت کسی صاحب نے اٹھ کر اپنے جلیس سے کہا کہ آپ کو بد مذہبوں کی صحبت میں اکثر دیکھا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت خوش قسمتی سے تشریف فرما ہیں، مناسب ہے توبہ کر لیجئے۔ یہ سنتے ہی وہ قدموں میں آ گرے اور صدق دل سے تائب ہوئے۔ اس پر ارشاد فرمایا: بھائیو! یہ نزول رحمت کا وقت ہے، سب حضرات اپنے اپنے گناہوں سے توبہ کریں جن کے گناہ خفیہ ہوں وہ خفیہ اور جن کے اعلانیہ ہوں وہ اعلانیہ، میری دعا ہے کہ اللہ

تعالیٰ آپ سب کو استقامت با کرامت عطا فرمائے۔ جو لوگ ڈاڑھی منڈواتے ہوں یا کترواتے ہوں یا ڈاڑھی چڑھاتے ہوں یا اس پر خضاب سیاہ لگاتے ہوں اور جو لوگ اس قسم کے دوسرے اعلانیہ گناہ کرتے ہوں، انہیں اعلانیہ توبہ کرنی چاہیے اور جنہوں نے پوشیدہ گناہ کئے ہوں، وہ اس کی پوشیدہ توبہ کریں، نجانے اعلیٰ حضرت کے ان چند فقرات میں خدا نے کیا تاثیر رکھی تھی کہ تمام لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور ایک کہرام سا مچ گیا۔ لوگ آنسوؤں کی بارش سے اپنے گناہوں کی سیاہی کو دھو رہے تھے اور بے تابانہ اعلیٰ حضرت کے قدموں میں گر گر کر اپنے ظاہری باطنی گناہوں سے توبہ کر رہے تھے اور اعلیٰ حضرت خود بھی گریہ وزاری سے بے حال ان لوگوں کے لئے دعائے مغفرت فرما رہے تھے، بعد میں اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ اس دن اٹھائیس لوگوں نے اپنے ظاہری گناہوں سے توبہ کی اور اکہتر آدمیوں نے اپنے باطنی گناہوں سے توبہ کی۔ (محصلہ الملفوظ ج ۲ ص ۱۳۱ تا ۱۳۶)

بحمد اللہ اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ اعلیٰ حضرت میں اعراض دنیا، رغبت آخرت، دینی بصیرت، عبادت پر مواظبت اور رشد و ہدایت تمام اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے اور انہیں اوصاف کے حامل شخص کو صوفیاء کی اصطلاح میں فقیہ کہتے ہیں اور ان اوصاف کے کمال سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کو اصطلاح تصوف کے اعتبار سے بھی فقہ میں بہت اونچا مقام حاصل تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ فقہ کی تین تعریفیں ہیں اور اعلیٰ حضرت تینوں اعتبار سے فقہ میں فائق مقام رکھتے ہیں۔ حفظ مسائل کے علیٰ وجہ الکمال حامل ہیں، علم و عمل اور زہد و تقویٰ کے بہترین جامع ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اہل علم نے کسی معنی کے اعتبار سے فقہ کا اطلاق نہیں کیا مگر اعلیٰ حضرت میں وہ معنی متحقق ہے۔ وللہ الحمد علیٰ ذالک

طبقات فقہاء

فقہ کی تعریف کے بعد اب ہم آپ کے سامنے طبقات فقہاء پیش کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے اعلیٰ حضرت کے فقہی مقام پر مزید روشنی پڑے گی۔

(۱) مجتہدین فی الشرع: یہ وہ لوگ ہیں جو قواعد و اصول مقرر فرماتے ہیں اور احکام فرعیہ کو اصول اربعہ سے مستنبط کرتے ہیں اور اصول و فروع میں کسی کے تابع نہیں

ہوتے۔ جیسے ائمہ اربعہ ہیں۔

(۲) مجتہدین فی المذہب: یہ صرف اصول میں امام کے تابع ہوتے ہیں اور ادلہ اربعہ سے فروع کے استخراج پر قدرت رکھتے ہیں اور مسائل فرعیہ میں بعض جگہ امام کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ جیسے اصحاب ابی حنیفہ وغیرہم (1)۔

(۳) مجتہدین فی المسائل: یہ اصول وفروع میں امام کے تابع ہوتے ہیں اور جن مسائل میں امام سے کوئی روایت نہیں ہوتی ان میں امام کے اصول کے مطابق استخراج کرتے ہیں۔

(۴) اصحاب تخریج: انہیں اجتہاد پر بالکل قدرت نہیں ہوتی۔ لیکن اصول اور اس کے ماخذ پر مکمل عبور ہوتا ہے۔ اس لئے یہ قول مجمل کی تفصیل پر قدرت رکھتے ہیں۔ جیسے ابوبکر رازی، جصاص اور کرخی وغیرہم۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

(۵) اصحاب ترجیح: یہ بعض روایتوں کو دوسری بعض روایتوں پر ترجیح دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جیسے ابوالحسن قدوری اور صاحب "ہدایہ" (رحمہم اللہ تعالیٰ)۔

(۶) ممیزین: یہ وہ لوگ ہیں جو روایات میں سے صحیح، اصح، قوی، ضعیف اور ظواہر ونوادر وغیرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان میں روایات کو باہم متمیز کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جیسے صاحب "کنز" اور صاحب "وقایہ" وغیرہما۔

(۷) محض مقلدین: یعنی وہ لوگ جنہیں امور مذکورہ میں سے کسی پر قدرت نہیں ہوتی۔

(ماخوذ از عقود رسم المفتی للشامی ص ۴۔۵)

طبقات فقہاء کی روشنی میں اعلیٰ حضرت

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ میں پہلے چھ طبقوں میں سے ہر طبقہ کی بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت میں مجتہدین فی المسائل کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ آپ کے زمانہ میں جو ایسے نئے مسائل پیدا ہوئے جن پر

1۔ اصحاب ابی حنیفہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) سے مراد امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر وغیرہم ہیں (رحمہم اللہ)۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی روایت موجود نہ تھی، آپ نے اصول و فروع میں اتباع امام اعظم کے ساتھ ان تمام مسائل کا استخراج کیا۔ "فتاویٰ رضویہ" کی بارہ جلدوں میں اس کی کثرت امثلہ موجود ہیں۔

اعلیٰ حضرت کی فقہی تحقیقات

فقہ کی تعریف اور طبقات فقہاء بیان کرنے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کی فقہی تحقیقات کی چند مثالیں پیش کی جائیں۔ جن سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے فقہی مقام کی ایک جھلک سامنے آجائے۔ آپ کی فقہی تحقیقات مختلف انواع پر منقسم ہیں۔ بعض مسائل میں انہوں نے فقہاء متقدمین کی عبارتوں میں اضطراب کو رفع کر کے تطبیق بین الاقوال فرمائی ہے۔ بعض مواقع پر جو گوشے متقدمین کی نظر سے مخفی رہ گئے ہیں انہیں اجاگر کر کے حق کو آشکارا کیا ہے۔ معاصر فقہاء میں جن حضرات نے فقہی مسائل میں لغزشیں کھائی ہیں ان پر ان گنت وجوہ سے متنبہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار (عنوان) ہیں جن کی وقت اجازت نہیں دیتا۔ فی الحال ہم زیر نظر تین عنوانوں پر گفتگو کرتے ہیں۔

تطبیق بین الاقوال

وضو میں بلاسبب پانی خرچ کرنے کے بارے میں فقہاء متقدمین کی عبارتوں میں زبردست اختلاف اور اضطراب پایا جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ حلبی نے "غنیۃ" میں اور علامہ طحطاوی نے "شرح درمختار" میں بلاسبب پانی خرچ کرنے کو حرام قرار دیا۔ مدقق علائی نے "درمختار" میں مکروہ تحریمی بتایا۔ "البحر الرائق" نے اس کو مکروہ تنزیہی قرار دیا۔ محقق علی الاطلاق امام ابن ہمام نے "فتح القدیر" میں خلاف اولیٰ ہونے پر جزم کیا۔ غرضیکہ اسراف فی الوضو کے بارے میں فقہاء کے چار قول ہیں: حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ اور بظاہر یہ چاروں متضاد اقوال ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے کمال تحقیق سے ان چاروں اقوال کے علیحدہ علیحدہ محمل بیان کئے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حرام: وضو میں سنت سمجھ کر بلاضرورت پانی خرچ کیا جائے۔

مکروہ تحریمی: بلا اعتقاد سنیت و بلاضرورت وضو میں پانی اس طرح خرچ کرے کہ وہ پانی

ضائع ہو۔

مکروہ تنزیہی: نہ سنیت کا عقیدہ ہو نہ پانی ضائع کرنے کا ارادہ، لیکن عادتاً بلاضرورت پانی خرچ کرتا ہو۔

خلاف اولیٰ: نہ اعتقادِ سنیت ہو نہ اضاعت ہو نہ بلاضرورت خرچ کی عادت ہو، بلکہ نادراً بلا ضرورت پانی خرچ کرے۔

اس تحقیق کے بعد مزید اضافہ کے طور پر فرمایا کہ اگر ان چاروں وجہ کے علاوہ کسی غرض صحیح سے وضو میں تین تین دفعہ سے زیادہ پانی خرچ کیا تو وہ بلاشبہ جائز اور صحیح ہے اور اس کی چار صورتیں بیان فرمائیں۔

(۱) بدن سے گندگی اور میل کا ازالہ اور تنظیف کی خاطر تین مرتبہ سے زیادہ دھویا جائے۔

(۲) شدت گرمی سے بچنے اور بدن کو ٹھنڈک پہنچانے کی غرض سے تین بار میں زیادتی کی جائے۔

(۳) دو یا تین میں شک پڑ جائے تو ازالہ ریب کی خاطر مقدار اقل پر بناء کر کے ایک بار اور دھوئے۔

(۴) وضو نور علی نور کے قصد سے تین مرتبہ سے زیادہ دھوئے۔

الغرض تطہیر کے قصد سے اگر تین مرتبہ دھونے پر زیادتی کرے تو اس کی چار صورتیں ہیں اور وہ حرام، مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی اور خلاف اولیٰ کا حکم رکھتی ہیں اور ان صورتوں کے بغیر اگر غرض صحیح سے بمطابق مؤخر الذکر چار صورتوں کے زیادتی کی جائے تو بلا کراہت جائز اور بلا ریب صحیح ہے۔ (محصلہ فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۱۶۶ تا ۲۰۸)

سید طحطاوی اور اعلیٰ حضرت

فقہاء کرام کا ضابطہ ہے کہ جو چیز بیماری کے سبب جسم سے خارج ہو اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ درمختار میں ہے:

وکذا کل مایخرج من وجع ولو من اذن او ثدی او سرۃ۔	نواقض وضو میں سے ہر وہ شئی ہے جو کسی بیماری کے سبب سے خارج ہو، اگرچہ کان،

پستان یا ناف سے ہی خارج ہو۔

اس قاعدہ پر علامہ سید طحطاوی نے یہ مسئلہ متفرع کیا کہ زکام سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ کیونکہ زکام میں بیماری کے سبب پانی ناک سے خارج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ''درمختار'' کے حاشیہ میں فرماتے ہیں:

ظاهره يعم الانف اذا زكم۔ اس عبارت کا ظاہر ناک کو بھی شامل ہے جب کہ زکام ہو جائے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ زکام سے وضو نہیں ٹوٹتا اور سید احمد طحطاوی پر یہ بات مخفی رہ گئی کہ فقہاء کا مذکور قاعدہ مطلقاً نہیں ہے۔ بلکہ اس صورت میں ہے کہ جب بیماری کے سبب سے جو چیز بدن سے خارج ہوئی اس میں خون یا پیپ کی آمیزش کا شائبہ ہو، چنانچہ منیہ، غنیہ، حلیہ، تحفہ، کافی، البحر الرائق، تبیین الحقائق، خلاصہ وجیز، فتح القدیر، وغیرہا کتب فقہ میں اس تقیید پر تصریح موجود ہے۔ قاعدہ مذکورہ کی وضاحت کے علاوہ اعلیٰ حضرت نے زکام سے وضو نہ ٹوٹنے پر دو مستقل دلیلیں ارقام فرمائیں، ہم ان کی تلخیص ہدیہ ناظرین کرتے ہیں:

(۱) فقہاء کرام نے تصریح فرمائی ہے کہ بلغمی رطوبات خواہ دماغ سے نازل ہوں یا پیٹ سے صاعد ہوں، طاہر ہیں۔ ان کا خروج ناقص وضو نہیں ہے اور زکام میں ناک کے راستے سے بلغمی رطوبات کا اخراج ہوتا ہے۔ پس ان کا خروج نقض وضو کا سبب نہیں ہے۔

(۲) فقہاء کرام کا قاعدہ ہے کہ نجاست کا خروج موجب حدث ہے اور جو نجس بالخروج نہ ہو وہ حدث نہیں ہے اور زکام کی رطوبات چونکہ نجس بالخروج نہیں ہیں اس لئے وہ موجب حدث نہیں ہیں۔ (خلاصہ فتاویٰ رضویہ ج ۱ ص ۳۴ تا ۴۰)

علامہ شامی اور اعلیٰ حضرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں اذان دی ہے یا کہ نہیں، بعض علماء نے کہا کہ آپ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی تھی، کیونکہ امام ترمذی کی روایت سے اسی طرح

ثابت ہے اور بعض علماء نے اس استدلال کو رد کر دیا، کیونکہ طریق ترمذی سے امام احمد نے روایت کیا کہ حضور نے حضرت بلال کو اذان کا حکم دیا تھا۔ پس روایت ''ترمذی'' میں حضور کی طرف اذان کا اسناد الی المسبب کے قبیل سے ہے۔ لہٰذا آپ کا اذان دینا ثابت نہ ہوا۔
چنانچہ علامہ شامی ''ردالمحتار'' ج ا ص ۲۷۳ پر فرماتے ہیں:

و مما یکثر السوال عنه هل باشر النبی ﷺ الاذان بنفسه و قد اخرج الترمذی انه علیه السلام اذن فی سفر و صلی باصحابه و جزم به النووی و لکن وجد فی مسند احمد من هذا الوجه فامر بلالا فاذن فعلم ان فی روایة الترمذی اختصارا و ان معنی قوله اذن امر بلالاً۔

عام طور پر لوگ پوچھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خود اذان دی ہے یا نہیں اور امام ترمذی نے روایت کی کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی تھی اور اس پر امام نووی نے اعتماد کیا۔ لیکن امام احمد نے اسی طریق سے روایت کیا ہے کہ حضور نے حضرت بلال کو اذان دینے کا امر فرمایا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ روایت سابقہ کا بھی یہی محمل ہے۔

اس مقام پر علامہ شامی نے ملا علی قاری اور دوسرے علماء کی طرح اس پر جزم کیا کہ حضور ﷺ نے اذان نہیں دی اور ''ترمذی'' کی روایات میں اسناد مجازی ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی تحقیق یہ ہے کہ حضور ﷺ نے سفر میں ایک مرتبہ اذان دی ہے اور اس کو اسناد مجازی پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ''تحفۂ امام ابن حجر مکی'' میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ سفر میں اذان دی اور اذان کے تشہد میں فرمایا کہ ''اشهد انی رسول الله'' ''میں گواہی دیتا ہوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں'' اور یہ نص مفسر ہے کہ جو کسی تاویل کی گنجائش نہیں رکھتی، کیونکہ اگر آپ نے اذان خود نہ فرمائی ہوتی تو ''اشهد انی رسول الله'' کے بجائے ''اشهد ان محمداً رسول الله'' کے الفاظ وارد ہوتے اور علامہ شامی نے خود ج ا ص ۲۷۴ پر ''تحفہ'' کی اس روایت کو ذکر کر کے اس کی صحت کو بیان کیا ہے۔

(فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۳۴۴ مع توضیح)

مولوی عبدالحی لکھنوی اور اعلیٰ حضرت

علماء احناف کے نزدیک سود کے تحقق کے لئے اتحاد قدر و جنس شرط ہے۔ یعنی دو چیزیں جب پیمانہ یا وزن میں برابر ہوں اور ان کی جنس ایک ہو تو ان کا تفاضل حرام ہے اور جو چیزیں کیل و موزون کے قبیل سے نہ ہوں بلکہ عددی ہوں، مثلاً انڈے یا پیسے تو ان میں تفاضل جائز ہے کیونکہ ان میں سود کی علت یعنی قدر مذکور متحقق نہیں ہے۔ بناء بریں نوٹ بھی چونکہ فلوس (پیسوں) کی طرح عددی ہے، لہٰذا اس میں بھی تفاضل جائز قرار پایا۔ مولانا عبدالحی لکھنوی اس اصول سے تو متفق ہیں کہ عددی چیزوں میں سود نہیں ہوتا۔ چنانچہ فلوس (پیسوں) میں وہ بھی وہ کہتے ہیں کہ تفاضل جائز ہے۔ لیکن نوٹ میں ان کا اختلاف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نوٹ میں تفاضل حرام ہے اور سود خالص ہے۔ چنانچہ انہوں نے نوٹ میں سود کے تحقق پر ایک فتویٰ تحریر کیا۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ فتویٰ آیا تو آپ نے اس فتویٰ کو ایک سو بیس وجوہ سے رد کر دیا۔ ہم آپ کے سامنے مولوی عبدالحی کا فتویٰ اور اس پر اعلیٰ حضرت کے ایک سو بیس وجوہ ابطال میں سے چند وجوہ پیش کرتے ہیں، جس کے مطالعہ سے اعلیٰ حضرت کا فقہی تدبر اور وسعت نظر قارئین کے سامنے آجائے گی۔

فتویٰ (ھو المصوّب)

نوٹ ہر چند کہ خلقتاً ثمن نہیں۔ مگر عرفاً حکم ثمن میں ہے، بلکہ عین ثمن سمجھا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اگر نوٹ سو روپیہ کا کوئی ہلاک کر دے تو اصل مالک سو روپیہ تاوان لیتا ہے اور سو روپے کا نوٹ جب بیچا جاتا ہے تو مقصود اس سے قیمت ملنا اس کاغذ کی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ وہ کاغذ دو پیسے کا بھی نہیں ہے، بلکہ مقصود سو روپے کا بیچنا اور اس کی قیمت لینا ہوتا ہے اور نوٹ سو روپیہ کا اگر کوئی شخص قرض لے لو تو بوقت ادا خواہ نوٹ سو روپے کا دیوے، یا سو روپے دیوے دونوں امر مساوی سمجھے جاتے ہیں اور دائن کو کسی کے لینے میں مدیون سے عار نہیں ہوتا۔ حالانکہ اگر مدیون غیر جنس بوقت ادا دیوے تو دائن نہیں لیتا۔ بخلاف پیسوں کے کہ وہ بھی اگرچہ عرفاً ثمن ہیں، مگر یہ کیفیت ان کی نہیں ہے۔ اگر ایک روپے کے عوض میں کوئی چیز خرید لے یا ایک روپیہ کسی سے قرض لے اور وقت ادا پیسے ایک

روپے کے دیوے تو دائن اور فروخت کنندہ کو اختیار رہتا ہے کہ وہ لے یا نہ لے۔ پس پیسے اگر چہ عرفاً ثمن خلقی نہیں سمجھے گئے ہیں۔ بخلاف نوٹ کے کہ یہ عین ثمن خلقی ہے گو عینیت خلقیہ نہیں، بلکہ عینیت عرفیہ ہے۔ پس تفاضل بیع فلوس میں جائز ہونے سے یہ نہیں لازم کہ نوٹ میں بھی جائز ہو جائے کیونکہ پیسے غیر جنس ثمن ہیں، حقیقتاً بھی اور عرفاً بھی۔ گو بوجہ اصطلاح اور عرف کے اس میں صفت ثمنیت آ گئی ہو۔ پس ہر گاہ نوٹ عرفاً جمیع احکام میں ثمن خلقی سمجھا گیا۔ باب تفاضل میں اسی بناء پر حکم دیا جائے گا اور تفاضل اس میں حرام ہوگا۔ (فتاویٰ عبدالحی ج ۲ فتاویٰ ۲۶)

علامہ عبدالحی کی دلیل کا ماحصل یہ ہے کہ ثمن خلقی یعنی سونا چاندی میں بوجہ موزون ہونے کے تفاضل حرام ہے اور نوٹ بھی ثمن خلقی یا اس کے حکم میں ہیں، اس وجہ سے اس میں بھی تفاضل حرام ہے۔ نوٹ کے ثمن خلقی (سونا چاندی) ہونے پر انہوں نے یہ دلیل دی کہ سو کا نوٹ ہلاک کر دینے پر سو چاندی کے روپے دینے پڑتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ نوٹ ثمن خلقی یعنی عین چاندی ہے۔ نیز انہوں نے کہا کہ پیسے ثمن عرفی ہیں۔ ان میں تفاضل جائز ہے اور پیسوں کے ثمن عرفی ہونے پر یہ دلیل دی کہ کوئی شخص کسی کو ایک چاندی کا روپیہ ادھار دیتا ہے تو ادائیگی کے وقت اگر اسے ایک روپیہ کے بجائے ایک روپیہ کے پیسے دیئے جائیں تو وہ امر کا مجاز ہے کہ وہ اپنے روپوں کے بجائے ان پیسوں کو قبول نہ کرے۔

مولانا عبدالحی صاحب کی دلیل کا رکن اول یہ ہے کہ نوٹ ثمن خلقی (سونا چاندی) یا اس کے حکم میں ہے۔ بہر حال نوٹ کا بعینہٖ سونا چاندی ہونا تو بداہۃً باطل ہے، کیونکہ نوٹ اور سونا چاندی دونوں میں ذاتیات اور عوارض کے اعتبار سے تباین ہے۔ رہا اس کے حکم میں ہونا تو اس پر اعلیٰ حضرت نے کثیر وجوہ سے کلام کیا۔ از اں جملہ یہ ہے کہ نوٹ کے لئے سونا چاندی کے جمیع احکام ثابت ہیں یا فی الجملہ مثلاً تمول وغیرہ۔ اگر جمیع احکام مراد ہوں تو قطعاً باطل ہے کیونکہ سونے چاندی کے زیورات برتن اور لباس ہائے فاخرہ وغیرہ بنائے جاتے ہیں اور نوٹ کا نہ کوئی لباس بنتا ہے، نہ زیور، نہ برتن اور اگر بعض احکام کے اعتبار سے یہ سونے چاندی کے حکم میں ہے کہ جس طرح سونا چاندی مال و دولت ہے اسی طرح نوٹ بھی

مال و دولت ہے تو یہ حکم پیسوں میں بھی مشترک ہے۔ کیونکہ پیسے بھی مال و دولت ہیں، پھر نوٹ میں تفاضل کا حرام ہونا اور پیسوں میں جائز ہونا یہ ترجیح بلا مرجح ہے۔

دلیل کا رکن ثانی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا سو روپیہ کا نوٹ پھاڑ دے تو اسے سو روپے (چاندی) کے دینے پڑیں گے، معلوم ہوا کہ بعینہٖ ثمن خلقی یعنی چاندی ہے (یہ اس وقت کی بات ہے جب چاندی کا روپیہ ڈھلتا تھا، اب تو اس دلیل کا بطلان اور واضح ہو گیا۔ سعیدی) پس معلوم ہوا کہ نوٹ چاندی کا عین ہے، کیونکہ وہ تاوان میں نوٹ کے عوض چاندی کے روپیہ لے رہا ہے۔

الجواب: اس طرح تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ نوٹ گھوڑے کا بھی عین ہے، کیونکہ اگر کوئی کسی کا سو روپیہ کا گھوڑا ہلاک کر دے تو مالک تاوان میں اس سے سو کا نوٹ لے گا۔ معلوم ہوا کہ نوٹ گھوڑے کا عین ہے، کیونکہ وہ تاوان میں گھوڑے کے عوض نوٹ لے رہا ہے۔ ثانیاً یہ اصول ہی غلط ہے کہ سو کا نوٹ ضائع کر دینے پر سو (چاندی کے) روپے دینے واجب ہوں گے۔ کیونکہ جائز ہے کہ وہ اسے تاوان کی صورت میں سو کا دوسرا نوٹ ہی دے دے یا ایک ایک کے سو نوٹ دے یا اٹھنی، چونی اور پیسوں کی شکل میں اسے سو روپیہ پورے کر دے۔

دلیل کا رکن ثالث یہ ہے کہ پیسے ثمن عرفی ہیں۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کو ایک روپیہ ادھار دے تو اسے حق ہے کہ وہ اس کے بدلے میں ایک روپے کے پیسے قبول نہ کرے۔

الجواب: مولوی عبدالحی صاحب کی خیالی دنیا میں ممکن ہے یہ رواج ہو، ورنہ واقع اور نفس الامر میں ایسا کوئی قانون رائج نہیں ہے۔ ایک روپیہ اور سو نئے پیسے کی مالیت میں فرق کرنا نہ صرف یہ بداہتاً باطل ہے بلکہ انتہائی مضحکہ خیز۔ فتاویٰ مذکور میں مولانا عبدالحی صاحب کو ایک شبہ لاحق ہوا ہے کہ اگر نوٹ میں تفاضل جائز رکھا جائے تو لوگ سود کے کاروبار کے لئے نوٹ میں تفاضل کے جواز کو حیلہ بنالیں گے اور نوٹ کے حیلہ سے سود کھانا شروع کر دیں گے۔

الجواب: یہ شبہ مشترک ہے، کیونکہ پیسوں میں تفاضل کے جواز کو آپ بھی مانتے ہیں،

پس جنہیں سود کھانا ہوگا وہ پیسوں کے حیلہ سے سود کھانا شروع کر دیں گے۔

(ماخوذ از کفل الفقیہ ص ۱۳۴ تا ۱۶۵)

جناب مولوی عبدالحی لکھنوی کے زیر نظر فتویٰ پر اعلیٰ حضرت نے ایک سوبیس وجوہ سے گرفت کی ہے، ہم نے ان میں سے کل پانچ وجوہ پیش کی ہیں، تفصیل کے لئے اصل کتاب کا مطالعہ فرمائیں، ہم نے یہاں پر اس کی ایک جھلک دکھلائی ہے۔ جس سے آپ کی فقہی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ تمام معاصرین پر آپ کی زبردست ہیبت طاری تھی۔ کیونکہ اس رسالہ کی اسی وقت طباعت ہوگئی تھی اور آج تک کوئی اس کا جواب نہ دے سکا۔

رشید احمد گنگوہی اور اعلیٰ حضرت

رشید احمد گنگوہی کی تحقیق یہ ہے کہ نوٹ اس سونے چاندی کی رسید ہے جو حکومت کے پاس محفوظ ہے اور یہ نوٹ سونا چاندی بھی ہے نیز نوٹ پر زکوٰۃ واجب ہے کیونکہ یہ مبیع نہیں ہے، اپنی اس تحقیق کو گنگوہی صاحب نے ایک فتویٰ میں بیان کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے ان کی اصل تحقیق کا بیس وجوہ سے رد کیا ہے۔ ہم قارئین کی ضیافت طبع کے لئے رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ اور اس پر اعلیٰ حضرت کے کلام کا کچھ حصہ پیش کرتے ہیں۔ رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

نوٹ وثیقہ اوس روپے کا ہے جو خزانہ حاکم میں داخل کیا گیا ہے مثل تمسک کے۔ اس واسطے نوٹ میں نقصان آجاوے تو سرکار سے بدلا سکتے ہیں۔ اگر گم ہو جاوے بشرط ثبوت اس کا بدل لے سکتے ہیں۔ اگر نوٹ مبیع ہوتا تو ہرگز مبادلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ دنیا میں کوئی مبیع بھی ایسا ہے کہ بعد قبض مشتری کے نقصان یا فنا ہو جاوے تو بائع سے بدل لے سکیں۔ پس اس تقریر سے آپ کو واضح ہو جائے گا کہ نوٹ مثل فلوس کے نہیں ہے۔ فلوس مبیع ہے اور نوٹ نقدین۔ ان میں زکوٰۃ نہیں، اگر بہ نیت تجارت نہ ہوں اور نوٹ تمسک ہے، اوس پر زکوٰۃ ہو گی، اکثر لوگوں کو شبہ ہو رہا ہے کہ نوٹ کو مبیع سمجھ کر زکوٰۃ نہیں دیتے، کاغذ کو مبیع سمجھ رہے ہیں۔ یہ غلطی ہے۔ فقط بندہ رشید احمد گنگوہی۔ (فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۱۲۶)

اعلیٰ حضرت نے جو اس فتویٰ پر کلام کیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ اولاً نوٹ کو رسید قرار

دینا بدلہتا باطل ہے۔ کیونکہ رسید کسی معین شخص یا ادارہ کی طرف سے کسی معین شخص یا ادارے کے لئے ہوتی ہے۔ مثلاً زید نے مال کی رسید دی ہے تو اب اس رسید کی رو سے صرف زید مال دینے کا ذمہ دار ہے۔ نہ کہ ہر کس و ناکس جس کو بھی رسید دی جائے وہ اس رسید پر مال ادا کر دے، بخلاف نوٹ کے کہ ہر ملک، ہر شہر، ہر قصبہ و دیہات میں اس کے عوض اس کی مالیت کے مطابق رائج سکہ مل جائے گا۔ جس طرح مال کی ہر جگہ قیمت لگتی ہے اسی طرح نوٹ کی ہر جگہ قیمت لگتی ہے۔ معلوم ہوا کہ نوٹ مال کی رسید نہیں، بلکہ خود مال متقوم ہے، بیچا اور خریدا جاتا ہے۔

ثانیاً: یہ فتویٰ خود متناقض لنفسہٖ ہے۔ کیونکہ پہلے کہا کہ یہ نقدین (سونا چاندی) کی رسید ہے۔ چند سطر بعد کہا کہ یہ خود نقدین ہے۔

ثالثاً: نوٹ کو تمسک قرار دیا اور اس پر زکوٰۃ بھی لازم کر دی، حالانکہ زکوٰۃ مال پر ہوتی ہے اور تمسک مال نہیں ہے۔

رابعاً: نوٹ کے مبیع نہ ہونے پر زکوٰۃ کی بناء کی ہے۔ گویا مبیع پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ فلہٰذا وہ تمام تجار جن کے پاس لاکھوں روپے کا بکاؤ مال ہوتا ہے، زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہو گئے۔

خامساً: کاغذ کو مبیع ہونے کے منافی قرار دیا، کیا کاغذ کی دنیا میں خرید و فروخت نہیں ہوتی، یا مولوی صاحب کے گاؤں میں ابھی تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ کاغذ بھی بکتا ہے؟

(ماخوذ از کفل الفقیہ ص ۱۲۳ تا ۱۳۳)

اشرف علی تھانوی اور اعلیٰ حضرت

اشرف علی تھانوی صاحب سے کسی نے پوچھا کہ جس طرح اذان میں نام مقدس پر انگوٹھے چومے جاتے ہیں، کیا اس طرح اقامت میں بھی نام اقدس پر انگوٹھے چومنا جائز ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اقامت تو بجائے خود اذان میں بھی انگوٹھے چومنا جائز نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے اس جواب کو تیس سے زائد وجہ سے رد کیا۔ ہم ذیل میں تھانوی صاحب کا فتویٰ اور اس پر اعلیٰ حضرت کے تعاقب کی ایک جھلکی پیش کرتے ہیں۔

فتویٰ

اول تو اذان ہی میں انگوٹھے چومنا کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں اور جو کچھ بعض لوگوں نے اس بارے میں روایت کیا ہے وہ محققین کے نزدیک ثابت نہیں۔ چنانچہ شامی بعد نقل اس عبارت کے لکھتے ہیں:

"و ذکر ذالك الجراحی و اطال ثم قال و لم یصح فی المرفوع من کل هذا شیء" انتهٰی (شامی ج ۱ ص ۲۶۷) مگر اقامت میں تو کوئی ٹوٹی پھوٹی روایت بھی موجود نہیں ہے۔ پس اقامت میں انگوٹھے چومنا اذان کے وقت سے بھی زیادہ بدعت و بے اصل ہے، اسی واسطے فقہاء نے اس کا بالکل انکار کیا ہے، یہ عبارت شامی کی ہے:

و نقل بعضهم ان القهستانی هامش نسخة ان هذا مختص بالاذان واما فی الاقامة فلم یوجد بعد الاستقصاء التام ص ۲۶۷ ج ۱۔

(فتاویٰ امدادیہ ج ۴ ص ۵۷)

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا تعاقب ملاحظہ فرمایئے:

(۱) تقبیل ابہامین حدیث موقوف سے ثابت ہے کہ اس باب میں کوئی صحیح مرفوع حدیث وارد نہیں اور جب تقبیل ابہامین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ثابت ہے تو یہ عمل کے لئے کافی ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدین کی اطاعت کو لازم قرار دیا ہے۔

(۲) صحیح حدیث کی نفی سے معتبر حدیث کی نفی سمجھ لینا، جیسا کہ تھانوی صاحب نے اس فتویٰ میں کہا کہ تقبیل فی الاذان کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں ہے، فن حدیث سے جہالت پر مبنی ہے۔ کتب رجال میں جا بجا مذکور ہے "یعتبر به ولا یحتج به" اور فضائل اعمال میں احادیث معتبرہ بالاجماع کافی ہیں۔ اگرچہ صحیح بلکہ حسن بھی نہ ہوں۔

(۳) تھانوی صاحب نے اذان میں انگوٹھے چومنے کو بدعت قرار دیا۔ حالانکہ جس جگہ کی عبارت نقل کی ہے اس سے متصل شامی نے بیان کیا کہ اذان میں انگوٹھے چومنا مستحب ہے اور استحباب کو قہستانی نے "فتاویٰ صوفیہ" اور "کنز العباد" سے بھی نقل کیا۔

ملاحظہ ہو:

یستحب ان یقال عند سماع الاولی من الشهادة صلی الله علیك یا رسول الله و عند الثانیة فیها قرة عینی بك یا رسول الله ثم یقول اللهم متعنی بالسمع والبصر بعد وضع ظفر الابهامین علی العینین فانه علیه السلام قائدا له الی الجنة۔ کذا فی کنز العباد اه لقهستانی ونحوه فی الفتاوی الصوفیه۔

جب اذان میں پہلی دفعہ ”اشھد ان محمداً رسول الله“ سنے تو کہے: ”صلی الله علیك یا رسول الله“ اور جب دوسری بار سنے تو کہے: ”قرة عینی بك یا رسول الله“۔ پھر دونوں انگوٹھے آنکھوں پر رکھنے کے بعد کہے: ”اللھم متعنی بالسمع والبصر“۔ پس اس شخص کی نبی ﷺ جنت میں قیادت فرمائیں گے۔ اسی طرح ”کنز العباد قہستانی“ اور ”فتاویٰ صوفیہ“ میں ہے۔

اس عبارت کو تھانوی صاحب گول کر گئے، تاکہ اذان میں انگوٹھے چومنے کو بدعت قرار دینے کا جواز پیدا ہو سکے اور قہستانی کی وہ مجہول نقل ذکر کر دی جس میں انہوں نے یہ ذکر کیا کہ مجھے اقامت میں انگوٹھے چومنے کی روایت نہیں ملی۔

(۴) تھانوی صاحب نے سلب کلی کر دیا کہ اذان میں تقبیل کسی معتبر روایت سے ثابت نہیں۔ حالانکہ ایک ہزار سے زیادہ کتب فقہ میں یہ روایت موجود ہے۔

(۵) قہستانی کی نقل مجہول ہے اور خود شامی نے ج ۲ ص ۵۱۲ پر تصریح کی ہے: نقل مجہول مقبول نہیں ہوتی۔ ”لا یکفی النقل الجهالة“۔

(۶) علی التنزل اگر اس نقل کو قبول کر بھی لیا جائے تو یہ نفی روایت ہے، روایت نفی تو نہیں ہے اور تھانوی صاحب کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ نفی ثابت کرنے کے لئے روایت نفی کی ضرورت ہے، نفی روایت کی نہیں۔

کسی فعل کو مکروہ ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس فعل پر نہی خاص موجود ہو۔ علامہ شامی فرماتے ہیں:

لا یلزم منه ان یکون مکروھا الا بنھی خاص لان الکراھۃ حکم شرعی فلا بدلہ من دلیل۔ (ردالمحتار ج ا ص ۶۸۴)

بغیر نہی خاص کے کوئی فعل مکروہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ کراہت حکم شرعی ہے۔ اس کے لئے دلیل خاص ضروری ہے۔

پس اقامت میں تقبیل سے روکنے کے لئے نہی بالخصوص ضروری ہے و بدونہ خرط القتاد۔ محض ثبوت کی روایت کا نہ ملنا اس کی کراہت کے لئے کافی نہیں۔ صاحب ''البحر الرائق'' فرماتے ہیں:

لا یلزم من ترك المستحب ثبوت الکراھۃ اذ لا بدلھا من دلیل خاص۔

ترک مستحب سے کراہت لازم نہیں آتی، کیونکہ اس کے لئے دلیل خاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

پس منفی روایات سے کچھ نہیں بنتا، جب تک کہ روایت نفی نہ ہو۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۱۷۶)

اقامت میں نام اقدس سن کر انگوٹھے چومنا نام اقدس کی تعظیم ہے اور اس کا منشاء بھی موجود ہے۔ پس اقامت میں نام اقدس سن کر انگوٹھے چومنا ادب و تعظیم کے قبیل سے ہے۔

محقق علی الاطلاق ابن ہمام فرماتے ہیں:

کل ما کان دخل من الادب والاجلال کان حسنا۔

ہر وہ کام جو ادب اور تعظیم میں داخل ہو، حسن ہے۔

امام ابن حجر مکی ''جوہر منظم'' میں فرماتے ہیں:

تعظیم النبی ﷺ بجمیع انواع التعظیم التی لیس فیھا مشارکۃ اللہ تعالٰی فی الالوھیۃ امر مستحسن عند من نور اللہ ابصارھم۔

تمام انواع تعظیم سے نبی ﷺ کی تعظیم کرنا، جن میں اللہ تعالٰی کی الوہیت میں مشارکت نہ ہو، اہل بصیرت کے نزدیک امر مستحسن ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ اذان میں تقبیل مذکور ثابت ہے اور اقامت میں جائز اور مستحسن ہے۔ جائز اس لئے ہے کہ اس کی نفی ثابت نہیں ہے اور مستحسن اس وجہ سے ہے کہ یہ تعظیم رسول کا ایک فرد ہے اور تعظیم رسول کم از کم مستحسن ہے۔

(محصلہ فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۳۸۳ تا ۳۹۶)

خلیل احمد انبیٹھوی اور اعلیٰ حضرت

مولوی خلیل احمد انبیٹھوی نے "براہین قاطعہ" مصدقہ گنگوہی میں سنت اور بدعت کا فقہی ضابطہ بڑے فخر کے ساتھ اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اسی ضابطہ کا کئی وجہ سے احتساب کیا ہے۔ ہم انبیٹھوی صاحب کا ضابطہ بیان کرنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے احتساب کا کچھ ملخص پیش کریں گے۔

مولوی انبیٹھوی صاحب لکھتے ہیں:

حاصل یہ ہوا کہ جس کے جواز کی دلیل قرون ثلاثہ میں ہو، خواہ وہ جزئیہ بوجوہ خارجی ان قرون میں ہو یا نہ ہو اور خواہ اس کی جنس کا وجود خارج میں ہو یا نہ ہو وہ سب سنت ہے اور جو بوجہ شرعی ان قرون میں موجود ہے اور جس کے جواز کی دلیل نہیں، تو خواہ ان قرون میں بوجوہ خارجی ہو یا نہ ہو وہ سب بدعت ضلالت ہے۔ اس قاعدہ کو خوب سمجھ لینا ضروری ہے۔ مؤلف اور اس کے اشیاع نے اس کی ہوا بھی نہ سونگھی۔ اس عاجز کو اپنے اساتذہ جہابذہ کی توجہ سے حاصل ہوا ہے۔ اس جوہر کو اس کتاب میں ضرور درج رکھتا ہوں کہ موافقین کو نفع اور مخالفین کو شاید ہدایت حاصل ہو۔ الخ (ملخصا، براہین قاطعہ ص ۲۸۔ ۲۹)

اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کا تعاقب

مولوی انبیٹھوی صاحب نے اپنے اس کلام میں جواز شرعی کی دلیل کے وجود عدم کا سنت و بدعت میں حصر عقلی کر دیا۔ پس استحباب، اباحت اور کراہت تنزیہی ان تمام احکام کی نفی ہو گئی۔ کیونکہ جس امر کے وجود کی دلیل شرعی پائی گئی وہ سنت ہے۔ استحباب اور اباحت کے ثبوت کی کوئی گنجائش نہ رہی اور جس امر کے جواز کی دلیل شرعی نہ پائی گئی وہ بدعت و ضلالت ہوگا۔ پس کراہت تنزیہی کا رفع ہو گیا۔ (محصلہ فتاویٰ رضویہ ج ۲ ص ۴۵۸۔ ۴۵۹)

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فقہ کی جس قدر انواع پر کام کیا ہے اگر ان تمام کا احصار کیا جائے تو اس کے لئے بھی ایک عظیم دفتر کی ضرورت ہے۔ یہ مختصر مقالہ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت الشاہ مولانا احمد رضا خاں کی تمام فقہی خصوصیات کو پیش کرنے سے یقیناً قاصر ہے۔ تاہم اعلیٰ حضرت کی فقہی تحقیقات میں سے چند انواع کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے تاکہ اس کا مطالعہ قارئین کو اعلیٰ حضرت کے فقہی تبحر سے ایک حد تک روشناس کرا سکے۔

اعلیٰ حضرت کا فقہی مقام

جن امور کو اس مقالہ میں پیش کیا گیا ہے، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ حضرت میں اصولیین، فقہاء اور متصوفین تینوں کی تعریفات کے اعتبار سے فقہ کی معنویت پائی جاتی ہے۔ طبقات فقہاء کے اعتبار سے اعلیٰ حضرت کا موازنہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ قواعد شرعیہ وضع کرنے کی وجہ سے آپ میں طبقہ اولیٰ یعنی ائمہ اربعہ کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ غیر منصوص مسائل کو قواعد امام سے استخراج کرنے کی وجہ سے خصاف اور طحاوی کی طرح طبقہ ثالثہ میں قدم راسخ رکھتے ہیں۔ روایات میں ترجیح اور تفصیل کے سبب سے طبقہ رابعہ اور خامسہ کے فقہاء سے کسی طرح کم نہیں۔ فقہ کا کوئی باب ایسا نہیں جس میں فقہاء سابقین کی تصریحات سے زیادہ مسائل نہ متفرع کئے ہوں۔ جو امور متقدمین کی نظر سے مخفی رہ گئے انہیں انتہائی لطافت کے ساتھ واضح کر کے دلائل و براہین سے مزین کیا۔ معاصرین فقہاء کی غلطیوں پر انہیں ان گنت وجوہ سے متنبہ فرمایا، فقہی مباحثہ میں جو طبعی و ریاضی کے مسائل آ گئے تو ان پر ایسے اچھوتے انداز میں بحث کی ہے کہ فارابی اور شیخ بھی دبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انصاف اور دیانت کی نظر سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے فقہ میں وہ مقام حاصل کیا ہے جس کی نظیر صدیوں پیچھے نہیں ملتی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین



صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی

آپ نے آریہ سماج کے فتنہ کا ڈٹ کے مقابلہ کیا

حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی قدس سرہٗ العزیز ۱۸۸۳ء بر ۱۳۰۰ ہجری میں ہندوستان کے مشہور شہر مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے آباؤ اجداد اورنگزیب کے عہد میں مشہد سے ہندوستان وارد ہوئے تھے۔ آپ نے سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا۔ اس کے بعد علم دین کی تمام مروجہ عربی اور فارسی کتابیں پڑھیں۔ انتہائی کتب اور دورۂ حدیث شریف حضرت مولانا محمد گل سے پڑھا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے تبلیغ دین کا کام شروع کیا۔ تبلیغ دین کی خاطر آپ اکثر و بیشتر ہندوستان کے قریہ قریہ گئے اور لوگوں کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر اسلامی ارکان و مسائل کی تعلیم اور عقائد صحیحہ سے روشناس کرایا۔ مناظرہ میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

۱۹۲۰ء کے بعد جب آریہ سماج کا فتنہ شروع ہوا تو آپ نے اس کا ڈٹ کے مقابلہ کیا اور بڑے بڑے ہندو مناظروں کو سرعام شکست فاش دی اور حقانیت اسلام کا پرچم بلند کیا۔ تقریر اور مناظرہ کے علاوہ آپ نے پورے ہندوستان میں مدارس دینیہ کا جال پھیلا دیا اور مرکزی طور پر مراد آباد میں جامعہ نعیمیہ قائم کیا۔ میدان تحریر میں تبلیغ کے لئے ''السواد الاعظم'' ماہنامہ جاری کیا، جس میں حالات حاضرہ کے مطابق دینی و سیاسی موضوعات پر اپنے قلم حقائق رقم سے برصغیر کے مسلمانوں کو فیض یاب کرتے رہے۔ آپ نے علمی، دینی اور فنی موضوعات پر متعدد کتابیں بھی تصنیف فرمائیں۔ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کا زور تھا اور کانگریس کے ارکان بھی اس تحریک کے مؤید تھے اور مہاتما گاندھی اور سیاسی جماعتوں کے مسلم لیڈر تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ترک موالات کا نام دے کر انگریزوں سے مکمل بائیکاٹ پر ابھارا۔

صدر الافاضل نے ۱۹۲۰ء میں ''السواد الاعظم'' میں ''حالات حاضرہ'' کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ لکھا اور اس میں واضح کیا کہ مسلمانوں کو انگریزوں سے ترک موالات بلکہ ترک معاملات کر کے ہندوؤں کے قریب کیا جارہا ہے۔ ہندوؤں کو امام و پیشوا بنایا جارہا ہے، ان کے حق میں نعرے لگ رہے ہیں، مسلمان رضا کاروں سے رام لیلیٰ کا انتظام کرایا جارہا ہے، ناپاک مشرکوں کو مسجدوں میں لا کر منبر رسول پر بٹھایا جارہا ہے، ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان میں گائے کی قربانی کے عدم جواز کے فتاویٰ جاری کئے جارہے ہیں، مشرکوں کی ارتھی کو مسلمانوں سے کندھا دلوایا جارہا ہے، ہندوؤں کے حق میں دعائے مغفرت کروائی جارہی ہے، انگریزوں سے ترک معاملات کر کے ہندوؤں سے موالات کی جارہی ہے۔ دین کے ساتھ یہ کس قدر خوفناک مذاق ہے اور مسلمانوں کی ملی اقدار کو کس قدر بگاڑا جارہا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں آپ نے اس موضوع پر بطور خاص ''موالات'' نام کا ایک رسالہ تحریر فرمایا اور اس کو کثیر تعداد میں شائع کر کے ملک کے کونہ کونہ میں پہنچایا تا کہ مسلمان گاندھی کے اس طلسم ہوش ربا سے محفوظ ہو سکیں اور مسلمان جو اس وقت بظاہر اپنا سیاسی اور ملی مستقبل ہندوؤں کے ساتھ وابستہ کرنے پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں، ان کو دو قومی نظریہ سے روشناس کرایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے وطنیت کے جس بت کو توڑ کر دو قومی نظریہ کی اساس رکھی تھی اور حضرت مجدد الف ثانی نے اکبری دور میں جس کی تجدید کی تھی اس فکر کو صدر الافاضل نے ۱۹۲۱ء میں اعلیٰ حضرت کی رہنمائی کے سبب ہندوؤں سے موالات کے پر آشوب دور میں ایک بار پھر تازہ کیا۔

صدر الافاضل نے اپنی فراست اور دوررس نگاہ سے دو قومی نظریہ کو ۱۹۲۰ء کے آواخر میں پیش کیا تھا، اس کی افادیت اور دوررس نتائج کو ٹھیک دس سال بعد ڈاکٹر اقبال نے محسوس کیا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (الہ آباد) میں ڈاکٹر اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں اس حقیقت کا برملا اظہار کر دیا اور اس کے آٹھ سال بعد ۱۹۳۸ء میں قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صدر الافاضل نے دو قومی نظریہ کو قائد اعظم سے اٹھارہ سال پہلے پیش کر دیا۔ ۱۹۳۱ء میں صدر

الافاضل نے "سوادِ اعظم" میں ایک مقالہ لکھ کر سب سے پہلے تقسیم ہند کا تصور پیش کیا، یہ اس وقت کی بات ہے جب بمبئی میں اس سال شوال کے مہینہ میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ آپ نے تحریر فرمایا: بمبئی کے ہندو کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی دکانیں مسلمان محلوں سے ہٹا کر ہندو محلوں میں لے جائیں۔ ہندوؤں کے یہ افعال، یہ تجویزیں، یہ طرزِ عمل اتحاد کے ذرا بھی منافی نہیں لیکن مسلمان ایسا کریں تو اتحاد کے دشمن قرار دیئے جائیں۔ یہ کھلی ناانصافی ہے، جب ہندو اپنی حفاظت اس میں سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے محلوں سے علیحدہ ہو جائیں اور اپنی حدود علیحدہ کر لیں تو مسلمانوں کو یقیناً ان کے محلوں میں جانے اور ان کے ساتھ کاروبار رکھنے سے احتیاط رکھنا چاہیے، دونوں کو اپنے اپنے حدود جداگانہ قرار دیں اور اس نکتہ کو ملحوظ رکھ کر سیاسی مباحث کو طے کر لینا چاہیے یعنی ہندوستان میں ملک کی تقسیم سے ہندو مسلم علاقے جدا جدا بنا سکیں تا کہ باہمی تصادم کا اندیشہ اور خطرہ باقی نہ رہے اور ہر علاقے میں اسی علاقہ والوں کی حکومت ہو۔ مسلم علاقوں میں مسلمانوں کی اور ہندو علاقوں میں ہندوؤں کی، اب نہ مخلوط و جداگانہ انتخاب کی بحثیں درپیش ہوں گی، نہ کونسلوں میں نشستوں کی منازعت کا کوئی موقع رہے گا، ہر فریق اپنی حدود میں آرام کی زندگی گزار سکے گا۔ جب ہندو ذہنیت نے بمبئی میں یہ گوارہ کر لیا ہے تو کیا وجہ ہے کہ جدید حکومت کا مسئلہ اس اصول پر نہ طے کیا جائے۔ صدر الافاضل نے تقسیم ہند کا یہ تصور اپنے فاضلانہ مقالہ میں ۱۹۲۱ء میں پیش کیا تھا اور ۱۹۲۸ء میں کانگریس میٹنگ (Meeting) منعقدہ لکھنؤ میں ہندو لیڈروں کے پوشیدہ عزائم اور ان کی اندرون خانہ اسلام دشمنی کو بھانپ کر قائد اعظم کی آنکھیں کھل گئیں اور انہوں نے یہ کہہ کر اجلاس سے واک آؤٹ (Walk Out) کیا کہ ہم باعزت اور مساویانہ شرکت کر سکتے ہیں، ذلیل اور ماتحت ہو کر شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد دو قومی نظریہ نے بہت شہرت پائی اور ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی، کانگریس اور نیشنلسٹ علماء نے قیام پاکستان کی مخالفت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اس کے مقابلہ میں علماء اہل سنت نے اپنی تمام فکری اور عملی صلاحیتیں قیام پاکستان کی مساعی کے لئے وقف کر دیں۔ صدر الافاضل نے ۱۹۴۶ء میں بنارس میں آل انڈیا سنی کانفرنس منعقد

کی جس میں تمام برصغیر کے علماء اہل سنت اور مشائخ عظام نے شرکت کی اور اس تاریخی اجتماع میں قیام پاکستان کی قرارداد منظور کی گئی۔ بنارس کی تاریخی کانفرنس میں حضرت صدر الافاضل نے اعلان کیا: اگر بالفرض آل انڈیا مسلم لیگ مطالبۂ پاکستان سے دست کش بھی ہو جائے تو آل انڈیا سنی کانفرنس مطالبۂ پاکستان سے دست بردار نہیں ہوگی۔ صدر الافاضل کی تمام زندگی ملی اور سیاسی خدمات کے ایک ہنگامہ خیز دور سے عبارت تھی۔ انہوں نے بظاہر مراد آباد میں جامعہ نعیمیہ کے نام سے ایک مدرسہ بنایا اور چند کتابوں کے علاوہ قرآن کریم کی ایک تفسیر لکھی، لیکن درحقیقت انہوں نے ایسے افراد تیار کئے جو اپنی شخصیت کے اعتبار سے ایک مستقل ادارہ تھے۔ ان کے تلامذہ میں سے حضرت مفتی احمد یار خاں اور پیر کرم شاہ الازہری نے قرآن کریم کی تفسیریں لکھیں۔ مولانا نور اللہ نعیمی بصیر پوری نے حالات حاضرہ کے مطابق فقہ حنفی میں تجدیدی کام کیا۔ تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی، ابو البرکات سید احمد، مولانا محمد یونس نعیمی اور مولانا حبیب اللہ جیسے یگانہ روزگار محدث اور مفتی پیدا کئے۔ ابوالحسنات سید محمد احمد اور علامہ مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہ اور علامہ شاہ احمد نورانی جیسی قدر آور سیاسی شخصیات بنائیں۔ علاوہ ازیں آپ کے تلامذہ نے پاکستان میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا۔ جن میں جامعہ نعیمیہ لاہور اور دار العلوم نعیمیہ کراچی خاص طور پر قابل ذکر ہیں (مؤرخہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ بروز جمعہ تحریک پاکستان کا یہ نامور مجاہد، برصغیر کے مسلمانوں کا پیشوا، اپنے دور کا عظیم ترین فاضل، رسول اللہ ﷺ کا محب صادق، اہل سنت کا محبوب اور ان کی عقیدتوں کا مرکز اور دنیائے اسلام میں علم و فضل کا یہ نیر تاباں غروب ہو گیا، لیکن حق یہ ہے کہ مومن کامل کبھی نہیں مرتا۔ اس کے زریں کارنامے اس کو زندہ رکھتے ہیں۔ ظلمت کدہ ضلالت میں اس کی سیرت کی یاد سپیدۂ سحر کی طرح نمودار ہوتی ہے۔ فراعنہ عصر کی یلغار سے پیچھے ہٹنے والے غازیوں کو اس کی ولولہ انگیز حیات سے آگے بڑھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ وہ جیتا ہے تو اللہ کے نام پر مرنے کے لئے اور مرتا ہے اللہ کے بندوں کے جینے کے لئے)۔



(۱) غزالیٔ دوراں مولانا سید احمد سعید کاظمی(1)

غزالیٔ زماں رازی دوراں سید احمد سعید کاظمی متعنا اللہ تعالیٰ بطول حیاتہم سرمایہ افتخار محدث، بے بدل فقیہ اور عظیم ترین محقق ہیں، انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علم حدیث کی خدمت میں گزارا ہے۔ مختلف علمی موضوعات پر تحقیقی تصنیفات سپرد قلم کی ہیں۔ سینہ میں ملت کا گہرا درد رکھتے ہیں اور ہر ضرورت کے موقع پر ملک اور قوم کے لئے گراں بہا قربانیاں دی ہیں۔ مسلک سے والہانہ لگن اور اہل سنت کے حقوق کی پامالی پر ہمیشہ مضطرب رہتے ہیں۔ سنیوں کی تنظیم کے لئے بارہا کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلہ میں ملک کے طول و عرض میں متعدد دورے کئے اور مختلف انواع کی مساعی مشکور کی ہیں۔

حضرت کے تلامذہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے جو ملک اور بیرون ملک میں دین کے متعدد شعبوں میں کام کر رہے ہیں۔ چشتی، قادری اور سہروردی ان تمام سلسلوں میں اجازت بیعت حاصل ہے۔ تلامذہ کی طرح مریدین کا حلقہ بھی بہت وسیع ہے اور پاکستان کے قریہ قریہ میں آپ کے ارادت مند پھیلے ہوئے ہیں۔

حضرت علامہ بے حد منکسر المزاج اور متواضع شخصیت کے مالک ہیں، جس شخص کو بھی آپ کے ساتھ کچھ روز گزارنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ آپ کے حسن اخلاق کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں سوز و گداز ہے۔ درس حدیث کے وقت اکثر آنکھیں اشک بار رہتی ہیں۔ ایک بار سراج العلوم خانپور کے سالانہ جلسہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے، عجب سماں تھا، پنڈال میں ہزاروں کی تعداد میں سامعین بیٹھے ہوئے تھے اور سب کی آنکھوں سے سیل اشک جاری تھا۔ اسی حال میں آپ دوران تقریر اسٹیج پر سے گر پڑے۔ ہر شخص پر رقت کا عالم طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں لوگوں کی آنکھوں سے آنسو تھمتے نہ تھے، ہچکیوں میں ڈوبی ہوئی آوازیں، بے اختیارانہ چیخیں، اشکوں

1۔ یہ مقالہ حضرت مولانا سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ تعالیٰ کی حیات میں لکھا گیا تھا۔

کا سیل رواں اور پرسوز نالے غرض تمام سامعین پر عجب قسم کی از خود رفتگی طاری تھی۔ راقم الحروف کو ۱۹۵۶ء سے حضرت کے ساتھ تعلق خاطر ہے۔ اس عرصہ میں اس گناہ گار پر حضرت کی بے پناہ عنایتیں اور نوازشیں شامل حال رہیں۔ بارہا آپ کی مجلسوں میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور آپ کی سیرت کے بے شمار واقعات لوح ذہن پر ثبت ہوتے رہے۔

ایک ملاقات میں میں نے آپ کے سامنے آپ کے حالات زندگی کا تذکرہ چھیڑ دیا اور آپ کی زندگی کے بہت سے اہم واقعات معلومات کی روشنی میں آ گئے۔ یہ تمام معلومات اور یادداشتیں میں نے اپنے پاس نوٹ کر رکھی تھیں۔ اس خیال سے کہ کسی وقت ان کو سوانحی انداز پر ترتیب دے لوں گا۔ حسن اتفاق سے محترم عابد نظامی صاحب نے فرمائش کی کہ میں اس ماہ "ضیائے حرم" کے لئے حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی مدظلہ کی شخصیت پر کچھ لکھ کر پیش کروں۔ مجھے سوانحی مضامین شخصیات پر لکھنے کا کچھ سلیقہ اور تجربہ تو نہیں ہے۔ بہر حال حضرت سے کچھ ملاقاتوں، یادداشتوں، آپ کی علمی کاوشوں اور سیرت کی جھلکیوں کا جو کچھ سرمایہ میرے پاس محفوظ ہے اسے تلخیص کے ساتھ قارئین "ضیائے حرم" کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔

ابتدائی حالات

بیہقی زماں، غزالی دوراں ابوالنجم سید احمد سعید کاظمی کا سلسلۂ نسب سیدنا امام موسیٰ کاظم رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک ہے۔ ۱۹۱۳ء میں مراد آباد کے مضافاتی شہر امروہہ میں پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد مختار کاظمی تھا۔ ایام طفولیت میں ہی والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ کی تعلیم و تربیت آپ کے برادر معظم سید محمد خلیل کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کی زیر نگرانی ہوئی۔ سید محمد خلیل کاظمی انتہائی جید فاضل، عظیم محدث اور صاحب نظر درویش تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی اور ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ڈوبی ہوئی نعتیں کہا کرتے تھے۔ شاہ جہاں پور کے مدرسہ بحر العلوم میں تدریسی خدمات انجام دیتے تھے اور سفر و حضر میں ہمیشہ حضرت علامہ کاظمی کو اپنے ساتھ رکھتے تھے۔

حضرت نے ابتداء سے انتہاء تک تمام تعلیم اپنے برادر معظم سے ہی حاصل کی اور آپ

ہی کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں سند فراغت حاصل کی۔ دستار بندی کے موقع پر حضرت شاہ علی حسین صاحب اشرفی کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے اور اپنے مبارک ہاتھوں سے آپ کے سر پر دستار فضیلت باندھی۔ اس تقریب میں حضرت مولانا معوان صاحب رامپوری، حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری و دیگر اکابر علماء اور اعاظم مشائخ اہل سنت موجود تھے جنھوں نے آپ کو خصوصی دعاؤں سے نوازا۔

ایام تحصیل ہی میں آپ نے امتناع کذب کے موضوع پر ایک انتہائی علمی اور پر مغز رسالہ "تسبیح الرحمٰن عن الکذب والنقصان" کے نام سے زیب رقم فرمایا۔ مختلف بدمذہبوں سے مباحثوں اور مناظروں میں حصہ لیا اور ہر بار خدا کے فضل و کرم سے غالب اور کامیاب رہے۔

تدریسی زندگی

حضرت علامہ فراغت کے بعد بعض احباب سے ملاقات کے لئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں حضرت سید محمد دیدار علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت سے مستفیض ہوئے اور حضرت مولانا سید ابو البرکات اور مولانا سید ابو الحسنات سے ملاقات ہوئی۔ اسی اثنا میں ایک دن جامعہ نعمانیہ تشریف لائے۔ وہاں ایک کلاس میں حافظ محمد جمال صاحب "مسلم الثبوت" پڑھا رہے تھے۔ آپ بھی سماع کی خاطر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت ماہیت مجردہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ آپ نے بھی اس بحث میں حصہ لیا۔ آپ کی جودت طبع اور استحضار مسائل کے ملکہ سے حافظ محمد جمال صاحب بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے دبیر انجمن خلیفہ تاج الدین صاحب سے آپ کی قابلیت کا تذکرہ کیا، انہوں نے آپ کو جامعہ نعمانیہ میں تدریس کی پیش کش کی، جس کو آپ نے اپنے برادر معظم کی اجازت کی شرط پر منظور کر لیا۔ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کے دوران آپ کے ذمہ نور الانوار، قطبی، مختصر المعانی اور شرح جامی وغیرہ کی تدریس مقرر کی گئی۔ رفتہ رفتہ طلبہ کا میلان آپ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں اٹھائیس اسباق کی تدریس آپ کے ساتھ متعلق ہو گئی۔ تدریس کا تجربہ آپ کو دوران تعلیم ہی میں حاصل ہو گیا تھا۔ زمانہ تعلیم کے آخری دو سالوں میں آپ باقاعدہ اسباق

پڑھایا کرتے تھے۔ وہ مہارت یہاں کام آئی اور نعمانیہ میں آپ کی تدریس کا سکہ بیٹھ گیا۔

۱۹۳۱ء میں آپ لاہور سے واپس امروہہ تشریف لے گئے اور چار سال تک امروہہ کے مدرسہ محمدیہ حنفیہ میں حضرت محمد خلیل صاحب کاظمی کی سرپرستی میں تدریس فرماتے رہے۔ اس دوران مطلع العلوم کے حضرت مولانا خلیل اللہ سے مجلس ہوتی اور متعدد علمی مباحثے ہوتے۔ مشہور مناظر مولوی مرتضیٰ حسین دربھنگی سے بھی کئی بار مناظرے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آپ ہمیشہ کامیاب وکامران رہے۔

لاہور کے زمانہ قیام میں حکیم جان عالم سے آپ کے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے، جو لاہور سے واپسی کے بعد بھی برقرار رہے اور ان سے خط وکتابت ہوتی رہی۔ انہیں کے اصرار پر آپ ایک سال کے لئے اوکاڑہ تشریف لے گئے، اس زمانہ میں اوکاڑہ میں گستاخان رسول کی بڑی شورش تھی۔ ہر طرف تنقیص رسالت کی مہم جاری تھی۔ آپ نے وہاں جا کر مسلک اہل سنت کی تبلیغ اور درس وتدریس کے سلسلہ کو جاری کیا۔ آپ کی مساعی سے بہت جلد فضا بہتر ہوگئی اور عظمت رسول کے نعروں سے اوکاڑہ کے درودیوار گونجنے لگے۔

ملتان میں آمد

حضرت سید نفیر عالم ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ آپ کے برادر معظم نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ آپ نے حضرت نفیر عالم کو اپنا شیخ صحبت بنالیا تھا۔

حضرت سید نفیر عالم ہر سال ملتان میں خواجہ غریب نواز سلطان الہند حضرت معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا عرس منعقد کیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلہ میں آپ کو وہاں تقریر کی دعوت دی۔ حضرت نفیر عالم نے جب آپ کی تقریر سنی تو دل وجان سے فدا ہو گئے اور تب سے ان کا پیہم اصرار رہا کہ آپ ملتان آ جائیں اور اہالیان ملتان کو مستفیض کریں۔ بالآخر ۱۹۲۵ء کے اوائل میں آپ ملتان تشریف لے گئے۔

ملتان آنے کے بعد آپ نے اپنے رہائشی مکان ہی میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ متلاشیان حق اور تشنگان علم دور دور سے آ کر آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہوتے

رہے۔ نومبر ۱۹۴۵ء میں آپ نے مسجد حافظ فتح شیر بیرون لوہاری دروازہ میں قرآن مجید کا درس شروع کیا۔ بعض بدبختوں نے اس درس کو ناکام کرنا چاہا، چنانچہ علاقہ کے تمام مخالف علماء درس میں شرکت کرتے اور دوران درس مختلف قسم کے اعتراض کیا کرتے۔ مگر خدا کے فضل سے وہ ہمیشہ ناکام رہے اور آپ کے علم وفضل کی شہرت دور دور پھیلتی گئی۔ حضرت اٹھارہ سال تک مسلسل اس مسجد میں درس قرآن پاک دیتے رہے اور اٹھارہ سال کے طویل عرصہ کے بعد آپ نے یہاں درس قرآن پاک مکمل کیا۔ اسی اثناء میں آپ نے عشاء کے بعد حضرت چپ شاہ صاحب کی مسجد میں درس حدیث شروع کیا اور پہلے ''مشکوٰۃ'' کا اور اس کے بعد ''بخاری شریف'' کا درس مکمل کیا۔

آپ کے حلقۂ درس میں یوں تو سب ہی آپ کے ارادت مند تھے، لیکن حاجی محمد ابراہیم کمپنی والے آپ سے خصوصی عقیدت رکھتے تھے۔ یہ گوجرانوالہ کے ایک غیر مقلد مولوی عبدالعزیز کے مرید تھے۔ جب حاجی محمد ابراہیم نے حج پر جانے کا ارادہ کیا تو مولوی عبدالعزیز گوجرانوالہ سے انہیں رخصت کرنے کے لئے ملتان آئے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کا یہ مرید حضرت کا درس سنتا ہے تو وہ بہت برہم ہوئے اور کہنے لگے: یہ لوگ تو (العیاذ باللہ) مشرک ہیں۔ دوسرے دن جب حاجی محمد ابراہیم کو گاڑی میں سوار کرانے کے لئے اس کے احباب گئے، ان میں حضرت بھی تھے اور مولوی عبدالعزیز بھی، پھر وہاں کسی نے باہم تعارف کرادیا۔

مولوی عبدالعزیز نے اس کے بعد اپنے تمام ہم خیال علماء کو اکٹھا کیا اور کہا کہ یہاں ایک بدعتی آگیا ہے۔ اگر اس کے قدم یہاں جم گئے تو بڑی پریشانی ہوگی، انہوں نے جواب میں کہا کہ حضرت! ہم نے بارہا کوشش کی ہے لیکن ان کے علم اور زور بیان کے آگے پیش نہیں جاتی، آپ کو فن مناظرہ میں بڑی مہارت ہے اور علم وفضل میں بھی بلند مقام رکھتے ہیں، اس لئے آپ ان سے مناظرہ کریں۔ چنانچہ مولوی عبدالعزیز اور اس کے حواریوں نے مناظرہ کی تیاری شروع کردی اور کئی دن صرف کر کے بے شمار کتابوں پر نشان لگائے تھے۔ حضرت کا معمول تھا کہ روزصبح درس کے بعد حضرت غوث بہاء الحق رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں

حاضری دے کر آتے تھے۔ ایک دن وہاں سے واپس آ رہے تھے تو پیغام ملا کہ مولوی عبدالعزیز نے گفتگو کے لئے حاجی ابراہیم کی کمپنی میں بلایا ہے۔ حضرت اسی وقت اور اسی حال میں کمپنی میں تشریف لے گئے۔ اس گفتگو میں مولوی عبدالعزیز بری طرح ناکام ہوئے اور ان کی رسوائی کی خبر تمام شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور شہر کے تمام لوگ ہر طرف سے آ کر آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ اس مباحثہ کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔

قاتلانہ حملہ

مولوی عبدالعزیز کی شکست کے بعد حضرت کا عروج ظاہر ہوا اور ہر طرف سے آپ کو لوگ تبلیغ و ارشاد کے لئے بلانے لگے اور مسلک اہل سنت کی اشاعت کا ماہ درخشاں سندھ اور پنجاب کے تمام اضلاع میں اپنی نور افگن شعاعیں پھیلانے لگا۔

اہل سنت کے اس غلبہ سے گھبرا کر مخالفین نے آپ کے قتل کی سازش تیار کی۔ چنانچہ مولوی حسین علی واں بھچروی کا شاگرد حبیب اللہ جو چنی گوٹھ میں رہتا تھا، اس نے حضرت کو بہاولپور کے گاؤں ملھا تجلن میں تقریر کی دعوت دی۔ یہ ایسی جگہ تھی کہ یہاں سے اسٹیشن بھی نومیل تھا اور تھانہ بھی نومیل تھا۔

ایسی دور دراز جگہ پر تین محرم کو جمعہ کے دن حضرت کو تقریر کے لئے بلایا گیا۔ جلسہ میں کلہاڑی بردار لوگ کافی تعداد میں شریک تھے، اچانک مولوی حبیب اللہ تقریر کے دوران چلایا: قتل کر دو۔ چنانچہ کلہاڑی برداروں نے آپ پر حملہ کر دیا، جلسہ میں سنی لوگ بھی تھے، انہوں نے آپ کی طرف سے کافی مزاحمت کی لیکن حملہ آوروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے آپ کے سر پر کلہاڑی کے پیہم وار کئے اور شدید ضربات سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ ایک ہندو عورت آپ کو یہ کہہ کر اٹھا کر لے گئی کہ یہ سید کا بال ہے۔ تین دن تک آپ اس ہندو عورت کے گھر میں بے ہوش پڑے رہے، پھر ادھر ادھر لوگوں کو خبر ہوئی اور آپ کو ملتان لایا گیا جہاں آپ چھ ماہ تک زیر علاج رہے۔ آپ کی عیادت کے لئے ہندوستان کے کونے کونے سے علماء اور مشائخ تشریف لائے۔ ان بزرگوں میں حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب، حضرت محدث صاحب کچھوچھوی، حضرت صدر

الا فاضل مولانا نعیم الدین اور مولانا حشمت علی خاں صاحب کے اسماء خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

انوار العلوم کا قیام

دوران علاج ہر وقت عیادت کرنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ اس حملہ کا تو کوئی ایسا افسوس نہیں ہے، لیکن یہ حسرت دل میں رہ گئی کہ زندگی میں کوئی عظیم کام سرانجام نہیں دیا۔ منشی اللہ بخش رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس وقت آپ کی عیادت کے لئے آئے ہوئے تھے، یہ سنتے ہی دس ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کئے اور کہا کہ یہ آپ کی نذر ہیں، ان کی بیگم نے اپنے سونے کے کڑے اتار کر دیئے کہ انہیں بیچ کر میری طرف سے نذر کریں۔ حضرت کی اہلیہ نے بھی اپنا تمام زیور اتار کر نذر کر دیا، آپ نے اس رقم سے ملتان کے وسط میں زمین خرید کر مدرسہ انوار العلوم قائم کر دیا۔

تحریک پاکستان

حضرت علامہ کاظمی شاہ صاحب نے برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کے لئے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مسلم لیگ کے سٹیج سے قیام پاکستان کے لئے جلسے کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں قرارداد پاکستان کی توثیق کے لئے بنارس کانفرنس میں شرکت کی۔ جس زمانہ میں کانگریسی اور احراری علماء سر دھڑ کی بازی لگا کر پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے اس وقت حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی، حضرت علامہ کاظمی صاحب مدظلہ، پیر جماعت علی شاہ، مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمہم اللہ کی رفاقت میں الگ قومیت اور آزاد پاکستان کے لئے سعی مسلسل اور جہد پیہم کر رہے تھے۔

جمعیۃ العلماء پاکستان کی بنیاد

قیام پاکستان کے بعد حضرت نے نئے حالات کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ وہ لوگ جو کل تک پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، پاکستان بننے کے بعد انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی اور دیکھتے دیکھتے وہ حکومت کی نظر میں سرمہ چشم بن کر سا گئے۔ اس وقت

آپ نے اہل سنت کے اتحاد اور تنظیم کی ضرورت محسوس کی تاکہ اہل سنت کو سیاسی استحکام اور قوت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لئے آپ نے مولانا ابوالحسنات سے مراسلت کی اور ان پر تشکیل جمعیت کے لئے زور ڈالتے رہے۔ نیز آپ نے پاکستان کے تمام علماء کے نام خطوط لکھے تا آنکہ مارچ ۱۹۴۸ء میں تمام علماء ملتان میں جمع ہوئے، جن میں حضرت مولانا ناصر جلالی (کراچی)، علامہ عبدالغفور ہزاروی (وزیر آباد)، مولانا ابوالنور محمد بشیر (سیالکوٹ)، مولانا ابوالحسنات (لاہور) اور مولانا غلام جہانیاں (ڈیرہ غازی خاں) کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ملتان کے اجلاس میں اہل سنت کی تنظیم کا نام جمعیۃ العلماء پاکستان تجویز کیا گیا اور حضرت علامہ ابوالحسنات کو جمعیت کا صدر اور حضرت علامہ کاظمی شاہ صاحب کو جمعیت کا ناظم اعلیٰ منتخب کرلیا گیا۔

حضرت علامہ نے اپنی نظامت کے دوران جمعیت کو بے حد فروغ دیا اور جمعیت کے ذریعے ملک وملت کی بیش از بیش خدمات انجام دیں۔ جہاد کشمیر، دستور سازی، تحریک تحفظ ختم نبوت، تبلیغ و اشاعت، سیلاب زدگان کی مدد غرض ہر خدمت اور ہر ضرورت کے موقع پر آپ نے جمعیت کے پرچم کو سربلند رکھا۔

جامعہ اسلامیہ میں

محکمہ اوقاف نے علوم اسلامیہ کے تخصص اور تحقیق کے لئے بہاولپور میں جامعہ اسلامیہ کو قائم کیا۔ اس جامعہ کے شعبہ حدیث میں بلند پایہ محقق اور ماہر حدیث کی ضرورت تھی جو روایت و درایت دونوں فنون میں قوی دست گاہ رکھتا ہو، بالآخر محکمہ کی نگاہیں آپ کی ذات پر جم گئیں اور اس نے آپ سے شیخ الحدیث کا منصب قبول کرنے کی درخواست کی۔ اگرچہ انوار العلوم کو چھوڑنا آپ کے لئے بار خاطر تھا، تاہم جامعہ میں اہل سنت کی نمائندگی اور مسلک کے تحفظ کی خاطر آپ نے یہ عہدہ قبول کرلیا اور بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ آپ کا یہ فیصلہ بروقت اور صحیح تھا۔ آپ نے ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۹۷۴ء تک جامعہ اسلامیہ میں شعبہ حدیث کے سربراہ کی حیثیت سے کام کیا۔ ان گیارہ سالوں میں سنی طلباء کو

آپ کی وجہ سے اپنے حقوق کے حصول میں انتہائی آسانی رہی اور کئی آسامیوں پر سنی علماء کا تقرر ہوا۔

چند معرکہ آرا مناظرے

دوران تعلیم امروہہ میں آریہ سماج کا مشہور مناظر پنڈت رام چند آیا اور اس نے تناسخ اور قدامت عالم پر مناظرہ شروع کیا۔ اس مناظرہ میں علماء اسلام نے شرکت کی اور مباحثہ میں حصہ لیا۔ حضرت نے بھی اپنے برادر معظم مولانا سید محمد خلیل رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت اور دعاؤں کے ساتھ اس مباحثہ میں شرکت کی۔

پنڈت رام چند نے قدم عالم اور تناسخ پر قرآن کریم کی دو آیتوں سے استدلال کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ (البقرہ) نیز فرماتا ہے: مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ (مائدہ: ٦٠)

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ بعض یہودیوں کو اللہ تعالیٰ نے بندر کی جون میں اور بعض عیسائیوں کو خنزیر کی جون میں تبدیل کر دیا اور یہ بعینہٖ تناسخ ہے۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ مرنے کے بعد شہداء کی روحیں سبز پرندوں کی شکل میں اڑتی پھرتی ہیں اور یہ بھی تناسخ ہے اور تناسخ قدم عالم کو مستلزم ہے۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ تناسخ اسے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد ایک جاندار کی روح دوسرے جسم میں منتقل ہو جائے اور یہاں یہودی اور عیسائی مرے تو نہ تھے، بلکہ زندگی میں ہی ان کی انسانی شکل کو مسخ کر کے انہیں بندروں اور خنزیروں کی شکل میں متشکل کر دیا تھا۔ لہٰذا یہ تناسخ نہیں تماسخ ہے اور ارواح شہداء کی جو آپ نے حدیث پیش کی ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے برزخ اور معاد کا حال بیان کیا ہے اور آپ معاد کے قائل نہیں ہیں۔ پنڈت رام چند نے کہا: اب تو میں جا رہا ہوں، آئندہ سال آ کر پھر اسی جگہ بحث کروں گا۔

آپ نے فرمایا: دیکھو موت کا کوئی پتہ نہیں ہے، کیا پتہ سال سے پہلے تمہیں موت آ جائے۔ لہٰذا مجھے یہ بتا کر جاؤ کہ اگر مر گئے تو آئندہ سال کس جانور کی جون میں آ کر مجھ سے ملاقات کرو گے۔ اس جواب پر وہ خوش ہوا اور جاتے وقت آپ کو اپنی گھڑی انعام میں

دے گیا۔

مولوی عبدالعزیز سے گفتگو اور مباہلہ

گوجرانوالہ کے مشہور غیر مقلد عالم مولوی عبدالعزیز نے ایک روز صبح صبح آپ کو حاجی محمد ابراہیم کی کمپنی میں بلوایا اور علم غیب کے مسئلہ پر گفتگو شروع کر دی۔ آپ نے حضور ﷺ کے لئے علم غیب کے اثبات پر مندرجہ ذیل آیات پیش کیں۔

(۱) عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ (الجن)

"اللہ تعالیٰ غیب کو جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی شخص کو مطلع نہیں کرتا سوا ان کے جن سے وہ راضی ہو جائے جو اس کے رسول ہیں"۔

(۲) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (آل عمران:۱۷۹)

"اور اللہ تعالیٰ کی یہ شان نہیں کہ وہ تم کو اپنے غیب پر مطلع کرے، لیکن اللہ تعالیٰ (اطلاع علی الغیب کیلئے) جسے چاہتا ہے پسند کر لیتا ہے، جو اس کے رسول ہیں"۔

(۳) عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (النساء:۱۱۳)

"اللہ تعالیٰ نے وہ تمام چیزیں آپ کو بتلا دیں جو آپ نہ جانتے تھے اور یہ آپ پر اللہ تعالیٰ کا فضل عظیم ہے"۔

ان تین آیتوں کے بعد آپ نے اثبات علم غیب کے لئے مندرجہ ذیل احادیث پڑھیں۔

(۱) عن عمر قال قام فینا رسول اللہ ﷺ مقاما فاخبرنا عن بدء الخلق حتی دخل اهل الجنة منازلهم واهل النار منازلهم حفظ ذالك من حفظه و نسیه من نسیه۔ (بخاری)

حضرت عمر سے روایت ہے کہ ایک دن حضور ﷺ نے ابتداء آفرینش عالم سے حوادث کی خبریں دینی شروع کیں، یہاں تک کہ جنتی جنت میں داخل ہو گئے اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو گئے، جس نے

اس کو یاد رکھا، یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا اس نے بھلا دیا۔

(۲) قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَعَلِمْتُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ فِی رِوَایَةٍ فَتَجَلّٰی لِیْ کُلُّ شَیْءٍ وَعَرَفْتُ۔

حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے جان لیا جو کچھ تمام آسمانوں اور زمینوں میں ہے اور ایک روایت میں یوں ہے: میرے لئے ہر چیز منکشف ہوگئی اور میں نے اس کو جان لیا۔

ان آیات اور احادیث کو سن کر مولوی عبدالعزیز کہنے لگا: ''فتاویٰ قاضی خاں'' میں ہے: جو شخص حضور ﷺ کے لئے غیب کا مدعی ہو وہ کافر ہے۔ آپ نے فرمایا: عجب بات ہے، میں قرآن اور حدیث پیش کرتا ہوں اور تم اس کے معارضہ میں قاضی خاں کے اقوال پیش کرتے ہو اور قول بھی وہ جو ''قالوا'' کے ساتھ مقرون ہیں اور قاضی خاں کی اصطلاح میں مقرر ہے کہ ''قالوا'' کے ساتھ جو قول ہو وہ ضعیف ہوتا ہے۔ مولوی عبدالعزیز نے کہا کہ تم حنفی ہو؟ فرمایا: ہاں! کہا: حنفیوں کی کتاب ''شرح فقہ اکبر'' میں لکھا ہے:

ان الانبیاء لم یعلموا المغیبات من الاشیاء الا ما اعلمھم اللہ تعالٰی احیانا

انبیاء کو علم غیب نہیں ہوتا، مگر ان باتوں کا جو اللہ تعالیٰ انہیں احیانا بتلا دیتا ہے۔

آپ نے فرمایا: یہ عبارت میرے خلاف نہیں ہے، کیونکہ اس عبارت میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے بغیر جاننے کی نفی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے علم کا قائل ہوں۔ ثانیاً اس عبارت میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء علیہم السلام کو احیاناً علم غیب عطا فرماتا ہے اور احیان، حین کی جمع ہے، اب میں بتلاتا ہوں کہ ایک حین میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کتنا علم عطا فرمایا ہے۔ ''ترمذی شریف'' میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا دست قدرت میرے شانوں کے درمیان رکھا، جس کی ٹھنڈک میں نے اپنے سینہ میں محسوس کی۔ ''فعلمت ما فی السموات وما فی الارض'' ''پس میں نے جان لیا جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے''

غور کرو! جب ایک حین میں حضور ﷺ کے علم کا یہ عالم ہے تو احیان میں ان کے علم کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟ مولوی عبدالعزیز نے کہا: دکھلاؤ یہ حدیث کہاں ہے؟ آپ نے

انہیں کی کتابوں میں سے "مشکوۃ شریف" میں سے یہ حدیث نکال کر پیش کی۔ کہنے لگا: "مشکوۃ" بے سند کتاب ہے، میں اس کو نہیں مانتا، "ترمذی" میں دکھلاؤ۔ آپ نے بسم اللہ پڑھ کر "ترمذی شریف" کھولی تو سامنے سورۂ ص کی تفسیر میں وہی حدیث نکل آئی۔ جب مولوی عبدالعزیز کو یہ حدیث دکھائی تو وہ غصہ میں آگ بگولا ہو گیا اور طیش میں آ کر کتاب کو پھینک دیا۔ جیسے ہی مولوی عبدالعزیز نے "ترمذی شریف" اٹھا کر پھینکی حضرت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور فرمایا: تو گستاخ اور بے ادب ہے، اب میں تجھ سے مناظرہ نہیں کرتا، مباہلہ کروں گا۔ چنانچہ دونوں نے یہ الفاظ کہے: اگر میرا مقابل حق پر ہو اور میں باطل پر ہوں تو میں اس سال کے اندر خدا کے قہر و غضب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاؤں اور اگر میں حق پر ہوں تو میرا مقابل خدا کے عذاب میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جائے۔ مباہلہ کرنے کے بعد آپ وہاں سے واپس تشریف لے آئے۔

مولوی عبدالعزیز جب گوجرانولہ پہنچے اور صبح کی نماز کے بعد قرآن مجید کا درس دینے کے لئے بیٹھے اور بولنا چاہا تو الفاظ منہ سے نہ نکلے، زبان باہر نکل آئی، کافی دنوں تک علاج کی کوشش کی گئی، لیکن ڈاکٹروں نے کہہ دیا کہ کوئی مرض ہو تو اس کا علاج کیا جائے، یہ تو عذاب الٰہی ہے بالآخر سال پورا ہونے سے پہلے ہی وہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گیا۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے گفتگو

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران مختلف مکاتیب فکر کے علماء کراچی میں اکٹھے ہوئے۔ ایک مجلس میں مولانا ظفر احمد انصاری، مفتی محمد شفیع، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور حضرت قبلہ کاظمی شاہ صاحب جمع ہوئے۔ اثناء گفتگو میں حضرت صاحب نے مولانا محمد ادریس کاندھلوی سے فرمایا: آپ نے اپنی کتاب "الکلام" میں مرزا غلام احمد قادیانی کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نبی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا حسب نسب اپنے زمانہ کے تمام احساب وانساب سے افضل ہو۔ حالانکہ یہ بات بے دلیل ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی نے کہا کہ میں نے تو حدیث شریف کا ترجمہ کیا ہے۔ "بخاری شریف" میں ہے: "كذالك تبعث الانبياء فى احساب قومهم" "انبیاء

علیہم السلام اپنی قوم کے بہترین نسب سے مبعوث کئے جاتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا: حدیث کا ترجمہ تو یہ ہے کہ جس قوم کی طرف نبی مبعوث ہو اس کا نسب اس قوم میں افضل ہوتا ہے۔ آپ نے لکھا ہے: نبی کا نسب اپنے زمانہ میں سب سے افضل ہوتا ہے۔ کہنے لگے: اگر میں نے لکھ دیا تو کیا خرابی لازم آئی؟ حضرت نے فرمایا: خرابی یہ ہے کہ "ترمذی شریف" میں حدیث ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم میں اسماعیل کو فضیلت دی اور اولاد اسماعیل میں کنانہ کو فضیلت دی اور کنانہ میں قریش کو اور قریش میں بنو ہاشم اور بنو ہاشم میں مجھے فضیلت دی۔ اس حدیث سے ظاہر ہوا کہ حضرت ابراہیم کے دو فرزندوں اسحاق اور اسماعیل علیہم السلام میں حضرت اسماعیل کا نسب حضرت اسحاق سے افضل تھا اور جس زمانہ میں نسل اسحاق سے بنی اسرائیل کے نبی مبعوث ہوئے اس وقت حضرت اسماعیل کی اولاد بھی موجود تھی اور ان کا نسب بنی اسرائیل کے انبیاء سے افضل تھا۔ اب اگر نبی کے لئے ضروری ہو کہ اس کا نسب اپنے زمانہ کے تمام انساب سے افضل ہو تو لازم آئے گا کہ بنی اسرائیل کے انبیاء، انبیاء نہ رہیں کیونکہ ان کا نسب اپنے زمانہ کے نسب اسماعیل سے افضل نہ تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کی نبوت کے انکار سے بڑھ کر اور کون سی خرابی ہوگی۔ جب حضرت نے یہ ایراد قائم فرمایا تو مولانا ادریس صاحب سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور مجلس وہیں برخاست ہوگئی۔

قاضی نجد سے گفتگو

حضرت علامہ حرم رسول میں حاضر تھے۔ پرسوز گزارشات اور التجائیں کر رہے تھے۔ چہرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اور پیٹھ مبارک کعبہ کی جانب تھی۔ نجدی پہرہ داروں نے منع کیا اور کہا کہ کعبہ کی طرف پیٹھ نہ کرو، بلکہ کعبہ کی طرف منہ کر کے حضور کی طرف پیٹھ کرلو۔ آپ نے ان کے انکار کی طرف ذرا التفات نہ کیا۔ دوسرے دن آپ کو قاضی کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاضی نے پوچھا: کیا آپ قبر رسول کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تم کعبہ کی بات کرتے ہو، میں تو اس جگہ کو عرش سے بھی افضل جانتا ہوں۔ اس نے پوچھا: دلیل؟ آپ نے فرمایا: دیکھو از روئے قرآن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے شکر گزار

بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ (ابراہیم: ۷) ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہارے مراتب میں اور زیادتی کروں گا''۔ حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے زیادتی دی، زمین سے چوتھے آسمان پر لے گیا۔ حضرت عیسیٰ وہاں بھی شکر گزار رہے۔ اب چاہیے یہ تھا کہ انہیں اور بلندی پر لے جاتا، یہاں تک کہ عرش پر لے جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں حضور کے پہلو میں لائے گا۔ معلوم ہوا کہ جو عظمت اور بلندی جوار مصطفیٰ میں ہے وہ عرش کو بھی حاصل نہیں ہے۔ حضرت نے جب یہ دلیل قائم کی تو قاضی مجدد دم بخود رہ گیا۔

فوائد حدیث

جامعہ اسلامیہ میں ایک مرتبہ حدیث شریف پڑھاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تابعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی، اس پر ایک طالب علم نے سوال کیا کہ تابعی تو وہ ہوتا ہے جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ دیکھا ہو، بلکہ آپ کے صحابی کو دیکھا ہو تو تابعی حضور سے کیسے روایت کر سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک صحابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سنی، بعد میں وہ العیاذ باللہ مرتد ہو گیا اور ''من یکفر بالایمان فقد حبط عملہ'' مرتد ہونے کے بعد اس کے تمام اعمال اکارت ہوئے۔ شرف صحابیت بھی جاتا رہا، حضور کے وصال کے بعد وہ پھر ایمان لے آیا اور اس نے صحابہ کو دیکھا، اب وہ تابعی ہوا، اس کے بعد اگر وہ حضور سے سنی ہوئی کسی روایت کو بیان کرے تو وہ حضور سے تابعی کی روایت ہو گی، صحابی کی نہیں۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ ''بخاری شریف'' میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ پڑھائی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں استغفار سے منع فرمایا ہے: اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ: ۸۰) نیز جب آپ کے استغفار کے باوجود اس کی مغفرت نہ ہوئی تو آپ کی شان محبوبیت اور استجابت دعا پر حرف آیا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: حضور نے عبداللہ بن ابی کے لئے دعا مانگی، نماز جنازہ میں آپ نے فرمایا: ''اللھم اغفر لحینا و میتنا'' ''اے اللہ! بخش دے ہمارے زندوں کو اور ہمارے مردوں کو'' اور وہ ہمارا کب تھا اور جو کہتے ہیں: ہمارا ہے انہیں مبارک ہو۔ رہا یہ سوال کہ کیا اب بھی کوئی شخص کسی مرتد کا جنازہ اس تاویل سے پڑھ سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا: ''ولا تصل علی احد منهم مات ابدا'' ''ان میں سے کسی کی نماز جنازہ نہ پڑھیں''۔ حضور نے اس کی نماز جنازہ اس آیت کے نزول سے پہلے پڑھائی تھی۔ لہٰذا حضور کا عمل جائز تھا اور اب جو پڑھائے گا اس کا فعل ناجائز ہوگا۔ باقی یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر آپ اس کے لئے ستر مرتبہ بھی استغفار کریں تو میں نہیں بخشوں گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وسیع القلبی، حلم اور رحمت کا تو یہی تقاضا تھا کہ آپ اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی استغفار چاہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمادیا کہ میں سب کو معاف کرسکتا ہوں، مگر محبوب کے گستاخوں کو معاف کردوں یہ تو قانون محبت کے خلاف ہے۔ جس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور نے حضرت علی سے فرمایا: میرا نام (محمد رسول اللہ) کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو۔ لیکن حضرت علی نے یہ نام نہیں کاٹا اور فرمایا: ''لا امحوك ابدا'' اور ان کا نام نہ کاٹنا اور آپ کی بات کا نہ ماننا اور ''لا امحوك ابدا'' کہنا آپ کی محبت کی وجہ سے تھا۔ اسی طرح آپ کے استغفار کے باوجود اللہ تعالیٰ کا عبداللہ بن ابی کو نہ بخشنا اور ''لن یغفر اللہ لهم'' فرمانا آپ کی محبت کی جہت سے تھا۔

ایک مرتبہ آپ سے کسی نے پوچھا کہ جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمر کی رائے تھی: انہیں قتل کردیا جائے اور حضرت ابوبکر اور بعض دوسرے صحابہ کی رائے تھی کہ انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکر کی رائے کو قبول کرلیا تھا اور بعد میں قرآن حضرت عمر کی رائے کے مطابق نازل ہوا۔ چنانچہ ارشاد ہوا: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ (انفال: ٦٧) ''تم مال دنیا کا ارادہ کرتے ہو اور اللہ آخرت کا ارادہ کرتا ہے'' اس سے لازم آیا کہ حضرت عمر کی رائے حضور کے مقابلہ میں صحیح ہو۔ حضرت نے جواب میں فرمایا: یہ وعید ان لوگوں کی طرف متوجہ ہے جو نئے نئے اسلام میں آئے تھے اور جنہوں نے مال دنیاوی کی طمع میں فدیہ کی رائے دی تھی اور حضرت ابوبکر نے ان کے اسلام قبول کرلینے کی توقع سے انہیں چھوڑنے کی رائے دی تھی، تاکہ ان کی آخرت سنور جائے۔ اس وجہ سے حضور نے اس رائے کو پسند کیا اور اسی بات کو پسند فرمایا کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ''اور اللہ تعالیٰ آخرت کا ارادہ کرتا ہے'' اور اس

طرح اللہ تعالیٰ نے ابو بکر کی رائے کو اپنی رائے قرار دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر کی رائے ان لوگوں کے مقابل میں بہتر تھی جنہوں نے مال دنیاوی کی طمع میں فدیہ کی رائے دی تھی اور جس رائے کو حضور نے پسند فرمالیا تھا یعنی حضرت ابو بکر کی رائے وہ مطلقاً بہتر تھی۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے اپنے رسالہ "شمول الاسلام" میں لکھا ہے کہ امام رازی نے الَّذِیْ یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۝ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ ۝ (الشعراء) کے تحت حضور کے ابوین کریمین کے ایمان کو بیان کیا ہے۔ جب ہم نے "تفسیر کبیر" میں اس آیت کی تفسیر دیکھی تو یہ مسئلہ نہ ملا، بلکہ اس کے برعکس یہ لکھا ہوا تھا کہ یہ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے۔ جب حضرت سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: امام رازی نے "اسرار التنزیل" میں اس آیت کے تحت یہ تقریر کی ہے اور اس کا ذکر امام سیوطی نے اپنے رسالہ "التعظیم والمنۃ" میں کیا ہے اور ہم اس مسئلہ کو ظنی طور پر مانتے ہیں اور شیعہ حضرات اس کو اصول سے مانتے ہیں۔

امام رازی نے "تفسیر کبیر" میں اس مسئلہ کے اعتقادی ہونے کا انکار کیا ہے اور "اسرار التنزیل" میں اس کے ظنی ہونے کا اثبات کیا ہے۔

تصانیف

امتناع کذب کے موضوع پر زمانہ طالب علمی میں آپ نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام "تسبیح الرحمن عن الکذب والنقصان" ہے۔ قوالی سننے کے جواز میں "مزیلۃ النزاع عن مسئلۃ السماع" تحریر فرمایا۔ یہ دونوں رسالے عرصہ سے نایاب تھے، اب چھپ چکے ہیں۔

حضور ﷺ کے حاظر و ناظر ہونے کے موضوع پر دو حصوں میں "تسکین الخواطر" تحریر فرمائی۔ یہ کتاب اب سکھر اور لاہور دو جگہوں سے طبع ہو چکی ہے۔ حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کے اثبات میں ایک رسالہ "حیات النبی" تصنیف فرمایا۔ یہ بھی متعدد بار چھپ چکا ہے۔ امام سیوطی کے رسالہ "انباء الاذکیا" کا ترجمہ فرمایا، یہ ترجمہ "حیات النبی" کے ساتھ لاحق کر دیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کے سفر معراج پر "معراج النبی" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو مقبول خاص و عام ہے۔ میلاد کے موضوع پر "میلاد النبی" "علم غیب

کے اثبات پر ''تقریر منیر'' حدیث پر ''حجیت حدیث'' رد عیسائیت میں ''اسلام اور عیسائیت'' مولانا مودودی کے بارے میں ''مکالمہ کاظمی و مودودی'' قربانی پر ''تحقیق قربانی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سائے کی نفی پر ''نفی الظل والفئی'' اور بیس رکعات تراویح کے اثبات پر ''کتاب التراویح'' تصنیف فرمائی۔ نیز بدمذہبوں کی عبارات پر تنقید و تبصرہ ''الحق المبین'' کے نام سے کیا۔

تفضیل جبرائیل کے موضوع پر ''التحریر'' تصنیف فرمائی اور اس کی شرح ''التقریر'' کے نام سے لکھی۔ ''اسلام اور سوشلزم'' اور ''طلباء کا اسلامی کردار'' وغیرہ کتابچے لکھے۔ یہ تمام کتابیں بارہا طبع ہو کر قارئین سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ مولانا قاسم نانوتوی کی بعض عبارات کے رد میں ''التبشیر برد التحذیر'' تصنیف فرمائی اور قوالی کے جواز میں ایک اور رسالہ تصنیف کیا، یہ دونوں ہنوز طبع نہیں ہوئے۔

تلامذہ

حضرت کے تلامذہ کا سلسلہ بے حد وسیع ہے۔ اس مضمون میں سب کے اسماء کا اندراج تو نہیں ہو سکتا، بعض از اں یہ ہیں۔ حضرت مفتی سید شجاعت علی قادری، مولانا خورشید احمد۔ مولانا محمد حسن حقانی (ایم۔ پی۔ اے، سندھ)، حضرت مولانا منظور احمد فیضی، حضرت مولانا عبدالمجید اویسی، حضرت مفتی غلام سرور قادری، حضرت مولانا عبدالقادر خانیوال، حضرت مولانا پیر محمد پشاور، حضرت مولانا مشتاق احمد نظامی ملتان، حضرت مولانا غلام مصطفیٰ رضوی، حضرت مولانا محمد مقصود احمد صاحب لاہور، حضرت مولانا عبدالحکیم صاحب شجاع آباد، حضرت مولانا حسن الدین ہاشمی جامعہ اسلامیہ بہاولپور، حضرت مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کراچی، حضرت مولانا سید سعادت علی قادری، حضرت مولانا غلام فرید ہزاروی، حضرت مولانا محمد شریف ہزاروی، حضرت مولانا خدا بخش اظہر، غلام رسول سعیدی۔

اس زمانہ میں جب علم و عمل میں بے گانگی ہے اور واعظوں کے لئے بھی عمل کرنا دشوار ہے، نفس حاوی ہوتا جا رہا ہے، مطلب پرستی اور خود غرضی کا دور دورہ ہے، جب بے عملی کی دھند کثیف اور گمراہی کے اندھیرے گمبھیر ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے میں حضرت کا وجود

پیروی سنت کی مشعل بن کر سیرت کا نور پھیلا رہا ہے۔

حضرت کی پوری زندگی دین و ملت کی خدمت سے عبارت ہے۔ آپ کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ شریعت پر استقامت اور متابعت سنت کا ذوق ابھرتا ہے۔ آپ کے پاس بیٹھنے سے سینہ میں عشق رسول کی بجلیاں کوندنے لگتی ہیں اور آپ کی گفتگو سن کر دل خوف خدا سے پگھل جاتا ہے۔



(۲) غزالئ دوراں مولانا سید احمد سعید کاظمی(۱)

ضیغم اسلام، غزالئ زماں، رازئ دوراں، حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی قدس سرہٗ العزیز، علم و فضل کے بے کراں سمندر، تحقیق و تدقیق کے نیر تاباں، زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت میں امام العلماء، ورثۃ الانبیا کی تعبیر، الفقر فخری کی تصویر، صداقت و فاروقیت کے سنگم، علم و فضل کے مرج البحرین، سادات کے گوہر آب دار، بارگاہ غوثیت کے مرغوب و مقبول، علوم ابوحنیفہ کی برہان، رضویت کے پاسبان، اسلاف صالحین کی میراث، اخلاف کے لئے مشعل راہ، اعداء دین کے سامنے شمشیر برہنہ، اہل دنیا کے سامنے سراپا استغناء، احباب کے لئے مہر و محبت، مریدین اور تلامذہ کے لئے سراپا شفقت، بادۂ توحید میں مست، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں سرشار، ان کی تحریر و تقریر میں اجتہاد و استنباط کی مہک، ان کی مجلس میں علم و عرفان کی بارش، گفتگو میں اثر آفرینی، روانی، قدرت اور سیلانی تھی۔ تمام علوم و فنون پر یکساں نظر و مہارت، مضامین میں طبع زاد نگارشات کا ملکہ، نکتہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔

۲۵ رمضان المبارک کو عشاء کے بعد یہ خبر میرے خرمن ہوش و حواس پر بجلی بن کر گری کہ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال ہو گیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے دنیائے سنیت یتیم ہو گئی۔ علم اور اخلاق کی عظمت اور برتری کا آئیڈیل (ideal) رخصت ہو گیا۔ وہ شفقتیں نظر سے اوجھل ہو گئیں جو صرف آپ سے وابستہ تھیں۔ علمی اور نظری الجھنوں میں اب مسائل کو سلجھانے والی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔ مصائب کے اندھیروں میں کسی طرف حوصلہ آفرینی کا اجالا نظر نہیں آتا۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ دنیا سے کیا گئے کہ علم و ادب، رشد و ہدایت اور شفقت و راحت کی محفل اجڑ گئی۔ نکتہ سنجی اور حاضر جوابی جاتی رہی اور برجستہ اور برمحل بات کرنے والا جاتا رہا۔

1۔ یہ مقالہ حضرت مولانا سید احمد سعید کاظمی رحمہ اللہ تعالیٰ کے وصال کے بعد لکھا گیا ہے۔

پاکستان میں اسلام اور سنت کے چار مستحکم ستون تھے۔ حضرت علامہ مولانا سردار احمد، حضرت مفتی احمد یار خان نعیمی، حضرت ابوالبرکات سید احمد اور حضرت غزالیٔ زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی۔ ان میں سے کوئی ایک بزرگ انتقال فرماتے تو دوسرے کی طرف آنکھیں لگی رہتی تھیں۔ لیکن علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہماری آنکھوں کے سامنے مکمل اندھیرا ہے اور روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ ان میں بے انداز خلوص اور للّٰہیت تھی۔

دین کی خدمت کرنے والے تو بہت سے علماء مل جاتے ہیں۔ لیکن اپنی جیب سے دین کی سربلندی پر خرچ کرتے ہوئے میں نے صرف علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تھا۔ ۲۳ سال پہلے ایک شوریدہ سر صحافی نے اپنے ہفت روزہ میں جب اسلاف اہل سنت کے خلاف سب وشتم کی شورش برپا کی، شعائر اہل سنت کا مذاق اڑایا اور اپنے مذموم عزائم پر چٹان کی طرح ڈٹ گیا تو اس وقت کوئی اور ادارہ یا شخص اس چٹان میں شگاف نہیں ڈال سکا تھا۔ اس چٹان کو توڑنے کے لئے صرف آپ اٹھے۔ ہفت روزہ "طوفان" کا اجراء کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے بساطِ مخالف کا نقشہ بدل ڈالا۔ اس مہم میں آپ نے اپنی جیب سے اس وقت دس ہزار روپے خرچ کئے تھے۔ یہ میرے علم اور مشاہدہ کی بات ہے۔ کرایہ اور نذرانے لے کر تو سبھی واعظ اور تقریریں کرتے ہیں لیکن بغیر کرایہ اور نذرانہ کے شرح صدر اور طمانیت قلب کے ساتھ سفر کرتے ہوئے میں نے صرف آپ کو دیکھا ہے۔

بے حد حلیم، ہمدرد اور غم گسار تھے۔ امیر اگر بیمار ہو تو ہر کوئی عیادت کرتا ہے، غریبوں کی عیادت کرتے میں نے صرف آپ کو دیکھا تھا۔

آپ میں غایت درجہ کی سادگی و انکساری تھی۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نابینا صحابی کو جو دعائے حاجت تلقین فرمائی تھی اس دعا کے الفاظ میں "یا محمد" بھی ہے، لیکن اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ نے "تجلی الیقین" میں لکھا ہے کہ "یا محمد" کی جگہ "یا رسول اللہ" پڑھے۔ فرمایا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا میں جو کلمات تلقین فرمائے ہوں انہیں بدلنا نہیں چاہیے۔ کیونکہ "بخاری شریف" میں ہے کہ جب حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے "بنبیک الذی

ارسلت" کی جگہ "برسولك الذی ارسلت" کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں "بنبیك الذی ارسلت" کہو۔ بہرحال اعلیٰ حضرت نے جو فرمایا حق فرمایا ہے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ زمین و آسمان کے سکون عدم حرکت کے قائل تھے اور قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے تھے:

إِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا (الفاطر:۴۱)

"بے شک اللہ روکے ہوئے ہے، آسمانوں اور زمین کو کہ جنبش نہ کرے"۔

(اعلیٰ حضرت کا ترجمہ)

میں نے جب اس مسئلہ میں آپ کی رائے پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ میرے خیال میں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کو ان کے محور میں رکھے ہوئے ہے اور ان کو اپنے محور سے ہٹنے نہیں دیتا۔ (آپ زمین کی حرکت کے قائل تھے) پھر فرمایا: میں اعلیٰ حضرت کے استدلال کی گہرائی کو نہیں پہنچ سکا اور تواضعاً واحتراماً فرمایا کہ ممکن ہے حق وہی ہو جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا ہے۔

کسی مسئلہ یا کسی رائے میں اگر اختلاف ہو جائے تو عموماً ہوتا یہ ہے کہ اکابر کے مقابلہ میں علماء اپنی رائے کو بہتر اور برتر قرار دیتے ہیں اور اسی کو ترجیح دیتے ہیں، مگر اکابر سے اختلاف کے موقع پر اکابر ہی کو ترجیح دینے والا کوئی شخص تھا تو وہ صرف حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ ان کی سادگی، تواضع اور انکسار تھا۔

ایک مرحوم واعظ (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) جو حضرت کے بمنزلہ شاگرد تھے، کسی بات پر حضرت سے روٹھ گئے، آنا جانا اور ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ آپ سے ایک مرتبہ لاہور کی کسی مجلس میں آمنا سامنا ہو گیا۔ آپ بے اختیار ان کی طرف بڑھے اور فرمایا: حدیث شریف میں ہے کہ "خیرکم من یبدء بالسلام" اس کے بعد السلام علیکم کہا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ علم کی بلندی اور علم و عمل کے بہترین امتزاج کی یہ مثال، ناراضگی کے موقع پر کسی بڑے آدمی کا اپنی بڑائی سے صرف نظر کر کے چھوٹے کے آگے جھکنے کی یہ نظیر میں نے صرف آپ میں دیکھی ہے۔ زہد و تقویٰ تو ان کی انفرادی عبادت تھی، لیکن اپنی سیرت میں

اخلاق کے یہ درخشاں نشان جو وہ چھوڑ گئے ہیں وہ پوری قوم کے لئے مشعل راہ ہیں۔

ایک مشہور محدث نے ایک مرتبہ آپ سے فرمایا کہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے لکھا کہ امام رازی وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ ﴿۲۱۹﴾ (الشعراء) سے حضور کے ابوین کریمین کے ایمان پر استدلال فرماتے ہیں، حالانکہ امام رازی نے "تفسیر کبیر" میں اس استدلال کا رد فرمایا ہے، آپ نے فرمایا:

"امام رازی نے "تفسیر کبیر" میں اس عقیدہ کی قطعیت کا رد فرمایا ہے اور "اسرار التنزیل" میں اس آیت سے استدلال کیا ہے، اعلیٰ حضرت نے اسی حوالہ سے لکھا ہے"۔

علامہ عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ تقریر میں فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلہ روح ہیں اور کائنات بمنزلہ بدن ہے۔ تقریر کے بعد فرمایا کہ میری تقریر متن ہے اور اس پر علامہ کاظمی صاحب حاشیہ چڑھائیں گے، آپ نے فرمایا کہ:

"محشی کا کام ہوتا ہے کہ متن کے ایراد اور اعتراض کو دور کرے، علامہ عبدالغفور کی تقریر پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ روح کو بدن کے بہت سے احوال کا علم نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم نہیں جانتے کہ ہمارے بدن میں کتنے اور کتنی اقسام کے جرثومے ہیں۔ خون کے ذرات کی کیفیت کو نہیں جانتے کہ ان میں کتنے امراض کی کیفیت اور استعداد ہے نہیں جانتے، اس کی مقدار کو نہیں جانتے۔ تمام اندرونی اعضاء کی تفصیل اور ان کی کیفیات کو نہیں جانتے، اگر حضور بمنزلہ روح اور کائنات بمنزلہ جسد ہو تو لازم آئے گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کائنات کی بیشتر باتوں کا علم نہ ہو۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علامہ عبدالغفور نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بمنزلہ روح قرار دیا ہے، عین روح نہیں کہا اور مثال، مثال لہٗ کے جمیع امور میں مساوی نہیں ہوتی۔ اس مجلس میں حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر بڑے بڑے اکابر موجود تھے"۔

لاہور کے ایک مشہور عالم نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا کہ قرآن کریم میں ہے: مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (انعام: ۱۶۰) اس کا مطلب ہے کہ ایک نماز دس نمازوں کے برابر ہے۔ اس اعتبار سے اگر کوئی شخص ایک دن کی تمام نمازیں پڑھ لے تو اگر خدانخواستہ وہ آئندہ ۹ دن کی فرض نمازیں نہ بھی ادا کریں تو بظاہر ایک دن کی پڑھی ہوئی ان

نمازوں سے ان کی تلافی ہو جانی چاہیے۔ حضرت کاظمی قدس سرہ العزیز نے جواباً فرمایا:

''ارشاد ربانی کا منشاء یہ ہے کہ مومن کے ایک صالح عمل کا اجر دس گنا عطا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ایک ہی فریضہ کی ادائیگی سے اس جیسے دس فرائض کی فرضیت، وجوب اور تکلیف شرعی ساقط ہو جائے گی۔ دوسرا نکتہ آپ نے یہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے فضل واحسان کے طور پر اگر کسی عمل کا اجر دس گنا عطا ہو تو وہ اس اصل عمل کے مساوی کب قرار پا سکتا ہے جو اپنی اصل میں دس گنا اجر کا موجب ہے''۔

بعض معاصرین سے آپ کا ایک علمی مسئلہ میں اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ حیوانات و بہائم کے ادراک پر حقیقت علم کا اطلاق ہوتا ہے اور آپ فرماتے تھے کہ حیوانات و بہائم کے ادراک پر حقیقت علم کا اطلاق جائز نہیں، البتہ مجازاً جائز ہے اور ''کل شیء یعرفنی انی رسول اللہ'' ایسے اطلاقات کو مجاز پر محمول کرتے تھے۔ آپ کی دلیل یہ تھی کہ علماء اسلام نے علم کی تعریف یہ کی ہے: ''العلم صفة یتجلی بھا المذکور لمن قامت ھی بہ'' اس تعریف میں لفظ ''من'' استعمال کیا گیا ہے اور وہ ذوی العقول کے لئے آتا ہے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ الطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ (النور:۴۱)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام زمین اور آسمانوں اور بالخصوص پرندوں کے ادراک پر علم کا اطلاق کیا ہے اور علم کی وہ تعریف جو ذوالعقول کے ساتھ خاص ہے، وہ علماء کی اصطلاح ہے اور اللہ تعالیٰ ان کی اصطلاح کا تابع نہیں ہے کہ اس اطلاق کو مجاز پر محمول کیا جائے۔ حضرت علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں فی البدیہہ فرمایا کہ:

قرآن مجید لغت عربی پر نازل ہوا ہے: اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (یوسف:۲) اور حیوانات اور بہائم کے ادراک پر لغت عرب اور اسی کے عرف میں علم کا ادراک نہیں ہوتا۔ علامہ خیالی نے حاشیہ ''شرح عقائد'' میں اس کی تصریح کی ہے، اس اعتبار سے یہاں علم کا اطلاق مجازاً ہے۔ ثانیاً تمام آسمان و زمین والوں میں ذوی العقول (مثلاً انسان) بھی ہیں

اور غیر ذوی العقول بھی۔ اللہ تعالیٰ نے ذوی العقول کو غلبہ دے کر تمام آسمان اور زمین والوں کو بمنزلہ ذوی العقول قرار دے کے ان پر علم کا اطلاق کر دیا۔ لہٰذا یہ آیت باب تغلیب سے ہے۔ ثالثاً "علم" کا فاعل "من فی السموات" نہیں بلکہ ضمیر مستتر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہے۔ یعنی "علم اللہ صلوته و تسبیحه"۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ مؤخر الذکر دو جواب معتبر تفاسیر میں بھی لکھے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے ایک مشہور منطقی استاذ نے ایک مرتبہ "خیالی" پڑھاتے ہوئے بیان کیا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی لکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کا کذب ممتنع بالذات ہے "فیما یبلغونه" مولانا نے فرمایا کہ جب انبیاء علیہم السلام کے کلام میں صدق واجب بالذات اور کذب ممتنع بالذات ہے تو اللہ تعالیٰ کے کلام میں صدق بطریق اولیٰ واجب بالذات اور کذب ممتنع بالذات ہوگا، میں نے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کی اس عبارت کے بارے میں استفسار کیا تو آپ نے فرمایا:

"انبیاء علیہم السلام امور تبلیغیہ میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ ان کا نہیں اللہ تعالیٰ کا کلام ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممتنع بالذات ہے"۔

دیوبندی مکتب فکر کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممکن بالذات اور ممتنع بالغیر ہے اور خیر آبادی حضرات اور مکتب فکر بریلی کا نظریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں کذب ممتنع بالذات ہے۔

شیخ اشرف علی تھانوی صاحب اہل دیوبند کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام لفظی بھی ہے اور نفسی بھی۔ کلام نفسی اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، اس میں تو یہ اختلاف ہو نہیں سکتا، رہا لفظی تو وہ مخلوق، حادث اور ممکن ہے اور ممکن کا سلب بھی ممکن ہے۔ لہٰذا امکان کذب ثابت ہو گیا۔ اس اشکال کا جواب میں نے صرف علامہ کاظمی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے، آپ نے فرمایا:

"اس دلیل سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہو سکتا کیوں کہ کلام لفظی کے امکان سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ جائز العدم ہو اور یہ کذب نہیں ہے۔ امکان کذب یہ ہے کہ ایسے کلام کا

صدور ممکن ہو جو خلاف واقع ہو اور کلام لفظی کے امکان سے یہ امکان لازم نہیں آتا"۔

لاہور کے مشہور عالم نے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ امام رازی نے "تفسیر کبیر" میں لکھا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حقیقت میں انسانیت سے زائد ایک حقیقت رکھی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا: پھر تو انسان انبیاء علیہم السلام کے لئے ایک جنس بن جائے گا حالانکہ امام رازی بھی انسان کو جنس نہیں مانتے (حقیقت یہ ہے کہ امام رازی نے حلیمی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو عام انسانوں کی بہ نسبت زیادہ خصوصیات عطا کی جاتی ہیں۔)

شیخ اشرف علی تھانوی سے کسی نے سوال کیا کہ ایک شخص اپنی بیوی اور بہن کے ساتھ سفر پر جارہا تھا، راستہ میں ڈاکوؤں نے اس کی بیوی اور بہن کو قتل کر دیا، بعد میں وہاں سے ایک ولی کا گزر ہوا، اس نے کرامت سے ان دونوں کو زندہ کر دیا۔ لیکن بیوی کے دھڑ کے ساتھ بہن کا سر لگا دیا اور بہن کے دھڑ کے ساتھ بیوی کا سر لگا دیا۔ اب وہ شخص کس کو بیوی قرار دے اور کس کو بہن؟

شیخ تھانوی نے جواب دیا کہ قتل سے ان کا نکاح ختم ہو گیا، اب بیوی کا کیا سوال ہے؟

یہی سوال ایک علمی مجلس میں ایک شخص نے حضرت علامہ کاظمی قدس سرہٗ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ "اعتبار سر اور چہرے کا کیا جاتا ہے"۔ ان صاحب نے تھانوی صاحب والا اعتراض کر دیا کہ قتل سے نکاح تو ختم ہو گیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے کیا ہوتا ہے، وہ سوال تو اب بھی قائم ہے کہ وہ کس عورت کو بہن قرار دے گا؟ جس بدن کے ساتھ سر ہے یا جس کے ساتھ دھڑ ہے۔ قتل سے نکاح ختم ہوا ہے، بہن کا رشتہ تو نہیں ٹوٹا اور چونکہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے متمیز اور مشخص کرنے والا عضو صرف دماغ ہے۔ اس لئے جس بدن کے ساتھ دماغ قائم ہے وہی اس کی بہن ہوگی"۔ وہ صاحب حیران رہ گئے۔

جی چاہتا تھا کہ یہ ذکر ختم نہ ہو اور حضرت شاہ صاحب کی جو یادیں دل میں نقش ہیں اور مجالس میں جو آپ سے استفادہ ہوا ہے اس کا سلسلۂ ذکر دراز ہو جائے۔ لیکن میں آج کل شب و روز "شرح صحیح مسلم" کی تصنیف میں مصروف ہوں، یہ چند سطریں اظہار عقیدت کے طور پر لکھ دیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت علامہ کاظمی قدس سرہٗ کے فیض کو تا قیامت پائندہ رکھے اور ہم ایسوں کو اپنی زندگی کے اندھیروں میں آپ کی سیرت کے چراغوں سے روشنی حاصل کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ حضرت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو والہانہ عشق تھا اس سے ہم حرماں نصیب لوگوں کو حظ وافر عطا فرمائے۔ اخلاق کی بلندی کے جو انمٹ نقوش آپ نے چھوڑے ہیں آج کے مشائخ کو انہیں اپنانے کی ضرورت ہے اور مسلک کی بے لوث خدمت اور انتھک مطالعہ کی جو میراث آپ نے چھوڑی ہے آج کے علماء کو اسے حرز جان بنانے کی ضرورت ہے۔



علامہ مفتی محمد حسین نعیمی

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے

مجاہد ملت، نقیب اہل سنت حضرت علامہ مفتی محمد حسین نعیمی دام ظلہ برصغیر کے علمی اور سیاسی حلقوں کی معروف اور ممتاز شخصیت ہیں۔ تبلیغ دین اور اشاعت مسلک میں انہوں نے ہمیشہ مثبت طریقہ کار کو اپنایا اور اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل: ۱۲۵) کے راستہ پر گامزن رہے۔ مخالفین کے ساتھ ان کا رویہ مخاصمانہ نہیں، ہمدردانہ ہوتا ہے۔ وہ اہل بدعت اور گمراہ فرقوں کے ساتھ تشدد اور منافرت کے سلوک کی جگہ خیر خواہی سے انہیں حق و صداقت کی تلقین کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے اسی طرز تبلیغ کی وجہ سے کئی بیگانے اپنے اور کئی مخالف موافق ہو گئے۔

''افضل الجهاد من قال كلمة حق عند سلطان جائر'' کی ہدایت کے مطابق حضرت مفتی صاحب نے ہر دور کے حکمرانوں کو ان کی غلط روش پر ٹوکا، لیکن بطور مخاصم اور حریف نہیں بلکہ خیر خواہ اور حلیف کی حیثیت سے۔ انہوں نے محراب و منبر کو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی امانت سمجھا۔ ان کی تائید نہ کسی ذاتی منفعت کے لئے ہوتی ہے نہ تردید کسی سیاسی مقصد براری کی خاطر۔

حضرت مفتی صاحب کی شخصیت پروقار، وضع قطع سادہ اور مزاج منکسر اور متواضع ہے۔ علمی تبحر اور سیاسی شکوہ کے باوجود ہر قسم کا کام کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کدال اور تیشہ سے جامعہ نعیمیہ کی بنیادوں کے لئے زمین کھودی ہے۔ مسجد کی دیواروں پر پلستر کیا ہے۔ مئی اور جون کی تیز دھوپ میں سارا سارا دن جامعہ کے گنبد و مینار پر کام کیا ہے۔ وہ اگر اینٹیں اٹھا رہے ہوں تو ایک جفاکش مزدور، دیوار بنا رہے ہوں تو ایک قابل مستری، جامعہ کا نقشہ بنائیں تو ایک ماہر آرکیٹیکٹ (Architect) اور اگر تفسیر و حدیث پڑھائیں تو بیضاوی اور

بیہقی کے مسند نشین معلوم ہوتے ہیں اور اگر وہ سامعین کے ہجوم میں ہوں تو ایک شعلہ نوا خطیب، میدان سیاست میں ہوں تو ایک بے باک نقیب، مستفسرین کے لئے ژرف نگاہ مفتی، طلبہ کے لئے سراپا شفقت، احباب میں سرتاپا خلوص اور ایوان حکومت میں بے خوفی اور بے باکی کا پیکر اور عزم واستقلال کا کوہ گراں معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت مفتی صاحب بے حد محنتی اور فعال شخصیت کے مالک ہیں، ان کی پوری زندگی ملک وملت کے لئے عمل پیہم اور جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ حال کے نوجوانوں، جاہ طلب واعظوں اور مست حال درگاہ نشینوں کو کردار سازی اور ایک با مقصد حیات کے لئے مفتی صاحب جیسے عظیم رجال کی زندگیوں میں جھانکنے کی ضرورت ہے "ضیائے حرم" نے عظمت کے ان میناروں کو روشناس کرانے کے لئے ہمیشہ اہم خدمات انجام دیں ہیں۔ اس وقت جب کہیں ظلم وتشدد کے اندھیرے ہیں اور کہیں فحاشی اور بے راہ روی ہے، کہیں قناعت اور یاس کی تاریکیاں ہیں اور کہیں حرص وآز۔ ان اندھیروں کو دور کرنے کے لئے "ضیائے حرم" کبھی سیرت اسلاف کی یادوں کے دیئے روشن کرتا ہے اور کبھی حال کے بزرگوں کے علم و عمل کی ضیائیں بکھیرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں محترم عابد نظامی نے مجھ سے کہا کہ حضرت کاظمی شاہ صاحب کے بعد اس دور کی ایک اور عظیم شخصیت حضرت علامہ مفتی محمد حسین نعیمی کا سوانح خاکہ بھی قارئین "ضیائے حرم" کے لئے پیش کردوں۔

میں حضرت مفتی صاحب قبلہ کا ایک ادنیٰ شاگرد ہوں اور تقریباً پچھلے تیرہ برس سے مفتی صاحب کے زیر عاطفت زندگی بسر کررہا ہوں۔ اس عرصہ میں مفتی صاحب قبلہ کی بے شمار علمی اور عملی خدمت اور ان کی سیرت کی تابناک جھلکیاں میرے مشاہدہ میں آئیں۔ مختلف علمی موضوعات پر ان کے مذاکرات اور متعدد جگہ ان کی تقاریر سننے کا موقعہ ملا۔ اخبارات میں ان کے بیانات، انٹرویوز اور ان کی شخصیت پر فیچر (Feature) پڑھے۔ انہیں سلاخوں کے پیچھے بھی دیکھا اور عدالت کے کٹہرے میں بھی۔ حلقۂ یاراں میں، تلامذہ کے جھرمٹ میں اور اساتذہ کی خدمت میں ہر جگہ اور ہر موقع پر ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا۔ اس تمام مشاہدہ اور مطالعہ کی داستان تو بہت طویل ہے۔ اختصار کے ساتھ اس داستان کی

چند سرخیاں قارئین ''ضیائے حرم'' کی خاطر پیش خدمت ہیں۔

ابتدائی حالات

حضرت علامہ مفتی محمد حسین نعیمی کا سلسلۂ نسب ترک کے سالار مسعود غازی سے ملتا ہے۔ حضرت مسعود غازی چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان میں بغرض جہاد آئے، آپ نے پرتھوی راج کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا اور ہر جگہ داد شجاعت دی۔ حضرت مسعود غازی کے ساتھ آئے ہوئے ترک سنبھل میں آباد ہو گئے اور اب سنبھل میں انہیں کی اکثریت ہے۔ مفتی صاحب اسی ترک خاندان کے ایک بزرگ ملا تفضل حسین کے فرزند گرامی ہیں۔ آپ ۶ مارچ ۱۹۲۳ء میں سنبھل کے ایک محلہ دیپا سرائے میں پیدا ہوئے۔ دو سال کی عمر میں حضرت مفتی صاحب کی والدہ ماجدہ فوت ہو گئیں اور آپ کی پرورش کی ذمہ داری آپ کی بڑی بہن نے سنبھال لی۔

تعلیمی مراحل

مفتی صاحب نے ناظرہ قرآن شریف اور پرائمری تک تعلیم سنبھل میں حاصل کی اور آپ کی عمر تیرہ سال کو پہنچی تو آپ کے بہنوئی حضرت مولانا محمد یونس رحمۃ اللہ علیہ آپ کو مراد آباد لے آئے اور جامعہ نعیمیہ میں داخل کرا دیا۔ جامعہ نعیمیہ میں آپ نے حضرت مولانا محمد حسین صاحب سے فارسی پڑھی، اس کے بعد ابتدائی صرف ونحو مولانا شمس الحق بہاری سے، پھر ''ہدایۃ النحو'' اور ''قدوری'' وغیرہ حضرت مفتی امین الدین اور ''کافیہ'' اور ''مختصر معانی'' وغیرہ مولانا وصی احمد سے پڑھیں، حضرت مفتی احمد یار خاں قدس سرہٗ سے ''شرح جامی'' کا سماع کیا۔ مشکوٰۃ، جلالین وغیرہ کا درس مولانا محمد یونس صاحب سے لیا۔ ''بخاری شریف'' کے علاوہ صحاح ستہ کی باقی کتب تاج العلماء حضرت مفتی محمد عمر نعیمی سے پڑھیں اور حضرت صدر الافاضل سے آپ نے منطق میں ''قاضی'' اور ''حمد اللہ'' فلسفہ میں ''صدرا'' اور ''شمس بازغہ'' علم کلام میں ''شرح عقائد'' اور ''خیالی'' حدیث میں ''بخاری'' اور تفسیر میں ''بیضاوی شریف'' پڑھی۔

دورۂ حدیث میں مفتی صاحب کے شرکاء میں حضرت صاحبزادہ پیر محمد کرم شاہ

الازہری، مولانا خدا بخش اور مولانا محمد علی صاحب کے اسماء قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ حضرت مفتی حبیب اللہ رحمۃ اللہ علیہ، مخدوم معین الدین مرحوم اور مولانا ریاض الحسن صاحب بھی مفتی صاحب کے قابل قدر ساتھیوں میں سے تھے۔

زمانہ تدریس

حضرت مفتی صاحب نے ۱۹۴۱ء میں سند فراغت حاصل کی، تین ماہ بعد آپ کو حضرت صدر الافاضل نے علامہ سید ابوالبرکات کی دعوت پر حزب الاحناف میں تدریس کے لئے لاہور بھیج دیا۔ یہاں آپ نے معقول اور منقول کی متوسط کتب پڑھانے سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ آپ نے حزب الاحناف میں چھ سال تدریسی خدمات انجام دیں اور اس عرصہ میں متعدد طلبہ نے آپ سے اکتساب فیض کیا جو بعد میں علم و فضل کے آسمان پر کہکشاں بن کر چمکے۔

حزب الاحناف چھوڑنے کے بعد ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک آپ نے لاہور کی قدیمی دینی درس گاہ جامعہ نعمانیہ میں تدریس کی۔ جامعہ نعمانیہ میں آپ نے ہر قسم کی کتابیں پڑھائیں اور طلبہ کی وافر تعداد نے آپ سے فیض حاصل کیا۔ جن میں اکثر حضرات کا بعد میں نامور علماء میں شمار ہوا۔

جامع مسجد دالگراں کی خطابت

۱۹۴۱ء میں جب آپ لاہور آئے، اسی وقت چوک دالگراں کی جامع مسجد میں امام کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہو گیا تھا۔ بعد میں کثرت مشاغل کی وجہ سے امام اور رکھ لیا گیا اور خطبۂ جمعہ اور صبح کا درس قرآن آپ کے ذمہ رہ گیا۔ درس میں آپ فقہی مسائل اور صوفیانہ نکات کے علاوہ مسائل حاضرہ پر بھی سیر حاصل بحث کیا کرتے۔ تیرہ سال میں آپ نے قرآن مجید کا درس حرفاً حرفاً مکمل کیا اور اب یہ سلسلہ دوبارہ شروع کیا ہوا ہے۔

جمعہ کے خطبہ میں آپ فقہی مسائل بیان کرتے، سیاسیات حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور حکام وقت کی غلط کاریوں پر برملا ٹوکتے۔ آپ کو اپنی راست گفتاری اور حق گوئی کی بنیاد پر بارہا مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ آپ نے مصائب جھیلے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت

کیں۔ وقت کے ہر چیلنج کو قبول کیا، لیکن آواز حق سنانے سے دست کش ہونا گوارا نہیں کیا۔

۱۹۶۱ء میں محکمہ اوقاف قائم ہوا اور جامع مسجد داتگراں بھی اوقاف کے زیر انتظام آ گئی۔

۱۹۶۲ء میں آپ کو محکمہ اوقاف کی طرف سے ڈسٹرکٹ خطیب مقرر کیا گیا۔ چار سال تک آپ اس منصب پر کام کرتے رہے۔ لیکن آپ کی حق گوئی اور بے باکی حکومت کی پالیسیوں سے موافقت نہ کر سکی اور اس پاداش میں آپ کو ڈسٹرکٹ خطیب کے عہدہ سے الگ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ کئی بار آپ کی ترقیاں روکی گئیں، مراعات ختم کی گئیں، معطل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن ان میں سے کوئی چیز آپ کو پیغام حق سنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

تحریک ختم نبوت

۱۹۵۳ء میں پاکستان کے علماء نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور اس سلسلہ میں کراچی سے خیبر تک تمام پاکستان میں جلسے، جلوس اور مظاہرے شروع کر دیئے گئے۔ حضرت مفتی صاحب قبلہ بھی اس تحریک کے سرگرم مجاہد تھے۔ آپ کو چوک داتگراں کی ایک تند و تیز تقریر کی بناء پر گرفتار کر کے بوسٹل جیل لاہور میں رکھا گیا۔ تین کرنلوں کی زیر قیادت فوجی عدالت میں مقدمہ چلا۔ ملک کے معروف اور نامور وکیل خضر تمیمی نے پیروی کی۔ پولیس کی طرف سے پیش کردہ گواہ متضاد بیانات کی وجہ سے جھوٹے ثابت ہوئے اور آپ کو بری کر دیا گیا۔

تحریک ختم نبوت کے بطل جلیل مولانا عبدالستار خاں نیازی کو کچھ اشتہارات مطلوب تھے، پریس پر پابندی تھی، اس موقعہ پر حضرت مفتی محمد حسین نعیمی اور علامہ محمود احمد رضوی نے اپنی خدمات پیش کیں۔ رضوی صاحب نے سائیکلوسٹائل مشین مہیا کی اور مفتی صاحب نے کاغذ۔ ان دونوں حضرات کی مشترکہ کاوشوں سے ختم نبوت کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے اشتہارات چھاپ لیے۔ اس جرم میں مفتی صاحب کو علامہ رضوی صاحب کے ساتھ دوبارہ گرفتار کر کے شاہی قلعہ لاہور میں رکھا گیا۔

جامعہ نعیمیہ

مارشل لاء کی قید سے رہا ہونے کے بعد مفتی صاحب نے ۱۹۵۳ء میں جامع مسجد

چوک دالگراں میں جامعہ نعیمیہ قائم کیا۔ اس موقع پر مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری، مولانا عبدالغفور اور حافظ محمد عالم صاحب نے مفتی صاحب کے ساتھ قابل قدر تعاون کیا۔ حافظ محمد عالم صاحب چھ ماہ تک، مولانا ازہری ایک سال تک اور مولانا عبدالغفور دو سال تک بلامشاہرہ پڑھاتے رہے۔

جامعہ نعیمیہ بتدریج ترقی کے مراحل طے کرتا رہا اور طلبہ اور عملہ کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ جامعہ کے تعلیمی اور تبلیغی مقاصد کے پیش نظر جامع مسجد چوک دالگراں ناکافی محسوس ہونے لگی۔ مفتی صاحب چاہتے تھے کہ اہل سنت کا ایک وسیع، شاندار اور مثالی دارالعلوم بنایا جائے۔ اس مقصد کے تحت ۱۹۵۸ء میں جامعہ نعیمیہ کو عیدگاہ گڑھی شاہو میں منتقل کر دیا۔ یہاں مفتی صاحب نے آٹھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے دس سال کی شبانہ روز مشقت، لگاتار جدوجہد اور محنت شاقہ سے آٹھ کنال جگہ میں ایک قابل رشک اور پرشکوہ دارالعلوم کی سہ منزلہ عمارت تعمیر کی۔ نیز دارالعلوم میں ایک وسیع وعریض جامع مسجد تعمیر کی جس میں شیشہ کی تراش خراش سے قرآن کریم کی آیات کندہ کی گئی ہیں۔ بالائی منزل میں گنبد کے نیچے شعبہ تصنیف وتالیف کے تحت ایک عظیم الشان لائبریری ہے جس میں ہر قسم کے علوم وفنون اور عربی، فارسی اور اردو زبان میں پچاس ہزار روپیہ کی کتابیں آچکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

جامعہ نعیمیہ کی تعمیر میں مفتی صاحب کی لگن اور شوق کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ محراب مسجد سے لے کر وضوخانہ تک کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جس کے بنانے میں مفتی صاحب نے خود کام نہ کیا ہو۔ گارا بنایا، اینٹیں لگائیں، پلستر کیا۔ غرض نقشہ سے لے کر تکمیل تک ہر مرحلہ میں مفتی صاحب نے جامعہ کی تعمیر میں کاریگروں اور مزدوروں کے ساتھ مل کر شانہ بشانہ کام کیا ہے اور بجا طور پر یہ دارالعلوم مفتی صاحب کے کارناموں کی جلی سرخیوں میں شمار ہوتا ہے۔

جمعیت سے وابستگی

جمعیت العلماء پاکستان کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ۱۹۵۴ء میں جامع مسجد چوک دالگراں

میں میٹنگ (Meeting) ہوئی جس میں مفتی صاحب کو مغربی پاکستان کا ناظم مقرر کیا گیا۔ مفتی صاحب، مولانا ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ کاظمی صاحب مدظلہ کے مشوروں سے جمعیت کی خدمات انجام دیتے رہے۔

۱۹۶۱ء میں علامہ ابوالحسنات کا وصال ہو گیا۔ ان کے وصال کے بعد مولانا عبدالغفور ہزاروی صاحب نائب صدر ہونے کی وجہ سے صدارت کے مستحق تھے۔ لیکن خلاف ضابطہ صاحبزادہ فیض الحسن جمعیت کی صدارت پر قابض ہو گئے۔ صاحبزادہ صاحب کے دور صدارت کے چھ سال تک جمعیت کا استحصال ہوتا رہا۔ صاحبزادہ صاحب خود تو نازنین سرکار کے پاؤں کی مہندی بنے ہوئے تھے، جمعیت کو بھی دربار میں پیش کرنے لگے۔ سنیوں کے بے شمار مسائل تھے جنہیں جماعتی سطح پر حل کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن صاحبزادہ صاحب حکومت کی تائید کے سوا اور کوئی کام کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مفتی صاحب کے لئے دیر تک ان حالات کو ایک خاموش تماشائی کی حیثیت سے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ پس ۱۹۶۸ء میں انہوں نے غیور اور باکردار علماء کے ساتھ مل کر جمعیت کی تطہیر کی مہم شروع کر دی۔ بالآخر مفتی صاحب کی کوششوں سے جمعیت کی تشکیل جدید کی گئی اور اس کا کھویا ہوا وقار بحال ہو گیا۔

حق گوئی و بے خوفی

حضرت مفتی صاحب قبلہ ان بقیۃ السلف علماء کی یادگار ہیں جنہوں نے مصلحت وقت کو کبھی ضمیر کی آواز پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ ان کی حریت فکر کو نہ کوئی ترغیب متاثر کر سکتی اور نہ کوئی ترہیب انہیں ان کے موقف سے ہٹا سکی۔ صدر ایوب نے انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد کہا: ان کی زیر نگرانی جیسے شاندار انتخابات ہوئے ہیں ایسے انتخابات صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی نہیں ہوئے تھے۔ صدر ایوب کے اس دل آزار بیان پر پورے ملک میں کسی طرف سے بھی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا، ان کے اس گستاخانہ بیان پر اگر کسی شخص نے گرفت کی تو وہ مفتی صاحب قبلہ کی ذات گرامی تھی۔ آپ نے اس موقع پر تمام اخبارات کو ایک تحریری بیان بھیجا جس میں صدر ایوب کے اس بیان کی مذمت کی گئی تھی۔

نوائے وقت لکھتا ہے:

مشہور عالم دین اور جامعہ نعیمیہ کے سربراہ مفتی محمد حسین نعیمی نے آج ایک بیان میں صدر ایوب کی تقریر کے اس حصہ پر سخت رنج و اندوہ کا اظہار کیا ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ بنیادی جمہوری نظام کے تحت جیسے شاندار انتخابات پاکستان میں ہوئے ہیں ایسے شاندار انتخابات تو خلفاء راشدین کے زمانہ میں بھی نہیں ہوئے تھے۔ مولانا نعیمی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ ان کے اس بیان سے خلفاء راشدین کی اہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ موجودہ انتخابات پر ہر طرف سے آئے دن یہ الزام لگائے جا رہے ہیں کہ ان میں کھلے بندوں دھاندلی، حکام کی مداخلت، بداعمالی اور غنڈہ گردی ہوئی ہے اور بے شمار جعلی ووٹ ڈالے گئے ہیں۔ حالانکہ حضرات صحابہ کرام کے زمانہ میں کٹر مخالفین کو بھی ایسی صورت کا تصور نہ ہو سکا۔ مولانا نے صدر ایوب کو تلقین کی ہے کہ وہ خلفاء اسلام کے بارے میں اس قسم کے ریمارکس (Remarks) پر اللہ تعالیٰ سے توبہ کریں اور مسلمانوں سے معافی مانگیں۔

(روزنامہ نوائے وقت ۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء)

۱۹۶۶ء کے اواخر میں صوبائی حکومت نے تعلیمی اداروں میں رقص و موسیقی پر پابندی لگا دی مگر صدر ایوب کی مرکزی حکومت نے اس پابندی کو احمقانہ فعل قرار دے کر ختم کر دیا۔ مرکزی حکومت کے اس فیصلہ پر احتجاج کرنے کے لئے جنوری ۱۹۶۷ء کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ مفتی صاحب نے اس جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

صدر ایوب ایک مسلمان شخص ہیں اور کسی مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ رقص و موسیقی کو فروغ دینے کی کوشش کرے۔ نیز صدر ایوب ایک جمہوری ملک کے صدر ہیں اور رقص و موسیقی پر پابندی عوام کے نمائندوں نے لگائی ہے اور ایک جمہوری سربراہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عوامی نمائندوں کے فیصلہ کو رد کر دے۔ پھر فرمایا: صدر ایوب ایک دانشور ہیں اور کسی صاحب عقل و فراست سے یہ متصور نہیں ہو سکتا کہ وہ رقص و موسیقی کے ذریعے نوجوان طلبہ و طالبات کے اخلاق کو بگاڑنے میں کوشاں ہو۔ مزید یہ کہ صدر ایوب نسلاً پٹھان ہیں

اور اس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو عورتوں کی عزت و ناموس کی خاطر جان پر کھیل جاتے ہیں، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے دختران ملت کو سٹیج پر آکر رقص کرنے کا کیوں مشورہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ سربراہ ملک قوم کے لئے ایک شفیق باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ قوم کی لڑکیوں کو اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتا ہے۔ پھر عقل حیران ہے کہ ایک باپ اپنی بیٹیوں کو رقص کے لئے سٹیج پر کیسے پیش کرسکتا ہے۔

۱۹۶۷ء میں ۲۹ رمضان کو پورے پاکستان میں کہیں چاند نظر نہیں آیا، مگر رات کو ریڈیو سے چاند کی رؤیت اور جمعرات کی عید کا اعلان کردیا گیا۔ علماء کی غالب اکثریت نے حکومت کے اس اعلان سے اتفاق نہیں کیا اور تمام ملک میں مجموعی طور پر جمعرات کے دن روزہ رکھا گیا۔ مفتی صاحب نے حکومت کے اعلان پر عید نہ کرنے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

عید تہوار ہی نہیں عبادت بھی ہے۔ عبادت کے پہلو کو غالب رکھنے کے لئے اسلام کے اصولوں اور ضابطوں پر عمل کرنا ضروری ہے، انہوں نے کہا: عید کے چاند کے بارے میں ہمیں رؤیت ہلال کمیٹی پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اختلاف تو اس طریقہ کار سے ہے جو چاند کے اعلان کے بارے میں اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا: رؤیت ہلال کمیٹی نے ٹیلی فون کی اطلاع پر چاند کا اعلان کردیا اور شہادت ضروری نہیں سمجھی اور ٹیلی فون کی شہادت شرعاً و قانوناً دونوں طرح سے قابل قبول نہیں ہے۔ (روزنامہ امروز ۲۵ جنوری ۱۹۶۷ء)

اس بیان کے چار دن بعد ۲۹ جنوری ۱۹۶۷ء کو مفتی صاحب کو چار دیگر علماء کے ساتھ گرفتار کرکے دو ماہ کے لئے نظر بند کردیا گیا۔

رمضان المبارک کے مہینہ میں صدر ایوب اپنے حواری وزراء کے ساتھ تاشقند گئے اور وہاں ایک ظہرانہ میں شرکت کی۔ مفتی صاحب نے اپنے جمعہ کے خطبہ میں اس ظہرانہ پر سخت تنقید کی اور روزہ نہ رکھنے اور احترام رمضان پامال کرنے پر صدر ایوب اور دوسرے شرکاء دعوت کی سخت مذمت کی۔ سٹی مجسٹریٹ نے آپ کو طلب کیا اور کہا، صدر ایوب مسافر تھے اور مسافر کے لئے روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔ آپ نے فرمایا: روزہ نہ رکھنے کی

رخصت ہے، سر عام دعوت اڑانے اور تقدس رمضان مجروح کرنے کی اجازت تو نہیں ہے۔
سٹی مجسٹریٹ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

حالات حاضرہ پر بصیرت

مفتی صاحب دور رس نگاہ رکھتے تھے اور روایتی علماء کی طرح صرف فقہی مسائل کے بیان پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ملکی اور بین الاقوامی مسائل پر بھرپور بصیرت رکھتے ہیں اور حسب ضرورت اور حسب موقع ملک اور بیرون ملک ہونے والے واقعات پر تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ مارچ ۱۹۶۸ء میں لاہور کے ایک مقامی کالج نے طالبات کی ایک ہاکی ٹیم کو بھارت میں نمائشی میچ کھیلنے کے لئے بھیجا۔ حضرت مفتی صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

"اخباری اطلاعات کے مطابق دختران پاکستان نے یہ میچ عیدالاضحیٰ کے مبارک اور مسعود موقع پر کھیلا جسے ہزارہا بھارتی تماشائیوں نے دیکھا۔ آپ نے کہا: اس میچ سے اسلامی تقاضوں اور قومی غیرت کو مجروح کیا گیا ہے۔ آپ نے پوچھا: کیا آئین پاکستان جسے کتاب وسنت کا آئینہ دار کہا جاتا ہے، دشمنان اسلام کے سامنے دختران اسلام کے ایسے نمائشی مظاہرہ کا روادار ہو سکتا ہے؟" (نوائے وقت ۱۳ مارچ ۱۹۶۸ء)

۱۹۷۰ء میں یحییٰ حکومت نے جب مرکزی بجٹ پیش کیا تو مفتی صاحب نے اس پر سخت تنقید کی اور کہا کہ اس بجٹ میں جس طرح ٹیکس لگائے گئے ہیں اس سے صرف جاگیردار طبقہ کو تحفظ ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی تخریبی عنصر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بجٹ سازی میں دخل انداز ہو کر عوام کے اقتصادی اضطراب میں اضافہ کر کے سوشلسٹ انقلاب کے لئے راستہ ہموار کرنا چاہتا ہے۔

(بہ حوالہ روزنامہ مشرق لاہور، ۱۷ جولائی ۱۹۷۰ء)

علماء سے مذاکرات

جس زمانہ میں مولانا منظور احمد نعمانی کے مناظروں کی ان کے اپنے حلقہ کے اندر بڑی شہرت تھی اسی دوران مفتی صاحب کی ان سے ریل میں ملاقات ہو گئی۔ مفتی صاحب

نے ان سے کہا: مولانا! کیا آپ نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ آپ جب بھی مناظرہ کرتے ہیں تو آپ کا موقف حضور ﷺ کی ذات میں کسی نہ کسی وجہ سے ثبوت نقص ہوتا ہے۔ آپ جب بھی مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کی نظر کو کسی نہ کسی وجہ سے حضور کے نقص کی تلاش ہوتی ہے کہ فلاں چیز پر حضور کو قدرت نہ تھی۔ کیا ایک امتی کا اپنے رسول کے ساتھ یہی انداز فکر ہوتا ہے؟ نہ جانے یہ اس گفتگو کا اثر تھا یا اور کوئی سبب، مولانا نعمانی نے اس واقعہ کے بعد مناظرے کرنے چھوڑ دیئے۔

ایک مرتبہ ایک مرزائی عالم سے گفتگو ہوئی، اس نے اجرائے نبوت پر بات چھیڑنی چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ اجرائے نبوت سے مرزا کا نبی ہونا تو لازم نہیں آتا، اگر بالفرض اجرائے نبوت ثابت ہو بھی جائے تب بھی اس پر گفتگو کرنی پڑے گی کہ مرزا نبی ہو سکتا ہے یا نہیں تو کیوں نہ پہلے مرزا کی نبوت پر گفتگو کر لی جائے۔ پھر آپ نے فرمایا: جس شخص کے کلام میں تضاد، جس کی ہر پیش گوئی غلط اور جھوٹی، جس کے اخلاق و عادات میں فسق و فجور، جس کی زندگی کفار کی مدد کے سہارے اور ان کی خوشامد میں گزری، جس نے نبیوں پر طنز اور استہزاء کے فقرے چسپاں کئے اور جو شخص ساری عمر صحابہ کرام اور اہل بیت عظام کی شان میں بدگوئی کرتا رہا، ایسا شخص تو ایک باکردار مسلمان بھی نہیں کہلایا جا سکتا چہ جائیکہ اس کے بارے میں نبوت کا عقیدہ رکھا جائے، مرزائی کے پاس اس بات کا تو کوئی جواب نہ تھا، وہ بار بار اجرائے نبوت پر گفتگو کے لئے اصرار کرتا رہا۔ بالآخر آپ نے بحث کو ختم کرنے کے لئے اجرائے نبوت پر گفتگو کی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو خاتم النبیین فرمایا ہے اور حضور نے اس کی تفسیر فرمائی: ''لا نبی بعدی ولا رسول بعدی'' ''میرے بعد نہ کسی نبی کی بعثت ہو سکتی ہے نہ رسول کی''۔ اس نے کہا: بعض لوگوں کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ حضور کے بعد غیر تشریعی نبی آ سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا: حضور ﷺ کی حدیث کے مقابلہ میں تم بعض لوگوں کے اقوال پیش کرتے ہو۔ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ حضور کے بعد کوئی غیر تشریعی نبی آ سکتا ہے تو کوئی صحیح مرفوع متصل حدیث لاؤ جو ''لا نبی بعدی ولا رسول بعدی'' کے عموم کو توڑ سکے۔ بعض لوگوں کے اقوال میں تو یہ طاقت نہیں کہ وہ حدیث رسول

کے مزاحم ہو سکیں۔ وہ کہنے لگا: کیا آپ بزرگان امت کو نہیں مانتے؟ آپ نے فرمایا: تم بزرگان امت کی بات کرتے ہو، حضور کے فرمان کے مقابلہ میں اگر کسی نبی کا قول بھی آ جائے تو میں وہ بھی نہیں مانتا، وہ کہنے لگا: حضور نے اپنی مسجد کو خاتم المساجد فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا: دکھلاؤ، لیکن وہ سعی بسیار کے باوجود حدیث نہ دکھا سکا۔

علمی فوائد

حضرت مفتی صاحب قبلہ گزشتہ تیس برس سے تفسیر و حدیث پڑھا رہے ہیں، وہ کسی آیت کی تحقیق کے وقت تمام معتبر تفاسیر کو سامنے رکھتے ہیں۔ پھر ان تفاسیر کی روشنی میں خود غور و فکر کر کے اس سے فوائد اور نکات اخذ کرتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیہ مبارکہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء: ۵۹) کی تفسیر کرتے ہوئے ایک مرتبہ آپ نے فرمایا:

اُولِي الْاَمْرِ سے علماء اور مجتہدین مراد ہیں، اب یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے ذکر کے ساتھ لفظ اَطِيْعُوا کا ذکر کیا گیا ہے اور اُولِي الْاَمْرِ کے ساتھ اَطِيْعُوا کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت مستقل ہو گی اور ائمہ مجتہدین کی اطاعت مستقل نہیں، بلکہ ان احکام میں ہو گی جو اللہ اور رسول کے کلام سے مستنبط ہوں گے۔ پھر فرمایا: یہاں تین چیزیں ہیں: تقنین، تبیین اور تفصیل۔ تقنین کا مطلب ہے: قانون بنانا اور یہ اللہ تعالیٰ کا حق ہے، کیونکہ قانون وہ شخص بنا سکتا ہے جو مالک ہو اور ملکیت چار طریقوں سے حاصل ہوتی ہے: خلق سے، خرید سے، ہبہ سے اور وراثت سے اور خرید، ہبہ اور وراثت خلق کی طرف رجوع کرتے ہیں، کیونکہ جب تک کوئی چیز پیدا نہ کی جائے نہ اس کو خریدا جا سکتا ہے نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی کو اس کا وارث بنایا جا سکتا ہے اور جب ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے تو وہی ہر چیز کا علی الاطلاق مالک ہے اور اسی کو ہر چیز کے بارے میں قانون بنانے کا حق پہنچتا ہے اور "ان الحکم الا للہ" کا بھی یہی مطلب ہے اور تبیین کا مطلب ہے: اللہ تعالیٰ کے قوانین کی وضاحت کرنا اور نبی چونکہ اللہ تعالیٰ کا مزاج آشنا اور اس کے منشاء کو پہچاننے والا ہوتا ہے اس

لیے اللہ تعالیٰ کے قانون کی وضاحت کرنا بھی اس کا منصب ہے۔ وہی بتا سکتا ہے کہ فلاں اطلاقی شرعی فلاں فلاں قید سے مقید ہے اور فلاں کلیہ سے کون کون سا جزئیہ مستثنیٰ ہے اور تفصیل کا مطلب ہے: قرآن اور حدیث سے مزید احکام کا استنباط کرنا، کلیات شرعیہ سے جزئیات کا استخراج اور وجود علت حکم کی بناء پر حکم لازم کرنا اور یہ ائمہ اور مجتہدین کا کام ہے۔

ایک مرتبہ ضرورت نبوت پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا مالک ہے اور مالک حقیقی کے مملوک پر تین حق ہوتے ہیں: عبادت، اطاعت اور خوشنودی۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ کوئی حکم بھی نازل نہ فرماتا، تب بھی مملوک ہونے کی حیثیت سے ہم پر لازم تھا کہ ہم اس کی تعظیم علی وجہ العبادۃ کرتے۔ اسی طرح اس کے احکام کی اطاعت کرنا اور اس کی رضا جوئی اور خوشنودی حاصل کرنا بھی بحیثیت مخلوق ہم پر لازم تھا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کے احکام اور اس کی خوشنودی معلوم کرنے کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ اپنی کتاب نازل فرمائے یا کوئی ترجمان بھیجے یا بندوں کو الہام اور وحی کے ذریعے مطلع کرے۔ اگر کتاب نازل فرمائے تو جو شخص حامل کتاب ہوگا وہی صاحب نبوت ہوگا اور اگر ترجمان بھیجے تو جو شخص اللہ اور بندوں کے درمیان ترجمان ہوگا وہی نبی ہوگا اور اگر اللہ تعالیٰ بندوں کو اپنے الہام کے ذریعے احکام سے مطلع کرے تو یہ الہام کل انسانوں پر ہوگا یا بعض پر، اگر کل پر الہام ہوگا تو نظام عالم فاسد ہو جائے گا کیونکہ ہر شخص اپنی جگہ پر مستقل ہوگا اور کوئی کسی کا پابند نہیں ہوگا۔ نیز ہر شخص اپنے جرائم اور بداعمالیوں کے جواز پر اپنے الہام کو حجت بنائے گا اور کوئی کسی کا مواخذہ نہ کر سکے گا اور اگر بعض انسانوں پر الہام ہو تو اسے اپنے الہام کو باقی لوگوں سے منوانے کے لئے کسی معجزہ اور دلیل کی ضرورت ہوگی اور جو شخص صاحب وحی والہام ہو اور معجزہ رکھتا ہو اسی کو اصطلاح شرع میں نبی کہتے ہیں۔

مجلس استفسار

مفتی صاحب کی علمی ثقاہت تمام لوگوں کے درمیان مسلم ہے، آپ کی خدمت میں ملک اور بیرون ملک سے بے شمار استفسار اور استفتاء بغرض جواب آتے رہتے ہیں۔ مراسلت اور خط و کتابت کے علاوہ بہت سے لوگ بالمشافہ استفادہ بھی کرتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کے لئے کل کا اور کل کائنات کا علم ماننا شرک ہے، کیونکہ یہ علم اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، آپ نے فرمایا کہ کل کائنات کے واقعات کو بذاتہٖ جاننا اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے، ورنہ قضاء وقدر کے فرشتوں کو شب قدر میں ایک سال کے واقعات کا علم قبل از وقت ہو جاتا ہے۔ اور جو فرشتہ رحم مادر میں بچہ کا رزق، اس کا عمل اور اس کا انجام لکھتا ہے۔ اس کو قبل از وقت اس کی پوری زندگی کے حالات معلوم ہو جاتے ہیں، یہ لوگ ایک دن کے واقعات قبل از وقت جاننے کو شرک کہتے ہیں اور ان فرشتوں کو انسان کی پوری زندگی کے احوال قبل از وقت معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کی زندگی سو سال ہو تو سو سال پہلے کا علم ہو گیا اور اگر دو سو سال ہو تو دو سو سال پہلے کا علم ہو گیا۔ حضرت نوح نے چودہ سو برس زندگی گزاری تو فرشتوں کو چودہ سو برس پہلے ان کے تمام حالات معلوم ہو گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو ہزار سال سے زندہ ہیں اور حیات خضر تو ظن وتخمین کی سرحدوں سے بھی ماوراء ہے۔ اب سوچئے کہ کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ یہ فرشتے ہزاروں سال پہلے کے واقعات جان لیں تو تسلیم اور حضور ایک دن پہلے کی بات جان لیں تو وہ شرک ہو جائے؟

ایک دفعہ شرف قادری صاحب نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ امام حسین نے یزید کی بیعت نہیں کی اور ایک الگ ریاست قائم کرنے کی کوشش کی، اس کے برخلاف دوسرے صحابہ نے ایسا نہیں کیا۔ سوال یہ ہے کہ ان کا یہ اقدام صحیح تھا یا غلط، اگر صحیح تھا تو باقی صحابہ نے ان کی موافقت کیوں نہ کی اور اگر امام حسین رضی اللہ عنہ کا اقدام غلط تھا تو یہ ان کے مقام اور حرمت کے خلاف ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا: حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حق میں ایسے حالات ظاہر کئے گئے تھے جن کی بناء پر وہ کسی ٹکراؤ اور فتنہ کے بغیر ایک صالح ریاست قائم کر سکتے تھے۔ اس کے برخلاف دوسرے صحابہ کرام کے حق میں ایسے حالات ظاہر نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے امام حسین اپنے رفقاء کے ساتھ میدان عمل میں آ گئے۔

ایک اور شخص نے ایک دفعہ پوچھا کہ اعمال پر محاسبہ اور اس پر سزا کا فیصلہ تو میدان حشر میں ہوگا، پھر فیصلہ سے پہلے قبر میں عذاب کیوں دیا جاتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ قبر بمنزلہ

حوالات ہوتی ہے، جس طرح اصل سزا فیصلہ کے بعد لاگو ہوتی ہے، تاہم حوالات میں ریمانڈ (Remand) وغیرہ کے سبب اسے سزا دی جاتی ہے، اسی طرح اصل سزا حشر کے بعد لاگو ہوگی اور عذاب قبر بمنزلہ ریمانڈ (Remand) ہے۔

ملی خدمات

مفتی صاحب نے قیام پاکستان کے لئے بھرپور کام کیا۔ بنارس کانفرنس میں شرکت کی، مسلم لیگ کے اسٹیج پر پاکستان کے حق میں تقریریں کیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہر موقعہ پر ملک وقوم کے لئے وسیع پیمانہ پر امداد مہیا کی۔ اسی طرح ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دفاعی فنڈ میں رقم جمع کرانے کے لئے وسیع بنیادوں پر کام کیا۔ نصاب کمیٹی اور شیعہ سنی امن کمیٹی کے رکن بنے۔ اوقاف کے انٹرویو بورڈ میں شامل رہے۔ علماء اکیڈمی کے تربیتی کورس کے سلسلوں میں قرآنی تعلیمات کے موضوع پر لیکچر دیئے۔ اسی طرح اور متعدد ملکی وملی مسائل کے حل کے لئے کام کرتے رہے۔

تلامذہ

مفتی صاحب کی تدریس تین ادوار پر مشتمل ہے۔ حزب الاحناف میں، جامعہ نعمانیہ میں اور جامعہ نعیمیہ میں۔ حزب الاحناف میں جن قابل ذکر لوگوں نے آپ کے سامنے زانوائے تلمذ طے کیا ہے، ان کے اسماء یہ ہیں:

مولانا حافظ محمد عالم، مولانا فیض الحسن تحویر، مولانا محمد رمضان، مولانا عارف حسین، مولانا ارشد پناہوی، مولانا خلیل احمد، مولانا ارشاد حسین، مولانا محمد قاسم، مولانا عبدالغفور، قاری غلام رسول اور جامعہ نعمانیہ میں مولانا اشرف کاظمی، مولانا سعید احمد نقشبندی اور مولانا سید عبداللہ شاہ اور جامعہ نعیمیہ میں مولانا محمد شریف نوری مرحوم، مولانا احمد علی قصوری، مولانا منظور احمد رضوی، صوفی اللہ دتہ، مولانا زاہد حسین صدیقی، مولانا محمد ایوبی، مولانا غلام فرید، مولانا محمد شریف، مولانا گل رحمان، مولانا حبیب اللہ، مولانا محفوظ الرحمٰن، مولانا محمد سرفراز، مولانا شاہ محمد قصوری، مولانا عبدالرزاق، مولانا محمد یعقوب، مولانا محمد فاضل، صاحبزادہ حبیب الرحمٰن، صاحبزادہ جمیل الرحمٰن، مولانا احمد حسین نوری اور غلام رسول سعیدی۔

سیرت اور کردار

حضرت مفتی صاحب نوعمری ہی میں علی حسین اشرفی صاحب سجادہ نشین کچھوچھہ شریف کے ہاتھ پر سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو گئے تھے۔ حضرت علی حسین اشرفی صاحب، صاحب نظر درویش تھے۔ مفتی صاحب کی تعمیر سیرت میں ان کی نظر کیمیاء اثر کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مفتی صاحب قانع مزاج انسان ہیں۔ لیکن یہ وہ قناعت نہیں ہے جو سعی و عمل کی راہیں مسدود کر کے قنوطیت کا راستہ دکھاتی ہیں۔ بلکہ یہ وہ قناعت ہے جو حرص و طمع کی نفی سے عبارت ہے۔ مفتی صاحب فتویٰ نویسی کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ تبلیغی تقاریر کے سلسلہ میں روایتی واعظین کی طرح نذرانے وصول نہیں کرتے۔ شہر سے باہر تقریر کے لئے جانا ہو تو کرایہ کے علاوہ باقی رقم واپس کر دیتے ہیں۔ جب ایک دفعہ وعدہ کر لیں تو اس کو بہر نوع پورا کرتے ہیں۔ حافظ محمد عالم صاحب نے ایک مرتبہ اکبری منڈی میں نماز فجر کے بعد آپ کے درس قرآن کا پروگرام طے کر لیا، اسی دن صبح کی نماز سے پہلے آپ کے کمسن صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا، لیکن اس حادثہ کے باوجود آپ حسب وعدہ حافظ صاحب کے ہاں قرآن کریم کا درس دینے تشریف لے گئے اور واپس آ کر بچہ کی تجہیز و تکفین کی۔

مفتی صاحب محنتی اور جفاکش ہیں، کام کی دھن میں انہیں اکثر اوقات کھانے کا بھی خیال نہیں رہتا۔ عموماً دوپہر کا کھانا شام کو کھاتے ہیں، کھانے میں کبھی مرغن اور ملذذ چیزوں کا اہتمام نہیں کرتے ہیں۔ اکثر دو تنوری روٹیاں اور چھولے منگا کر گزارہ کر لیتے ہیں۔ جامعہ نعیمیہ میں تدریس، تعمیر، افتاء اور انتظامی شعبوں میں ان کی شخصیت مصروف عمل رہتی ہے۔ وہ دوسروں کی انا اور عزت نفس کا بڑا خیال رکھتے ہیں اور انتہائی حکیمانہ انداز میں طلبہ کی اصلاح کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک لڑکے نے لائبریری سے ایک کتاب چرا لی۔ مفتی صاحب کو پتہ چلا تو یہ کہہ کر اس کو کتاب واپس کر دی کہ اس نے پڑھنے کے لئے لی ہو گی اور ساتھ فرمایا کہ پڑھ کر واپس کر دینا۔ تبلیغ کے لئے مخالفین کے سٹیج پر بھی اگر دعوت آئے تو قبول کر لیتے ہیں اور ان کے اسٹیج پر جا کر حکیمانہ انداز میں اپنی بات پیش کرتے ہیں۔ ان کے مزاج میں جو سلجھاؤ کا عنصر ہے اس کی وجہ سے ہر طبقہ میں ان کا احترام کیا جاتا ہے۔

ظلم و جور کی اس فضا میں جب آواز حق سنانا مشکل ہے اور جبر و تشدد کی آندھیاں اس قدر تند و تیز ہیں کہ چراغ ہدایت کو قائم رکھنا دشوار ہے، ایسے میں رشد و ہدایت کے لئے متلاشیان حق کی نگاہیں مفتی صاحب جیسے بزرگوں کی طرف اٹھتی ہیں جو پس و پیش اور مصلحت وقت کی پرواہ کئے بغیر ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان حضرات کو تادیر سلامت رکھے اور جس نور سے ان کے دلوں کو روشن کیا ہے وہ اوروں کو بھی عطا کرے۔



تجدید واحیائے دین کے ایک روشن مہتاب

پیر مہر علی شاہ قدس سرہٗ

فخر علم و آگہی، نشان ولایت، نباض تقاضا ہائے عصر، متلاشیان حق کے ملجا، حکمت و معرفت کے سیلاب آفریں دریا، بادۂ توحید میں سرمست، عشق رسالت میں غرقاب، ناظرین حدیث کے امام اور استاد، وارفتگان شوق کے کعبہ، عابدوں کے رہنما، زاہدوں کے قافلہ سالار، صوفیوں کے پیشوا اور علماء کے لئے افتخار کا زرنگار سہرا، اقلیم فقر کے تاجدار، جود و سخا کے بحر بیکراں، اللہ کے سامنے فقیر شاکر، اکابرین کا فخر، معاصرین کے رشک، پیشرو حکما کی آرزو اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ، صاحب تصانیف کثیرہ، واصل مراتب عظیمہ، حرمت قرآن کے نگہبان، ناموس احادیث کے پاسبان، ابو حنیفہ کی فقہ کو دلائل سے آبدار کرنے والے، عصر حاضر کی گتھیاں سلجھانے والے، ابن عربی کے علوم کو حیات نو بخشنے والے، ابن سینا کے پژمردہ افکار کو رنگ و نکہت عطا کرنے والے، سلمان اور ابو ذر کے پرتو، سہیل اور بلال کا آئینہ، غزالی اور رازی کے علوم کے جامع، آلوسی و طنطاوی کی شان، تفسیر اور حدیث کے نکتہ دان، بے مہار عقل اور تقلید جامد میں متوازن راہ کے سالک، شریعت کے سنگم، معرفت اور حقیقت کے مرج البحرین، یہ تھے پیر مہر علی شاہ رضی اللہ عنہ۔

جہالت و ضلالت کی تاریکیاں نہ جانے کب سے کسی ہدایت دینے والے آفتاب کی منتظر تھیں۔ نہ جانے کب سے ان گنت ہونٹوں پر دعائیں مچل رہی تھیں، کتنی آہیں مضطرب تھیں اور کتنی فریادیں تڑپ رہی تھیں۔ وہ آئے تو زمانے نے ان کو یوں گلے لگایا جیسے کب سے ان کی راہ دیکھ رہا تھا۔ وہ جس میدان میں گئے چھا گئے۔ مکتب میں گئے تو اساتذہ نے ان کو پڑھانا اپنا فخر سمجھا۔ طلباء کے جھرمٹ میں ایسے جیسے ستاروں میں چاند، علماء میں آفتاب، آزروں میں ابراہیم، فراعنہ میں موسیٰ، ان کی نثر میں دلائل کی فراوانی اور نظم میں جذبات کی جولانی، ان کی شخصیت کا ہر پہلو ایک مکمل کتاب۔

ہندوستان پہلی جنگ آزادی کے خونی دور سے گزر رہا تھا۔ سلطنت مغلیہ دم توڑ چکی تھی۔ برصغیر ظلم کی چکی میں پستا ہوا مکمل طور پر افرنگ کے پنجۂ استبداد میں آ چکا تھا۔ دین اسلام کے اساطین جو زندہ تھے پابند سلاسل تھے۔ اور جو امر ہو چکے تھے وہ اپنی یادوں کے چراغ جلتے چھوڑ گئے تھے۔ غلامی کی اس تنگ و تاریک فضا میں حریت کا یہ چراغ یکم رمضان ۱۲۷۵ء بروز پیر رونق سرائے عالم ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جو سنت جاریہ ہے کہ وہ بداعمالیوں، گمراہیوں اور بدعات کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں تجدید و احیائے دین کے لئے ایک روشن مہتاب ظہور میں لاتا رہا ہے، اسی سنت کے مطابق آپ کا وجود ظہور پذیر ہوا۔

بچپن ہی سے آپ کو شہروں سے وحشت اور ویرانوں سے الفت تھی، آپ کی اکثر راتیں پہاڑیوں، وادیوں اور گھاٹیوں میں گزرتیں۔ آپ کو ناظرہ قرآن مجید پڑھنے کے لئے مکتب میں داخل کرایا لیکن آپ قرآن کے حافظ بن کر نکلے۔ کرم خوردہ اوراق کو بھی آپ مسلسل عبارت کی طرح روانی سے پڑھتے، پڑھنے لکھنے میں آپ اس قدر منہمک اور مستغرق تھے کہ عشاء سے فجر تک موسم سرما کی سرد اور طویل راتیں مسلسل مطالعہ میں گزر جاتیں۔

آپ تدریجاً تعلیم کے مراحل طے کرتے رہے۔ مولانا سلطان محمود انگوی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری ایسے مشاہیر عصر کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے رہے۔

صوفیاء نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق وحدت کے جلوؤں کو دیکھا۔ کوئی بحر توحید میں اس طرح غرقاب اور سرمست ہوا کہ اس عالم رنگ و بو میں اسے الوہیت سے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ پھولوں کی مہک ہو یا ستاروں کی چمک، پانی سے جھلکتے ہوئے آبشار ہوں یا ابلتے ہوئے چشمے، آفتاب کی نور افگن شعاعیں ہوں یا مہتاب کی رو پہلی کرنیں، سر بہ فلک پہاڑوں کی چوٹیاں ہوں یا لہلہاتی کھیتیاں، برساتی ندیاں ہوں یا نیلگوں سمندر، وہ کہتے ہیں: کچھ نہیں۔ یہ سب کچھ نہیں، یہ محض اعتبارات ہیں۔ ان سب کا وجود اعتباری، انتزاعی اور ظلی ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (القصص:۸۸) مابہ الموجودیت تو وجود حقیقی ہے۔ جو واحد بالشخص اور واجب بذاتہ ہے۔ هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ (حدید:۴) وَفِيْ

اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذاریات) بس حقیقت میں وہی ہے، اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ ایک انتزاع اور اعتبار ہے۔ جیسے فوق اور تحت، یمین اور یسار، قدام اور خلف، سراب نہیں، فریب نظر نہیں، لا اور یہ کا واہمہ نہیں، اس کے باوجود یہ سب نسبتیں ہیں۔ حقیقت تو وہ ذات ہے جس کے ساتھ یہ نسبتیں قائم ہیں۔ اسی طرح صوفیاء کہتے ہیں: یہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے ایک اعتبار ہے، حقیقت تو وہ ذات ہے جس کے ساتھ موجودات کا یہ نظام قائم ہے۔ پس وہی حقیقت ہے۔ وہی وجود واحد ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں اور یہی وحدۃ الوجود ہے۔ پیر صاحب نے وحدۃ الشہود اور وحدہ الوجود کے درمیان یہ کہہ کر ربط و تعلق پیدا فرمایا ہے کہ وحدہ الشہود ابتدائے سلوک اور نفس ایمان ہے اور وحدہ الوجود انتہائے مقام اور کمال ایمان ہے۔ اس مرتبے کے لئے نہ تو امت سابقہ مکلف تھی اور نہ امت محمدیہ مکلف ہے۔ یہ اخص الخواص کا مشاہدہ ہے۔ یہ حال ہے قال نہیں۔ منصور حلاج ہو یا بایزید بسطامی، ابن عربی کی ''فتوحات'' ہو یا فضل حق کی ''الروض المجودیہ'' سب حال ہیں اور نظر قال میں آتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوق میں سب سے افضل حضور کو بنایا۔ اللہ اللہ! ان کی عظمتوں کا کیا کہنا جن کی مرضی بدلے تو قبلہ بدل جائے، جن کی توجہ ہٹے تو بیت المقدس اپنی جگہ سے ہٹ جائے۔ جن سے اللہ تعالیٰ کہے: مشرق و مغرب میں سے کسی جگہ کے ساتھ ہماری خصوصیت نہیں، تم جس طرف رخ کرلو گے وہی ہمارا قبلہ ہے۔ دل بے لگام ہوتا ہے، اس پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے صاف کہہ دیا: جس شخص نے ان کے حکم کے خلاف دل میں بھی ناگواری رکھی اس کا ایمان نہیں رہے گا۔ یہاں بے قابو دل کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ پسندوہ ہو جو ان کو پسند ہے، ناپسندوہ ہو جو ان کو ناپسند ہے۔ طبیعت ان کی طبیعت میں ڈھل جائے، مزاج ان کے مزاج میں بدل جائے، وہ جنہیں دنیا میں مغفرت کی نوید سناتا ہے۔ عَسٰۤى اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ (اسراء) کا مژدہ دیا۔ وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ۝ (والضحیٰ) کی بشارت دی۔ ساری مخلوق اسے راضی کرنے کے لئے نماز پڑھتی ہے، ان سے کہا کہ تم نماز اس لئے پڑھو تا کہ تم راضی رہو۔ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ (طٰہٰ) ساری مخلوق اسے دیکھتی ہے وہ انہیں دیکھتا ہے۔ اَلَّذِیْ

یَرٰىكَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۙ وَ تَقَلُّبَكَ فِی السّٰجِدِیْنَ (الشعراء) ابراہیم نے مانگا: وَ لَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ (الشعراء) انہیں بن مانگے فرمایا: یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ (التحریم:۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مانگا: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ (اعراف:۱۴۳) انہیں بن مانگے فرمایا: اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ (فرقان:۴۵) حضرت داؤد علیہ السلام سے کہا: لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (ص:۲۶) اور ان کے بارے میں فرمایا: وَ مَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (النجم) حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (طٰہٰ:۲۵) رب کہتا ہے: اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (الم نشرح) جس زمانے میں جب بھی کوئی نبی آیا تو کہتا تھا: تم میرا کلمہ پڑھتے ہو، یادرکھو جب وہ آجائیں گے پھر میں بھی ان کا کلمہ پڑھوں گا۔ تم بھی ان کا کلمہ پڑھنا، میں بھی ان کا منتظر ہوں تم بھی ان کا انتظار کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: وَ اكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ (اعراف:۱۵۶) ''اے اللہ! ہمارے لئے دنیا اور آخرت میں بھلائی مقدر کردے''۔ اللہ تعالیٰ نے کہا: میں دنیا و آخرت کی بھلائی لکھ دوں گا، مگر ان کے لئے فرمایا: اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِیْلِ (اعراف:۱۵۷) دیکھو مانگ حضرت موسیٰ علیہ السلام رہے ہیں اور مل رہا ہے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکاروں کو، آپ کے غلاموں کو۔ زمانہ کسی نبی کا ہو، کسی رسول کا ہو، سکہ چلتا تھا تو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا چلتا تھا۔ بول بالا تھا تو میرے نبی کا بالا تھا۔ جس زمانے میں کچھ لوگ مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کم کر رہے تھے۔ آپ کے ذکر کو گھٹا رہے تھے۔ کوئی آپ کے علم کو کم بتاتا تھا۔ کوئی آپ کی قدرت میں کمی ثابت کرتا۔ کوئی معاذ اللہ آپ کی حیات کا انکار کرتا۔ حضرت پیر صاحب ایسے لوگوں سے معرکہ آرا ہوئے۔ اصحاب تنقیص کے ہر سوال کا جواب دیا، ہر اعتراض کو اٹھایا، نا آشنا لوگوں پر مقام مصطفیٰ واضح کیا اور محبت رسول سے خالی دلوں میں عشق رسالت کی آگ بھڑکا دی۔

صحابہ کرام جن کے سر پر ''اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم'' کا سایہ ہے۔ ابرو ہیں یا اللہ اللہ فی اصحابی کی کمانیں ہیں۔ رخساروں پر ''ما انا علیہ و اصحابی'' کا غازہ ہے۔ جن کا سراپا رسول اللہ کا اسوہ جو ''رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ'' کی سند ہیں،

بعد کے لوگوں کے لئے "والذین اتبعوھم باحسان" کی ضمانت ہیں۔ عشرہ مبشرہ ہیں، خلفاء راشدین ہیں، جو سرکار کی تربیت کے شاہکار ہیں، نگاہ نبوت کے فیض یافتہ اور جامعہ رسالت کے فارغ التحصیل، جن کی محبت میں کمی ہو تو نفاق کا اندیشہ، جن کی تعظیم میں فرق آئے تو کفر کا فتویٰ۔

پیر صاحب نے صحابہ کے مرتبے اور مقام کو واضح کیا، اصحاب ثلاثہ کی خلافت کو نص قرآن سے ثابت کیا۔ ایک اثناء عشر عالم نے کہا کہ خلافت تو حضرت علی کا حق تھا، آپ نے فرمایا: اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ فرماتا ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (النور:۵۵) لہٰذا اس آیت کی رو سے اللہ تعالیٰ نے ایک دو نہیں بلکہ دو سے زیادہ اصحاب رسول سے زمین میں خلافت عطا کرنے کا وعدہ فرمایا اور بعد کے واقعات سے یہی ثابت ہوا، اگر امامیہ حضرات حضرت علی کے علاوہ حضرت حسن کی شش ماہ خلافت کو بھی شامل کر لیں تب بھی وعدۂ الٰہی دو اصحاب رسول تک محدود رہتا ہے۔ حالانکہ آیت کریمہ میں لفظ "ھم" کو کم از کم تین خلفاء کا تقاضا کر رہا ہے۔ پھر وہ تیسرے خلیفہ برحق ثابت کرنے کے لئے کس کو پیش کریں گے جس کی خلافت زمین پر قائم رہی۔

حضرت پیر صاحب جس دور میں پیدا ہوئے اس زمانے میں اقتدار افرنگ کا آفتاب کہیں غروب نہیں ہوتا تھا۔ برصغیر کے امراء اور والیان ریاست فرنگیوں کی حکومت کا دم بھرتے تھے، علماء و مشائخ اور رؤسا ان میں کچھ ایسے تھے جو سرکار انگریز کی آنکھوں کا کاجل بنے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو افرنگ کے پاؤں کی مہندی بنے ہوئے تھے۔ اور کچھ ایسے تھے جو انگریز ریذیڈنٹ (Resident) کی بگھی میں گھوڑوں کی طرح جت جانا اپنے ماتھے کا جھومر سمجھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز کی خوشامد خوش نصیبی کی علامت تھی اور انگریز سے احتراز اور اجتناب یا اس کا عتاب تباہی اور بربادی کا نشان تھا۔ بعض مصلحت کوش اور ابنائے وقت انگریز کے قرب کو مسلمانوں کی معاشی بہبود، خوشحالی اور سیاسی اقتدار کا باعث خیال کرتے تھے۔ ابتلاء کے اس دور میں کچھ مردان خدا ایسے بھی تھے جو ہر کٹھن آزمائش سے گزر گئے۔ سختیوں کے سارے وار تنہا اپنی جان پر جھیل گئے، لیکن اپنے

دامن کو انگریز کی خوشامد سے داغ دار ہونے نہیں دیا۔ اہل جرأت کے اس قافلے میں حضرت پیر صاحب کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جارج پنجم دہلی میں اپنا دربار سجا رہا تھا اور ہر طبقے سے نمائندہ حضرات دربار میں شریک ہو کر جارج پنجم کو سلامی دے رہے تھے، دینی رہنماؤں کی فہرست میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ جارج کے دربار میں آپ کو بھیجنے کے لئے ہر طرف سے کوشش کی گئی۔ متعدد طریقوں سے آپ پر دباؤ ڈالا گیا، آپ نے ہر چیلنج کو قبول کیا لیکن پیہم اصرار کے باوجود جارج پنجم کے دربار میں حاضری نہیں دی۔

یہ گفتگو ادھوری رہے گی اگر مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ آپ کے معرکہ کا ذکر نہ کیا جائے۔ غلام احمد قادیانی ۱۸۴۰ء میں پیدا ہوا، ۱۸۶۴ء میں مروجہ علوم سے فارغ ہوا، ۱۸۸۲ء میں مبلغ کی حیثیت سے ظاہر ہوا، ۱۸۸۶ء میں الہام کا دعویٰ کیا، ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود کا دعویٰ کیا۔ ۱۹۰۱ء میں پچھلے تمام دعوؤں کو غلط قرار دے کر ظلی نبوت کا دعویٰ کر دیا اور اس کے بعد بتدریج مستقل اور صاحب تشریع نبی کی منازل طے کرتا رہا۔ بالآخر ۱۹۰۸ء میں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ حضرت پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے غلام احمد قادیانی کے تمام دعوؤں کو رد کیا۔ اس کی تصانیف میں علمی اغلاط، خیانت اور سرقے کی نشاندہی کی۔ روبرو گفتگو کی دعوت دی لیکن وہ آپ کے سامنے آنے کی ہمت نہ کر سکا۔

آپ کی پوری زندگی سعی پیہم اور جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ آپ نے علم و آگہی کے چراغ جلائے۔ طریقت اور معرفت کی قندیلیں روشن کیں۔ غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے قوم کے مردہ تن میں حریت کی روح پھونکی، باطل سے ٹکرائے، بیگانوں کو یگانہ اور پرائیوں کو اپنایا۔ امیروں سے دور رہے، غریبوں کو گلے لگایا۔ بیماروں کی عیادت کی، حاجت مندوں کے کام آئے، کمزوروں اور ناتواں لوگوں کا بوجھ اٹھایا۔ مصائب میں شاکر اور فراغت میں فیاض رہے۔ کفار کے لئے شمشیر برہنہ اور مسلمانوں کے لئے بریشم کی طرح نرم، حیات مستعار کے ۸۲ سال یوں ہی گزر گئے اور ۱۳۵۶ھ میں ان گنت ارادتمندوں کو سوگوار چھوڑ کر واصل بحق ہو گئے۔

حضرت پیر مہر علی عالم، فاضل، عابد و زاہد، فیاض اور جواد، ان کا چہرہ خوف الٰہی سے

زرد اور محبت رسول سے روشن رہتا تھا۔ ان کے فیضان کا جو سلسلہ ان کی زندگی میں قائم ہوا، مسلسل بڑھ رہا ہے۔ اصول وفروع اور عقائد واعمال میں امت مسلمہ کو صراط مستقیم پر جو استقامت اور تصلب حاصل ہے، اس میں پیر صاحب کا وافر حصہ ہے۔ انہوں نے آیات قرآن کا صحیح محمل بیان کیا۔ احادیث رسول کی وضاحت کی، ان کے حلقے میں شریک ہو کر نجانے کتنے افراد دنیائے شریعت وطریقت میں امر ہو گئے۔ انہوں نے ذروں کو اٹھایا تو رشک ماہتاب بنا دیا، ننگ انسانیت کو فخر ملائکہ بنا دیا۔

سلام ہو اس رجل عظیم پر جس نے جھلملاتے چراغوں کو سورج کی توانائیاں بخشیں۔ آفرین ہو اس مرد کامل پر جس نے علوم اسلامیہ کو رعنائیاں دیں۔ آج سلسلۂ چشتیہ میں انہیں کے فیض کے دھارے بہہ رہے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت کی، اللہ عزوجل نے ان کے ذکر کو ایک عالم میں پھیلا دیا۔ دلوں میں ان کی محبت وعقیدت کے چراغ روشن کر دیئے۔ جب تک مکاتب میں قیل وقال کی محفل سجی رہے، جب تک خانقاہوں میں خرقہ پوشوں کی مجلس جمی رہے، آسمان رحمت سے ان کی قبر پر انوار وتجلیات کی برسات ہوتی رہے گی اور جن وانس کا ایک جہان مہر علی کو سلام کرتا رہے گا۔



مفتی اہل سنت جسٹس (ریٹائرڈ)

ڈاکٹر مفتی شجاعت علی قادری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت ڈاکٹر مفتی سید شجاعت علی قادری رحمۃ اللہ علیہ اہل سنت کے بہت عظیم عالم دین تھے۔ علوم دینیہ اور مروجہ علوم رسمیہ دونوں پر یکساں عبور اور مہارت رکھتے تھے۔ عربی اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ وہ بہت عمدہ خطیب تھے، ملک اور بیرون ملک میں بڑے بڑے اجتماعات سے خطاب کرتے تھے۔ انہوں نے تین مرتبہ برطانیہ کا تبلیغی دورہ کیا اور وہاں بڑے بڑے عظیم الشان جلسوں میں خطابت کے جوہر دکھائے۔ وہ ہر موضوع پر فی البدیہہ تقریر کرتے تھے، اہل برطانیہ ان سے بہت مانوس تھے۔ ہالینڈ اور بھارت میں بھی متعدد جلسوں سے خطاب کیا، عراق اور برطانیہ کی بعض بین الاقوامی کانفرنسوں میں انہوں نے عربی میں خطاب کیا۔ پاکستان اور بیرون پاکستان سے آئے ہوئے سوالات کے جواب میں بہت علمی اور تحقیقی فتاویٰ لکھتے تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی کے بہت مقبول مقرر تھے، وہ دین کے بہت سے شعبوں میں کام کر رہے تھے۔ لیاقت کالج کراچی میں سولہ سال تک پروفیسر رہے۔ سترہ سال دارالعلوم امجدیہ میں افتاء اور تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر انہوں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر دارالعلوم نعیمیہ کی ۱۹۷۲ء میں بنیاد رکھی اور اس کے مہتمم، مفتی اور شیخ الحدیث رہے۔ وفاقی شرعی عدالت میں چھ سال تک بطور جج ملک وقوم کی خدمت کرتے رہے۔ کراچی یونیورسٹی کی سینڈیکیٹ کمیٹی کے ممبر تھے۔ وفاقی شرعی عدالت سے الگ ہونے کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بنے اور کونسل کی متعدد سب کمیٹیوں میں کام کرتے رہے۔ نفاذ شریعت کمیٹی میں بھی شامل رہے۔ افتاء، تدریس، خطابت اور دوسری مذہبی وملی خدمات کی عظیم مصروفیات کے باوجود تصنیف وتالیف کے لئے بھی وقت نکالتے تھے۔ اردو اور عربی کی متعدد کتب ان کی یادگار ہیں۔ انہوں نے درس نظامی کے طلبہ کے لئے چار حصوں میں "انشاء العربیۃ" کے نام سے ایک کتاب لکھی جو

بہت سے مدارس دینیہ کے نصاب تعلیم میں شامل ہے۔ ''الخیرات الحسان'' اور ''شرح الصدور'' کا ترجمہ لکھا، جو بہت مقبول ہوا، ان کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ''تفسیر مظہری'' اور ''المواہب اللدنیہ'' کا ترجمہ لکھا۔ ''فتاویٰ رضویہ'' کی پہلی جلد کے دو حصوں کی عربی عبارت کا ترجمہ کیا۔ ''دعوت فکر'' کا عربی میں ترجمہ کیا۔ ''مجدد الامۃ'' کے نام سے اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تفصیلی تعارف لکھا جس کے ذریعے دنیائے عرب میں اعلیٰ حضرت کے علمی کارناموں کا تعارف ہوا۔ بعد میں اسی کتاب کو جامعہ نظامیہ لاہور نے ''من ھو امام احمد رضا'' کے نام سے شائع کیا۔ فقہی مسائل پر مشتمل ایک کتاب ''فقہ اہل سنت'' لکھی۔ اس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے جو طہارت اور نماز کے مسائل پر مشتمل ہے، اس کے بعد اس کی تکمیل کے لئے زکوٰۃ، روزہ اور حج کے مسائل پر مشتمل اس کتاب کے مزید تین حصے لکھے۔ اس میں عبادت کے ضمن میں مسائل عصر حاضر سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے موضوعات پر متعدد علمی اور گراں قدر مقالے لکھے جو ملک کے بہت سے رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شدید خواہش تھی کہ عربی میں علم حدیث پر کوئی وقیع کتاب لکھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''الآثار'' کی عربی میں مبسوط شرح لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ اس کتاب میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی علم حدیث میں خدمات کو نمایاں طور پر پیش کرنا چاہتے تھے کہ تقدیر نے ان کو اس کام کی تکمیل کی مہلت نہیں دی۔ انہیں تو ان شاء اللہ اپنی نیت کا ثواب مل جائے گا لیکن ہم ایسے تشنگان علم ان کے فیض سے استفادہ کرنے سے محروم رہ گئے۔ انہوں نے کم عمر پائی لیکن ان کی خدمات اور ان کے کارنامے ان کی عمر سے بہت زیادہ ہیں۔ وہ بظاہر ایک شخص تھے، لیکن حقیقت میں ایک ادارہ تھے۔ وہ بہت اعلیٰ اور بلند اخلاق کے مالک تھے۔ بہت شگفتہ مزاج، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ وہ ہر بزم کی رونق اور ہر محفل کی جان تھے۔ وہ قادر الکلام تھے اور بہت فصیح و بلیغ گفتگو کرتے تھے۔ جو لوگ ہر وقت ان کی خلوت اور جلوت میں رہنے والے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ان کی زبان سے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں سنا گیا۔ ان کو کبھی غم میں از خود رفتہ

دیکھا نہ غصہ میں بے قابو، ان کا حوصلہ اور حلم مثالی تھا۔ وہ ہمیشہ سلام میں سبقت کرتے تھے، تلامذہ کا بھی تعظیم اور توقیر سے ذکر کرتے تھے، ہمیشہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور انہیں کام کرنے اور آگے بڑھنے کا ولولہ فراہم کرتے تھے۔

اہل سنت کے افتراق اور انتشار سے بہت پریشان تھے۔ انہوں نے ہمیشہ جماعت اور تنظیم کی کوشش کی۔ تنظیم المدارس (اہل سنت) پاکستان کو وجود میں لانے کے لئے کراچی سے لاہور گئے۔ وہاں مختلف علماء سے ملاقات کی اور ان کو تنظیم کی افادیت سے آگاہ کیا اور یہ انہی کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج تنظیم المدارس (اہل سنت) قائم ہے۔ جماعت اہل سنت کراچی کو بھی ابتداء میں انہوں نے قائم کیا اور اس کی نشاۃ ثانیہ بھی انہی کی کوششوں سے ہوئی۔ وہ خود عملی سیاست سے الگ رہتے تھے لیکن اس کے باوجود سیاسی طور پر سنیوں کو ایک پلیٹ فارم پر دیکھنے کے بہت خواہش مند تھے اور اس کے لئے حتی المقدور کوشش کرتے رہتے تھے۔ ان کی مثالی شائستگی اور اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے ہر طبقہ میں ان کا بے حد احترام تھا۔ ان کی زندگی بھی عزت کی زندگی تھی اور ان کی موت بھی عزت کی موت تھی اور انشاء اللہ ان کی عاقبت میں بھی عزت اور وجاہت ہوگی۔

حضرت مفتی سید شجاعت علی قادری رحمۃ اللہ علیہ سے میرے بہت دیرینہ مراسم تھے۔ ہمارے ذہنوں، خیالات اور نظریات میں بہت ہم آہنگی تھی۔ مسائل حاضرہ پر ہم ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرتے تھے، اپنے اپنے نظریات پر دلائل قائم کرتے تھے۔ بعض اوقات ہم میں نظریاتی اختلاف بھی ہوتا تھا، کبھی ہم ایک دوسرے سے اتفاق کر لیتے اور کبھی اپنے اپنے موقف پر قائم رہتے تھے، لیکن ہماری باہمی دوستی، الفت اور محبت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ ہم مسائل پر بحث کرتے تھے اور بے تکلفانہ نوک جھوک بھی کرتے تھے۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت شگفتہ مزاج اور حاضر جواب تھے۔ ایک دفعہ ایک شیعہ عالم نے ان سے کہا: آپ کی فقہ میں چور کا ہاتھ پہنچے سے کاٹا جاتا ہے اور ہماری فقہ میں انگلیوں سے۔ اگر اسلامی نظام نافذ ہو گیا تو ہماری فقہ کی زیادہ تبلیغ ہوگی، کیونکہ جس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا وہ اپنا ہاتھ بچانے کے لئے کہے گا: میں شیعہ ہوں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برجستہ

کہا: یہ فائدہ تو خیر آپ کو ہوگا لیکن اس کا نقصان یہ ہوگا کہ لوگ سمجھیں گے کہ جتنے چور ہیں وہ سب شیعہ ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ شیعہ عالم مبہوت رہ گیا۔

حضرت مفتی رحمۃ اللہ علیہ فقیہ یسر تھے۔ جن مسائل میں فقہاء کا اختلاف ہوتا وہ ان میں سے اس قول کو اختیار کر لیتے جس میں امت کے لئے آسانی ہو۔ مسائل حاضرہ میں وہ اجتہاد کا ملکہ رکھتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت علماء دیکھے لیکن بحث مباحثہ کے بعد حق کی طرف رجوع کرتے ہوئے صرف انہی کو دیکھا ہے۔ ان میں خوف خدا اور للہیت تھی، وہ مجسم ایثار تھے اور سب سے بے لوث محبت کرتے تھے۔

۲۴ جنوری ۱۹۹۳ء کو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ وزارت بہبود آبادی کی طرف سے ایک وفد کے ساتھ انڈونیشیا کے ایک مطالعاتی دورے پر گئے تھے۔ جانے سے پہلے انہوں نے مجھ سے ضبط تولید کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کیا اور باہمی مشورے سے یہ طے کیا کہ وہاں جا کر یہ تبلیغ کریں گے کہ انفرادی طور پر طبی ضرورت کی وجہ سے ضبط تولید کے طریقے پر عمل کرنا جائز ہے لیکن کسی قانون کے ذریعے تمام لوگوں پر جبراً ضبط تولید کو لازم کر دینا جائز نہیں ہے۔ ''فتاویٰ اسلامیہ'' میں علماء مصر نے بھی لکھا ہے۔ وہ ''فتاویٰ اسلامیہ'' کی نویں جلد اپنے ساتھ لے گئے اور کہا کہ وہ اس فتوے کی فوٹو کاپیاں وہاں کے علماء میں تقسیم کریں گے۔ ابھی یہ دورہ جاری ہی تھا کہ ۴ شعبان ۱۴۱۳ھ بمطابق ۲۸ جنوری ۱۹۹۳ء جمعرات کے دن ایک بجے یہاں یہ خبر آئی کہ جکارتہ میں آج صبح ڈاکٹر مفتی شجاعت علی قادری کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا یہ سفر دین کی تبلیغ کے لئے تھا اور اللہ کی راہ میں تھا۔ ''صحیح مسلم'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اللہ کی راہ میں فوت ہوا وہ شہید ہے۔ نیز انہیں عارضۂ قلب کے علاوہ سانس کی تکلیف بھی تھی اور وہ اسی مرض میں فوت ہوئے۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص بیماری میں فوت ہوا وہ شہید ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کی مغفرت فرمائے۔ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا

فرمائے۔ان کی تمام تصنیفات، تعلیمات اور تلامذہ کو ان کے لئے صدقہ جاریہ کردے۔ان کے قائم کردہ دار العلوم نعیمیہ کو قائم ودائم رکھے، ان کی اولاد اور اہل خانہ کی حمایت اور کفالت فرمائے۔ان کے فرزند مولانا سید ناصر علی قادری کو ان کی منشاء کے مطابق ان کا صحیح جانشین بنائے۔ آمین یا رب العالمین بجاہ حبیبک سیدنا محمد خاتم النبیین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وعلی الہ واصحابہ وازواجہ اجمعین۔



علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ

ایک شخص جو اپنی ذات میں کائنات تھا

بچھڑا اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء بوقت نماز ظہر مجھے یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ قائد ملت اسلامیہ، امام اہل سنت، صدر متحدہ مجلس عمل و جمعیت علمائے پاکستان، سینیٹر حضرت علامہ مولانا الحافظ شاہ احمد نورانی صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ اسلام آباد میں سینٹ سیشن کی کارروائی میں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ وضو کرتے ہوئے ان کو ہارٹ اٹیک ہوا، ان کو فوراً ایمبولینس میں ہسپتال پہنچایا گیا مگر وہ پولی کلینک پہنچنے سے پہلے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

مجھے میرے برادر محترم حضرت جمیل العلماء علامہ جمیل احمد نعیمی مدظلہ العالی نے حکم دیا کہ قبلہ شاہ صاحب کی خدمت اقدس میں کچھ کلمات تحسین پیش کیجئے اور میری بھی یہ شدید خواہش تھی کہ حضرت کی حالات زندگی پر کچھ لکھوں، کیونکہ حضرت کی مجھ سے تقریباً ۳۸ سالہ شناسائی میں مجھ پر انتہا درجے کی شفقت اور نظر عنایت اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ نہ صرف اپنے محسن بلکہ ملت اسلامیہ کے اس عظیم مجاہد کی شان میں گلہائے عقیدت پیش کروں۔

حضرت امام نورانی کا اسم گرامی شاہ احمد تھا، آپ اپریل ۱۹۲۶ء میں یوپی کے ضلع میرٹھ بمطابق ۱۷ رمضان المبارک ۱۳۴۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی مدنی رحمۃ اللہ علیہ اعلیٰ حضرت کے خلیفہ اور چودھویں صدی ہجری کے مبلغ اعظم تھے جنہوں نے ساری زندگی تبلیغ دین اور قیام پاکستان کے لئے جدوجہد کے لئے وقف کر دی۔ ہزاروں لوگ آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ایسی ہستی کا فرزند یقیناً نادر و نایاب ہی ہونا تھا۔ آپ کی والدہ بہت عبادت

گزار خاتون تھی جنہوں نے طویل عمر (۱۰۳ سال) پائی۔ آپ نے ان نفوس قدسیہ کی آغوش میں پرورش پائی۔ ۸ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، نیشنل عربک کالج سے گریجویشن کیا، الٰہ آباد یونیورسٹی سے فاضل عربی کیا۔ دارالعلوم اسلامیہ عربیہ میرٹھ سے درس نظامی (فاضل) کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۴ زبانوں کے ماہر تھے اور اسی میں تبلیغ کرتے تھے۔ ۴۷-۱۹۴۶ء میں قیام پاکستان کے وقت آپ نے مسلم نوجوانوں کی نیشنل گارڈ کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی اور نوجوانوں کو تحریک پاکستان کے لئے منظم کیا۔ قیام پاکستان کے بعد وقت کے طالع آزماؤں اور اقتدار کے دیوانوں نے تاریخ کو مسخ کرنے اور کلمہ طیبہ کے نام پر حاصل کی گئی اس مملکت خداداد سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کو نکالنے کی ناپاک کوشش کی۔ اس وقت حضرت علامہ عبدالحامد بدایونی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں جب نوجوانان اسلام متحد ہوئے تو قائد ملت اسلامیہ نے اس تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ ۱۹۷۰ء میں کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، اس وقت پاکستان کو توڑنے کی کوشش کی گئی تو قائد اہل سنت پاکستان کی وحدت کو بچانے کے لئے تن من دھن سے جت گئے۔ آپ نے اس سلسلے میں مشرقی پاکستان کے کئی دورے کئے اور آخر وقت تک مجیب الرحمٰن کو وزارت عظمیٰ دینے کی حمایت کرتے رہے۔ اس وقت یحییٰ خان اور بھٹو کے آگے کلمہ حق بلند کرنا اور مسلمانوں کو وحدت ملی کا درس دینا یہ سب اعزازات صرف آپ ہی کے پلڑے میں نظر آتے ہیں، جنرل یحییٰ خان جیسے عیاش اور سفاک حکمران کے سامنے سے شراب کی بوتلیں اٹھوا دینا، یہ عظمت بھی سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ کے بعد آپ ہی کی حیات میں ملتی ہے۔ مگر ان سب کاوشوں کے باوجود معاشرے کے ناسور ۱۹۷۱ء میں اس مملکت کو دولخت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تھا"۔

مغربی پاکستان میں سوشلسٹ قیادت کے ہاتھ میں زمام اقتدار آیا۔ سوشلسٹ قیادت کے مقابلے میں اس وقت کی مسلم قیادت نے آپ ہی کو اپنا رہبر و رہنما اور پیشوا و مقتدا چنا۔ اس سوشلسٹ قیادت نے بھی آپ کی عظمتوں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ آپ کی تبلیغ

سے ان کے اندر بھی حرارت ایمانی جاگ اٹھی۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کو اس سوشلسٹ قیادت کے ہاتھوں سے ہی اسلامی بنانا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ وہ لوگ بھی آپ کی مذہبی قیادت کو تسلیم کرتے تھے۔ اس آئین میں شامل اسلامی دفعات اور توہین رسالت پر سزاؤں کو آئین میں شامل کرنا اور تحفظ مقام ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی عظمت و بلندی اور قائدانہ صلاحیتوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔

قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لئے آپ ہی نے اسمبلی کے فلور پر قرارداد پیش کی۔ جس پر اس وقت کی بیوروکریسی نے آپ کو اس عمل سے روکنے کے لئے اس وقت کے ۵۰ لاکھ (آج کے چھ کروڑ) روپے پیش کئے، مگر آپ نے ایک ہی بات کہی: "اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں پاکستان کا وزیر اعظم ہوں تو اسے بھٹو صاحب جیل یا پاگل خانے میں داخل کرا دیں گے، مگر میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین کا جو اعزاز میرے رب نے قرآن مجید میں عطا فرمایا ہے اس پر کوئی شخص قدغن لگانے کی ناپاک جسارت کرے تو ہم اسے اور اس کو مسلمان ماننے والوں کو کافر نہ کہیں؟ ہماری دینی غیرت وحمیت اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ دولت میرے جوتے کی نوک پر ہے، کیونکہ یہ پیسہ تو آنے جانے والی چیز ہے۔ باقی رہنے والا نام میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے"۔ بھٹو کے لئے اب بچنے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اس طرح پہلی دفعہ کسی بھی اسلامی ملک کی اسمبلی نے آپ ہی کی کاوشوں کے طفیل قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا اور آپ ہی کی کوششوں سے مسلمان کی تعریف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی ماننے کو شامل کیا گیا۔ جمعۃ المبارک کی چھٹی اور شراب پر پابندی آپ ہی کے مرہون منت تھی۔ لفظ مسلمان کی تعریف کو آئین میں شامل کرنا بھی آپ ہی کا کارنامہ ہے۔

تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت آپ ہی کے حصے میں آئی۔ ضیاء دور کے مارشل لاء میں دو صوبوں کی گورنری اور آٹھ وزارتوں کی پیشکش کو آپ نے ٹھکرا دیا۔ جس پر آپ کو ہاؤس اریسٹ کیا گیا اور پھر کئی شہروں میں جانے پر پابندی لگا دی، مگر آپ نے ایک آمر کی شخصی حکومت کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔

۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۲ء تک کراچی میں ایک لسانی تنظیم نے جب کلاشنکوف اور بھتہ

خوری کے زور پر اہل کراچی کو یرغمال بنا دیا تو اس وقت بھی صرف آپ ہی کی ذات نے ان کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا اور مرتے دم تک ان بھتہ خوروں اور دہشت گردوں کو نکیل ڈالتے رہے۔ جس کی وجہ سے آپ پر کئی قاتلانہ حملے ہوئے مگر وہ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ آپ نے اپنی لگ بھگ ۳۵ سالہ سیاسی زندگی میں کوئی پلاٹ، پرمٹ، گاڑی، وزارتیں، بھاری رقومات و مراعات وغیرہ کبھی حاصل نہیں کیں اور ساری زندگی کراچی میں دو کمروں کے فلیٹ میں گزار دی۔ کراچی کے ڈی آئی جی نے کہا: آپ دہشت گردوں کی نظر میں ہٹ لسٹ پر ہیں، اپنے ساتھ گارڈ رکھ لیجئے۔ مگر آپ ایک ہی اعلان کرتے: ہماری ہٹ لسٹ تو شعبان کی پندرہویں شب کو بن جاتی ہے۔ فرقہ واری، دہشت گردوں نے جب ملک میں انارکی پھیلا دی اور مساجد و امام بارگاہیں دہشت گردی کا اڈہ بن گئیں تو آپ نے مسلمانوں کی قیادت کر کے تمام فرقوں کو باہم ملا دیا اور شیر و شکر کیا۔ جانی دشمنوں اور خون کے پیاسوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا۔ پہلے ملی یکجہتی کونسل کی قیادت اور پھر متحدہ مجلس عمل کی صدارت آپ کے حصے میں آئی۔ پھر مجلس عمل کی الیکشن میں کامیابی بھی آپ ہی کی ذات کا صدقہ، آپ ہی کے طفیل اور آپ ہی کی مرہون منت ہے۔

جب آپ سے صاحبان اقتدار نے کہا کہ آپ حکومت کی حمایت کر کے مراعات کیوں حاصل نہیں کر لیتے؟ تو آپ ان کو ایک جواب دیتے تھے: جب معتزلہ نے خلیفہ مامون الرشید کے قلب و ذہن کو فتح کر کے اقتدار کی مسند پر قبضہ کر لیا تو سیدنا امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ امام صاحب کو پابند سلاسل کر دیا، صاحبان اقتدار نے کہا: ہم حق پر ہیں، اگر آپ حق پر ہوتے تو آپ کو یہ اعزاز حاصل ہوتا اور ہم آپ کی جگہ پر ہوتے۔ آپ ان کو یہی فرماتے کہ ہمارے درمیان حق کا فیصلہ میرا جنازہ کرے گا۔

بے شک اہل کراچی کے اس عظیم اجتماع نے ثابت کر دیا کہ آپ ہی حق پر تھے، آپ کا جنازہ کراچی کی تاریخ کا نہ صرف سب سے بڑا جنازہ بلکہ سب سے بڑا اجتماع تھا، بلکہ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، جو اپنے قائد کے جنازے میں شرکت کے لئے امڈا چلا آ رہا تھا۔

آپ بہت سادہ تھے، بڑے ہی وضع دار تھے، احسان کر کے نہ جتاتے تھے اور نہ ہی بتاتے تھے۔ مجھے اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بنایا اور بڑے عرصے بعد پتا چلا کہ آپ ہی کے حکم سے ایسا ہوا۔ مجھے "تاریخ دمشق" دلائی اور میرے شکریہ کہنے پر فرمایا کہ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس خدمت کا موقع عنایت فرمایا۔ آپ سچے محب رسول، پابند صوم وصلوٰۃ اور تہجد گزار تھے۔ ۶۵ سال مسلسل رمضان المبارک میں تراویح، شبینے اور تہجد کی نماز کی امامت کرتے رہے۔

آہ! ایک دور تھا جو گزر گیا، ایک باب تھا جو بند ہو گیا۔ یقیناً وہ راستے آپ کو یاد کرتے ہوں گے جہاں سے آپ کا رزق آتا تھا اور آپ کے اعمال صالحہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کئے جاتے تھے۔ تمام عمر عظمت ناموس رسالت ﷺ کا جھنڈا ہاتھ میں تھامے رکھا اور گرنے نہیں دیا۔

اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے، آپ کے درجات بلند فرمائے، آپ کی سیئات کو درگزر فرمائے اور حسنات کو قبول فرمائے اور آپ کے وسیلے سے ہماری مغفرت فرمائے، ان کو اور ہم کو قیامت میں اپنے حبیب پاک ﷺ کی شفاعت نصیب فرمائے اور آپ کے مزار کو مرجع خلائق بنائے۔ (آمین یا رب العالمین)



میری امی کی یاد میں

۸ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ/سات اگست ہے ۲۰۰۳ء کو میری امی محترمہ شفیق فاطمہ رحمہا اللہ، اس دار الفناء سے کوچ کر کے درالبقاء کی طرف روانہ ہو گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون! وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ۸۶ برس تھی اور اب میری عمر ۶۶ برس ہے، گویا ۶۶ برس تک میں ان کی شفیق نگاہوں اور مستجاب دعاؤں کے زیر سایہ رہا۔

وہ عابدہ، زاہدہ خاتون تھیں، شب بیدار اور تہجد گزار تھیں، وہ اس آیت کا مصداق تھیں:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ''اور ایمان والے اللہ سے سب سے شدید محبت کرتے ہیں''۔ (البقرہ:۱۶۵)

وہ ہر نیک کام اور ہر نعمت خواہ کسی سے ملی ہو اس کی اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کرتی تھیں، وہ نفل نماز پڑھ رہی ہوں یا اوراد و وظائف پڑھ رہی ہوں، اس دوران کوئی ملنے آ جائے تو وہ اس کی طرف بالکل التفات نہیں کرتی تھیں، ایک دفعہ وہ دن میں نوافل پڑھ رہی تھی کہ میری خالہ (امی کی بڑی بہن) ان سے ملنے آ گئیں، سلام پھیرنے کے بعد جب وہ دوبارہ نیت باندھنے لگیں تو خالہ بیگم نے ان سے کہا: ابھی تو تم نے نماز پڑھی تھی پھر نماز پڑھنے لگیں، امی نے بہت ناگواری سے کہا: آپ میری نماز کو نہ ٹوکا کریں، ان کا سب سے زیادہ دل اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگتا تھا۔ انہوں نے بچپن سے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا اور وفات سے چند سال پہلے تک قرآن مجید پڑھاتی رہیں، ان گنت لڑکوں اور لڑکیوں کو انہوں نے قرآن مجید پڑھایا، میں نے بھی قرآن مجید ان ہی سے پڑھا تھا اور جب تک ان کے پڑھائے ہوئے قرآن مجید پڑھتے رہیں گے ان کو ثواب پہنچتا رہے گا، وہ خود قرآن مجید کی بہت زیادہ تلاوت کرتی تھیں، ایک دن میں سترہ سترہ پارے تلاوت کر لیا کرتی تھیں، سورۂ یٰسین، سورۂ رحمان، سورۂ واقعہ، سورۂ ملک اور سورۂ مزمل بہت دل گداز اور دل سوز آواز میں پڑھتی تھیں، قاری غلام رسول صاحب کا ترتیل سے پڑھا ہوا قرآن مجید جو ۷۵

کیسٹ میں تھا، وہ میں نے امی کو لا کر دے دیا تھا، وہ قرآن مجید کو ان کیسٹس میں سنتی بھی تھیں، پھر جب ان کی نظر بہت کمزور ہو گئی اور وہ دیکھ کر قرآن مجید پڑھنے سے معذور رہ گئیں تو پھر وہ ان کیسٹس سے قرآن مجید سنتی رہتی تھیں، پھر ایک وقت آیا کہ ان کی سماعت اس قدر کمزور ہو گئی کہ وہ کیسٹس سے بھی نہیں سن سکتی تھیں اور ہر وقت ملول اور افسردہ رہتی تھیں کہ اب میں قرآن مجید پڑھ سکتی ہوں، نہ سن سکتی ہوں، میں نے ان کو یہ حدیث سنائی:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کے جسم میں کوئی بیماری ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کے اعمال کی حفاظت کرنے والے فرشتوں سے فرماتا ہے: میرا بندہ جو نیک عمل کرتا ہے، اس کے صحیفۂ اعمال میں ہر روز وہ عمل لکھتے رہو۔ (مسند احمد ج ۴ ص ۱۴۶، المعجم الکبیر ج ۱۷ ص ۲۸۴)

نیز حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ کسی اچھے طریقے سے عبادت کر رہا ہو پھر وہ بیمار ہو جائے تو جو فرشتہ اس پر مامور ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ تندرستی کے ایام میں جو عمل کرتا تھا اس کا وہ عمل لکھتے رہو، حتیٰ کہ وہ تندرست ہو جائے۔

(مسند احمد رقم الحدیث: ۶۸۹۵، حافظ الہیثمی نے کہا: اس حدیث کی سند صحیح ہے، مجمع الزوائد ج ۲ ص ۳۰۳)

لیکن قرآن مجید پڑھنے اور سننے کی لذت سے جو وہ محروم ہو گئیں تھیں، اس کی وجہ سے ان کا غم نہیں جاتا تھا، اس کے بعد وہ ہر وقت تسبیح پڑھتی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ رات کو اٹھتی تھیں اور جس قدر ہو سکتا تھا اس قدر نمازیں پڑھتی تھیں۔ ان کو ۱۹۷۵ء سے شوگر ہو گئی تھی، وہ بہت سخت پرہیز کرتی تھیں، شوگر کی وجہ سے ان کو کوئی خطرناک عارضہ نہیں ہوا، آخری سات سالوں میں ان کی شوگر لو رہتی تھیں اور ڈاکٹروں نے ان کی شوگر کنٹرول کرنے والی دوا بند کرا دی تھی، البتہ عمر کے تقاضے سے اور مقوی خوراک نہ کھا سکنے کی وجہ سے بے حد کمزور، نحیف اور لاغر تھیں۔

قرآن اور حدیث سے ماں کا مقام

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ ''اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے

أُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ (لقمان)

ساتھ نیکی کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کرتے ہوئے اس کو پیٹ میں اٹھایا اور اس کا دودھ چھوٹنا دو برس میں ہے (اور ہم نے یہ حکم دیا کہ) میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کرو، میری ہی طرف لوٹنا ہے"۔

ماں اور باپ دونوں کی اطاعت واجب ہے، لیکن ماں کی اطاعت کا حق چار میں سے تین حصہ ہے اور باپ کی اطاعت کا حق ایک حصہ ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا: یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میرے نیک سلوک کا سب سے زیادہ کون مستحق ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہاری ماں، اس نے کہا: پھر کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا: تمہاری ماں، اس نے پوچھا: پھر کون ہے؟ فرمایا: تمہاری ماں، اس نے کہا: پھر کون ہے؟ فرمایا: تمہارا باپ۔ (صحیح البخاری رقم الحدیث: ۵۹۷۱، صحیح مسلم رقم الحدیث: ۲۵۴۸)

حضرت جاہمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں جہاد کے لئے جانا چاہتا ہوں، آپ نے پوچھا: کیا تمہاری ماں ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: پھر اس کے ساتھ چمٹے رہو، کیونکہ جنت اس کے پیروں کے پاس ہے، وہ پھر دوبارہ کسی اور وقت گئے، پھر سہ بارہ کسی اور وقت گئے تو آپ نے یہی جواب دیا۔ (سنن نسائی رقم الحدیث: ۳۱۰۴، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۲۷۸۱، مسند احمد ج ۳ ص ۴۲۹ طبع قدیم، مسند احمد ج ۲۴ ص ۲۹۹، رقم الحدیث: ۱۵۵۳۸، موسسۃ الرسالۃ بیروت، ۱۴۱۹ھ، اس حدیث کی سند حسن ہے، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۲۶، مصنف عبدالرزاق: ۹۲۹۰، تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۳۴، المستدرک ج ۲ ص ۱۰۴، شعب الایمان رقم الحدیث: ۷۸۳۳، الاحاد والمثانی رقم الحدیث: ۱۳۷۱، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۲۲۰۲، مصنف ابن ابی شیبہ ج ۱۲ ص ۴۷۴، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۴۹۳۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت ماؤں کے

قدموں کے نیچے ہے۔

(جمع الجوامع ج ۴ ص ۱۸۵، رقم الحدیث: ۱۱۱۴۲، المستدرک ص ۷۰، دار الکتب العلمیہ بیروت، ۱۴۲۱ھ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنی ماں کی دو آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا تو یہ بوسہ اس کے لئے (دوزخ کی) آگ سے حجاب بن جائے گا۔ (شعب الایمان ج ۶ ص ۱۸۷، رقم الحدیث: ۷۸۶۱)

نفس میت کو بوسا دینے کے ثبوت میں یہ حدیث ہے:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے دیکھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے فوت شدہ جسم کو بوسہ دیا اور آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

(سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۳۱۶۳، سنن ترمذی رقم الحدیث: ۹۸۹، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۴۵۶)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ! اللہ تعالیٰ کی توفیق سے میں نے ان تمام احادیث پر عمل کیا ہے، میں امی سے رخصت ہوتے وقت ہمیشہ ان کے پاؤں کو ہاتھ لگاتا تھا کہ یہ میری جنت ہیں اور ان کی آنکھوں کے درمیان بوسہ دیتا تھا اور ان کی وفات کے بعد کئی بار میں نے ان کے ماتھے پر اور ان کے پیروں پر بوسہ دیا اس وقت وہ کفن میں ملفوف تھیں، ان کی نماز جنازہ پڑھائی اور اشک بار آنکھوں سے ان کے لئے دعا کی اور تدفین کے بعد دعا کی، ان کی نماز جنازہ میں کثیر تعداد میں علماء اور طلباء شامل تھے اور ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے، جن کی تعداد سات سو کے لگ بھگ تھی اور اس میں بھی ان کی مغفرت کی بشارت ہے۔

جن احادیث سے امی کی مغفرت متوقع ہے

حدیث میں ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو مسلمان بھی فوت ہو اور اس کی نماز جنازہ میں چالیس مسلمان ہوں جو اللہ سے بالکل شرک نہ کرتے ہوں، اللہ تعالیٰ اس میت کے حق میں ان کی شفاعت کو قبول فرمائے گا۔ (صحیح مسلم رقم الحدیث: ۹۴۸، سنن ابی داؤد رقم الحدیث: ۳۱۷۰، سنن ابن ماجہ رقم الحدیث: ۱۴۸۹، مسند احمد ج ۱ ص ۲۷۷ طبع قدیم، مسند احمد ج ۴ ص ۳۰۷ طبع

جدید، رقم الحدیث: ۲۵۰۹، صحیح ابن حبان: ۳۰۸۲، المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۲۱۵۸، سنن کبریٰ للبیہقی ج ۴ ص ۳۰، شعب الایمان رقم الحدیث: ۹۲۴۹، شرح السنہ رقم الحدیث: ۱۵۰۵)

میری امی جمعہ کی شب تقریباً ساڑھے گیارہ بجے رات فوت ہوئیں اور جمعہ کی شب فوت ہونے میں بھی ان کی مغفرت کی بشارت ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو مسلمان بھی جمعہ کے دن فوت ہوتا ہے یا جمعہ کی شب فوت ہوتا ہے، اللہ اس کو قبر کے فتنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ (سنن الترمذی رقم الحدیث: ۱۰۷۴، مصنف عبدالرزاق رقم الحدیث: ۵۵۹۴، مسند احمد ج ۲ ص ۱۶۹ طبع قدیم، مسند احمد ج ۱۱ ص ۱۴۷، رقم الحدیث: ۶۵۸۲، مؤسسۃ الرسالہ ۱۴۲۰ھ، الترغیب والترہیب للمنذری ج ۴ ص ۳۷۳، مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۱۳۶۷، کنز العمال رقم الحدیث: ۲۱۰۴۵)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن فوت ہو جائے اس کو عذاب قبر سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔

(المعجم الصغیر رقم الحدیث: ۲۷۱، الکامل لابن عدی ص ۲۵۵۴)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے دن یا جمعہ کی شب فوت ہوا اس کو عذاب قبر سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس پر شہداء کی مہر ہوگی۔

(حلیۃ الاولیاء ج ۳ ص ۱۸۱، رقم الحدیث: ۳۶۲۹، تقریب البغیۃ ج ۱ ص ۳۳۳، رقم الحدیث: ۱۲۱۶)

جن واقعات سے امی کے مقرب ہونے کا پتہ چلتا ہے

اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری امی کا بہت بڑا درجہ تھا، اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کو قبول فرماتا تھا اور ان کی خواہشوں کو بھی پورا فرماتا تھا، کوئی دس سال پہلے کی بات ہے، آدھی رات کو میری اچانک آنکھ کھل گئی اور دل میں سخت بے چینی تھی، لگتا تھا کہ کسی کی یاد آرہی ہے، میں سوچتا رہا کہ مجھے کس کی یاد آرہی ہے لیکن دل مطمئن نہیں ہوا، آخر میں نے سوچا کہ امی کی وجہ سے دل بے چین ہے، میں نے فیصلہ کیا کہ کل میں امی کے پاس جاؤں گا، پھر دل مطمئن ہو گیا اور میں سو گیا۔ دوسرے روز میں امی کے پاس پہنچا تو امی نے کہا، میں نے

رات کو تہجد میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ کل نجمی (میرا گھریلو نام) کو میرے پاس بھیج دینا۔ امی کی ایک خواہش تھی کہ ان کو چلتے پھرتے موت آئے، کسی کی محتاج نہ ہوں، سو ایسا ہی ہوا، ان کی خواہش تھی کہ ان کی وفات کے وقت ان کی بڑی بیٹی بھی موجود ہوں، مجھے رات ۱۲ بجے موبائل پر فون کر کے میری چھوٹی بہن نے بتایا کہ امی کا انتقال ہو گیا، میں بڑی بہن کو فون کرتا رہا لیکن ان کا فون خراب تھا، انہوں نے نیا گھر لیا تھا وہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا، بڑی مشکل سے رات کو اڑھائی بجے میں نے اپنی خالہ زاد بہن کو فون کر کے ان کا پتا معلوم کیا اور میں اپنے ایک کرم فرما محترم محمد شمیم خان کے ساتھ اللہ پر بھروسہ کر کے رات تین بجے ان کا گھر ڈھونڈنے نکلا، ہم اس علاقہ میں گھر ڈھونڈ رہے تھے کہ ایک شخص جو دس سال پہلے شمیم صاحب کے ساتھ سعودی عرب میں کام کر چکا تھا وہ ان کی آواز سن کر چونکا اور اس نے شمیم صاحب کو پہچان لیا، وہ اس علاقہ میں رہتا تھا، اس کے تعاون سے ہم نے گھر ڈھونڈ لیا اور اس طرح حیرت انگیز طریقہ سے امی کی یہ خواہش پوری ہوئی اور میں نے بڑی بہن کو امی کے پاس پہنچا دیا۔

اس سلسلہ میں دوسری انہونی یہ ہوئی کہ میں رات کو اپنا موبائل آف (Off) کر دیتا تھا، امی کی وفات سے ایک ہفتہ پہلے میری چھوٹی بہن صبیحہ نے مجھے فون کر کے کہا کہ آپ موبائل آف نہ کیا کریں، پھر میں نے موبائل آف نہیں کیا، اگر اس رات میرا موبائل آف ہوتا تو رات بارہ بجے صبیحہ بہن مجھے مدرسے کے فون پر اطلاع دیتیں اور رات بارہ بجے مدرسہ کے فون کو اٹینڈ (Attend) کرنے والا کوئی نہ ہوتا اور شاید پھر میرے بہنوئی امی کی تجہیز و تکفین کرتے اور مجھے یہ سعادت نہ ملتی اور امی کی یہ خواہش پوری نہ ہوتی کہ ان کی تجہیز و تکفین ان کے بیٹے کریں، وہ بار بار کہتی تھیں اور دعا کرتی تھیں کہ میرے بیٹے میری تجہیز و تکفین اور تدفین کریں۔

اس سلسلہ میں تیسری انہونی یہ ہوئی کہ میرے چھوٹے بھائی محمد خلیل، ریاض میں تھے۔ امی کی یہ خواہش تھی کہ ان کی تدفین میں ہم دونوں شریک ہوں، جمعہ کی شب رات بارہ بجے میرے پاس صبیحہ بہن کا فون آیا تھا کہ امی فوت ہو گئی ہیں، اس کے دس پندرہ منٹ

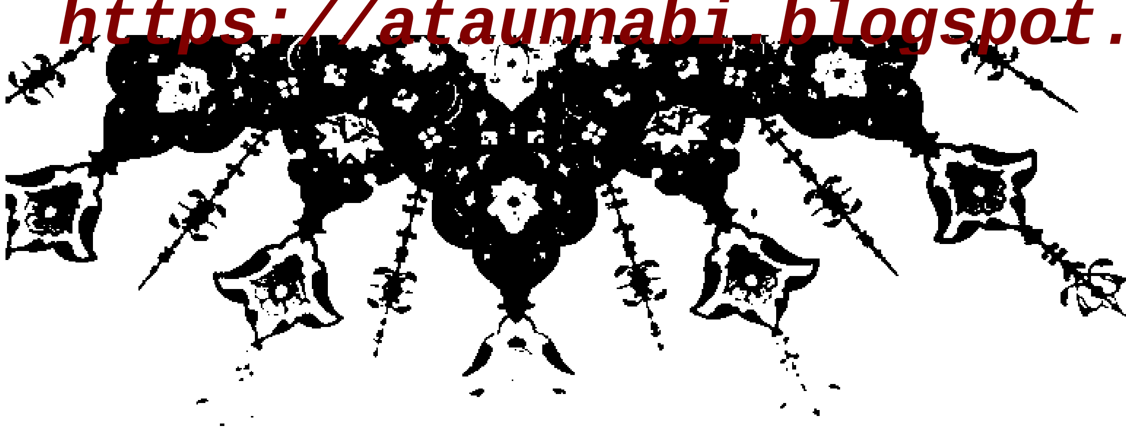
بعد میرے بھائی خلیل کا فون آیا کہ آپ تدفین مؤخر کر دیں میں ہر صورت ہفتہ کو کراچی پہنچوں گا، اگلے دن جمعہ تھا، جمعہ کو سعودی عرب میں تمام دفاتر بند ہوتے ہیں اور جب تک ان کے پاسپورٹ پر ایگزٹ ری انٹری ویزا نہ لگ جائے وہ سعودی عرب سے نکل نہیں سکتے تھے، بھائی کا پاسپورٹ کمپنی کے آفس میں تھا، اس کے لئے ایک فارم بھرنا پڑتا ہے، وہ فارم بھی آفس میں تھا، آفس جمعہ کی وجہ سے بند تھا، اس فارم پر ان کی کمپنی کے ڈائریکٹر کے دستخط ہونا لازمی تھے، وہ ڈائریکٹر اس وقت جرمنی میں تھا، اس کا موبائل نمبر بھائی کے پاس نہیں تھا، اس کے سیکرٹری کے پاس اس کے موبائل کا نمبر تھا، وہ جمعہ کی چھٹی کی وجہ سے اردن روانہ ہو چکا تھا، نیز اس دن ریاض سے کراچی کی کوئی فلائٹ نہیں تھی، بہ ظاہر یہ ایسے عوارض تھے کہ بھائی کا ہفتہ کے دن کراچی پہنچنا ناممکن تھا اور ہم تدفین میں زیادہ تاخیر کرنا نہیں چاہتے تھے، لیکن اللہ اپنے نیک بندوں کی خواہش پوری کرنے کے لئے بڑی سے بڑی رکاوٹ دور کر دیتا ہے، بھائی کو معلوم ہوا کہ ڈائریکٹر کے سیکرٹری کی فلائٹ کسی وجہ سے ملتوی ہو گئی ہے، وہ بس سے اردن جا رہا تھا، بھائی نے اس کو موبائل پر فون کیا، اس سے ڈائریکٹر کا فون نمبر لیا، پھر ڈائریکٹر سے بات کی، اس نے غیر معمولی تعاون کیا، بھائی نے متعلقہ یمنی شخص کی مدد سے آفس کھلوایا، اپنا پاسپورٹ نکلوایا اور وہ فارم نکلوا کر عربی میں بھروایا، ادھر ان کی کمپنی کے ڈائریکٹر نے اپنے ایک دوست کے ذمہ لگایا تو وہ جمعہ کی نماز کے بعد بھائی کا پاسپورٹ لے کر پاسپورٹ آفس گیا، پاسپورٹ آفس کھلوا کر اس کی ری انٹری ایگزٹ ویزا لگایا اور شام چار بجے بھائی کو پاسپورٹ جس پر ایگزٹ ری انٹری ویزا لگا ہوا تھا دے دیا، ریاض سے کراچی کی کوئی فلائٹ نہیں تھی، جدہ سے تھی، بھائی نے جدہ اپنے دوست کو فون کیا، انہوں نے بھائی کا ٹکٹ لیا، بھائی ریاض سے جدہ پہنچے اور جدہ ایئر پورٹ پر اپنے دوست سے ٹکٹ لے کر جہاز میں سوار ہو گئے اور ہفتہ کو صبح ساڑھے چار بجے کراچی پہنچ گئے اور ساڑھے آٹھ بجے میں نے امی کی نماز جنازہ پڑھائی اور دس بجے ہم تدفین سے فارغ ہو گئے۔

امی کی تعزیت کے لئے کراچی کے مشاہیر اور قابل ذکر علماء میرے پاس آئے ان

کے اسماء یہ ہیں: قائد ملت اسلامیہ سینیٹر علامہ شاہ احمد نورانی، مفتی محمد حسن حقانی، شاہ فرید الحق، مفتی منیب الرحمٰن مہتمم دارالعلوم نعیمیہ، مولانا غلام محمد سیالوی، مولانا غلام دستگیر افغانی، مولانا غلام ربانی، مولانا غلام نبی فخری، مفتی محمد اطہر نعیمی، مولانا جمیل احمد نعیمی، علامہ خالد محمود سیالوی، مفتی محمد اسماعیل نورانی، مولانا سید ناصر علی قادری، مفتی رفیق حسنی، مفتی منظور احمد فیضی، مفتی ابوبکر صدیق، مفتی فیض رسول، مولانا محمد الیاس رضوی اور کراچی کے دینی مدارس کے دیگر علماء اور فضلاء۔ صاحب زادہ محمد حبیب الرحمٰن نے بریڈ فورڈ برطانیہ سے اور ثمینہ بہن اور مولانا عبدالمجید نے برسٹل برطانیہ سے اور سید محسن اعجاز نے لاہور سے ٹیلی فون کے ذریعے تعزیت کی، مولانا الیاس قادری بانی دعوت اسلامی نے دبئی سے مکتوب بھیجا، مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری، ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی اور مولانا غلام نصیر الدین نے لاہور سے، مولانا محمد حفیظ نیازی ایڈیٹر ماہنامہ "رضائے مصطفیٰ" نے گوجرانوالہ سے، مولانا محمد عارف چشتی نے لندن سے اور دیگر احباب نے تعزیتی مکاتب لکھے، میں ان سب علماء اور احباب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری غم گساری کی، میں اپنے قارئین سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر میری امی کو ثواب پہنچائیں اور ان کے لئے دعائے مغفرت کریں۔

اور آخر میں مولانا محمد نصیر احمد نقشبندی، محترم محمد شمیم خان اور مولانا محمد اعظم نورانی صاحب کے لئے دعا کرتا ہوں جو آدھی رات کو اٹھ کر نماز فجر تک امی کی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں میرے ساتھ رہے اور سید معراج بھائی کے لئے دعا کرتا ہوں، جنہوں نے تدفین کے مراحل میں میری مدد کی اور خصوصاً شفیق بھائی کے لئے دعا گوں ہوں جنہوں نے قدم قدم پر میری غم گساری کی۔ قاری عامر حسین قادری، مولانا سید محمد علی قادری، مولانا محمد صابر نورانی، مولانا محمد عادل قادری، محمد ناصر خان چشتی، مولانا عبدالمجید ہزاروی، مولانا وکیل حسین چشتی، حافظ اکرام اللہ، حافظ محمد اویس، حافظ محمد جشید ہاشمی نورانی، حافظ محمد فاروق، بابر نفیس، سید امجد اور سید عمیر کے لئے دعا گو ہوں جنہوں نے اس سلسلہ میں بہت تعاون کیا۔





ضیاء القرآن پبلی کیشنز

